

خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اکتوبر 2018

نگارِ عالی
معراجِ رسول

PakiBooks.Site

صفحات 290
قیمت 100 روپے

الحق

مدیر اعلیٰ

عذرار رسول

مدیرہ
نائب مدیر
یمنی احمد
اظہر حسین

مینجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن مینجر

سید منیر حسین

0333-3285269

پیشہ ور

ماہر خراباب

محبت کے جھوٹے دعوؤں کا امتحان
لینے والی ایک قتالہ کا ماحبرا

101

سزائے انتظار

شاہر لطیف

معنا پرست رشتوں کے لیے
انوکھی سزا کا انتخاب

انشائیہ

جون ایلیا

دنیا میں خدا ہی خدایہ... اگر کوئی
نفع ہے تو صرف جہنم... ماضی سے انتخاب

14

مرکافات

ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا آئینہ... یاغیہ اور بانیغیہ
انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات

63

ٹھنڈی چائے

مختار آزاد

غفلت کے شکار دلوں میں
سوز جگاتی ایک پرستہ تحریر

113

موت سے پہلے

منظر امام

قدم قدم پر ٹھوکر کمانے والے ایک
محبور و بے بس عاشق کا ماحبرا

آپ کے خط

مدیر اعلیٰ

سہاس لی ٹاس... شہادت و تائید کی تلاش
شیریں بائیں کے کلمات اور سلاوس مشورے

49

نافا بل یقین

دو ویر ریاض

ایک شہادت اور غیبت
نواب نے مائیں پر قبضہ کا قصہ

76

رننگ سماں

آرہ اور اجپوت

شرق اور غرب... اور تازہ و نئی خبریں
کے محبت اور شہادت میں اپنی پہچان

118

چارنا چار

مرزا امجد بیگ

ملک صاحب کی نقشبندی کے پیچیدہ
انداز اور محبوسوں کا عبرت ناک انجام

پاگل ممتا

فہمی فردوس

اولاد کے ناز اٹھانے والی
ایک ماں کا پاگل پن

171

چشم دید

محمد طاہر عمیر

مغربی دنیا میں جرائم کے ارتکاب میں
ہر حد عبور کرنے والا ایک مکار مجرم

215

خازنار

محمد الیاس

خازن ارزاہوں پر چلنے
والی ایک دو شیزہ کی پراثر روداد

241

گرپیا

محمد سجاد خان

ٹھنڈی چھانوں سے بچھڑنے
والی ایک گرپیا کا انجام

بریفٹ کیس

سلیم انور

لاچ میں اندھے ایک دوست
کی لرزہ خیز واردات کا قصہ

181

احسان مند

نادیہ نور

ایک قاتل کے خمیر کا بوجھ، جسے
دوا کرنے کے لیے بے چین تھا

221

چور

ثمر عباس

ایک چور کا دوسرے چور سے
ملنا اور چھوٹی کا انوکھا ماحبرا

245

کیر

ظفر اقبال ظفر

کیر کے درخت تے بیٹھی ایک بے بس
عورت کی آہ و زاری کا دل نگار قصہ

مخفیانہ شیعہ سچ

قارئین

آپ کے ہاتھوں بھی ایک نئے نئے نئے
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

188

وقت

حسام بیٹ

ایک عزم بازی کی بازی گری... سنسنی
خیز واقعات پر مشتمل ایک طویل داستان

229

حضرت موسیٰ

رضوانہ ساجد

مصر کی سرزمین پر فرعون
سازشیں اور تینبر کے معجزات کا احوال

250

بجنگل

طاہر جاوید مغل

معاشرے کے بے خطر ناک اور پُر فکر
کرنے والے تھیں... جنگل آمد جنگل آمد کی تفسیر

75500

پبلشر پرو پرائنٹر: نیشنل رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور 63 • فیزا ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹڈیو کراچی

جلد 47 • شمارہ 10 اکتوبر 2018 • ذریعہ سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 100 روپے •

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 021 35895313 • E-mail: jdpgroup@hotmail.com

انشائیہ

جون ایلیا

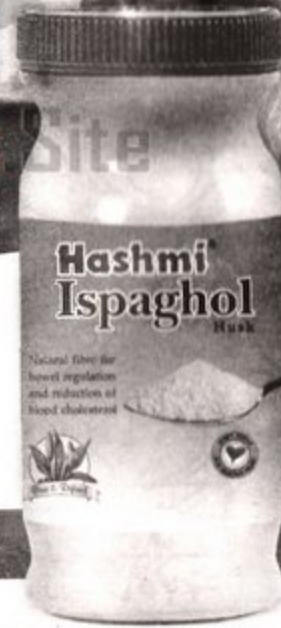
بڑا خسارہ

راستی، راستائی اور راستینی تلاش کرنے والوں کے لیے یہ ایک پُر آشوب زمانہ ہے۔ دلوں میں تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ دلیلوں پر درہمی کی افتاد پڑی ہے اور دانش پر دیوانگی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی اس طرح کبھی خلط ملط نہ ہوئی تھیں۔ ادھر یا ادھر، جدھر بھی دیکھو، ایک ہی سا حال ہے۔ تیرہ درونی نے اپنی دستاویز درست کی ہے اور کبھی، کبج رانی اور کج روی کا دستور جاری کیا گیا ہے۔ جو سمجھانے والے تھے، وہ اپنے افادات کی مجلسوں میں برائی بھارے ہیں۔ برائی سوچنی جارہی ہے اور بُرا چاہا جا رہا ہے۔ خیال اور مقال کی فضا اس قدر زہرناک کبھی نہ ہوئی تھی۔ انسانی رشتے اتنے کمزور کبھی نہ پڑے تھے۔

ایک اور قندہ برپا ہوا ہے، وہ احموری سچائیوں کا قندہ ہے۔ اس نے انسانیت کی صورت بگاڑ کر رکھ دی ہے۔ ایک آنکھ، ایک کان، ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کی انسانیت زندگی کے حسن تناسب کا نادر نمونہ ٹھہری ہے۔ یہی وہ انسانیت ہے جس کے باعث اس دور میں ہماری تاریخ کے سب سے بدترین واقعات ظہور میں آئے ہیں۔ گمان گزرتا ہے کہ یہ انسانوں کی نہیں، ہنسنسوں کی دنیا ہے اور ہم سب نسناس ہیں۔ جسے دیکھو وہ غیر انسانی لہجے میں بولتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ سہاتوں پر شیطانی شطیحات نے قبضہ جمالیا ہے۔ یہاں جو بھی کان دھر کر سن رہا ہے، وہ کانوں کے گناہوں کا مرکب ہو رہا ہے۔ سوچا ہے کہ ایسے میں نیک سماعتیں اعتراض اختیار کریں۔ اپنی نیتوں کی نیکی پر سختی سے قائم رہو اور اس کی ہر حال میں حفاظت کرو کہ تمہارے پاس یہی ایک متاع باقی رہ گئی ہے اور یہی تمہاری سب سے قیمتی متاع بھی ہے۔ نفرتوں کی گرم بازاری اور محبتوں کی اس قحط سالی میں دھکی انسانیت کے دکھ اور بھی بڑھ گئے ہیں۔ اس بیمار کے تیار داروں اور غم گساروں کی تعداد آہستہ آہستہ کم ہوتی جارہی ہے۔ اچھائی اور برائی میں ایک عجیب معاملت ہوئی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے اپنے ناموں کا آپس میں تبادلہ کر لیا ہے۔ اب ہر چیز اپنی ضد نظر آتی ہے۔ علم، جہل پر سمجھ گیا تھا اور جہل، علم کے خطاب پر بُری طرح لوٹ پوٹ تھا۔ سودوئوں ہی نے ایثار سے کام لیا۔

انسان کو اس دور میں وہ وہ منفعیتیں حاصل ہوئی ہیں جن پر ہر دور کا انسان رشک کرے۔ پر اس کا خسارہ بھی اسی قدر شدید ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کے اس انبوہ میں خود انسان ناپید ہو گیا ہے۔ جس مزاج اور جس قماش کی دنیا میں ہم رہتے ہیں، اس کا حال تو یہی ہے اور یہی ہونا بھی تھا۔ کونے کی کمائی کا لک کے سوا اور کیا ہے؟ اندرائن کے پیڑ سے کیا بھی انگوڑے خوشے بھی توڑے گئے ہیں؟

Poora Pakistan
Raha Hai Bol
Hashmi Ispaghool



روزانہ ہاشمی اسپغول
قدرتی فائبر کا استعمال رکھے
✓ معدے کو صاف
✓ بلڈ شوگر کا لیول برقرار
✓ کولیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
✓ قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست

Daily Lo Fit Raho

www.hashmisurma.com Hashmi Since 1794

Benchmark.pk

عزیزانِ من
السلام علیکم!

اکتوبر 2018ء کا سہنس باذوق قارئین کی نذر ہے۔ لیجئے جناب تمام حجاج کرام بھی حج کا فریضہ ادا کر چکے ہیں اور عید النبی بھی گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کا حج قبول و مقبول فرمائے۔ (الہی آمین) محرم الحرام کی آمد ہے، ایشیاد و قربانی اور عہد کی وفاداری کی عظیم مثال جانے ہوئے ذہنوں اور سوسے ہوئے ضمیروں پر آگاہی اور تنبیہ کی دستک دیتی ہے جو قیامت کے لیے سوچنے کے کئی دروازے کھولتی ہے۔ زندگی کی بے ثباتی ہمیں اپنے ارد گرد سے پرہیز کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ صحیح اور غلط کا فرق سمجھاتی ہے مگر مردہ ضمیروں پر شاید اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ملک بھر میں اچانک بچوں کے اغوا کی جانے والی ایک کو ایک باہر خود فوجہ کر دیا ہے۔ نئی حکومت کے حوالے سے اطمینان کی جہلور آئی تھی اس میں اچانک ان ناپاک عناصر نے ایک بے یقینی پیدا کر دی ہے۔ قوانین کے بنانے والے اور معائنہ کے لیے یہ جرم کوئی پہلی بار سرزد نہیں ہوا۔ ماضی سے تاحال اس کا تسلسل جاری ہے مگر افسوس کہ ان مجرمانہ کارروائیوں کے ستر باب کے لیے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو سکی۔ مایوسی اور افسردگی یا نامیدی کی فضا آخر تک تک۔؟ سوالیہ نشان جواب طلب ہے اور ہم سب منتظر ہیں۔ اقتصاد تو ہمارے قارئین بھی کر رہے ہیں اپنی پیاری محفل میں اپنے دوستوں کے تبصروں کا۔ تو چلیے جناب پھر دیکر بات کی۔

خالد شیخ طاہری، جاشور سندھ سے تشریف لائے ہیں۔ ”تجربہ کا سہنس خوبصورت سرورق اور میدانی کی مبارک کے ساتھ ملا۔ فہرست پر نگاہ ڈالی تو تقریباً سبھی جانے پہچانے نام نظر آئے لیکن اس وقت دل خوش ہو گیا جب آواز، یادگار کو آخری صفحات پر برہان پایا۔ (بہت خوب) جون صاحب کا انشائیہ پڑھا شاعر اور با۔ انشائیہ پڑھ کر جب ہم پہلے اپنی محفل میں حکومت سے پرانے مسائل حل کرنے کی امید کے ساتھ کو ایک ونگڈز اٹھاس پڑھی۔ رائے کے بارے میں بس یہی کہوں گا کہ ہمیشہ سے قاری ہمیں ادارے کے ہر فیصلے کو تسلیم کرنا چاہیے چاہے وہ قیامت کا اضافہ ہی کیوں نہ ہو۔ میری اپنی بھی سبب رائے ہے کہ صفات میں کمی نہ کی جائے مشکل وقت ہے مگر رہا جائے گا۔ قیامت میں اضافہ ہی بہترین آپشن ہے۔ چلیں پھر صاحب کو کرسی صدارت بہت بہت مبارک۔ جہوں میں بھی نے بہترین تبصرے کیے۔ سہنس میں اپنا پہلا تبصرہ لکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آخری صفات، یادگار کو آخری پڑھا۔ آپا نے سہنس کے قاری کو جنگ آزادی کے ان کرداروں سے ملوایا جن پر بہت کم لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ ناصر ملک، صاحب کی دوست مایوسی رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی پرانی غلطی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ اس کا قاری صاحب نے خود غرض میں نگہ رشتوں کی بے بسی پر زبردست تحریر لکھی۔ منظر امام صاحب نے تماشا میں تو کمال کر دیا۔ ایک اور زبردست تحریر پڑھنے کوئی۔ محمد طاہر میر کی آسان شکار پڑھتے ہوئے ذہن ہالی ڈکی دو تین فلموں میں الجھ کر رہ گیا۔ کہانی دلچسپ تھی پوری پڑھی۔ شاہ زین صاحب کی جیش گوئی کے اہتمام نے پانچواں۔ وقت پڑھنا شروع کی اور آخر تک پڑھتا چلا گیا۔ کہانی بہت ہی سست چل رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ہیرو ہر قسط میں ایک قدم اٹھا رہا ہو۔ راجپوت صاحب رنگب آسمان میں بہتر جا رہے ہیں۔ یہ قسط سنسنی خیز رہی۔ سہنس کلاسک میں اکیس بیٹا پوری صاحب کا نام دیکھ کر ماضی میں پہنچے جہاں محلاتی سازشوں کے درمیان کم ہو گئے۔ مقبوت وقت واقعی کلاسک رہی۔ خوریر ریاض کی ہم سفر شروع ہوئی اور تم ہو گئی ہائی ٹیکس چلا کیا تھا کہانی میں۔ مرزا امجد بیگ صاحب نے اپنی ڈائری میں اس واقعہ جو ہے دان میں زبردست پیشہ وارانہ مہارت کا ثبوت دیا۔ عبرت اثر روداد جو آخر تک دلچسپی سے پڑھی۔ انیل رضا کی اداکارہ بہتر رہی۔ رضوانہ ساجد کی تحریر حضرت موسیٰ علیہ السلام معلومات سے بھرپور رہی محفل شعر و سخن میں تمام شعر بہترین انتخاب تھے اور کتر میں دلچسپ رہیں۔ آخر میں ادارے کے لیے نیک خواہشات اور دعا ہے، یہ مشکل وقت آسانی سے ٹل جائے۔“ (آپ کی یہی اپنا بیت ہمارا اعلیٰ مزید مضبوط کرنے کا باعث بنی ہے۔ بہت شکر یہ آپ سب کا جو اس مشکل وقت میں ادارے کے ساتھ کھڑے ہیں)

عاصر شہزاد، ننگنا صاحب سے خط لکھ رہے ہیں ”تجربہ کا شمار مطالعے کے بعد زیر تبصرہ ہے۔ سرورق خوبصورت اور جاندار ہے، حسین لڑکی قیامت ڈھار رہی ہے۔ انشائیہ ہمیشہ کی طرح شاندار ہے۔ ایڈیٹر صاحب قیمت چاہے کتنی بھی بڑھ جائے رسالہ ہر حال میں جاری رہتا چاہیے۔ اس سے ہماری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ خطوط میں چلیں پھر، زین آفریدی، خالد شیخ سہنس ڈائجسٹ 2018ء اکتوبر 2018ء

طاہری، رمضان پاشا، ایمانے زارا شاہ، محمد زبیر، ناہید یوسف، شاہانہ سلطان، مہتاب احمد، نازش خان، بشری اقبال اور ریاض بیٹ نے تبصرہ نگاری کا حق ادا کر دیا۔ کہانیوں میں مقبوت وقت، ہم سفر، دوست، چوہے دان، آسان شکار، خود غرض، تماشا، پرانی غلطی، اداکارہ، حضرت موسیٰ، جیش گوئی اور ایک کہانی بڑی پرانی بہترین ثابت ہوئیں۔ تمام راسخز ناخصوص الیاس بیٹا پوری، ناصر ملک، اسحاق قادری، ڈاکٹر شیر شاہ سید، انیل رضا، رضوانہ ساجد اور زویا اعجاز نے منفرد اور اپنی کوئی اسٹور پرنکس۔ شعر و سخن میں مہوش، ظفر علی خان، زین خان، لیلیٰ منصور، کبکشاں فردوس، مدحت، وردہ ملک، نازش ریحان، بریرہ، انعم کمال، خورشید اعظم، ناصر علی، صاحبزادہ زینب خواجہ، عدوت ناصر، منیرین، سنبل، ناہید یوسف اور شہزاد علی نے بہترین شاعری تخلیق کی۔ نیز ریاض بیٹ کی دل اور آنسو ڈاکٹر تصدق حسین کی جہالت کی تاریکی، صفیہ رشید کی ماڈرن دور، طیل احمد لودھی کی ماڈرن ڈکسٹری، وزیر محمد خان کی سگریٹ اور نوشی ظلام حسین کی خواہش وزیر محمد خان کی پینٹل اور ذرا سوچے، بہترین معلومات افزا اہتمام پر ہیں۔ آخر میں دعائے خیر ہے۔ سہنس ڈائجسٹ دن دو گنی رات چوٹی ترقی کرے۔ آمین۔“

ریاض بیٹ، حسن ابدال سے بھرپور تبصرے کے ساتھ ”ماہ تجربہ کا شمار اس بار خلاف معمول 16 اگست کو ہی مل گیا۔ دیدہ زیب سرورق اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ جون ایلیا کا انشائیہ بہت خوب ہے۔ دل کی آنکھوں سے اسے پڑھا اور غور کیا۔ جو کچھ کہا گیا کچھ کہا گیا۔ اب اسے ہم نے مانا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے مانا ہے۔ ورنہ سارا سفر رانگاں چلا جائے گا۔ آگے بڑھے تو ادارہ اپنی مجبوریوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ مہنگائی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ آپ نے اپنی مجبوری بتادی، اب ہماری مجبوری بھی سن لیجیے۔ ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ رسالے کی اشاعت معطل کر دی جائے۔ میرا مشورہ تو ہے کہ قیمت بڑھا دیں۔ ہمیں رسالہ ہر صورت چاہیے۔ (بہت شکر یہ محترم آپ کی محبت اور ہماری مجبوریوں کو سمجھنے کا) اب بڑھتے ہیں خطوط کی طرف، چلیں پھر آپ کا تبصرہ بہت خوب ہے۔ لفظوں کا ترکا خوب لگایا ہے۔ یقینی ہم بھاگنے والے اگل نہیں ہیں، بیستیس سال سے سہنس سے جتنے ہوئے ہیں۔ خدا عمر دے اگر کرے۔ زین آفریدی اس بار تبصرہ ذرا مختصر تھا۔ خالد شیخ طاہری کا تبصرہ محفل کی جان ہے۔ اچھا لگا۔ آئندہ بھی ایسے جاندار تبصرے کے ساتھ آتے رہے گا۔ رمضان پاشا بھائی کیسے ہو؟ ہر ماہ تبصرے کے ساتھ حاضر ہوتے ہیں۔ بہت اچھا لگتا ہے۔ محمد راقم صاحب بھی باقاعدگی سے آتے ہیں اور دریا کو کوزے میں بند کرنے کا فن جانتے ہیں۔ میرا خط پندرہ گنے کا شکر یہ.... ایمانے زارا شاہ، محمد زبیر ساگر، ناہید یوسف، شاہانہ سلطان، مہتاب احمد، نازش خان، بشری اقبال کے تبصرے بھی پسند آئے۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سہنس کلاسک کے سلسلے کی تاریخی کہانی مقبوت وقت الیاس بیٹا پوری کے جادوئی قلم کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سفر سطر دل میں اتر گئی۔ واقعی ماضی میں حکومتوں کے تختہ الٹنے میں کئیوں اور غلاموں کا بڑا ہاتھ تھا۔ بہر حال اپنی تحریروں میں زندہ (مروم) مصنفین کی تحریروں کو خراج عقیدت یا تحسین پیش کرنے کا یہ ایک اچھا اور قابل تعریف سلسلہ ہے (اس سلسلے کو سراہنے کا شکر یہ) رنگب آسمان میں اب کافی تیزی آگئی ہے۔ یہ قسط پڑھ کر مزہ آگیا۔ ناصر ملک کی دوست کے کیا کہنے۔ ایسی تحریریں سیدی دل میں اتر جاتی ہیں۔ واقعی جب بے رحم وقت اپنی چال چلتا ہے تو دل کے نازک آنگینوں کو کرجی کر پی کر دیتا ہے تو دل کے ساحل پر گزرنے لگاتے گھونگے، سپہاں بن کر پڑے رہ جاتے ہیں۔ یہی حال رضی الدین کا ہوا۔ پھر پیچھے مرزا امجد بیگ صاحب کی ادائیگی بھیمزوں میں ابھی کہانی چوہے دان تک۔ اس جرم کی بنیاد ایک داہیات شک پر مبنی تھی جسے بیگ صاحب نے بڑی پاک بندی اور اپنی پیشہ وارانہ مہارت سے آشکار کر کے اپنے موکل سکندر کو باعزت بری کر دیا۔ سکندر واقعی قسمت کا دشمن نکلا۔ کراسے مرزا امجد بیگ صاحب جیسا وکیل میسر آگیا۔ اسے کہتے ہیں خود اپنے جال میں میاں آگیا۔ پرانی غلطی، ڈاکٹر شیر شاہ سید کی رلا دینے والے موضوع پر لکھی ایک حساس تحریر ہے۔ واقعی انسان کو اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہی حالات اس کے سامنے آتے ہیں اور جب ادنیٰ پڑا کے نیچے آتا ہے تو اسے اپنی حیثیت کا پتا چلتا ہے۔ باقی کہانیوں میں اداکارہ (انیل رضا) جیش گوئی (شاہ زین

سانحہ ارتحال

کتابوں اور رسائل کے سرورق کے مصور، کہنہ مشق فنکار، ڈاکٹر حسین جنہوں نے تقریباً نصف صدی کا عرصہ ادارے کی قریبی رفاقت میں گزارا، طویل علالت کے بعد 30 اگست 2018ء کی رات اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انشاء اللہ الیہ راجعون۔ قارئین مرحوم کی مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعا فرما لیں۔

سینئر صحافی الیاس شاکر طویل علالت کے بعد کراچی میں انتقال کر گئے۔ مرحوم کی صحافت میں خدمات قابل فراموش ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کریں۔



رضوان) اور ذوی اعجاز کی ایک کہانی بڑی پرانی بہت اچھی لگیں۔ خاص کر ذوی اعجاز نے بڑے اچھے انداز سے کہانی کے تانے بانے کیے اور آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ ویل ڈن اور سب سے بڑھ کر یہ اعلیٰ صاحبِ داد کی مستحق ہیں جنہوں نے اتنی اچھی کہانیاں منتخب کیں۔“ (آپ کی پسندیدگی ہمارا حوصلہ بڑھا دیتی ہے)

عید مبارک کہنی نظر آئی اور ساتھ میں کہہ رہی تھی کہ بھئی مجھے دیکھ کر حیران کیوں ہو رہے ہو۔ بارہا تم لوگوں نے مجھے جاسوسی ٹائٹل پر دیکھا ہے۔ اب سسٹمز پر بھی آگئی ہوں۔ عید کا موقع ہے۔ تاہم اس خوشی کے موقع پر جون انکل کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے خود کو مارنے پر تلتے ہوئے ہیں۔ ان کو اچھا بھلا پتا بھی ہے کہ ان کے مرنے سے ستر اراط، فارابی، طوسی، رومی اور برنارڈ شاہسیت اک پوری بستی مرجائے گی لیکن پھر بھی..... تمہارا شکریہ انکل کرتا ہوں میں زندہ ہو اور اک عید زندہ ہے..... چلوئی حکومت آگئی اور اچھی امیدیں بھی دلارہی ہے جو خوش کن ہیں۔ ورنہ باریاں لینے والوں سے تو ایسی کوئی توقع بھی فضول ہی ہوتی تھی۔ بہر حال بھان سنی کے کہنے میں سے چلتی ہی رہے اس دفعہ میدان مار لیا۔ بھئی اس دفعہ تو انہی آپ سب پاورفل شہزادیاں ہیں۔ عمدہ تبصرہ کیا۔ زرین آفریدی ج کی سعادت کے لیے گئی ہیں اللہ قبول فرمائے۔ (آمین) بہت مبارک ہو یہ سعادت! خالد شیخ طاہری کی اسپیلہ زبردست ہے۔ رمضان پاشا نے بھی مختصر آئندہ کیا، لنگا ہے عید کی بھاگ دوڑ میں اور اللہ دیا۔ محمد رفاقت اور محمد زبیر ساگر نے بھی عمدہ لکھا۔ ارے ریاض بٹ بھائی جانے کیوں دیں؟ اس دفعہ باریاں لینے والی حکومت خود ہی آگئی ہے جو جانے دیں۔ بھئی تبدیلی آئی ہے بس خواہشات نیک رہیں۔ ایمانے زاراشاہ کی شوخیاں اس دفعہ ماند پڑی دکھائی دیں۔ کیا اس آئی لینڈ کی ٹھنڈک اتنی زیادہ محسوس کر لی کہ مجھ ہی ہو گئیں؟ خیر تبصرہ اچھا ہوا۔ ناہید یوسف سسٹمز کو دیکھ کر بے اختیار تو ہو جاتی ہیں مگر کھرے کاموں کی بسی فہرست؟ پتا نہیں پھر کیسے تاہم نکال لیتی ہیں؟ پھر بھی عمدہ تبصرہ، ویلڈن ناہید یوسف۔ شاہانہ سلطان کا شاہانہ تبصرہ اچھا لگا۔ مہتاب احمد نے بھی بہت اچھا لکھا۔ تبصرہ یادگار بنانے کے لیے نازش خان کے ٹیپا لکھا کا اظہار بھی عمدہ ہوا۔ خراماں خراماں چٹتی بشری اقبال کا تبصرہ بھی شگفتگی تھا لیکن ساتھ ساتھ چلتے سسٹمز نے بھی ان کے موزک لطف دو لاکر اور اداس سے یہاں سے یہاں سے تبصرہ نگار جن میں دوست محمد، رانا بشیر احمد، ایاز محمد، صفدر معاویہ، بابر عباس، سید عہادت کاسمی، انیس خان، اوشاشی، بشری افضل، ڈاکٹر نائلہ نصر، کہاں خواب ہو کر رہ گئے ہیں۔ پلیز اپنی محفل میں تشریف لائیں۔ (کہا کسی نے؟) اگر کسی نے تو آئے ہیں کیا حرج ہے بھئی؟ کہانیوں میں سسٹمز کلاسک نے خوشی کی لہر دوڑادی۔ مجھے یاد ہے جب پہلے سسٹمز پڑھتا تھا تو ایسا سیتا پوری کا نام دیکھ کر خوش ہو جاتا اور تاریخی واقعات پر دل اور بھی مجھوم جاتا کہ واقعات اسے کون سا دور سے بیان کیے جاتے کہ بیان سے باہر ہے۔ سب سے پہلے معتب وقت ہی پڑھی اور بہت اچھی لگی۔ ایک علیحدہ اقبال ہوا دوسرا برابر اقتدار اور تیسرے کا دنیا میں قدم جبکہ ابراہیم کھر با سے ملتے ملتے رہ گیا اور معتب وقت ظہار۔ رنگ آساں میں شیطانی ممد کی پراسراریت کھلی تو اس کی اینٹ سے اینٹ بن گئی۔ شکر ہے ریتانے اپنے محبوب اور سخن کو اس کے لیے ڈھلی اور بے دوش ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اب سفیدی کا جانے کیا سرا ہے، امید ہے اگلی قسط میں ظاہر ہو جائے گا۔ شاہ زمان کی بہادری بھی ٹوب رہی لیکن وہ پریشان نہ ہو، اریہ کہ ایسا کہنا بھی اس کی چال ہی ہوگی۔ عمدہ کہانی۔ اپنی پارٹی چھوڑ کر تم میری پارٹی جوائن کر لو دوست اور پھر سب سے عجیب لڑکی نازو نے انکاری صورت میں اپنی راہیں ہی جدا کر لیں اور فاروق ساتھ ملتا ہی رہ گیا۔ دوست بھی اچھی کہانی تھی۔ نسلی کے شوہر سکندر کو بیگ صاحب نے رپا کر دیا اور سرکار نے سرکار سے کام لے کر صفدر ناہی بندے کو کل کے کیم میں پکڑ لیا۔ ساتھ میں اطلاع کا شوہر انیس علی بھی چہرے دان میں قابو آ گیا۔ عمدہ۔ وقت میں علی کو کھنڈے سے جڑے پر کاٹا گیا۔ بھوکا یا علی تو علی کی بھی کچھ نہ کچھ کا یا پلٹ جانے کی۔ باقی اس نے اپنے باپ کے قاتل چنگیز خان کو بھی مصری می بنا کر مہر تھاک۔ موت سے دو چار کیا۔ اب کا یا کی سسٹمی کیفیت پتا نہیں کوئی کہانی سامنے لارہی ہے، ہمیں اس وقت تک انتظار ہے گا۔ ایک کہانی بڑی پرانی، ہنوار سے پہلے اور بعد کے حالات سے جڑی پراثر تحریر۔ مشرقی اقداروں کی قدر و منزلت سے پتی آبیاری کو ملتی اور جدید اقداروں سے پامال ہوتے دیکھنا خون کے آنسو لانے کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود فصل بہار لانے کی امید لیے ستر کا آغاز کرنا اچھی بات ہے۔ ایک کہانی بڑی پرانی زبردست رہی۔ خود غرض بھائی تو اپنی آپا کی زندگی خراب کرنے پر مائل ہوا تھا مگر معاف نہ رہتے جوڑ کر اور چھان بین کر کے سسٹم کی ساری خود غرضی دور کردی اور مقام نے رفعت سے اپنے ابا کی شادی کر کے محبت کا بیج بو دیا۔ ہنس مزاح اور تنبیہ کی سے پھر ہر کہانی اچھی لگی۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدہ و دل وا کرے کوئی



واہ! اہلِ سبوت و بصیرت کے مابین تماشے نے کمال کر دیا۔ ڈاکٹر شہزاد سید کی کہانی بہت اچھی لگی۔ جو بویا ہو وی سامنے آتا ہے۔ ستائیس سال پرانی کی ہوئی غلطی اپنی بیٹی کے نہ رکھنے پر یاد آتی تو دل کی بے چینی تھی تھی۔ رشتے جاتوں میں ادب و لحاظ اور تسلیم ختم کا بھی بڑا مقام ہے۔ پرانی غلطی اچھی کہانی تھی مگر ایسی غلطیاں اچھی نہیں ہوتیں۔ بی اسرائیل نے جب اللہ کی بات نہیں مانی تو چالیس سال کے لیے بیابان میں بھٹکا مقدر ٹھہرا۔ اب حضرت موسیٰ انیس قریب داری کا احساس دلارہے ہیں تو سراسر انیس لوٹ مار کرنے پر تلتے ہیں۔ ایسی عجیب قوم کہ شرارتی بچوں کی حریفیں کرتی پھر بھی حضرت موسیٰ انیس معافی دلادیتے ہیں اور وہ پھر مخرف ہو جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کا واقعہ بھی سبق آموز تھا۔ محفل شعر و سخن سے زرین خان آفریدی، مختار انصاری اور قدرت اللہ ناز کی کے شعر اچھے گئے۔“ (آپ کے تفصیلی اور با معنی تبصرے نے دل خوش کر دیا، ویلڈن)

محمد رفاقت پھولوں کا گلدستہ لے واہ کینٹ سے حاضر ہیں۔ ”ماہنامہ سسٹمز ڈائجسٹ ستمبر 2018ء پھولوں کا گلدستہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی ہر ایک کہانی ایک پھول کی طرح ہے اور اس طرح یہ پھولوں کا گلدستہ بن گیا ہے۔ جناب اس کی پہلی کہانی تو میں سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ اس دفعہ بھی ایسا سیتا پوری کی معتب وقت، بہت ہی اچھی اور شاندار کہانی تھی۔ یہ سازشیں ابھی تک چل رہی ہیں اور ازل سے اب تک یہ کھیل چلتا رہے گا۔ کہانی ہم سفر میں گہری نیند سونے والے بھی مل جاتے ہیں۔ ناصر ملک کی دوست بھی اچھی کہانی ہے۔ مرزا احمد بیگ صاحب کی چوہے دان ایک تفتیشی کہانی ہے جس میں دوسروں کو پھنسانے والے خود ہی اس میں پکڑے گئے ہیں۔ آسان شکار، خود غرض، تماشا، وقت، اداکارہ، پیش گوئی، ایک کہانی بڑی پرانی اور پرانی غلطی بھی خوب اچھی لگی تھی۔ سب کو بہت مبارک باد قبول ہو۔ ادارے نے اس دفعہ بھی محفل شعر و سخن بہت خوب صورت انداز میں سجا ہی ہے اور ہر شعر اچھا ہونے کے ساتھ ساتھ معیاری بھی ہے جس کے لیے ادارہ مبارک باد کا حق ہے۔ کتر نہیں بھی اس رسالے کی جان ہیں، ان سے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ آتے ہیں اس رسالے کے سب سے زیادہ متبول سلسلے آپ کے خط کی جانب۔ تو جناب سب لکھنے والے بہت اچھے انداز میں کہانیوں کے بارے میں تحریر کر رہے ہیں اور ان کے خیالات سے رسالے کی پسند کا بھی پتا چلتا ہے۔ خط جو شامل ہوئے ہیں، ان میں ایمانے زاراشاہ، زرین آفریدی، خالد شیخ طاہری، رمضان پاشا، ریاض بٹ، محمد زبیر ساگر، مہتاب احمد، ناہید یوسف، شاہانہ سلطان، نازش خان اور بشری اقبال کے تبصرے بڑے جان دار تھے۔ سب کو اتنا اچھا لکھنے پر بہت مبارک ہو۔ اس رسالے کے لیے وقت نکالیں اور خوب لکھیں۔ ایک بات اور..... ڈیم کے لیے بھی دل کھول کر اپنا حصہ ڈالیں یہ صریحہ جاری ہے۔ اب نئی حکومت بھی بن گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پاکستانی عوام کی خدمت کرنے کا موقع دے اب نئے عزم، پوری لگن اور ایک جان ہو کر پاکستان کی خدمت کرنی ہے تاکہ آئے والے نکل کو ہم اپنے بچوں کو ایک محفوظ پاکستان دے سکیں۔ انشا اللہ میں جون ایلیا نے جو بیان دیا ہے ”تمہارا شکر ہے“ میں گزارش کروں گا کہ وہ اس نئے پاکستان کے بارے میں بھی کچھ لکھیں۔ ان کی باتیں بہت اثر انگیز ہوتی ہیں۔“ (آپ کو شاید علم نہیں کہ جون ایلیا صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ یہ سب ان کی نادر تحریریں ہیں جو شائع ہو رہی ہیں)

محمد رمضان پاشا کا مشورہ بکشن اقبال، کراچی سے ”آدی کے لباس سے اس کی حیثیت اور وقار کا اندازہ ہو جاتا ہے کیونکہ لباس ہی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، اسی طرح کسی رسالے کا سرورق دیکھ کر یا لوگ اندازہ لگاتے ہیں کہ اندر کے مندرجات کتنے شاندار اور جادو ہوں گے۔ اس معاملے میں ہمارا سسٹمز صف اول میں شمار ہوتا ہے۔ (بہت شکر یہ جناب) کاغذ کا بحران اور میکانیکی کے سلسلے میں اپنے قارئین سے مشورہ طلب کیا ہے تو حقیر فقیر کا مشورہ حاضر ہے۔ گر قبول اقتدر ہے عز و شرف..... صفحات کم کرنے کے حق میں نہیں ہوں، اشاعت کا قفل سسٹمز کے شیدائیوں پر قلم ہوگا۔ ہاں البتہ دام میں تھوڑا سا اضافہ کر لیں تو کوئی حرج نہیں۔ سسٹمز جو بہ حال میں خریدنا ہی خریدتا ہے.....“ (آؤ سے آؤ سے.....) (آپ سب قارئین کی اس محبت کو دیکھتے ہوئے ادارے نے آپ کے لیے ایک درمیانہ راستہ نکالا ہے۔ امید ہے آپ سب مطمئن ہوں گے)۔ دوست اس کہانی کا عنوان عجیب لڑکی ہونا چاہیے تھا۔ دوست بہت ہی پرانا اور گھسا پھسا عنوان ہے۔ آسان شکار ایک جھجک اور داغ جھکا دینے والی کہانی تھی، پھر بھی لطف تو آئی گیا۔ ہم سفر کہانی بہت دلچسپ تھی، لیکن اختتام اچھا نہیں تھا۔ رنگ آساں کہانی زبردست چل رہی ہے، گو قصہ بہت پرانا ہے۔ آخر کار کالی کے مندر کا تپا اچھا ہو گیا اور اب مہارانی اور اس کے دو مہر عاشق کا حشر شرابی ہے۔ چوہے دان احمد بیگ کی کہانی حسب معمول اس بار بھی بہت دنگ تھی۔ تماشا منظر امام نے تو اس بار کمال لکھ دیا، کہانی بہت ہی پراثر تھی۔ طبع زاد کہانیوں میں خود غرض بہت عمدہ کہانی تھی، بہت مزہ آیا۔ وقت، چنگیز خان سے خوب انتقام لیا۔ ایسا انتقام پہلے بھی ستانہ پڑھا اور اب علی کی نئی محبوبہ کا یا اپنی رام کہانی سامنے کی۔ اداکارہ غامی دلچسپ کہانی تھی، اختتام پر بھی بھئی آئی۔ شہزاد صاحب نے پہلے ہمیں اچھی اچھی کہانیاں پڑھنے کو دیں مگر اس بار انہوں نے بہت مایوس کیا۔ پرانی غلطی کوئی اچھا تاثر نہ چھوڑ سکی۔ غیر ملکی کہانیوں میں پیش گوئی کافی متاثر کن تھی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود قاتل پکڑ میں نہیں آیا۔ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ساتھ تبصرہ



لگا کر دیا اعلانیہ کہانی نے بہت تڑپایا، آنکھیں بھی نم کر دیں۔ ان کو مبارکباد دوں یا؟..... اشعار کی محفل میں ایسے سجادہ زریں آفریدی، ناصر علی اور منظر امام کے اشعار قائل داد تھے۔ کٹر نہیں بلکہ جواب تھیں۔ خطوط کی محفل میں جن دوستوں نے اس عاجز کا ذکر فرمایا، ان سب کا شکریہ۔“

انجم فاروق ساحلی، لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں۔ ”ستمبر کا سسپنس“ 113 اگست کو یک اسٹال پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ خوش رنگ نائل منظر اور پیکش لگا۔ خطوط کی محفل خوب بری بھری تھی۔ عرض ہے کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی ہر چیز کو اپنی پیٹ میں لے رہی ہے۔ لکھنے والے بھی مسائل کا شکار ہیں لیکن بہادر قارئین جیسے دوسری اشیائیں لکھنے والوں کو خریدتے ہیں، نو سسپنس کی قیمت میں مزید اضافہ بھی قبول کر لیں گے۔ اسے بند کرنے والی بات ہر حال قارئین کو بلا دینے والی ہے۔ صفحات تو پہلے ہی کم رہ گئے ہیں، مزید کی تو کم ہیں ہی نہیں معلوم ہوئی۔ مہنگائی معاشرتی زندگی کو بچھو کر رہی ہے لیکن بہر حال زندگی کے لوازمات جاری رہیں گے۔ یہی دستور زندگی ہے۔ میرے خیال میں قیمت بڑھا کر صفحات بھی بڑھا دیے جائیں اور اس کے رنگ روپ میں بھی اضافہ کیا جائے۔ (آپ سب کی رائے اور تبصروں کے پیش نظر کیا جانے والا فیصلہ کیا لگا) چلتی پھرتی بیرونیاض اور ناہید یوسف کے خط خاصے بھر پور اور اہم تھے۔ بٹ صاحب باذوق قاری ہیں۔ بقول قارئین قسط دار کہانیاں اگر ایک ہی دائرے میں گھومتی ہیں تو راسخو حضرات سے گزارش ہے کہ تھوڑی تو جگہ فرمادیں۔ ویسے حسام بٹ صاحب اچھا لکھنے والے ہیں۔ مرزا امجد بیگ کے کارنامے بھی خوب قلم بند کرتے ہیں۔ اداکارہ سے مطالعہ شروع کیا لیکن وہ متاثر نہ کر سکی۔ چوہے دان، پیش گوئی، تماشا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اچھی تحریریں ہیں۔ معاشرتی تحریروں کو غرض، پرانی غلطی دوست اور ہم سفر بھی خوب ہیں۔ الیاس سیتا پوری کا تو جواب ہی نہیں۔ ان کی کاوش بہت اچھی تھی۔ ایک کہانی بڑی پرانی انجی زیر مطالعہ ہے لیکن بادی انظر میں خوب معلوم ہوتی ہے۔ سسپنس کی مزید کامیابی و کاسرائی کے لیے دعا گو ہوں۔“

غفر احمد کا خط اسلام آباد سے ”وقت اپنی اڑان بھرتا رہا۔ ماہ و سال گزرتے رہے اور ہم سسپنس کو یونہی یک اسٹال کی زینت بنے دیکھتے رہے۔ ابتدائی صفحات کی تاریخی کہانی، دیوتا کا عہد، مختصر معاشرتی اور جاسوسی کہانیاں، حسام بٹ کے تحریر کردہ ملک صفدر حیات اور مرزا امجد بیگ کے کیسز اور آخری صفحات کی طویل خوب صورت کہانی۔ سسپنس نے ہمیں ہمیشہ ایک اچھی تفریح دہیا کی اور پھر وقت بدلے لگے۔ لوگ کتابوں سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ یہ وقت آ گیا کہ ادارے کے لیے ڈائجسٹ کو مین ٹین کرنا مشکل ہو گیا اور آپ قارئین سے صفحات کی کمی، قیمت میں اضافہ یا اشاعت میں قفل کا مشورہ کرنے لگے۔ (سسپنس اور قارئین کا تعلق ہی اتنا مضبوط اور خوب صورت ہے کہ قارئین سے مشاورت ضروری تھی) طاہر عمیر باغی کے بعد لمبے وقفے کے بعد طلوعہ گر ہوئے اور اس بار بھی چھانگے۔ طاہر عمیر یونہی لکھتے رہے۔ ذویا اعجاز کی کہانی آخری صفحات کی زینت تھی۔ ذویا کے لیے مشورہ ہے کہ کہانی میں الفاظ سے خوبصورتی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کی تحریر میں دلچسپی کمی کی ہوتی ہے۔ امیل رضا کو سسپنس کا حصہ دیکھ کر اچھا لگا۔“

محمد ہمایوں تنولی، اسلام آباد سے شامل محفل ہیں۔ ”ستمبر کا شمارہ میدانِ اشی کے اگلے دن مل گیا۔ اس بار سرورق کافی گرین تھا۔ لکنا ہے کہ سسپنس میں بھی تبدیلی آگئی ہے کیونکہ سرورق کافی ہرا بھرا ہے۔ دیوار چین کی طرح پھولوں کی دیوار بنادی ہے۔ اب جاتے ہیں کہانیاں کی طرف تو سب سے پہلے مرزا امجد بیگ کی چوہے دان پڑھی۔ مرزا امجد بیگ جیسے وکیل ہوں تو کوئی بے گناہ جیل میں نہ رہے۔ مرزا صاحب کو تو پولیس میں ہونا چاہیے۔ 90 فیصد کا تو پولیس کا کرتے ہیں۔ آئی او کو تو اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ اپنی توہم کن کرنے کے لیے آڈٹ ورک بھی کریں۔ اب وقت ضائع کرنا مناسب نہیں۔ علی کے ساتھ اخبار لکھنا گئے اور وہاں چنگیز خان کو مورا کر..... پرانی غلطی پڑھی۔ اداکارہ بھی اچھی کہانی ہے پھر خود غرض سے نئے اور تماشا بھی دیکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات پڑھ کر دل کو اطمینان حاصل ہوا۔ رنگ آتا اب کچھ میں آتی شروع ہوئی ہے۔ ویسے کہانی بہت اچھی ہے۔ مگر ذرا گہرائی میں جانا پڑتا ہے پھر کچھ میں آتی ہے۔ ہم سفر بھی اچھی کہانی ہے۔ لائف بک بھی دلچسپ تھی۔ پسند آئے۔ محفل شعر و سخن میں صدر علی خان کو کون کا قطعہ اچھا تھا۔ ایس سجادہ کا ڈھکشا شعر بھی اچھا تھا۔ کبکشاں کا شعر بھی بہت اچھا تھا۔ خطوط میں چلتی پھرتی طاہر جی، خالد شیخ طاہری جاشورہ، ریاض بٹ حسن ابدال اور شاہانہ سلطانہ کے خطوط بہت لمبے تھے۔ لکنا ہے چاروں ویسے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کتاب پڑھتے بغیر تبصرہ کر دیتے ہیں۔ کئی لوگ لفظوں کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔ خط اتنا ہو کہ باقی لوگ بھی محفل میں شامل ہو سکیں۔“ (ایک خیال ہے)

فیصل مشتاق، قبولہ شریف سے شریک محفل ہیں۔ ”ماہ ستمبر کا سسپنس تھوڑا لیت موصول ہوا مگر خوبصورت سرورق اور



قابل لکھاریوں کی کہانیوں سے مزین تھا۔ ادارہ بہت خوب رہا۔ جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا، بہت بردست لگا۔ واقعی لکھاری یا شاعری موت نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات دنیا کے حالات و واقعات سے تنگ آ جاتا ہے۔ وہ ظاہری موت مر جاتا ہے مگر اس کے الفاظ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ آپ کے خط سسپنس کا بہت دلچسپ سلسلہ ہے جس میں گلے شکوے، تبصرے، کھٹی میٹھی باتیں سب شامل ہوتا ہے۔ میں نے تمام دوستوں کے خطوط پڑھے۔ چلتی پھرتی آپ کا تبصرہ بہت عمدہ اور جامع رہا۔ اس کے بعد خالد شیخ طاہری اور ایمانہ نے زارا شاہ کا تبصرہ بھی لکھا جواب تھا۔ ناہید یوسف اور ریاض بٹ کا تبصرہ بھی جامع اور بردست تھا۔ انہوں نے ہر کہانی پر تبصرہ کیا۔ اس کے بعد کہانیوں کے تبصرے پڑائیں تو مجھے منظر امام کی تماشا نے بے حد متاثر کیا۔ نور آنکھیں نہ ہونے کے باوجود مجھ سب دیکھ سکتا تھا اور واقعی کسی نے صحیح کہا ہے..... ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی، ہو دیکھنا تو دیدہ و دل واکرے کوئی۔ نور وہ دیکھ سکتا تھا جو شاید ظاہری طور پر کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بہت ہی زبردست اور لا جواب کہانی تھی۔ ناصر ملک کی دوست بھی اچھی رہی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی حقیقی موضوع پر بھی کہانی اپنے اندر باپ بیٹی کے رشتے کی خصوصی محبت پیٹنے ہوئی تھی۔ بے شک باپ اور بیٹی کی محبت کا رشتہ تب ہی کچھ آتا ہے جب خود باپ کا رتبہ حاصل ہو۔ بد قسمتی کہ پرانی غلطی کی معافی نہ مل سکی تھی۔ ان محبت بھرے رشتوں کو ہم تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم خود ان کا رتبہ اختیار نہیں کر لیتے۔ امیل رضا کی اداکارہ بھی خوب ہٹ رہی۔ کیتھرین دراصل اپنے ہی شو پر سینٹ کے ساتھ اداکاری کر رہی تھی اور بے قصور سینٹ اس کے دھوکے کا شکار جانے کتنے سال سے ہو رہا تھا۔ ہم سفر فرہت کی پہلی کہانی تھی۔ چونکہ میں نے آخر میں پڑھی اور بلاشبہ بہت متاثر ہوا۔ کیسا عجیب سفر تھا۔ بیک نے ماں باپ کی بات نہ مان کر غلطی کی تھی۔ جری اور ڈیری جیسے لوگوں سے اس کا واسطہ خطرناک رہا۔ اس کے ساتھ سفر میں جو واقعات پیش آئے وہ ضرور چھپتا ہوا ہوگا۔ کہانی اپنے اندر بہترین پلاٹ اور سبق لیے ہوئے تھی ہمارے لیے بھی سبق ہے کسی کو ہم سفر بنانے سے پہلے سوچا جائے۔ غلطی سے بیک نے گھر چھوڑا اور اس کا برا وقت شروع ہو گیا۔ اسی طرح برا وقت آتے دیر نہیں لگتی۔ ویل ڈن جناب تو ریر ریاض۔ اس کے بعد شمر وخن کی محفل میں تمام شعر بہت خوب رہے۔ اس کے علاوہ تمام کہانیاں ہٹ رہیں۔ سسپنس میں میری پہلی انٹری ہے، آئندہ بھی آ جا رہوں گا۔“ (بی بی محمد، ہم اللہ، ہم اللہ..... خوش آمدید)

محمد اشرف کی مداح سرائی مغل پورہ، لاہور سے ”میں آپ کا اور سسپنس ڈائجسٹ کا بڑا مداح ہوں اور بہت پرانا قاری ہوں۔ ہر ماہ کے ڈائجسٹ میرے پاس محفوظ پڑے ہیں۔ ماہ ستمبر 2018ء کا اس وقت پڑھ رہا ہوں۔ بہت عمدہ کہانیاں ہیں، خاص طور پر چوہے دان اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور نبوت کی سیریز اچھی جا رہی ہے..... عذرا رسول صاحبہ ایک مرتبہ پھر میں یاد دہانی کروانا چاہتا ہوں۔ پہلے بھی میں نے آپ کو خط لکھا تھا۔ جون 2016ء کا شمارہ جو مجھ تک پہنچا، اس میں ایک کہانی ہے، ملک صفدر حیات کی۔ کہانی کا نام ہے درحقیقت۔ وہ نام مل تھی۔ صفحہ نمبر 98 کے بعد صفحہ 131 شروع ہو گیا تمام سسپنس ختم ہو گیا اور میں آج بھی بے چینی محسوس کرتا ہوں۔ کیا یہ صرف میرے شمارے میں ہوا تھا یا کسی اور قاری نے بھی محسوس کیا؟“ (جناب! اتنی پرانی بات آپ دبائے بیٹھے ہیں۔ ہمیں آپ کی طرف سے کوئی خط نہیں ملا۔ بہر حال آپ کے مسئلے کا حل بتا دیتے ہیں۔ اگر کبھی آپ کے پرچے میں ایسا ہوا ہے تو براہ مہربانی آپ نے جس بک اسٹال سے پرچہ خریدا ہو، وہاں دوبارہ رابطہ کر کے پرچہ بدلا لیں۔ اکثر بکسٹلنگ کی غلطی سے صفحات آگے پیچھے ہو جاتے ہیں)

رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے تشریف لائی ہیں۔ ”اس دفعہ سسپنس میں نیا نائل دیکھنے کو ملا۔ مدیرہ اعلیٰ صاحبہ نے کاغذ کی مہنگائی کی وجہ سے 3 جلدوں کے ہمارے سامنے رکھی ہیں۔ ہم سب کا مشورہ یہی ہے کہ بے شک رسالوں کی قیمت بڑھادی جائے۔ JDP کو کچھ عرصے کے لیے نہیں، ایک مہینے کے لیے بھی معطل کرنے کا سوچیں بھی نہ۔ ہمارے مگر ان اعلیٰ نے اسے دن رات انتھک کوششوں سے یہاں تک پہنچایا ہے۔ سب کے خطوط پڑھتی ہوں۔ بہت معلوماتی تبصرہ ہوتا ہے۔ جو قاری مجھے جانتے ہیں ان کے تبصروں میں اپنا نام ضرور تلاش کرتی ہوں جیسے اشفاق شاہین، محمد خواجہ، زرین آفریدی، مرزا حاکم، عبدالجبار روی اور محمد صفدر معاویہ..... آپ کو بیٹے کی بہت مبارکباد“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
ریحانہ خالد، پشاور۔ سلیم اختر، کراچی۔ راشد محمود، حیدرآباد۔ غلام فرید، سکھر۔ رانا احسان، کراچی۔ فرخندہ سلیم، سرگودھا۔ ریاض فیروز، میرپور خاص۔ محمد انور، کوئٹہ۔ امتیاز احمد، حیدرآباد۔ رحیم ایڈو، نواب شاہ۔ کاغذ بٹول، ملتان۔ غلام رسول، پیٹوٹ۔ محمد اسلم، پھالیہ۔ اختر زلفر، ڈیرہ اسماعیل خان، نوشہرہ گڑا، بھکر۔ رانا ارشد، چکوڑی (منڈی بہاؤ الدین)

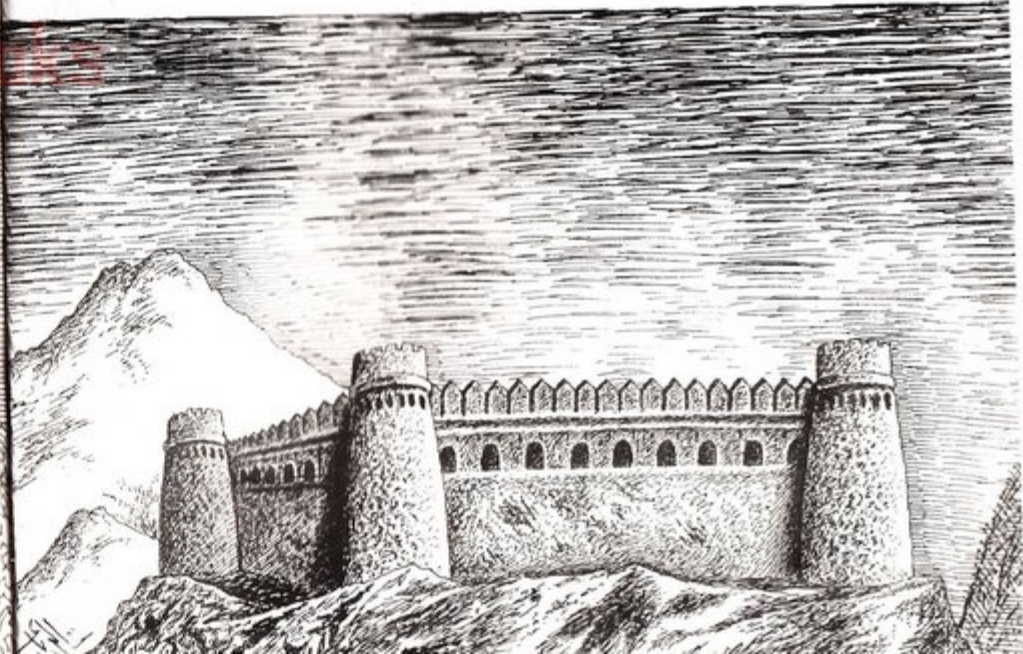


مکافات

ڈاکٹر ساجد امجد

ماضی کا سحر بھی کتنا عجیب ہوتا ہے۔ جانے والوں کی زندگی کے نشیب و فراز... غم، خوشی... فتح، شکست جیسے واقعات آنے والوں کے لیے کسی دلچسپ داستان سے کم نہیں ہوتے... سسپنس کے تاریخی صفحات کا یہی جاودہ ہے کہ پڑھنے والوں کو اپنے سحر سے آزاد نہیں ہونے دیتا... بلین کا دور بھی تخت اور طاقت کے گرد اپنا دائرہ مکمل کرتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ جہاں طاقت، دولت اور حکمرانی یکجا ہو جائیں وہاں سازشیوں کا گروہ بہت فعال کردار ادا کرتے ہوئے اس طاقت کے منبع کو تاراج کر دے کی مذموم کاوشوں میں مصروف عمل رہتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اچھے کرداروں کے ساتھ ان منفی رویہ اختیار کرنے والوں کا ذکر کیسے تاریخی حوالوں میں ملتا... بہر حال چاہے بادشاہوں کی داستان ہو یا فقیروں کی زندگی، اعمال کو پرکھنے اور ان کے لیے مکافات کا فارمولا بالکل یکساں ہے اور اس کے شکنجے سے کوئی آزاد نہیں ہو پاتا۔

لکھنؤ کی کوئی یہاں رکھا تھا۔ دارالحکومت دہلی سے جان جوکھوں کا کام تھا لہذا جب سلطان غیاث الدین بلبن نے اپنے ایک ترک غلام ”طغرل“ کو وہاں کا حاکم مقرر کیا تو اس نے غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار کر حکمرانی کے علاوہ بریں ایسے دشوار گزار راستے تھے کہ وہاں تک پہنچنا



خواب دیکھ لیکن نیا نیا دہلی سے آیا تھا۔ بلین کے دربار کی شان و شوکت ابھی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی۔ بلین کے بہترین اختلاعات، اس کے بیٹوں کی بہادری اور خود بلین کی تلوار کی کاٹ اس کے حوصلوں کو بہت کیے دے رہی تھی حالانکہ خود اس کی بہادی ضرب ابلش تھی۔ وہ عرصے تک اپنے ارمان دل میں دبائے بیٹھا رہا۔ انہی ہمت نہ ہوتی تھی کہ علم بغاوت بلند کرے۔ یہ کہہ کہہ کر حوصلہ بڑھاتا تھا کہ اس کا آقا بلین بھی تو ایک غلام تھا۔ جب وہ بادشاہ بن سکتا ہے تو میں کیوں نہیں۔ قطب الدین ایک کی مثال بھی اس کے سامنے تھی۔ اس سب کے باوجود وہ ارادے باندھتا تھا اور توڑ دیتا تھا۔ سرکشی کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس نے کسی ڈراؤنے خواب کی طرح اس خیال کو پس پشت ڈالا اور صوبے کے انتظام و انصرام میں دہمچی سے مشغول ہو گیا۔ تنگ حرامی شاید اس کے نصیب میں لکھی ہوئی تھی کہ اس کو اس علاقے کی چند مہموں میں زبردست کامیابی ہوئی۔ ان کامیابیوں نے اس کے ارادوں کو جو ان کرنا شروع کر دیا۔ یہ علاقہ ہی ایسا تھا کہ ایک مدت سے بغاوت کرنا یہاں کے رہنے والوں کی عادت اور طبیعت بن گئی تھی۔ یہ شریک پند فطرت کے ارادوں کو بھانپ گئے تھے لیکن وقت آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ موقع انہیں اس وقت مل گیا جب فطرت نے ایک مال دار علاقے ”جانب نگر“ پر حملہ کر دیا۔ اس محرے میں بہت سا مال و دولت اس کے ہاتھ لگا۔ لکھنؤ کی شریک پندوں اور باغیوں نے اس تک رسائی حاصل کر لی اور اس کو طرح طرح سے درغلا شروع کر دیا۔ ”سلطان بلین اب بوڑھا ہو گیا ہے اور اس نے اپنے دونوں لڑکوں کو مغلوں کے مقابلے کے لیے متعین کر دیا ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ مغل ہندوستان میں نہ کھس آتے ہوں اور کوئی نہ کوئی قضیہ نہ اٹھ کھڑا ہوتا ہو۔ مغلوں کے خلاف دفاع کا انتظام شاہان دہلی کے لیے سب سے اہم مسئلہ ہے۔ سلطان بلین اور اس کے لڑکوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ مغلوں کو نظر انداز کر کے لکھنؤ کی کارخ کریں اور نہ ہی اس کے امراء میں کوئی سردار ایسا ہے کہ آپ کے مقابلے پر آئے۔ لہذا آپ چتر شاہی سرپرستیں اور اپنی بادشاہت کا اعلان فرمادیں۔“

فطرت ان باتوں پر فریفتہ ضرور ہوا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا اور سردرد کا بہانہ کر کے محفل سے اٹھ گیا۔ شریک پندوں پر مایوسی چھائی۔ وہ آپس میں اس کے خلاف باتیں کرنے لگے۔

”فطرت ایسی بزدلی کا مظاہرہ کرے گا، یہ تو ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اگر وہ بغاوت پر آمادہ نہ ہوا تو ہمارے خلاف قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا کیونکہ ہمارے ارادے اس پر ظاہر ہو گئے ہیں۔“

”چھر؟“

”چھر کیا..... اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچے، ہم اس کے قتل کا بندوبست کرتے ہیں۔ شاید نیا آنے والا ہمارے مطلب کا ہو۔“

”کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن کیا یہ اتنا آسان ہوگا؟“

”اس میں مشکل کیا ہے۔ یہ باتیں چل ہی رہی ہیں۔ ان باتوں کے بہانے اس سے ملاقات کریں گے اور موقع دیکھ کر کام تمام کر دیں گے۔“

”سیرے خیال میں تو ابھی جلدی مت کرو۔ اس کی طرف سے کوئی جواب آنے دو۔ ہو سکتا ہے اسے سوچنے کے لیے وقت درکار ہو۔“

”ٹھیک ہے، دو چار دن اور دیکھے لیتے ہیں۔“

فطرت ان لوگوں کے پاس سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا تھا۔ اس وقت ایک ہی موضوع اس کے پاس سوچنے کے لیے تھا اور وہ سوچ رہا تھا۔ رات کا ایک بڑا حصہ اسی ادھیڑ میں گزرا اور پھر ایک نتیجہ پر پہنچ گیا۔

”مجھ ہوئی تو اس نے بلین کے غیظ و غضب کو بلائے طاق رکھا اور جو مال قیمت وہ جان بوجھ کر لے لیا تھا، سب اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک باغی تھوڑی سی طرف روانہ نہیں کیا۔ کسی حاکم کے لیے اس سے بڑا اور کوئی جرم نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کا حصہ بڑبڑ کرے۔ یہ کھلی بغاوت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بادشاہ اس پر گفتگو کی ضرورت کرے گا لیکن اسے بھی اپنی عسکری قوت پر ناز تھا لہذا ڈانٹا رہا۔“

جب کئی دن گزر گئے اور بادشاہ کی جانب سے نہ تو کوئی قاصد آیا نہ لشکر کشی کی خبر ملی تو اسے تعجب ہوا۔ اسے باوثوق ذرائع سے اطلاع ملی کہ بلین سخت بیمار ہے اور ایک مہینہ ہو گیا ہے وہ اپنی رہائش گاہ سے باہر نہیں نکلا ہے۔ اس نے اس وقت کو غنیمت جانا اور لشکر تیار کرنے لگا تاکہ صحت یاب ہونے کے بعد بلین اس طرف کا رخ کرے تو اس کا مقابلہ کیا جاسکے۔

اس کے ساتھیوں کو جب اس کے اس اقدام کی اطلاع ہوئی تو ان کی کچھ ڈھارس بندھی اور اسے مشورہ دیا کہ وہ اس بغاوت کے ساتھ ہی اپنی بادشاہت کا اعلان بھی

مکافات

کردے اور اپنے نام کا سکہ جاری کر کے دہلی سے اپنا رشتہ منقطع کر لے۔ فطرت نے ایک مرتبہ پھر ان کے اس مشورے کو ماننے میں ہچکچاہٹ ظاہر کی۔

ان شریک پندوں کو کوئی تاخیر گوارا نہیں تھی۔ انہوں نے پھر آپس میں صلاح مشورے کیے اور اگلے ہی دن اس کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔

”آپ کے پاس دہلی سے کوئی خبر آئی۔“

”کبھی خبر؟ بس یہی معلوم ہوا تھا کہ بلین علیل ہے۔“

”وہ انتقال کر چکا ہے۔ سلطنت میں انتشار نہ پھیل جائے اس لیے اس خبر کو چھپایا جا رہا ہے۔“

اس بے بنیاد خبر کو سنتے ہی اس نے تحقیق کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ چتر شاہی سرپرستیں نکلن کیا اور سلطان معز الدین کا خطاب اختیار کیا اور اس کو فخر کے ساتھ خطبہ دسکے میں شامل کر لیا۔ وہ چونکہ بہت فیاض تھا اور لوگوں پر کثرت سے بخشش کرتا تھا اس لیے اس شہر کے باشندے اور علاقے کے رہنے والے اس کے ساتھ ہو گئے۔

فطرت کو خود مختار حکومت قائم کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ بلین کی صحت یابی کے فرمان لکھنؤ پہنچے لیکن چونکہ خود مختاری کا چکا بڑچکا تھا اس لیے اس نے آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنا مناسب نہ سمجھا۔ اپنی اس ناشائستہ حرکت پر نادم ہونے کے بجائے بغاوت پر آمادہ رہا۔ اس کے نادان دوست برابر اسے سمجھاتے رہے کہ بلین کو مغلوں ہی سے فرصت نہیں، وہ لکھنؤ کی کارخ کیا کرے گا۔

بلین کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اسے سخت رنج ہوا۔ دکھ اس بات کا تھا کہ ایک غلام سے یہ حرکت سرزد ہوئی تھی۔ فطرت کی بخششوں کی خبریں برابر اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کا غصہ اور غضب بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کا شعلہ غضب ایسا بڑھ گیا تھا کہ کسی کو اس کے سامنے آنے اور کچھ عرض کرنے کی مجال نہیں تھی۔ آخر کئی روز خلوت میں رہنے کے بعد اس نے اپنے ایک سردار ملک ایشکین کو جو ایشن خاں بھی کہلاتا تھا، طلب کیا۔

”تم نے کافرعت فطرت کی تنگ حرامی کی خبر سن لی ہوگی۔ وہی فطرت جو میرا غلام تھا اور میں نے اسے لکھنؤ کی حاکم بنایا۔ اس نے بغاوت کی ہے اور غلامی کو شاہی سے بدلنے کے درپے ہے۔“

”جی ہاں یہ خبر میں نے اسی رنج کے ساتھ سنی ہے

جس دکھ کا اظہار آپ نے فرمایا۔“

”یہ نہیں پوچھو گے میں نے تمہیں کس لیے طلب کیا ہے؟“

”بادشاہوں کے معاملات بادشاہ ہی جانیں۔“

”میں فطرت کو معزول کر کے تمہیں صوبہ لکھنؤ کی حاکم مقرر کرتا ہوں۔ وہ چونکہ بغاوت پر کمر بستہ ہے اس لیے تمہیں اس بغاوت کو کچل کر اپنا غلبہ حاصل کرنا ہوگا۔“

”مجھے صوبہ داری کا کالاج نہیں لیکن میں اس بغاوت کو کچلنے کے لیے آپ کے حکم کی پاسداری ضرور کروں گا۔“

ایشن خاں سلطان بلین کا غلام تھا۔ برسوں سے اودھ کے اقتدار اس کے پاس تھے۔ اس کا شمار لشکر کے سرداروں میں کیا جاتا تھا۔ سلطان نے چند نامی گرامی امراء کو اس کے ساتھ کیا۔

ایشن خاں فطرت کی بغاوت فرد کرنے کے لیے روانہ ہوا۔

ایشن خاں ہندوستان کے لشکر کے ساتھ جنگ کے لیے مستعد ہو کر لکھنؤ کی لیے روانہ ہوا۔ ادھر سے فطرت بھی ایک زبردست لشکر کے ساتھ اپنے دارالحکومت سے باہر آیا۔ ایک وسیع میدان میں دونوں کا آمناسامنا ہوا۔

فطرت کے پاس آدمیوں کی بہت بڑی جماعت اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس کی کثرت بخشش کی وجہ سے اس علاقے کے باشندے اور خود دہلی سے آئے ہوئے لوگ دل و جان سے اس کے دوست بن گئے تھے۔ یہاں بھی اس نے سبھی کیا۔ نیزے اور تلوار سے کام لینے کے بجائے روپے اور چاندی سے کام لیا۔ ایشن خاں تو اس کے سپاہیوں کی تعداد دیکھ کر ہی حیران ہو رہا تھا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے اپنے سپاہی بھی رشوت لے کر منحرف ہو چکے ہیں۔ اس کا انکشاف اس وقت ہوا جب باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوا اور ایشن خاں کا آدھا لشکر، فطرت سے جا کر مل گیا۔ جو باقی بچ گئے تھے ایسی بے دلی سے لڑے کہ جلد ہی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ہندوستانی سپاہی ایک سمت میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگنے کے دوران ہندوؤں نے انہیں خوب لوٹا کیونکہ کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔

ایشن خاں کی شکست کی خبر جو بلین سلطان تک پہنچی، وہ آپے سے باہر ہو گیا اور وہ ایسی حرکت کر بیٹھا جو اس سے کبھی سرزد نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ایشن خاں کو قتل کر کے اس کا سر اودھ کے دروازے پر لٹکوا دیا۔ جنگوں میں فتح بھی ہوتی ہے اور شکست بھی۔ شکست کا مطلب ہرگز غداری نہیں ہوتا

12

اکتوبر 2018ء

روزانہ نامزد ہوتے تھے، وہ چند کوس آگے جاتے تھے اور آگے پیچھے دیکھیں بائیں ہر طرف فطعل اور اس کے لشکر کی تلاش اور جستجو کرتے تھے لیکن وہ ایسا غائب ہوا تھا کہ کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ ایک روز بلین کے چند نامور بہادر تیس چالیس سواروں کے ساتھ فوج کے آگے آگے جا رہے تھے کہ انہوں نے چند بقالوں کو آتے ہوئے دیکھا۔

”اس بے آب و گیاہ میدان میں ان بقالوں کا کیا کام..... یہ کہاں سے آرہے ہیں؟“

”بات تو سوچنے کی ہے۔ فطعل یہیں کہیں چھپا ہوا ہے اور یہ لوگ اس کے لشکر میں سامان فروخت کر کے آرہے ہیں۔“

”یہ بقال ہیں اور نیچے ہیں۔ ذرا سی دھمکی سے سب کچھ اگل دیں گے۔ آؤ ان سے معلوم کرتے ہیں۔“ یہ لوگ آگے بڑھے اور ان بقالوں کو گھیر لیا۔

”بتاؤ تم لوگ کہاں سے آرہے ہو؟“

”تم لوگ کون ہو اور ہم سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ہم سلطان بلین کے سپاہی ہیں اور کھنونی کے حاکم فطعل کی تلاش میں نکلے ہیں۔“

”ہم دیہاتی لوگ کیا جاہیں کون فطعل۔ ہم تو ایک شادی سے آرہے ہیں اور اب اپنے گاؤں جا رہے ہیں۔“

”شادی سے آرہے ہو تو یہ خالی پورے کہاں سے لا رہے ہو۔“

”شادی میں راشن لے کر گئے تھے۔ اس کی خالی پوریاں ہیں۔“

”صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ تم لوگ جھوٹ بول رہے ہو۔ سچ بتاتے ہو یا کسی اور طرح پوچھیں۔“

”جو کچھ ہم بتا سکتے تھے بتا دیا۔ اب ہمارا راستہ چھوڑو۔“

ایک بلین امیر ملک محمد نے آگے بڑھ کر ایک بقال کا سر قلم کر دیا۔ ”سچ اگل دوور نہ تم سب کا بھی یہی حال ہوگا۔“ اسے قتل ہوتے دیکھ کر دوسرے ڈر گئے اور گڑگڑانے لگے۔

”آپ ہم سے جو مال و متاع لینا چاہیں لے لیں مگر ہمیں زندہ چھوڑ دیں۔“

”ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ فطعل کے ٹھکانے کا پتا لگائیں۔ اگر تم ہمارے حکم کے مطابق عمل کرو تو تمہاری جانیں محفوظ رہیں گی ورنہ سب قتل کر دیے جاؤ گے۔“ ملک محمد نے دھمکا دیا۔

اس دھمکی کے بعد وہ ڈر گئے اور جان کی سلامتی کا

کھڑا ہوگا۔ کافر کی تعظیم کسی طرح بھی واجب نہیں۔ یہ ایسا سنگین معاملہ بن گیا کہ اس نے اپنے امراء کو طلب کر کے یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ امراء بھی اس مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ناکام ہو گئے۔ کسی نے کہا وہ راجا سے نہ ملے۔ کسی نے کہا راجا کے بھائے وہ خود اس سے ملنے پہنچ جائے۔ بالآخر ایک امیر نے نہایت قابل عمل تجویز پیش کی کہ سلطان ایک شکاری شکارا تھا جس میں لے کر تخت پر بیٹھے اور جو بھی راجا آئے، وہ شکار چھوڑ کر جلدی میں کھڑا ہو جائے تو لوگ لازمی طور پر یہ سمجھیں گے کہ سلطان شکار چھوڑنے کے لیے کھڑا ہوا ہے نہ کہ راجا کے لیے اور راجا کو بھی شکایت نہیں ہوگی کیونکہ بہر حال سلطان کھڑا ہو کر اس کا استقبال کرے گا۔ یہی ہوا بھی۔ جب راجا اس سے ملنے آیا تو شکار اڑا اور اس کے ساتھ ہی بلین بھی تخت سے نیچے اترا اور شکرے کو بھول کر دونوں رائے کا استقبال کرنے لگا۔

راجا کو یہ فکر تھی کہ دہلی کا بادشاہ اپنے دشمن کو ڈھونڈتے ہوئے اس علاقے تک آیا ہے تو کہیں اس کے علاقے پر بری نظر نہ ڈالے اور دشمن کا غصہ اس پر اترے۔ اس نے نہایت چکنی چڑی باتوں سے بلین کا دل موہ لیا اور یہ عہد کیا کہ وہ ہمیشہ بلین کے ہمدردوں میں شامل رہے گا۔ راجا نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر فطعل نے شکست کھا کر دریا کے راستے سے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ (راجا) اسے دریائے راستے جان بچانے کا موقع نہیں دے گا۔ بلین نے بھی راجا کے سامنے یہ عہد کیا۔

”میں نے اس مہم کے لیے سلطنت دہلی کی بازی لگائی ہے۔ اگر وہ دریا میں بھی قیام کرے گا تو میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا اور جب تک اس کا اور اس کے ساتھیوں کا خون نہیں بہاؤں گا، ہرگز دہلی واپس نہیں جاؤں گا بلکہ دہلی کا نام تک نہیں لوں گا۔“

سلطان بلین کوچ کرتا ہوا ساٹھ ستر کوس چل کر جاب گھر کی حد تک پہنچ گیا لیکن کسی نے بھی فطعل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ کچھ معلوم نہ ہوتا تھا کہ وہ کوچ کر کے کس طرف گیا ہے۔ آخر کار سلطان نے ملک بیکس سے کہا کہ سات آٹھ ہزار جرار سوار لے کر لشکر سلطانی کے مقدمے کے طور پر دس بارہ کوس آگے چلے اور روزانہ چند سوار جاسوسی کے لیے دس بارہ کوس آگے بھیجے تاکہ فطعل کے متعلق معلومات حاصل کریں کہ وہ کہاں روپوش ہے۔ چنانچہ ملک بیکس مقدمے کے طور پر آگے جاتا تھا اور شاہی لشکر چند کوس پیچھے روانہ ہوتا تھا۔ مقدمے کے جس قدر جاسوس

خود ہدایات دے اور احکامات جاری کر۔ میری عدم موجودگی میں مجھ سے کسی معاملے کے متعلق دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔“

یہ پیغام بھیجنے کے بعد اس نے کوچ کر دیا۔ یہ برسات کا زمانہ تھا لیکن اس کی عالی ہمتی نے موسم کی پروا نہ کی۔ وہ جب اودھ پہنچا تو عام معائنے کے لیے سب کو جمع کیا۔ اس وقت سوار، پیادے، تیر انداز، غلام، نوکر، سوداگر سب کی تعداد دو لاکھ ہوئی۔ جونہی اس نے دریائے سر جو پور لپٹا کر ہونے لگی۔ اگرچہ سلطان کے ساتھ بہت سے بجرے تھے مگر نشیبی مقامات میں پانی کے جمع ہوجانے، آدمیوں کی کثیر تعداد، کچھ اور دلدل کی زیادتی اور متواتر بارش کی وجہ سے لشکر کو جگہ بگہر رکتا پڑا جس کی وجہ سے کھنونی پیچھے میں معمول سے زیادہ دیر ہو گئی۔

سلطان کے کھنونی کے عزم کی خبر سننے سے پہلے فطعل اپنے درباریوں سے کہا کرتا تھا کہ سلطان کے علاوہ جو بھی میرے مقابل آئے گا، اس کو میں اچھی طرح جواب دے سکتا ہوں لیکن ہاں اگر سلطان، دہلی کے معاملات کو چھوڑ کر خود آجائے تو اس کا مقابلہ میں نہ کر سکوں گا۔

آخر وہ وقت آ ہی گیا۔ جب اس نے سنا کہ سلطان بلین اپنے لشکر کے ساتھ دریائے سر جو پور پر چکا ہے تو اس نے بھگتے کی تیاری کی۔ بلین کو بارش کی وجہ سے جگہ بگہر رکتا پڑا تھا لہذا فطعل کو تیاری کا خوب موقع مل گیا۔ اس نے اپنی دولت، ہاشمی، ہر آہوردہ اور سونے کے ان کے ہوی پتوں کو اپنے ساتھ لے جانے کی تیاری کی۔ کھنونی سے ہر طبقے کے لائق اور کارآمد آدمیوں کو بلین کی سزا دہی سے ڈرا کر اپنے ہمراہ لے لیا اور ”جانب گھر“ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وہ کچھ دن جاب گھر میں قیام کرے گا اور بلین کے واپس ہونے کے بعد دوبارہ کھنونی پر قبضہ کر لے گا۔

اب حال یہ تھا کہ فطعل جاب گھر کی طرف بڑھ رہا تھا اور بلین کھنونی کی طرف۔

سلطان بلین نے کھنونی میں چند دن قیام کیا اور پھر فطعل کے تعاقب میں جاب گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس عزم کے ساتھ کہ جب تک فطعل سے انتقام نہ لے لے گا، واپس نہیں جائے گا، متواتر کوچ کرتا ہوا تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ جب وہ سارگاؤں پہنچا تو وہاں کے راجا دونوں رائے نے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بلین کو اعتراض تو کوئی نہیں تھا بلکہ یہ تو ایک لحاظ سے اچھا ہی تھا لیکن وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گیا کہ راجا کے آنے پر وہ تعظیم کے لیے کس طرح

لیکن امین خاں کو غدار کی سزا ملی۔ اس سزا کو عام لوگوں نے اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ یہ باتیں عام ہونے لگیں کہ اب بلین کا عہد حکمرانی خاتمے کے قریب ہے۔

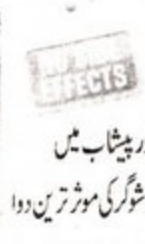
اگلے سال سلطان بلین نے ایک دوسرا سردار متعین کر کے ہندوستان کے لشکروں کے ساتھ کھنونی کے لیے نامزد کیا۔ امین خاں کے لشکر کی شکست نے فطعل کا حوصلہ بڑھا دیا تھا اور اس کی شوکت و قوت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا چنانچہ وہ ایک بڑی فوج کے ساتھ کھنونی سے روانہ ہو کر دہلی کے لشکر کے ساتھ برسر پیکار ہوا۔ اس نے اس لشکر کو بھی بر آسانی شکست دے دی اور بے پناہ مال غنیمت پر قبضہ کر لیا۔ اس شکست کی خبر بلین تک پہنچی تو اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس نے اپنے بڑے چاہنے والوں تلے روند اور فطعل کا قلع قمع کرنے کے لیے خود کمر بستہ کی۔

”دریائے گنگا و جمنہ میں بہت سی کشتیاں اور بجرے تیار رکھے جائیں۔“ فرمان جاری ہوا۔

کھنونی پر لشکر کشی کا ارادہ تھا لیکن اس نے ظاہر یہ کیا کہ شکار پر جا رہا ہے۔ شکار کے بھانے وہ ساندہ اور سنام کی جانب روانہ ہوا۔ ساندہ اور سنام کی ولایت کو شتوں میں تقسیم کیا اور وہیں کے امراء کو سپرد کیا۔ ملک سراج کو ساندہ کی نیابت تفویض کی اور ساندہ کے لشکر کا سردار بھی اسی کو بنایا اور اپنے بیٹے بغرا خاں کو پناہ ذاتی دست مرتب و مستعد کر کے شاہی لشکر کے پیچھے آنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد وہ ساندہ سے واپس ہوا اور دو آپ کے علاقے میں داخل ہو کر دریائے گنگا کو عبور کیا اور کھنونی کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں سے اس نے ملتان میں اپنے بڑے بیٹے کو حکم بھیجا کہ میں کھنونی آ گیا ہوں، اب تو جانے اور وہ علاقہ جس طرح ممکن ہو اور تو مناسب سمجھے مظلوم کا مقابلہ کر۔ ساندہ کا لشکر میں نے تیرے لیے نامزد کر دیا ہے۔

کوئٹہ دہلی ملک فخر الدین کی طرف پیٹھ مبر دوڑایا اور یہ پیغام بھیجا۔

”میں نے فطعل کا تعاقب شروع کر دیا۔ شکار کا تو محض بہانہ تھا تاکہ وقت سے پہلے فطعل کو میری آمد کی اطلاع نہ پہنچے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں فطعل کی سرکوبی کے لیے دہلی سے نکلتا تھا۔ جہاں بھی وہ جائے گا، میں اس کا پیچھا کروں گا جب تک کہ اس سے اور اس کے ساتھیوں سے انتقام نہ لے لوں۔ دہلی کو میں نے تیرے سپرد کیا۔ میری عدم موجودگی میں دہلی کے معاملات کی دیکھ بھال کر۔ دیوان وزارت اور دیوان عرض کے محرموں اور ان کے ماتحتوں کو



کیا آپ کو معلوم ہے کہ؟

ریشاب میں
شوگر کی موثر ترین دوا

[illegible]

1/2 چمچ صبح 1/2 چمچ شام کھانے سے پہلے یا بعد پانی کے ساتھ استعمال کریں

☆ خواجہ میہ نکل سنور بالمقابل ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی ☆ عرفان قادری جزی بوٹی 10 بابر مارکیٹ لاندی کراچی ☆ رفیق ٹریڈرز اینڈ وانی مصطفیٰ دواخانہ رسالہ روڈ حیدر آباد ☆ خالد براور مدنی سٹریٹ سکھر ☆ سندھ مل ہو میو قدر روڈ تھلہ سکھر ☆ کلاسک ہو میو مسجد روڈ کونہ ☆ راوی دواخانہ اوگی ☆ مونگا پنسار مین بازار لیاقت آباد لاہور ملت دواخانہ گھنٹہ گھر پشاور ☆ ضیا ہو میو سنور سکندر پورہ پشاور ☆ ناصر دواخانہ 20 صدر لائن پشاور مدرستی ڈرگ سنور جی ٹی روڈ ینگورہ ☆ البخت پنسار مری روڈ ایبٹ آباد ☆ خالد دواخانہ صرافہ بازار ایبٹ آباد بادشاہ دی ہٹی بوہڑ بازار راولپنڈی ☆ زمان دواخانہ روہتاس روڈ جہلم ☆ / الرحمن دواخانہ 2 نور باوا جرنوالہ ☆ قدیمی دواخانہ کچہری بازار سرگودھا ☆ شاہی طبی دواخانہ چنیوٹ بازار فیصل آباد

شورہ V.P. ڈیلر کے بارے میں معلومات کیلئے 0300-6389463

YouTube Deva Herbal Health Tip Facebook Catrain Email Bdhdeva@yahoo.co

وعدہ لے کر رنج اُٹھ دیا۔
 ”ہم طفول کے لشکر کو غلہ دے کر آرہے ہیں۔ آپ
 کے اور طفول کے درمیان محض ایک میل کا فاصلہ ہے۔ وہ
 ایک سنگین حوض کے کنارے میثم ہے۔ آج وہ وہیں قیام
 کرے گا۔ اگر آپ نے آج ہی اسے پڑایا تو تھیک ورنہ وہ
 کل جان بچ کر نکل جائے گا۔“

ملک محمد نے یہ سنبھالی ہو تو رک سواروں کو ان بقالوں کے ساتھ کر دیا اور پیچھے آنے والے لشکر کے پاس بھیجا کہ جلدی پانچو۔ ملک محمد بطور ہراول آگے بڑھا اور اُدھے کوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کر کے ایک بند نیلے پر پہنچ گیا۔ اس بند نیلے سے اس نے دیکھا کہ طفل کا خیمہ لگا ہوا ہے اور لشکر کے لوگوں نے اس کے چاروں طرف خیمے لگا لیے ہیں۔

سب کے سب بے فکر اور بے جبر ہیں۔ کچھ لوگ اس سلسلے
میں کپڑے دھو رہے ہیں۔ بعض شراب پی رہے ہیں
ورگہ بیمار رہے ہیں۔ ہاتھی درختوں سے شاخیں توڑ توڑ کر
کھا رہے ہیں۔ کھوڑوں اور بیلوں کو چراگا ہوں میں چھوڑ دیا
گیا ہے۔

ملک محمد اور اس کے چالیس ساتھی چھپ کر یہ تماشا
 دیکھ رہے تھے۔ پیچھے آنے والے لشکر کا انتظار کیا جا رہا تھا۔
 راندیشی بھی تھا کہ اگر لشکر کو آنے میں دیر ہوگی اور فطزل نے
 نونگوں کو دیکھ لیا تو فرار ہونے میں دیر نہیں کرے گا لہذا
 ہر پہلی ہوگا کہ اپنے آنے والے لشکر کا انتظار نہ کریں بلکہ
 پیچھے آ رہے ہیں اس کو دیکھ کر اسی انداز میں سلطان فطزل
 کیجئے آ رہا تھا، وہاں پہنچ گیا۔ ملک محمد نے اسی وقت فطزل کا
 سر اور خوشنری کا فتح نامہ سلطان بلبن کو بھیج دیا۔
 فطزل کی بیویاں، لڑکے، لڑکیاں، خزانہ اور ہاتھی اور
 اس کے خواص، مقررین اور کارکن مع بیوی بچوں کے لشکر کے
 ہاتھ آئے۔

ہو اسرا ملا اس نے وہیں قیام کیا۔ ملک بھر کو انعام و اکرام اور ”طغرل ش“ کے خطاب سے نوازا کہ گھنٹی کا رخ کیا۔ گھنٹی چنچنے ہی اس نے حکم دیا کہ شہر کے بڑے بازار کے دو دروازے پر آواز اٹھائی کہ: ”طغرل ش“

ملک محمد نے اپنے سپاہیوں کو ایک جگہ جمع کیا اور انہیں

”ساتھ قتلِ طفل کا خفیہ ہمارے سامنے ہے۔ تم یہ بھی سوچو کہ اس خفیہ کے ارد گرد کوئی حفاظتی انتظام نہیں ہے۔ لشکر کی بھی بے فکر ہیں۔ ان کے ہتھیار بھی ان کے بدن میں ہیں۔ ہماری تعداد اس وقت بہت کم ہے لیکن ہم سرخ اور دوغہ سرخ غفلت میں ان پر ٹوٹ پڑو۔ سب سے ہم طفل کے خفیہ پر حملہ آور ہوں گے۔ اگر کم نے اس قلم کر لیا تو پھر لشکر میں سے کوئی بھی ہمارے قریب نہیں آئے گا اور بھانے کی فکر کرے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہماری سے باخبر ہو، اس پر حملہ آور ہو جائے۔“

سپنس ڈائجسٹ 20 اکتوبر 2018ء

قلندر کا لقب دیا تھا۔ تین من سونا اسے دیا تھا جس سے اس نے یہ زنجیریں اور دوسرا سامان بنوایا تھا۔ بلبن نے تین تین من سونا اس سے حاصل کیا اور اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

لکھنؤ میں موت بھی رخص کر رہی تھی اور موت کا سنا بھی ناچ رہا تھا۔ جنگل کی زمین لاشوں سے پٹ گئی تھی۔ جو سزایاب ہوئے تھے، وہ تو موت کی نیند سو ہی گئے تھے لیکن جو بچ گئے تھے وہ ان سزاؤں کو کچھ کمر گئے۔

سزائیں دینے کے کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے لکھنؤ کی حکومت اپنے بیٹے بفر خاں کے سپرد کی اور تنہائی میں اس سے سوال جواب کیے۔

”تو نے دیکھا؟“

اس سوال پر بفر خاں حیران رہ گیا اور اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ بلبن نے پھر پوچھا۔ ”تو نے دیکھا؟“ وہ پھر حیرت زدہ رہ گیا کہ کیا جواب دے۔ تیسری مرتبہ بلبن نے خود ہی جواب دے دیا۔

”بازار میں تو نے میری سزا دی دیکھی؟“

”جی، میں نے دیکھا۔“

”اگر کوئی باغی حرام خوردگی تھے سے کہے کہ دہلی کے بادشاہ سے جنگ کرنا چاہیے تو میری ان سزاؤں کو یاد کر لیتا اور اچھی طرح سمجھ لیتا کہ جو بھی بادشاہ دہلی سے باغی ہوگا اور اس کے خلاف کھوار اٹھائے گا تو اس کے بوی بچوں اور اس کے ساتھیوں کو بھی یہی سزا دی جائے گی جو طغرل، اس کے بیٹوں اور اس کے آدمیوں کو دی گئی۔“

بلبن نے اس یاد دہانی کے بعد خزانے کے علاوہ جو کچھ مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا تھا، وہ سب اسے بخش دیا اور لکھنؤ میں اس کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہو گیا۔

بلبن نے واپسی سے قبل ایک مرتبہ پھر بفر خاں کو چند مقررین کے ساتھ مجلس خلوت میں طلب کیا اور ان لوگوں کی موجودگی میں اس سے کہا۔

”میں نے تیرے اندر حکومت کرنے کی اہلیت دیکھی ہو یا نہ دیکھی ہو مگر شفقت پداری اور مصلحت مکی کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھنؤ کی اقلیم اور بنگال کا علاقہ میں تجھ کو دے رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ میں لکھنؤ سے پانچ چھ منزل ہی دور دہلی کی طرف پہنچوں گا کہ تو عیش و طرب میں مشغول ہو جائے گا مگر کیا کروں میری مصلحت یہی تھی کہ لکھنؤ کا حاکم تجھے بناؤں۔ اب یہ تیری مرضی کہ تو مجھے سرخرو کرنا ہے

یا عذاب سے دو چار۔“

ان باتوں کے بعد اس نے کوچ کا تھارہ بچایا اور دہلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

شہر دہلی میں جہاں سلطان تین سال بعد واپس آیا تھا لوگوں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کا بیٹا شہزادہ سلطان محمد اپنے باپ سے ملاقات کے لیے ملتان سے دہلی آیا اور اعلیٰ درجے کے تحائف اس کی خدمت میں پیش کیے۔ بلبن اپنے بیٹے کی آمد اور اس کی سعادت مندی سے بہت خوش ہوا اور اسے پدرانہ شفقت سے سرور کیا۔

سلطان محمد دہلی میں رہ کر باپ کی شفقت سے محفوظ ہو رہا تھا کہ مغلوں کی ہنگامہ آرائیوں کی خبریں پہنچنے لگیں۔

بلبن نے مجبور ہو کر سلطان محمد کو رخصت کر دیا۔

شہزادہ سلطان محمد نے ملتان پہنچ کر بے شمار مغل ڈاکوؤں کو جو سرحدی مقامات پر لوٹ مار کر بازار گرم کیا کرتے تھے، تھج کر کے ان کے قبضے سے اپنا ملک نکال لیا لیکن یہ فتوحات اسے مہنگی پڑ گئیں۔ نامی گرامی چنگیزی امیر تیمور خاں جو ہرات، قندھار اور غزنی وغیرہ کا حاکم تھا، اپنے ہم قوموں کا بدلہ لینے میں ہزار مغلوں کا لشکر لے کر لاہور اور بیالپور کے درمیانی علاقے میں آیا۔ تیمور خاں ملتان کی طرف بڑھا اور مغل دست کر کے سلطان محمد پر حملہ آور ہو گیا۔

سلطان محمد کے لشکر نے نہایت پامردی سے تیمور خاں کے حملوں کا مقابلہ کیا لیکن سلطان محمد کا اقبال مائل نہ ہو سکا۔ اسے فتح مل چکی تھی لیکن موت اس کی تاک میں تھی۔ مغل سپاہی میدان جنگ سے فرار ہوئے تو شہزادے کے لشکر نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ شہزادے نے ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد واپس کے کنارے جانے نماز پجھائی اور ظہر کی نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مغل سپاہیوں کا ایک دستہ جو کہیں گا ہوں میں چھپا ہوا تھا، باہر نکلا اور سلطان محمد پر حملہ کر دیا۔ شہزادے نے اپنے سپاہیوں کو ساتھ لے کر مغلوں کا مقابلہ کیا۔ اگرچہ ان سپاہیوں کے ٹھوڑے ٹھکنے سے چور تھے لیکن معرکہ آرا ہونا پڑا۔ قبل اس کے کہ مغل شکست کھا کر میدان جنگ سے فرار ہوتے، ایک تیر شہزادے کے آکر لگا اور اس کی روح نفسِ معصی سے پرواز کر گئی۔

☆ ☆ ☆

محل کی دیواریں کئی روز سے سوگ کا لباس پہنے کھڑی تھیں۔ قلعہ دہلی دہلی سسکیوں میں ڈھل گئے تھے۔ کینز،

باندیاں ہنسنے سے پہلے ادھر ادھر کچھ لیتی تھیں کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ سلطان بلبن پر خان شہید کی موت کا ایسا اثر ہوا تھا کہ کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ کہتا وہ یہی تھا کہ میں راضی پر رضا ہوں لیکن راتوں کو کھٹکھٹ کر اپنے بیٹے کو یاد کرتا تھا اور زور قطار روتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ خان شہید کا غم اسے چھینے نہیں دے گا تو اس نے اپنے دوسرے بیٹے بفر خاں کو لکھنؤ سے بلایا۔

بفر خاں وہاں سے چل پڑا لیکن وہ ابھی راستے میں تھا کہ بلبن کی کمزوری نے بیماری کی صورت اختیار کر لی اور وہ صاحبِ فراش ہو گیا۔ بفر خاں نے باپ کی بیماری کا حال سنا تو ساتھیوں کو چھوڑا اور اکیلا ہی تیز رفتاری سے سفر طے کرتا ہوا دہلی کی طرف دوڑا۔ دیکھا تو بلبن کے چہرے پر موت کے آثار دکھائی دیے۔ دیر تک دلاسا دیتا رہا۔ بلبن نے خیف آواز میں اسے مخاطب کیا۔

”تمہارے بھائی کی وفات نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ اب میں موت کے قریب آ پہنچا ہوں اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اب میرا آخری وقت قریب آ گیا ہے۔ خان شہید کے سوا میرا کوئی وارث نہیں۔ ایسی حالت میں تمہارا مجھ سے دور رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ تمہارا بیٹا کیتا اور خان شہید کا لڑکا کچھ دو دنوں ہی ابھی نو جوان ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کے ہاتھ حکومت آگئی تو خدا جانے وہ اپنی ناتجربہ کاری اور جوشِ جوانی کے باعث کیا کچھ کریں۔ ان حالات کے پیشِ نظر میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے دور نہیں رہنا چاہیے۔“

بفر خاں نے باپ کے حکم پر تسلیم فرم کیا اور دہلی میں قیام کی ضمان لی۔ بادشاہت خود بخود اس کی طرف چل کر آ رہی تھی۔ وہ اسی امید میں دہلی میں بیٹھارہا کہ بلبن کا انتقال ہو اور کب وہ تخت پر بیٹھے۔ اس نے دو تین نام ایسے بھی سوچ لیے تھے جنہیں وہ اپنی جگہ لکھنؤ کا حاکم بنا سکتا تھا۔

کچھ دنوں بعد بلبن کی طبیعت سنبھلنے لگی اور اس کے چہرے سے صحت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ طبیعوں نے بھی اطمینان کا اظہار کیا۔ اب بفر خاں کا یہاں رہنا بے کار تھا۔ اس نے شکار کا بہانہ کیا اور باپ کو بتائے بغیر ہی لکھنؤ چلا گیا۔

جب بلبن کو یہ معلوم ہوا کہ بفر خاں نے شکار کا بہانہ کیا تھا اور اس نے راستے ہی سے شکار کے لیے ساتھ جانے والوں کا ساتھ چھوڑا اور لکھنؤ چلا گیا۔ یہ سنتے ہی بلبن کی حالت خیر ہو گئی۔ اسے خان شہید کی موت سے بھی زیادہ بفر

خاں کی نافرمانی کا صدمہ ہوا۔ اسی صدمے نے اسے ایک مرتبہ پھر بستر پر ڈال دیا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ اس نے بڑے بیٹے خان شہید کے لڑکے کچھ کو بلایا۔ اس کے ساتھ ہی کوتوال دہلی، حضرت خواجہ حسین اور اپنے چند مقررین کو جو حکومت کے معاملات کو خوب سمجھتے تھے، اپنے پاس بلایا اور ان کے سامنے اپنی وصیت کا اظہار کیا۔

”اب میرا وہ وقت آ گیا ہے جس کا سامنا ہر بادشاہ کو کرنا پڑتا ہے، یعنی میری موت نزدیک ہے اور میرے بعد کسی کو میرا جانشین بھی ہونا ہے۔ تم کو چاہیے کہ میرے بعد کچھ کو جو میرے بڑے بیٹے خان شہید کا لڑکا ہے، اسے میں نے ولی عہد بنا دیا ہے۔ وہ حکومت کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ اس کو میرے تخت پر بٹھلاؤ۔ اگرچہ وہ کم سن اور جوان العمر ہے اور حکمرانی کا پورا حق ادا نہیں کر سکتا لیکن میں کیا کروں بفر خاں جس سے کچھ کام چل جاتا اور لوگوں کو اس سے کچھ امید بھی تھی، لکھنؤ چلا گیا۔ لہذا میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ کچھ وقت کے میں بادشاہی کی وصیت کروں۔ میرے بعد تم لوگ کچھ کو کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیتا اور کیتا کو اس کے باپ کے پاس لکھنؤ بھیج دینا۔“

جب بلبن یہ وصیت کر رہا تھا کوتوال ملک فخر الدین بھی موجود تھا۔ اسے خان شہید سے کسی وجہ سے پر خاش تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا بادشاہ بنے۔ وہ اس وقت تو خاموش رہا لیکن دل میں منصوبے بھی بناتا رہا کہ کس طرح کچھ کو کے بجائے کیتا کو بادشاہ بنا جائے۔

اس وصیت کے بعد تیسرے دن بلبن کا انتقال ہو گیا۔

جس وقت سلطان بلبن کا جنازہ ”کوٹک لعل“ سے باہر لایا گیا اور ”دارالامان“ میں اتارا گیا تو ملک فخر الدین کوتوال نے اپنے سر پر خاک ڈالی اور اتنی بلند آواز میں بین کرنے لگا کہ تمام حاضرین سن لیں۔

”اس بادشاہ کے مرنے پر جس نے دو قرن تک بادشاہی کی اور جو مملکت کے عوام و خواص کے نیک و بد سے واقف ہو گیا تھا اور لوگوں کے اس پر اور اس کے لوگوں پر بہت سے حقوق تھے، آج کوئی شخص بھی ایسا نہیں کہ اس کے مرنے کے بعد پانی بھی اطمینان سے پیا ہو۔ ایسے خدا ترس بادشاہ کے مرنے کے بعد وہ وقت آ گیا ہے کہ جب ہر شاکستہ اور ناشائستہ شخص کے دل میں بادشاہی کی ہوس اور سرداری کی خواہش پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو جو جماعتیں اس پختہ کار

بادشاہت ملی، وہ بے مبری سے ساری بندشیں توڑ کر اپنے مقاصد اور خواہشات پوری کرنے میں بے لگام ہو گیا۔ اس نے جو کچھ لکھا پڑھا تھا، سب یکسر بھلا دیا۔ ادب و اخلاق کو بالائے طاق رکھ دیا اور عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ جوانی کی خواہشات کی تکمیل کو امور جہاں بانی اور مہمات جہاں داری پر ترجیح دینے لگا۔ سلطان بلبن کی بادشاہی اور سزاؤں کے خوف نے لوگوں کے دلوں سے لہو و لعبہ کی آرزو اور شراب نوشی کی تمنائیں دلوں سے نکال دی تھیں۔ اب جوئے بادشاہ کورنگ رلیاں مناتے ہوئے دیکھا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے کار لوگوں کی بن آئی۔ عیش و عشرت کے جتنے دلداد تھے اور اب تک گوشہ گیر تھے، سب کام سے لگ گئے۔ بالا خانوں پر حسین عورتیں جلوہ نمائی کرنے لگیں۔ عیاشی اور ادا باشوں کے دن پھر گئے۔ مسخروں کی قسمت جاگ اٹھی۔ رفتہ رفتہ ارکان دولت بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔

سلطان معز الدین شہر کی سکونت ترک کر کے باہر چلا گیا اور ایک مقام کیلوکھری میں دریائے جتنا کے کنارے محل بنوایا اور اپنے خاص مصاحبین کو لے کر وہاں چلا گیا اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہ کیلوکھری میں سکونت کی طرف مائل ہے تو انہوں نے بھی اپنے محلوں میں مکانات اور قصر بنوا لیے۔ جب کیلوکھری کی شہرت دور و نزدیک پھیلی تو ہر علاقے سے مطرب، خوش الحان گویے اور بھانڈے دربار میں آ گئے۔ فسق و فجور عام ہو گیا۔ مسجدیں نمازیوں سے خالی ہو گئیں۔ شراب خانے آباد ہو گئے۔

ملک فخر الدین نے نہایت چالاکی سے سلطنت کے تمام امور اپنے داماد ملک نظام الدین کے حوالے کر دیے۔ کیتباد کی عیش کوئی اور بے خبری کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ملک نظام الدین کے سر میں حکومت کرنے کا سودا سمایا۔ اس کے خیال میں ایسے بادشاہ کو حکومت سے علیحدہ کرنا نہایت آسان تھا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے سازشی عمل شروع کر دیا۔ اس نے جب ادھر ادھر نظر دوڑائی تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ بغرا خاں لکھنؤ کی حکومت پر انکشاف کے بنگالے میں خاموشی سے بیٹھا ہوا ہے۔ لے دے کہ کچھ وہی ایسا ہے جو راکوٹ کا باعث بن سکتا ہے لہذا اس نے کچھ کا خاتمہ کرنے کا ارادہ کر لیا اور اس کی تباہی کے منصوبے پاندہ لگے۔ چند رئیس امرا کو بھی اپنے ساتھ ملایا اور ایک دن موقع دیکھ کر کیتباد کے حضور پہنچ گیا۔ اس وقت بھی کیتباد کے ارگرد جام و صراحی رکھے ہوئے تھے اور پری رو

”میں ابھی شہزادہ کچھ کی طرف گیا تھا تاکہ اسے سلطان کی وصیت سے آگاہ کروں۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ اس کے محل میں گیا تو معلوم ہوا وہ ملتان روانہ ہو گیا ہے۔“

”ملتان؟ کیا آپ نے اسے سلطان کی وصیت سے آگاہ نہیں کیا تھا؟“

”اس گناہ گار نے اسے آگاہ کر دیا تھا لیکن نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی۔ اسے شاید بادشاہت سے زیادہ اپنے باپ خان شہید کی جاگیر کی فکر تھی۔“

”کیا وہ باقی ہو گیا؟“

”شاید ایسا ہی ہو۔ اگر میں اس کے تعاقب کے لیے فوج روانہ کرتا تو اسے گستاخی سمجھا جاتا۔ اس کے علاوہ ان جھگڑوں میں پڑنے کا وقت بھی نہیں کیونکہ تخت خالی پڑا ہے۔ میں آپ کے پاس یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ بغرا خاں کے بیٹے کیتباد کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ کیتباد، کچھ دے کے برعکس نیک نفس اور سیدھی سادی طبیعت کا مالک ہے۔ اس نے غیاث الدین بلبن کی آغوش محبت میں تربیت حاصل کی ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم کیتباد کو بادشاہ کا جانشین منتخب کریں۔“

وزیر نے ملک فخر الدین کی رائے سے اتفاق کیا لیکن دوسرے امیروں کی رائے کو بھی مہور کرنا تھا لہذا اسی رات دربار منعقد کیا گیا۔ ملک فخر الدین نے وہاں بھی وہی باتیں کیں جو وہ وزیر سے کر چکا تھا۔ ان سب نے بھی فخر الدین کی باتیں ہاں ملائی۔ اس لیے بھی کہ یہ باتیں بظاہر مناسب نظر آ رہی تھیں اور آپس میں مشورہ کر کے کیتباد کو ”معز الدین“ کا خطاب دے کر بلبن کا جانشین بنا دیا گیا۔ اس وقت اس کی عمر اٹھارہ سال تھی، گویا اشد جوانی اور اپنی بڑی سلطنت۔

☆☆☆

سلطان معز الدین ایک خوش اخلاق اور حسین شہزادہ تھا۔ اس کی طبیعت صاف اور عادات پاکیزہ تھیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ بلبن کی زیر نگرانی پرورش پانے کی وجہ سے نہایت پابندیوں میں اس عریک پہنچا تھا۔ نہایت سخت نگراں اس کی دیکھ بھال کے لیے رکھے گئے تھے جبکہ جوانی کے تقاضے اسے بے قراری رکھتے تھے۔ جوانی کی خواہشات پوری کرنے کی تمنا اور دنیا کی نعمتوں اور لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا شوق اس کے دل میں بھرا ہوا تھا۔ اسے جیسے ہی

آج رات ہی ملتان کی طرف کوچ کرنا چاہیے۔“

”میں بھی یہ پوچھنے میں حق بجانب ہوں کہ مجھے اتنی جلدی میں یہاں سے جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”جوبات میں کہتا نہیں چاہتا تھا آپ نے وہ کہنے پر مجبور کر ہی دیا۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ مغل لشکر سلطان بلبن کی وفات کی خبر سننے ہی لاہور اور دہلی پور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اس کا ہدف یقیناً ملتان ہوگا۔ آپ دہلی کی طرف سے مطمئن رہیں۔ یہاں میں موجود ہوں۔ آپ ملتان کی فکر فرمائیں۔“

”متمحترم! صورت حال یہاں کی بھی قابل رشک نہیں۔ دن بھر تلخے ہی تلخے تلخے کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ ان جھگڑوں میں پڑ کر ملتان سے غافل نہ ہو جائیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ میں دہلی میں موجود ہوں۔ یہاں ابتری نہیں ہونے دوں گا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ جب سلطان معظم مغول کی سرکوبی کے لیے لکھنؤ کی تحریف لے گئے تھے تو اس فقیر ہی نے سلطنت کے انتظامی امور سنبھالے تھے۔ وہی تجربہ اب کام آئے گا اور کسی مفسد کو یہ خیال نہیں آئے دوں گا کہ اب سلطان بلبن اس دنیا میں موجود نہیں۔ آپ کے والد محترم خان شہید کی روح خوش ہوگی اگر آپ ان کے دشمنوں سے بدلہ لیں گے۔ دہلی کے تخت پر کوئی بچہ بھی بیٹھ جائے گا تو مغلوں کی ہمت نہیں ہونے دوں گا کہ اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھیں۔“

ملک فخر الدین کو تو اس نے یہ باتیں کچھ اس طرح کہیں کہ کچھ دے اسی وقت سفر کی تیاری کی اور دہلی سے نکل کھڑا ہوا۔

کچھ دے کر روانہ ہوتے ہی فخر الدین کو تو اس نے اپنے چہرے پر گہرا ہت طاری کی اور خواجہ حسین وزیر کی ڈیوڑھی پہنچ گیا۔ رات اتنی گزر چکی تھی کہ دروازے بند تھے۔ بڑی منت سماجت کے بعد اس نے پہرے داروں کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ وزیر محترم تک اس کی آمد کی اطلاع پہنچا دیں۔ وہ کوئی اور نہیں فخر الدین کو تو اس کا شہر کا نظم و ضبط اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے عملے کے افراد سے کبھی ڈرتے تھے اور پھر یہ تو تو بھی ایسا تھا۔ تخت خالی پڑا تھا۔ کوئی بھی مخالف طاقت سر اٹھا سکتی تھی۔ کو تو اس کی ایسے نا وقت آمد نے وزیر کو بھلا دیا اور اسے فوراً طلب کر لیا۔

”فخر الدین! خیر تو ہے۔ اس وقت!“

”خیر ہی تو نہیں۔“

”یا اللہ خیر۔ جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو۔“

بادشاہ کی حکومت کی وجہ سے متحد ہو گئی تھیں، منتشر ہو جائیں گی اور قدیم خاندان تتر بتر ہو جائیں گے۔ اسی لیے اس شخص کو تخت نشین کیا جائے گا جو اس کا سچا جانشین ہوگا۔ بہت سے لوگ بہت سی باتیں کریں گے لیکن میں کیونکہ سلطنت کا وسیع تجربہ رکھتا ہوں اور سلطان بلبن نے مجھ سے بہت سی ایسی باتیں کہی تھیں جن کی روشنی میں قرعہ قاتل میں اسی کے نام نکالوں گا جس کی خواہش سلطان مرحوم کیا کرتے تھے۔“

ملک فخر الدین نے جان بوجھ کر اس وصیت کا ذکر نہیں کیا جو بلبن نے آخری وقت کی تھی۔ وہ مقررین بھی وہاں موجود تھے جن کے سامنے یہ وصیت بیان ہوئی تھی۔ انہوں نے بھی کوئی خیال نہیں کیا کہ وصیت کا ذکر کیوں نہیں آیا۔ ملک فخر الدین کو تو اس کے عملے کے لوگ شہر میں بہت دلیر تھے۔ ہر شخص ان سے ڈرتا تھا۔ امرائے کبار بھی اس سے خوف زدہ رہا کرتے تھے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کو تو اس کو خان شہید کے بیٹے کچھ دے سے پر خاش ہے اور وہ کبھی اسے تخت نشین نہیں ہونے دے گا۔

جب بادشاہ کی تدفین ہو چکی تو ملک فخر الدین اپنے عملے کے چند ارکان کے ساتھ کچھ دے کے سامنے حاضر ہوا۔ کچھ دیر تک خان شہید اور بلبن کی تعزیت کرتا رہا پھر اپنے مطلب پر آ گیا۔

”خان شہید کے انتقال کے بعد لاہور، ملتان اور گرد و نواح کا انتظام آپ نے سنبھال لیا تھا۔ مغلوں کا زور آپ نے نس خوبصورتی سے توڑا تھا لیکن سلطان مرحوم کے انتقال کے بعد اور آپ کی غیر حاضری انہیں بھر حوصلہ دے گی کہ وہ حملہ آور ہوں۔ اس وقت آپ کا وہاں ہونا بہت ضروری ہے۔“

کچھ دے کو تو اس کے ارادوں سے بے خبر تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ سلطان بلبن نے کیا وصیت کی ہے، حیران ہوا کہ آخر اتنی رات گئے کو تو اس کو کیا ضرورت پیش آ گئی جو یہ اطلاع دینے آ پہنچا۔

”تم محترم! میں سازشی نہیں ہوں۔ اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں یہ دیکھنے کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا ہوں کہ دیکھوں گے دہلی کا بادشاہ بنایا جاتا ہے۔ اور نہ ہی میں اس کا خواہش مند ہوں۔ مجھے ملتان پہنچنے میں عار نہیں لیکن ایسی جلدی بھی نہیں۔ دادا جان کا آج ہی تو انتقال ہوا ہے۔ کم از کم سوئم تک تو مجھے دہلی ہی میں رہنا ہوگا۔“

”میری یہ بھال نہیں کہ آپ کو مجبور کروں لیکن سلطنت کا خیر خواہ ہونے کی حیثیت سے یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کو

حسینا بھی مغل سچائے ہوئے تھیں۔ نظام الدین کی دخل اندازی اسے بری معلوم ہوئی تھی لیکن وہ اسے منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس نے مجلس موقوف کی اور ملک نظام الدین کو باریابی کی اجازت دے دی لیکن اپنی ناگواری کو چھپائیں۔

”نظام الدین! جو کہنا ہے جلدی کہو۔“
”حضور! جو کچھ میں کہنے والا ہوں اس میں جلدی نقصان دہ ہوگی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ نہایت اطمینان سے میری گزارشیں۔“

”کئی جمہد کی ضرورت نہیں۔ جو کہنا ہے براہ راست کہو۔“
”حضور! امراء و ملوک مختلف گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں جس سے مملکت میں انتشار پیدا ہو رہا ہے۔“
”اس انتشار کو ختم کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ میرے پاس کیوں چلے آئے ہو؟“

”اس لیے کہ جو قدم میں اٹھانے والا ہوں اس میں مجھے آپ کی اجازت اور مدد کی ضرورت ہے۔“
”میری طرف سے اجازت ہے اور مدد بھی ملے گی۔“
”تو ہر گم نامہ تریر کیجیے اور کچھ لوگ بھی طلب فرمائیے۔“
”کچھ وکا تہ کردہ درمیان میں کہاں سے آگیا؟“

”یہ انتشار اسی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اس انتشار سے فائدہ اٹھا کر وہ سخت شاہی پر قبضہ کرنے کا عزیمت کر چکا ہے۔“
”یہ کیونکر ممکن ہے؟“

”کچھ وکا تہ آپ کا شریک مملکت ہے۔ ملوک اس کی طرف بہت مائل ہیں اور جانتے ہیں کہ سلطان بلبن کا بنایا ہوا ولی عہد وہی ہے۔ اگر کچھ ملوک اس کے ساتھ ہو گئے تو آپ کی جگہ اسے تخت دہلی پر بٹھا دیں گے۔ مصلحت یہی ہے کہ اسے ملتان سے بلو کر راستے سے ہٹا دیا جائے۔“

”کیا یہ اتنا ہی آسان ہوگا جتنا تم کہہ رہے ہو؟“
”یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ کو تو بس طلبی کا حکم نامہ تحریر کرنا ہوگا۔“

”کاتب سے کہو وہ فرمان تحریر کر دے، ہم اس پر دستخط کر دیں گے۔“
”میں نے تحریر لکھوائی ہے۔“

”ملک نظام الدین نے تحریری فرمان اس کے سامنے رکھ دیا۔ قیقاہ نے دستخط کر دیے اور ملک نظام الدین وہاں سے خوشی خوشی اٹھ آیا۔“

اس سے پہلے کہ یہ فرمان کچھ دیکھ پہنچتا، اسے معلوم ہو گیا کہ طلبی کے احکام پہنچنے والے ہیں۔ ملک نظام الدین کی

سازشوں کی خبریں بھی اس تک پہنچ رہی تھیں لہذا وہ چونکا ہو گیا۔ وہ اس سازش کا اکیلے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خفیہ طور پر غزنی پہنچا اور وہاں کے حاکم تیمور خاں سے مدد کا طالب ہوا۔ تیمور خاں نے اس سے ہمدردی کا اظہار ضرور کیا لیکن اس کی امداد سے معذرت کر لی۔ کچھ دیر کی دن تک وہاں مقیم رہا اور پھر رنجیدہ و ملول غزنی سے ملتان واپس آ گیا۔ اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی قیقاہ کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کرے۔ اس نے ملتان پہنچتے ہی قیقاہ کے پاس یہ پیغام بھجوایا۔

”میرا یہ فرض ہے کہ میں ہر حال میں تمہاری اطاعت اور فرمان برداری کروں اور مجھے یہ یقین ہے کہ تمہیں مجھ سے برادرانہ محبت اور خلوص ہے لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے دربار کے کچھ عاقبت نااندیش لوگ تمہارے اور میرے درمیان فساد کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں۔ یہ اہل غرض لوگ تمہیں میرے خلاف اکساتے رہتے ہیں اور میری طرف سے تمہارے کان بھرتے رہتے ہیں لیکن اگر تم مجھے اپنا بھی خواہ اور سچا ہمدرد سمجھ کر میرے باپ کی جگہ میرے حوالے کر دو تو یہ فعل برادرانہ شفقت کے عین مطابق ہوگا۔“

چند روز کے وقفے کے بعد اسے قیقاہ کا جواب موصول ہوا۔

”میں دنیا میں تجھ سے بڑھ کر کسی اور سے محبت نہیں کرتا ہوں۔ جو کچھ گزر چکا ہے تم اپنے دل سے نکال دو اور بغیر کسی خوف و خطر میرے پاس آ جاؤ تاکہ بد زبانوں کی زبانیں بند ہو جائیں اور میں تمہیں عزت و تکریم کے ساتھ ملتان کا حاکم مقرر کر دوں۔“

ملک نظام الدین کی نظروں سے یہ پیغام چھپا نہ رہ سکا۔ وہ قیقاہ کو درود نہیں سکتا تھا لیکن اس کے فیصلے کو تبدیل ضرور کر سکتا تھا۔ اس نے موقع دیکھا اور ایک ایسے وقت قیقاہ کی خلوت میں پہنچ گیا جب وہ نشے کی آخری حدوں پر تھا۔ حسین کنیزیں اس کے ہوش و حواس پر غالب آ چکی تھیں۔ اس مدہوشی کے باوجود ملک نظام الدین کا خوف اس پر ایسا غالب تھا کہ وہ باریابی کی اجازت دے بغیر نہ رہ سکا۔ ”میں نے یہ سنا ہے کہ آپ نے کچھ کو برادرانہ شفقت کے ساتھ طلب کیا ہے اور ملتان کی حکمرانی دینے کا وعدہ بھی کر لیا ہے؟“

”آپ نے بالکل درست سنا ہے۔“
”یہ پیغام بھیجے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔“
”آپ کا بھی مشورہ یہی تھا۔“

”لیکن یہ مشورہ نہیں تھا کہ آپ اسے ملتان کا حاکم بنا دیں۔“
”وہ میرا بھائی ہے۔“

”مگر وہ آپ کو اپنا حریف سمجھتا ہے بھائی نہیں۔ اس نے کئی امراء سے خفیہ مراسلت کر رکھی ہے۔ وہ ملتان کا حاکم نہیں، دہلی کا بادشاہ بننا چاہتا ہے۔ آپ کی غفلت کا فائدہ اٹھا کر آپ کے ہاتھوں سے یقین لیتا چاہتا ہے۔“

قیقاہ کو ملک نظام الدین کی دخل اندازی ناگوار معلوم ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ نشے میں بھی تھا۔ چاہتا تھا کہ ملک نظام الدین قصہ مختصر کرے اور یہاں سے روانہ ہو جائے۔

”تم اگر کچھ وکا تہ کرو راستے سے ہٹانا چاہتے ہو تو ہٹا دو مگر اس وقت میری جان چھوڑو۔“

”کچھ وکا تہ اس کا الزام مجھ پر آ جائے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ قتل کا فرمان لکھ کر میرے حوالے کر دیں۔“

نشے کے عالم میں، غفلت کی اس کیفیت میں اس نے ملک نظام الدین کی باتوں کا یقین کر لیا اور کچھ وکا تہ کا فرمان لکھ کر نظام الدین کے حوالے کر دیا۔ اس فرمان کے لئے ہی ملک نظام نے اپنے چند خاص امیروں کو کچھ وکا تہ پر مقرر کر دیا۔

بے خبر کچھ وکا تہ قیقاہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دہلی کے لیے روانہ ہوا۔ ابھی وہ دروچنگ تک پہنچا تھا کہ ملک نظام کے پیچھے ہوئے آدھوں نے اسے گھیر لیا اور معمولی سے مقابلے کے بعد اسے قتل کر دیا۔

کچھ وکا تہ کے قتل کے بعد تمام بلہنی سردار جو سلطان معز الدین کی حکومت کے اعوان و انصار بن گئے تھے، ملک نظام سے خوف کھانے لگے۔ ان کو خوف زدہ دیکھ کر ملک نظام کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ بلہنی خاندان کی بیخ کنی کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔ اب اس کا مشن یہ تھا کہ قیقاہ کے وفادار امراء کو ایک ایک کر کے راستے سے ہٹا دیا جائے چنانچہ خواجہ خلیفہ جو بادشاہ کا مشیر اور وزیر تھا، ملک نظام نے اس پر سازش کا الزام لگا دیا اور اسے گدھے پر بٹھا کر بڑی ذلت و رسوائی کے ساتھ شہر سے نکال دیا۔ خواجہ خلیفہ کے علاوہ غیاث الدین بلہن کے اور بھی کئی امراء کو اسی طرح سازش کے الزام میں متنبہ کیا گیا اور ان کی لاشوں کو دور یاے جتنا کی لہروں کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں طرف ملک نظام کی طاقت کا سکھ بیٹھ گیا۔ سب دیکھ رہے

تھے قیقاہ کے پردے میں وہی حکومت کر رہا ہے لہذا سب اس سے ڈرنے لگے۔

ابھی یہ قیقاہ چل ہی رہا تھا کہ مغلوں کی آمد کی خبر گرم ہوئی۔ مغلوں کی فوج لاہور کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک برلاس..... اور خان جہاں کو روانہ کیا گیا۔ لاہور کے نواح میں فریقین میں زبردست معرکہ آرائی ہوئی۔ اس لڑائی میں مغلوں کے بہت سے سردار مارے گئے اور جو بچ گئے تھے انہیں گرفتار کر کے دہلی لایا گیا۔

اس کے بعد ملک نظام نے عیاری اور چالاکائی کا ایک اور جال بچھایا۔ ایک روز تنہائی میں اس نے قیقاہ سے کہا، جو مغل سردار سلطان غیاث الدین بلہن کے عہد سے دہلی میں مقیم ہیں، ایک ہی قوم کے ہیں اور نہایت با اقتدار ہیں۔ اگر سب نے مل کر آپ سے غداری اور مکاری کی تو انہیں سنبھلانا مشکل ہو جائے گا۔ عجیب بات ہے کہ ہم مغل حملہ آوروں سے مقابلہ کرتے ہیں اور انہی کے ہم قوموں کو اقتدار میں رکھے ہوئے ہیں۔

قیقاہ ان تو ہم آئینہ باتوں میں آگیا اور اس نے دہلی کے تمام مغل امیروں کے قتل کا فرمان جاری کر دیا۔ ملک نظام نے ان امراء کو ایک ہی دن میں موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے خاندانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ دہلی کدوہ امراء جو مغل امیروں کے رشتے دار تھے انہیں گرفتار کر کے دور دراز علاقوں میں بھجو دیا گیا اور مختلف قلعوں میں نظر بند کر دیا گیا۔

قدیم امراء کو خوب اچھی طرح تباہ کرنے کے بعد ملک نظام الدین نے دوسرے امراء پر نگاہ ڈالی اور اس نے ملتان کے حاکم ملک نظام بیگ اور لاہور کے حاکم ملک ترکی کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور بالآخر وہ ان مقاصد میں بھی کامیاب ہو گیا۔

ان امراء کی تباہی و بربادی کے بعد قیقاہ پوری طرح ملک نظام کے قبضے میں آ گیا۔ اگر کوئی امیر خود قیقاہ کی ہمدردی میں اس سے ملک نظام الدین کے بارے میں کچھ کہتا تو قیقاہ فوراً نظام الدین کو اطلاع کر دیتا اور گرفتار کر کے ملک نظام کے سپرد کر دیتا۔

یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر ملک نظام کی بیوی نے شاہی محلات کی طرف توجہ کی۔ وہ بادشاہ کی منہ بولی ماں بن کر شاہی محلات پر چھائی اور ہر طرف اس کا حکم چلنے لگا۔ جو امراء کسی نہ کسی طرح بچ گئے تھے، وہ نظام الدین کی

دربارداری کرنے لگے اور اپنے آپ کو اس چالاک و عیار امیر کی دست برد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کی بارگاہ بے رونق اور بے نور ہو کر رہ گئی۔ دربار شاہی کی تمام شان و شوکت اب نظام الدین کے دروازے پر نظر آنے لگی۔

یہ خبریں اتنی گرم ہوئیں کہ ملک فخر الدین کو تو ال تنک بھی پہنچیں۔ ملک نظام الدین اس کا بیٹھجا اور دادا تھا لہذا اس نے اسے طلب کیا اور اس کے فاسق ارادوں سے اسے روکنے کے لیے گفتگو کی اور عقلی دلائل سے اسے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ سلطنت کے خواب دیکھنا چھوڑ دے لیکن ملک نظام پر اس گفتگو کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس قول پر قائم رہا کہ جو چھوہ کر رہا ہے، وہی درست ہے۔

”آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے اور آپ کے کہنے کے خلاف عمل کرنا نادانی اور حماقت ہے لیکن میں نے اب تک جو کچھ کیا ہے اس سے تمام خلق خدا میری جانی دشمن ہو گئی ہے۔ اب اگر میں اپنے ارادے سے منحرف ہو گیا تو لوگ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔“ ملک نظام نے کہا۔

ملک فخر الدین نے یہ جواب سن کر اسے بہت سخت ست کہا اور لعنت ملا مت کر کے اپنے سامنے سے دور کر دیا۔

کیتباد کا باپ بغرا خاں کھنوتی میں تھا لیکن ملک نظام کے بڑھتے ہوئے اقتدار کی خبریں اس تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ اس نے ایک نصیحت آمیز خط کیتباد کو لکھا۔ اس خط میں ملک نظام الدین کی عیاری و چالاک اور اس کے ارادوں سے کیتباد کو آگاہ کیا گیا تھا لیکن کیتباد کو جوانی اور بادشاہی کے نشے اور شراب کی مستی نے ایسا مدھوش کر دیا تھا کہ اس نے باپ کی نصیحتوں پر کان تک نہیں دھرا اور ملک نظام کے خدار اندہ خیالات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

سلطان معز الدین کیتباد کی غفلت اور بے پروائی کی خبریں سن کر اس کا باپ کھنوتی میں دل ہی دل میں غم کھاتا رہتا۔ تجربے کے آئینے میں کیتباد کی تباہی صاف نظر آرہی تھی۔ اسے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ میری عدم موجودگی میں میرے پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہوگا لہذا اس نے طے کیا کہ بیٹے سے ملاقات کرے اور جو کچھ اس سے کہنا ہے وہ اس کی موجودگی میں کہے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے کیتباد کو خط لکھا۔

”اے فرزند! تو بادشاہ سے اور عیش و طرب تجھ سے جانیں سکا لیکن میرے دیدار کو تو غیبت سمجھ اس لیے کہ اب مجھ میں تجھ سے ملنے کے اشتیاق کو برداشت کرنے کی طاقت

بانی نہیں رہی۔“

جب کیتباد نے باپ کا یہ محبت آمیز خط پڑھا تو اسے بھی ملاقات کا شوق ہوا۔ اس نے بھی اظہار اشتیاق کیا اور اپنی محبت آمیز عرضی مقررین کے ذریعے باپ کے پاس روانہ کی۔ خطوط کے تبادلے کے بعد یہ طے ہوا کہ کیتباد دہلی سے اودھ آجائے گا اور بغرا خاں کھنوتی سے روانہ ہو کر دریائے سرو تک آئے گا اور وہیں باپ بیٹے کی ملاقات ہوگی۔

کیتباد کسی دشمن سے نہیں اپنے باپ سے ملاقات کے لیے نکل رہا تھا اس لیے چاہتا تھا کہ تنہا جائے لیکن ملک نظام اس ملاقات کو جنگ میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے کیتباد کو اس ارادے سے روکا۔

”آپ کے لیے تنہا اتنی طویل مسافت طے کرنا خلاف مصلحت ہے۔“ ملک نظام نے کہا۔

”میں کسی دشمن سے نہیں، اپنے باپ سے ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔“ کیتباد نے کہا۔

”امور مملکت میں باپ بیٹے کے رشتے کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ مصلحت یہ ہے کہ آپ سلطنت کے ساز و سامان اور آراء و افکار کے ساتھ سفر کریں۔“

کیتباد نے اس نصیحت کو تسلیم کیا۔ اس نے حکم دیا کہ لشکر اور شاہی کارخانوں کو مرتب کیا جائے۔ چند روز میں ان کو مرتب کر لیا گیا اور کیتباد بادشاہی شان و شوکت کے ساتھ اودھ کی طرف کوچ کر گیا۔ ملک نظام تو ایک لمحے کے لیے اسے اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ اس سفر میں بھی وہ اس کے ساتھ تھا اور مختلف جیلے بہانوں سے یہ کوشش جاری رکھے ہوئے تھا کہ کسی طرح دونوں باپ بیٹے کی یہ ملاقات جنگ میں تبدیل ہو جائے۔

معز الدین کیتباد کا لشکر زمین کو دھلتا، بگل بجاتا، شان و شوکت کی جلوہ ریزی کرتا اودھ کے علاقے میں پہنچا۔ بادشاہ کے خیمے دریائے سرو کے کنارے لگا دیے گئے۔

بغرا خاں نے جب سنا کہ اس کا بیٹا لاؤ لشکر کے ساتھ آیا ہے تو ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ ملک نظام الدین کی سازشوں سے وہ واقف تھا۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ ملک نظام اسے ملاقات کے لیے نہیں جنگ کے لیے لایا ہے۔ اس نے بھی مقابلے کی نیت سے لشکر تیار کیا اور لاتعداد جنگی ہتھیاروں کے ساتھ کھنوتی سے باہر آیا اور متواتر کوچ کرتا ہوا۔۔۔ دریائے سرو کے کنارے قیام کیا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ دریائے سرو کے ایک کنارے پر

مکافات

بیٹھے گا اور وہ دست بوسی کی شرائط بجالائے گا۔“

بغرا خاں نے اس شرط کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور ملک نظام کو خط تحریر کیا۔

”مجھے بیٹے کی خدمت میں حاضر ہونے سے عار نہیں۔ اگرچہ وہ میری اولاد ہے لیکن میرے باپ کی جگہ دہلی کے تخت پر بیٹھا ہے۔ دہلی کا تخت بہت عظیم الشان تخت ہے۔ دوسری تمام اقلیم کے بادشاہوں پر دہلی کے بادشاہ کی تعظیم و تکریم واجب ہے۔ میں اگرچہ سلطان ملین کا لڑکا ہوں اور اس تخت پر میرا ہی حق تھا لیکن چونکہ وہ میرے بیٹے کو مل گیا ہے، اس لیے میں سمجھتا ہوں وہ خود مجھے ہی مل گیا ہے۔ میرے مرنے کے بعد بھی وہ اسی کو پہنچتا۔ اب میری زندگی میں اس کو مل گیا تو مجھے اور بھی زیادہ خوشی ہے کہ دہلی کی حکومت میرے ہی گھرانے میں رہی۔ اس صورت میں اگر میں بادشاہ دہلی کی عزت و حرمت کا پورا احترام نہ کر دوں گا اور اپنے بیٹے کی خدمت میں حاضر نہ ہوں گا، اس کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا اور اس کے سامنے کھڑا نہ ہوں گا تو بادشاہ دہلی کا دبدبہ بڑھتا ہو جائے گا۔ اس سے مجھے اور میرے بیٹے دونوں کو نقصان پہنچے گا۔ نیز مجھ کو میرے باپ نے وصیت کی تھی کہ میں بادشاہ دہلی کا خلیفہ اور فرماں بردار رہوں اور اس کا احترام کروں۔“

ملک نظام یہ سمجھ رہا تھا کہ بغرا خاں اس شرط کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا اور بات ملاقات سے جنگ کی طرف لوٹ جائے گی لیکن اس خط کے پہنچنے کے بعد ملاقات کو ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے شاہی منہج کو طلب کیا۔ اس نے زانچہ دیکھ کر دونوں کی ملاقات کے لیے ایک مبارک دن مقرر کر دیا۔ اس روز دربار کو آراستہ اور تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

بغرا خاں، دربار کے دالان میں آیا اور تین جگہ زمین بوسی کی شرط پوری کی۔ جب وہ تخت کے سامنے پہنچا تو کیتباد اپنے باپ کی یہ ذلت برداشت نہ کر سکا۔ شاہی نخوت کو خیر باد کہہ کر تخت سے اترا آیا اور باپ کے قدموں پر گر پڑا۔ بادشاہی دبدبہ ایک طرف رہ گیا شفقت پذیری نے دامن سمجھ لیا۔

باپ بیٹے پر رقت طاری ہو گئی اور دونوں رونے لگے۔ کیتباد کا حال تو یہ تھا کہ روتا تھا اور باپ کے قدموں پر آنکھیں رکھ کر ملتا تھا۔ جب اس کی حالت میں قدرے سکون ہوا تو باپ نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ لیا اور تخت پر بٹھلا دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ دیر تخت کے سامنے مودبانہ کھڑا رہے لیکن کیتباد تخت سے اترا اور باپ کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر لے گیا اور اپنی دائیں طرف بٹھایا۔ سونے اور چاندی کے ٹکے بچھاؤ

کیتباد کا لشکر تھا، دوسرے کنارے پر اس کا باپ بغرا خاں لشکر انداز تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خیموں کو بے آسانی دیکھ سکتے تھے۔ یہاں پہنچ کر باپ کے بھوٹے ایک مرتبہ پھر ہوش مارا۔ وہ جنگ کے ارادے سے نکلا تھا لیکن دوسری طرف لگے بیٹے کے خیمے کو دیکھ کر اس نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا اور بیٹے سے ملاقات کی کوشش کرنے لگا۔ دونوں جانب سے سرسبز آوردہ لوگ باپ اور بیٹے کے پاس آتے جاتے رہے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف سے پیغام لاتے اور لے جاتے تھے۔

ملک نظام، کیتباد پر چھلپا ہوا تھا۔ اس کے ارادے اسی صورت میں پورے ہو سکتے تھے کہ باپ بیٹے میں ٹھنی رہے لہذا وہ برابر کوشش کرتا رہا کہ باپ بیٹے میں صلح نہ ہونے پائے۔ کیتباد بھی ملک نظام کے بہکاوے میں آکر باپ سے معرکہ آرائی کے لیے تیار ہو گیا۔

بغرا خاں نے جب دیکھا کہ جنگ کی نوبت قریب آگئی ہے تو اس نے پدر اندہ جذبات سے کام لیا اور کیتباد کے نام ایک محبت آمیز خط لکھا اور اس کے پاس روانہ کر دیا۔

”اے بیٹے! میں تیری جدائی کی وجہ سے بہت پریشان و طول ہوں اور تجھ سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ اگر تو کوئی ایسا انتظام کر سکے کہ میں تجھے ایک لمحے کے لیے دیکھ سکوں تو اس سے مجھے بڑا سکون پہنچے گا اور تیرے عیش و آرام میں کسی طرح کا خلل بھی نہ پڑے گا۔“

اس خط کو پڑھ کر کیتباد زار و قطار رونے لگا اور چاہتا تھا کہ دریائے سرو کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر باپ سے ملاقات کرے لیکن ملک نظام پھر حائل ہو گیا۔

”سرکار عالی! بادشاہت میں باپ بیٹے کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ آپ بادشاہ ہیں، عام آدمی نہیں۔ اگر آپ خوچل کر گئے تو بادشاہی رعب جاتا رہے گا۔ اول تو ملاقات کی پیشکش آپ کو قبول ہی نہیں کرنی چاہیے اور اگر ملاقات اتنی ہی ضروری ہے تو آپ کے والد گرامی کو آنا چاہیے نہ کہ آپ جاہیں۔“

”اس میں بھی مضائقہ نہیں۔“

”صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ملاقات کے وقت وہ بادشاہ کی عمر و تعظیم کو ملحوظ خاطر رکھیں گے۔“

ملک نظام نے خط تحریر کر دیا جس میں یہ شرائط رکھی گئی تھیں۔

”بغرا خاں، بادشاہ دہلی کی تعظیم و تکریم ملحوظ رکھے گا اور دریائے سرو پر مکر کے بیٹے کو دیکھنے آئے گا۔ پناہ تخت پر

سلطان سے کہا کہ ہم کتنے بہت سے حسین سلطان کے جمال جہاں آرا کی آرزو میں کہاں کہاں سے آئے ہیں اور بادشاہ اس طرح ہم سے دور چلا جا رہا ہے۔ کیا ہم اس قافلہ بھی نہیں کر تو ہماری طرف ایک دفعہ دیکھ لے۔

سلطان اس کے تباہ کن حسن اور کمرہ ساز باتوں سے ایسا مدھوش ہوا کہ بے اختیار اس تو بہ شکن لڑکے کو بغل میں ڈال لیا اور یہ شعر پڑھا۔

(معتشوقوں کے ناز و انداز کے خوف سے رات کو میں شراب سے تو بہ کر لیتا ہوں، صبح کو ساقی کا چہرہ پھر کام جاری کر دیتا ہے)

اس شوخ نے بھی اس شعر کے جواب میں شعر پڑھ دیا۔ (میرا عابد فریب غزوہ زاید صد سالہ کو بھی پیشانی کے بال پکڑ کر شراب فروش کے پاس بھیج لاتا ہے)

وہ شعر پڑھتا جاتا تھا اور ہزار طرح کے ناز و انداز اور کمرے اور چستی و چالاکی دکھاتا جاتا تھا۔ سلطان کی قیادت نے اس کا ہاتھ پکڑا اور نیمہ شامی میں لے آیا جو اسی وقت اس جنگل میں لگا دیا گیا تھا۔

”آج سے تو ہماری مجلس کا ساقی ہے۔“ اس مایہ ناز نے شعر پڑھا اور اپنا مدعا بیان کر دیا۔

”اگرچہ ہم چاند سے زیادہ حسین ہیں مگر بادشاہ کے غلاموں کے غلام ہیں۔“ یہ شعر پڑھا اور شراب کا جام بھر کر سلطان کے ہاتھ میں دے دیا۔

کیقباد بھی تو انہی محفلوں کا کھلاڑی تھا۔ اسے بھی ان مواقع سے نسبت رکھنے والے اشعار ادا کرتے تھے۔ اس نے بھی جواب میں شعر پڑھا۔

(جب پیالہ دینے کی باری آئے تو جو لوگ مجلس میں نزدیک بیٹھے ہیں، ان کو دے دے اور مجھے چھوڑ دے کہ میں ساقی کی آنکھوں کو دیکھنے میں مست ہو جاؤں)

وہ معتشوق بھی کہاں چوکے والا تھا۔ اس نے اپنا سر زمین پر رکھا اور شوشی و ناز سے ابرو میں خم ڈال کر غزوہ کرتے ہوئے کہا۔

”شاہ جہاں، نوش فرمایے، شاہ جہاں، نوش فرمایے۔“ کیقباد نے برجل کہا۔

”اگر تو ہمارا ساقی ہے تو کون کہتا ہے شراب حرام ہے۔“ اس کے بعد سلطان کیقباد نے حکم دیا۔ اس حکم کے جواب میں ایک ہزار چاندی کے تنکے لائے گئے۔ یہ تنکے اس معتشوق مفت پر نچاؤ کر دیے گئے۔

الوداع کہا ہے۔ میں جانتا ہوں اور میں نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ جلد ہی نہ یہ لڑکار بگڑے گا اور نہ سلطنت دہلی۔“ ☆☆☆

بغرا خاں کی واپسی کے چند روز بعد کیقباد نے بھی اودھ سے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ باپ کی نصیحتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ ان نصیحتوں کے پیش نظر اس نے عیش و عشرت سے پرہیز کیا باوجود یہ کہ شاید شراب کا شوق اس کی طبیعت میں داخل ہو چکا تھا۔ مصاحبین اشاروں کنایوں میں اس کو ترغیب دیتے تھے لیکن باپ کی نصیحتوں کے پیش نظر وہ ان کو منع کر دیتا تھا۔ اس کے عیش و عشرت کی داستانیں ہر زبان پر تھیں اس لیے ہر طرف سے حسین ملائیں اور شیریں گفتار گویے اس کے دربار کا رخ کرتے۔ وہ اس سفر میں جس راہ سے گزرتا، اس کی صحبت میں شرکت کے ارادے سے اس کے گرد پکڑ کاٹنے اور اس کی خدمت میں حاضری کا ارادہ کرتے۔ وہ اب تک خود پر ظاہری زہد طاری کرتا رہا تھا۔ باپ کی نصیحتیں اسے روک رہی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ باپ کی نصیحتوں پر عمل کرے لیکن آہستہ آہستہ وہ ان پر فریفتہ ہوتا چلا گیا۔ اس کی آتش شوق بھڑکنے لگی۔ بے اختیار ہو کر ان نازنیوں کے چہروں کی طرف دیکھتا۔

اس روز صبح کی سپیدی نے اپنی کرنوں کو پھیلانے کا آغاز ہی کیا تھا کہ ایک پری زاد نے بلاشبہ نازنیوں کا سردار کہا جاسکتا تھا، زرنگار قبائ کے ساتھ عربی اُتھل گھوڑے پر سواری کیڑوں عجیب ہنر اور دلچسپ کربت دکھاتا ہوا بادشاہی پتھر کے سامنے آیا اور ایسے عجیب ہنر اور دلچسپ کربت دکھائے کہ کیقباد باپ کی نصیحتیں بیکارگی بھول گیا اور راستے میں بے اختیار غمگین اور اس سے گفتگو کرنے لگا۔ اس کے حسن و جمال پر کچھ ایسا رہنما کہ باپ کی نصیحتیں دھری رہ گئیں۔ شوق اشتیاق میں گھوڑے سے اتر پڑا اور شراب طلب کی۔ اسی جگہ منزل کر دی۔ جشن شروع ہو گیا۔ اس پری زاد نے شراب کا پیالہ بھرا اور سلطان کے ہاتھ میں دے دیا اور یہ شعر پڑھا۔

سرو سینا بہ صحرا می روی
نیک بد عہدی کہ بے مایہ روی
(او چاندی جیسے جسم والے سرو، تو جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ تو بہت بے مروت ہے کہ بغیر ہمارے جا رہا ہے)

یہ مطلع پڑھ کر ہزار ناز و انداز کے ساتھ اس نے

مند دولت خواہوں میں سے میرے دربار میں کوئی بزرگ باقی نہ رہا جو مجھے پند و نصائح کر سکے۔ اگر آپ ازراہ شفقت پدیری مجھے چند ایسی نصیحتیں کریں جن میں میرے دین و ملک کی فلاح ہو تو آپ کی عنایت ہوگی۔“

”میں خود تو دیکھی چاہتا ہوں کہ چند نصیحتیں تیرے گوش گزار کروں اور تیرے عیش کو کٹی میں بدل دوں تاکہ تو تخت و حکومت کی حفاظت کر سکے۔ پہلی نصیحت تو یہ ہے کہ تم اپنی صحت اور جان کا خیال رکھو۔ تم نے اپنی غلط کاریوں سے اپنی صحت تباہ کر لی ہے۔ تمہارا گلاب چہرہ زردی میں بدل گیا۔ عیاشی نے تمہیں ضعیف کر دیا ہے۔ ان عادات کو بالکل ترک کر دو۔“

”دوسری نصیحت یہ ہے کہ اپنے امیروں اور حاکموں کی خون ریزی سے اجتناب کرو تاکہ وہ تجھ پر بھروسہ کریں اور خوف کے مارے سچ باتیں نہ چھپائیں۔ ملک نظام الدین اور ملک قوام الدین کے علاوہ دو اور پختہ کار امیروں کو منتخب کر کے اپنا شریک کار بناؤ۔ یہ چار امیر تمہاری سلطنت کے چار ستون ہوں گے۔ یہ نصیحت بھی یاد رکھنا کہ اگر کسی راز کو فاش کرنا مقصود ہو تو ان چاروں کے ہی گوش گزار کرنا۔ نماز اور روزے کی پوری پوری پابندی کرنا۔ دینی مسائل کو ایسے عالموں سے نہ پوچھنا جنہوں نے لالچ اور ہوس پرستی میں مبتلا ہو کر دنیا پرستی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔“

ان نصیحتوں کے بعد بغرا خاں نے زار زار دواؤں کا شروع کر دیا اور جوش محبت میں کیقباد کو آغوش میں لے لیا اور اس کے کان میں بڑی آہستگی سے عجیب بات کہہ دی۔

”تجھے لازم ہے کہ جس قدر جلد ہو سکے ملک نظام کو موت کے گھاٹ اتار دے ورنہ اگر اسے کوئی موقع مل گیا تو وہ فوراً تیری جان لے لے گا۔“

کیقباد نے یہ نصیحت سنی ضرور لیکن اس کے دل میں نہ اتار سکی۔ وہ ملک نظام الدین پر پوری طرح بھروسہ کرنے لگا تھا اور اس کے خلاف کوئی بات سننے کا رد اور انداز نہ تھا۔

بغرا خاں کے تجربے نے بے بات اس پر ظاہر کر دی کہ کیقباد کو یہ بات ناگوار گزری ہے لیکن اس نے کیقباد پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ روتا ہوا گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔ وہ اس قدر افسردہ تھا کہ اس نے اس دن کھانا تک نہ کھایا۔ نہ میوں نے اصرار کیا تو اس کی آنکھوں کے کٹورے ایک مرتبہ پھر چٹک اٹھے۔

”میں نے اپنے بیٹے اور سلطنت دہلی دونوں کو

ہونے لگے۔ شعر انے قصیدے پڑھے۔ مطربوں نے گانے شروع کیے۔ آخر کار دربار پر خاست ہوا۔ اب باپ بیٹے کچھ دیر مجلس خلوت میں گئے۔ کچھ دیر بعد بغرا خاں اٹھا اور دربار پار کر کے اپنی قیام گاہ پر چلا گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے کو تحفے ارسال کیے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو قیمتی اشیاء، لذیذ کھانے اور مرقف شربت روانہ کیے۔ دونوں لشکروں کے سپاہیوں کو حکم دیا گیا کہ بے گانگی کی غلیجوں کو پاٹ کر ایک دوسرے سے ہمدردانہ و دوستانہ ملاقات کریں۔

کیقباد اور بغرا خاں کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ بغرا خاں بیٹے سے ملنے کے لیے آتا اور بیٹائی کھول کر باپ کی خاطر توسیع کرتا۔

جب رخصت کا دن آیا اور دونوں ایک دوسرے سے بچھڑنے لگے تو بغرا خاں کو اپنے باپ بلین کی یاد آگئی۔ وہ باپ کو یاد کر کے بہت دیر تک روتا رہا پھر بیٹے سے مخاطب ہوا۔

”معز الدین! میں نے بچپن میں ایک کتاب ”آداب السلاطین“ پڑھی تھی۔ اس میں بادشاہ جشیہ کا قصہ تھا، وہ ترجمہ کن لو۔“

”جی ہاں ضرور سنائیے۔“

”جشیہ اپنے لڑکوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ جس سردار کے پاس دس منتخب اور اچھے سردار نہ ہوں، اسے سردار نہ کہیں اور اس سپہ سالار کو جس کے پاس دس سردار ایسے نہ ہوں جو اس کی بیرونی میں بیوی بچوں کو بھی چھوڑ دیں، اس کو سپہ سالار نہیں کہنا چاہیے۔ اسی طرح جس امیر کے زیر اہتمام دس سپہ سالار نہ ہوں، اس کو امیر نہیں کہہ سکتے۔ جس ملک کے تحت دس امیر نہ ہوں، اس کو ملک کہنا بے

ہودگی شمار کی جاتی ہے اور جس خان کے لشکر میں دس ملک نہ ہوں اس کو خان نہیں کہا جاسکتا اور ہر وہ بادشاہ جس کے اعوان و انصار میں دس خان نہ ہوں، اس بادشاہ کے لیے جہاں بانی اور جہاں گیری کا نام تک زبان پر نہ لانا چاہیے۔ جشیہ کا یہ بھی قول ہے کہ اس بادشاہ کو جہاں دار اور جہاں بان نہیں سمجھا جاتا جس کے خزانے میں اتنی مقدار میں مال و دولت نہ ہو کہ مقابلے پر آنے والے دشمنوں کے حملے اور غلبے کی صورت میں کام آسکے۔“

یہ اور اسی قسم کی دوسری نصیحتیں کرنے کے بعد بغرا خاں چاہتا تھا کہ وہ اس سے رخصت ہو کہ کیقباد نے اس کا دامن پکڑ لیا۔

”آپ کو علم ہے کہ میرے دادا کے تجربہ کار اور دانش

اس نے تین بار جھک کر سلطان کو سلام کیا اور مسکراتے ہوئے عرض کیا۔

”یہ چھادور ان لوگوں کا حق ہے جنہوں نے مجھ جیسے چاند کو تجھ جیسے بادشاہ کے لیے تربیت دی ہے اور دربار میں حاضری کی تمنا لیے بیٹھے ہیں۔“

”کیا ان میں تجھ جیسا اور بھی کوئی ہے؟“ کیتباد نے کہا۔

”مجھ جیسے کو کوئی ماں پیدا ہی نہیں کر سکتی۔ ہاں، میرے گردہ میں سب پروین صفت ہیں۔ وہ انیا گاتے ہیں کہ زہرہ کورقص میں لے آتے ہیں۔ ایسا کہ ان کا گانہ سن کر اڑتے ہوئے پرندے پیچھے آتے ہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو اس طائفے کو پیش کیا جائے۔“

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ حسیںوں کا جھرمٹ سائے میں دھوپ اندیرے میں چاندنی بن کر داخل ہوا۔ سلطان کی چشم حیرت نے ان کی طرف دیکھا۔ دیکھا کہ ایک سے ایک زیادہ حسین، خوب رو اور خوبصورت ہے۔ جب انہوں نے گانا اور ناچنا شروع کیا، کیتباد ان مغل غزلروں کے ناز و ادا کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

کیتباد نے باپ کے پند و نصائح کو بھلا دیا اور دن رات ان توبہ شکنوں کے ساتھ عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا۔

وہ تمام روپیہ جو ملک نظام الدین نے اقتدار ہندوستان کی فاضل آمدنی سے، مال غنیمت، اطراف کے راجاؤں کے نذرانوں وغیرہ سے حاصل کیا تھا اور لشکر کے خزانے میں جمع کر دیا تھا، کیتباد نے وہ سب اہل طرب کے طاقتوں پر خرچ کر دیا۔ اودھ سے دہلی تک تمام راستے وہ عیش و تفریح کرتا رہا اور شراب پیتا رہا اور انعامات تقسیم کرتا رہا۔

دہلی میں سلطان کی آمد کی خوشی میں لوگوں نے آرائش کی انتہا کر دی تھی۔ نئی اور پرانی گانے والیوں اور ناچنے والوں نے عجیب سا ہاں باندھا تھا۔ کیتباد شہر میں داخل ہوا اور پھر شاہی محل میں نزول اجلال فرمایا۔ اس کی توبہ تو ٹوٹ ہی گئی تھی۔ باپ کی نصیحتوں کو ایک کونے میں رکھ کر وہ عیش و طرب کی مختلف سجانے کیلئے کھری چلا گیا جو اسی مقصد کے لیے آباد کیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اہل طرب کے طائفے بھی گئے۔ بادشاہ کی دیکھا دیکھی امراء بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ کئی کوچوں میں اعلانیہ شراب پی جاتی تھی۔

اودھ سے دہلی آئے اور رنگ رلیوں میں جھلارہے ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ بے راہ روی نے رنگ

دکھایا۔ وہ بیمار پڑ گیا۔ بیماری کیا تھی، کمزوری تھی۔ رنگ زرد پڑ گیا اور ضعف غالب آ گیا۔ جب موت سر پر ناچنے لگی تو اسے باپ کی نصیحتیں یاد آئیں۔ اس کے باپ نے ایک نصیحت یہ بھی کی تھی کہ ملک نظام الدین کو راستے سے ہٹا دینا۔ بیماری کی وجہ سے وہ سخت پریشان تھا۔ اس معاملے میں وہ کوئی مقول رائے قائم نہ کر سکا۔ اسے یہی سمجھی کہ وہ ملک نظام کو دہلی سے دور ملتان بھیج دے۔ اس نے نظام کو بلایا اور اس سے کہا کہ وہ ملتان جا کر وہاں کا کام سنبھالے۔ ملک نظام سمجھ گیا کہ سلطان نے اس کو ہٹانے کا ارادہ کر لیا ہے لہذا وہ مختلف بہانوں سے معذوری کا اظہار کرتا رہا۔ درباری امراء بادشاہ کے مقصد کو تاڑ گئے۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ کیتباد ملک نظام سے اب خوش نہیں اور اسے علیحدہ کرنا چاہتا ہے۔ ان امراء میں سے اکثر ملک نظام سے خوش نہیں تھے لہذا انہیں موقع مل گیا۔ انہوں نے کیتباد سے اجازت لی اور ملک نظام کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

ملک نظام راستے سے ہٹ گیا تو کیتباد نے ملک جلال الدین فیروز کو جو سانسہ کا نائب تھا، سانسہ سے بلوایا اور شاہنشاہ خاں کا خطاب دے کر عارض ممالک کے عہدے پر فائز کیا۔ برنی کا صوبہ اسے جاگیر میں عطا کیا گیا۔

کیتباد کی بیماری روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اس بیماری نے فارغ کی صورت اختیار کر لی اور وہ بالکل ہی صاحب فراش ہو گیا۔ سلطنت کے کاموں میں برائے نام حصہ لینے کے قابل نہ رہا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر امراء بادشاہت کے خواب دیکھنے لگے۔ بلقی امراء اس صورت حال سے سخت پریشان تھے۔ ان امراء نے باہمی مشورے کے بعد طے کیا کہ کیتباد کے لڑکے کی موت کو جو اگرچہ خرد سال ہے، حرم سے باہر لا کر تخت پر بٹھلا کر حکومت بلبن ہی کے خاندان میں رہے اور ترکوں کی نسل سے باہر نہ نکلے۔ اس پر اتفاق ہو جانے کے بعد سلطان معز الدین کیتباد کے لڑکے کو حرم سے باہر لائے اور سلطان شمس الدین کا خطاب دے کر تخت پر بٹھلا دیا اور بدنگان بلقی اس کے اعوان و انصار ہو گئے۔

کیتباد کا علاج ہوتا رہا۔

☆☆☆

جلال الدین فیروز غلجی جس کو عارض ممالک مقرر کیا گیا تھا اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ بہار پور میں قیام پذیر تھا۔ وہ ترک نہیں تھا اس لیے ترکوں سے اس کے تعلقات استوار نہیں تھے اور نہ ترک امراء اس کو اپنے گردہ

میں سمجھتے تھے چنانچہ شاہی امراء دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ غلجی امراء کا تھا جو جلال الدین غلجی کا دم بھرتا تھا، دوسرا گروہ ترک سرداروں کا تھا۔ جب حالات یہ ہوں تو اتحاد و اتفاق خواب بن کر رہ جاتا ہے لہذا جھگڑے یہاں بھی کھڑے ہو گئے۔ ترک امراء کو یہ ناز تھا کہ بادشاہ ترک نسل ہے۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر غیر ترک یعنی غلجی گروہ طاقتور ہو گیا تو بادشاہت ترک خاندان سے چلی جائے گی۔ ان امراء نے یہ منصوبہ بندی کی کہ غلجی گروہ کو ہلاک کر دیا جائے۔ ایک فہرست تیار کی گئی جس میں سرفہرست جلال الدین غلجی کا نام تھا۔ جب جلال الدین کو اس بات کی خبر ہوئی تو اس نے اپنے آدمیوں کو جمع کیا۔ غلجی امراء اور ملوک کو اکٹھا کیا اور بعض دوسرے امراء کو بھی اپنے ساتھ ملایا۔

اب سوال یہ تھا کہ جلال الدین پر کیسے قابو پایا جائے؟ اسے کیسے قتل کیا جائے؟ اس کام کے لیے ویل مملکت ملک اختر چکن آگے آیا کہ ملک جلال الدین کو دھوکے سے بلالائے اور اس کا کام تمام کر دے۔ جلال الدین کو معلوم ہو گیا تھا کہ ملک اختر اس فعل بد کے لیے سوار ہوا ہے لہذا وہ اور اس کے ساتھی ہوشیار ہو گئے تھے۔ اختر جیسے ہی جلال الدین کو بلانے کے لیے اس کے دروازے پر پہنچا تو لوگوں نے اسے گھوڑے سے اتار لیا اور لوگوں اس کے گلے پر چاڑھی۔ جلال الدین کے بیٹے پچاس سواروں کے ساتھ بارگاہ سلطانی میں داخل ہوئے اور کیتباد کے بیٹے کو تخت سے اٹھا کر لے گئے اور کیتباد کے پاس پہنچا دیا۔

شہر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خواص و عوام اور پھوٹے بڑے سب سلطان کے بیٹے کی مدد کو پہنچے۔ شہر کے لوگوں کو غلیوں کا اقتدار سخت ناپسند تھا۔

اس سے پہلے کہ یہ ہنگامہ زور پکڑتا، کوتوال نے اس ہنگامے کو فوجوں اور لوگوں کو واپس کر دیا۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ غلیوں کی طاقت دیکھتے ہوئے بہت سے ملوک و امراء جو ترک نسل تھے، جلال الدین کے ساتھ مل گئے۔ اس طرح غلیوں کی جمیعت بہت بڑھ گئی۔

کیتباد نے ملک نظام الدین کے بھڑکانے پر بہت سے ترک امیروں اور ان کے رشتے داروں کو گل کرادیا تھا۔ اب جو انہیں جلال الدین کی حمایت حاصل ہوئی تو کیتباد کی جان کے دشمن ہو گئے اور جلال الدین سے تقاضا کرنے لگے کہ کیتباد کو راستے سے ہٹا دیا جائے چنانچہ ایک ملک کو جس کے باپ کو کیتباد نے قتل کر دیا تھا، کیلئے کھری بھیجا اور اشارہ کر دیا کہ کیتباد کو قتل کر دیا جائے۔

کئی کوئیں معلوم تھا کہ یہ شخص جلال الدین کے ساتھ مل گیا ہے اور اسی کا بیٹھا ہوا ہے لہذا وہ آسانی سے محل کے اندر داخل ہو گیا۔ دیکھا کہ کیتباد کا آخری وقت ہے، چند سانس باقی ہیں۔ اس شخص نے اسے چند چادروں میں لپیٹا، دو چار لائیں ماریں اور پھر دیارے جتنا میں بھاڑ دیا۔ جب جلال الدین نے دیکھا کہ یہ کتا بھی نکل گیا اور تخت خالی پڑا ہے تو وہ ایک کثیر جماعت کے ساتھ کیلئے کھری آیا اور کیتباد کے خاص محل میں فروکش ہوا۔ بلبن کا ایک بیٹھا ملک چھو سلطنت کا واحد ویدوارہ رہ گیا تھا۔ جلال الدین نے اسے ”کڑہ“ کا حاکم مقرر کر کے اودھ روانہ کر دیا اور خود شاہی نجومی کے مشورے کے مطابق ایک مبارک گھڑی میں شاہی تخت پر بیٹھ گیا اور شاہی شان و شوکت کے انتظامات، عہدوں کی تقسیم اور درباب و اعزہ کے جمع کرنے میں مصروف ہو گیا۔

شہر کے عوام کو اس کی بادشاہی سخت ناپسند تھی لہذا وہ ایک عرصے تک شہر کے لوگوں کے خوف سے دہلی کے اندر داخل نہ ہو سکا۔ اس دوران وہ ایسے عمدہ کام کرتا رہا جو خلق خدا کی بہتری کے لیے تھے۔ جب اس کے لطف و کرم کی عام شہرت ہوئی تو دہلی کے مشہور و معزز خاندانوں کے اراکین جو ترکی نژاد بادشاہوں کی ملازمت میں رہ چکے تھے اور غلیوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو اپنی توبہیں سمجھتے تھے، دہلی سے شہر میں آئے۔ ان سب نے بڑے خلوص کے ساتھ جلال الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس کے ہمدردوں میں شامل ہو گئے۔

جب جلال الدین غلجی نے یہ دیکھا کہ عام و خاص مطمئن ہیں، مخالفت کا زور ٹوٹ گیا ہے، ترک امراء اس کے ساتھ ہیں تو اس نے بہت ہی اور کیلئے کھری کا گل چھوڑ کر قدیم دہلی میں آ گیا اور دہلی کے بادشاہوں کے تخت پر رونق افروز ہوا۔ تخت شاہی پر بیٹھ کر اس نے بلند آواز میں ملوک و امراء کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

”میں خدا کا شکر کیونکر ادا کر سکتا ہوں کہ جس تخت کے سامنے برسوں میں نے سر زمین پر رکھا ہے، آج اسی تخت پر اپنا پاؤں رکھے ہوئے ہوں اور بادشاہی کے لیے بیٹھا ہوں۔ میرے ساتھی اور ہمدرد جو ہر طرح سے مجھ سے بہتر ہیں، ہاتھ باندھے ہوئے میرے سامنے کھڑے ہیں۔“

اس مختصر خطاب کے بعد جلال الدین سوار ہوا اور ”کوٹک لعل“ میں پہنچ گیا۔ (کوٹک لعل غیاث الدین بلبن کا خاص محل تھا) بارگاہ سلطانی کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 1200 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیمت ایک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد

رسالے کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے

ارحال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر

رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیادوں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا پی گرام کے

ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر

بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: امراترہاس فون نمبر: 0301-2454188

سرکوشن منیجر: سید منیر حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ، پبلی کیشنز
C-63، فرینٹس ہاؤسنگ اتھارٹی، مین کوئٹہ روڈ، کراچی
فون: 35804200-35804300

مشہور مشہور راولوں اور پاکیزوں نے ملک بھجوں کے
ساتھ ساتھ... قلم سے اٹھائے کردہ سلطان جمال الدین
کے کلام کو یاد رکھیں گے۔

اب دہلی کے ایک دوسرے کے سامنے ہوئے اور

جمال الدین کے لشکر نے حیر برسانے شروع کیے تو ملک بھجوں

کے لشکر میں شامل ہندوستانیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اب جمال الدین کے لشکر کے اگلے سپاہیوں نے کوارس

لہاؤں سے نکالیں تو ملک بھجوں کا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ خود ملک بھجوں

اگلی بھاگنے پر مجبور ہو گیا اور قریب کے ایک گاؤں میں

گھپ گیا۔ جمال الدین کے سپاہی اس کا تعاقب کرتے

ہوئے اس گاؤں میں پہنچ گئے لیکن ملک بھجوں کا وہاں نام

وہاں تک نہیں تھا۔

ملک بھجوں کے لشکر کی شکست کے بعد اس کے امراء قید

ہوئے۔ جمال الدین کے بیٹے ارکلی خاں نے ان کی گردنوں

میں دو شاخے لٹکا دیے اور انہیں اونٹوں پر سوار کر کے

سلطان جمال الدین علی کے پاس لایا۔ سلطان کی نظر جو نمی

ان قیدیوں پر پڑی اس نے رومال آنکھوں پر رکھ کر بلند

آواز سے کہا۔ ”یہ کیا ظلم ہے۔ ان معزز امراء کی یہ حالت

کس نے بنائی ہے؟ انہیں فوراً اونٹوں سے اتار لیا جائے اور

ان کی گردنوں سے دو شاخے علیحدہ کر لیے جائیں۔“

ان قیدیوں میں بعض ایسے امراء بھی تھے جو سلطان

غیاث الدین کے دربار میں بہت ہی معزز عہدوں پر فائز

تھے۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر جمال الدین کی آنکھیں بھر

آئیں۔ اس نے ان امراء کو فوراً حکام کی طرف بھیجا اور غلب

خاص سے سرفراز کیا۔ جب یہ امراء تباہ و برباد اور خستہ

تن کر کے آئے تو سلطان نے انہیں اپنی خاص مجلس میں

شریک کیا اور عطرو، دیان وغیرہ سے مدارات کی۔ یہ معلوم ہی

نہیں ہوتا تھا کہ یہ جنگ میں قید کیے ہوئے قیدی ہیں لیکن یہ

نہیں تھا لیکن شہر کے اکابر و عوام اور سربراہان و دروہ لوگوں نے

جلال الدین کی انصاف پسندی اور آداب ملحوظ رکھنے سے

متعلق گفتگو سنی تو اس کی تعریف کی اور اس کی بادشاہی کی

طرف مائل ہو گئے اور اس کے متعدد وہابی خواہ بن گئے۔

اس کی نرم دلی کے لیے قیسے اس کے دشمنوں اور اقتدار

پسندوں تک بھی پہنچے اور وہ قانکہ اٹھانے کے لیے تیار یاں

کرنے لگے۔

وہ دہلی سے ایک مرتبہ پھر کیلکھری چلا گیا اور اسے

دارالحکومت بنا کر اس کے استحکام میں مشغول ہو گیا۔

ابھی ایک سال ہی گزرا تھا کہ غیاث الدین بلبن کے

بھتیجے ملک بھجوں نے اس نے ”کڑہ“ کا حکم مقرر کر کے بھیج

دیا تھا، شوق اقتدار نے بے تاب کیا۔ وہ شکار کے لیے نکلا

اور اودھ کے حاکم امیر علی جامدا کے پاس پہنچ گیا۔

”تمام حالات آپ کے سامنے ہیں۔ جلال الدین

سلطان نہیں، قاتل ہے۔ اس نے معزز الدین قبیاد کو قتل

کر لیا، تخت پر قابض ہو گیا اور مجھے ”کڑہ“ کا حکم بنا کر خود

سے دور کر دیا کیونکہ سلطان بلبن کا وارث میں تھا۔ اب

وقت آ گیا ہے کہ اگر آپ میری مدد کریں تو میں اپنے چچا

سلطان بلبن کا تخت آزاد کرالوں۔“

اودھ کے حاکم امیر علی جامدا نے مدد کا وعدہ کر لیا۔

ملک بھجوں نے ”کڑہ“ میں اپنے نام کا سکہ کر لیا اور سلطان

مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے سارے اودھ کا خود مختار

فرماں روا بن گیا۔ اس علاقے کے تمام امراء نے ملک بھجوں

کا ساتھ دیا اور وہ ایک زبردست لشکر لے کر دہلی کی طرف

روانہ ہو گیا۔

جلال الدین نے اطلاع ملتے ہی اپنے بیٹے ارکلی

اترا۔ اسے گھوڑے سے اترتے ہوئے دیکھ کر اس کے

ہمراہوں نے اسے یاد دلایا۔

”اب یہ محل آپ کی ملکیت ہے۔ حضور گھوڑے سے

کیوں اترتے؟“

جلال الدین نے نہایت عادلانہ جواب دیا۔

”جو کو شک میرے باپ دادا نے بنایا ہو اور ان کی

ملک میں رہا ہو، وہی کو شک میری ملک اور جائداد ہو سکتا

ہے۔ یہ کو شک سلطان بلبن کا ہے جو اس نے اپنی خانی کے

زمانے میں بنایا تھا، یہ اسی کے بیٹوں اور پوتوں کا ہے۔ میں

تو صرف اسے غلبہ کر کے تصرف میں لایا ہوں۔“

اس پر ایک امیر ملک احمد نے جواب دیا۔

”مصلحت ملنے کا تقاضا یہی ہے کہ گزشتہ بادشاہوں کی

موردی اور غیر موردی ملکیت باقی نہیں رہنی چاہیے۔“

جلال الدین نے جواب میں کہا۔

”جو کچھ تو کہتا ہے، میں بھی جانتا ہوں لیکن کیا تو یہ کہتا

ہے کہ چند روزہ اور تپا پائیدار مصلحت کے لیے میں دائرہ

اسلام سے باہر نکل جاؤں۔ تو خوب جانتا ہے کہ ہمارے

اسلاف میں سے کوئی بھی بادشاہ نہیں ہوا کہ اس سے شاہی

نخوت اور غرور مجھے میراث میں پہنچا ہو۔ اس وقت مجھے ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ سلطان بلبن اس کو شک میں تخت پر بیٹھا

ہے اور دربار کر رہا ہے اور میں اس کے سامنے سے گزر رہا

ہوں۔ میں نے اس کو شک میں اس بادشاہ کی خدمت میں

بہت حاضری دی ہے۔ اس کی ہیبت کا رعب ابھی تک

میرے دل سے دور نہیں ہوا۔“

سلطان جلال الدین علی محل میں پیادہ چل کر جا رہا تھا

اور ہمراہیوں کو سلطان بلبن کے رعب و جلال کے قیسے سناتا

جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ”ملوک خانہ“ کی طرف گیا اور اس کے

چبوترے پر بیٹھ گیا اور رومال منہ پر رکھ کر زار زار رونے لگا۔

بعض امراء کو اس کا یہ رونا سخت ناپسند ہوا۔ وہ آپس

میں گفتگو کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑانے لگے۔

”بادشاہت اس کے بس کی نہیں۔“

”رونا تو عورتوں کا کام ہے نہ کہ بادشاہوں کا۔“

”سلطنت تو قبر و قفس سے چلتی ہے۔ قدم قدم پر

خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ یہ شخص کس طرح سلطنت قائم رکھ

سکے گا۔“

”ہمیں نہیں لگتا کہ جلال الدین کی حکومت زیادہ دن

قائم رہ سکے گی۔“

نوجوان امراء کے نزدیک اس کا یہ کردار قابل تعریف

تبیروں پر مل پڑ گئے اور بادشاہ کے خلاف اٹھنے والے جذبات مزید بھڑک گئے۔ جلال الدین کی معزولی کے مشورے مزید شدت اختیار کر گئے۔ ان امراء نے ملے کیا کہ اگرچہ جلال الدین کی بہادری اور جرأت میں کوئی شک نہیں اور اس نے اپنے عہد جوانی میں بارہا مظلوموں کے مقابلے پر ہمت کے جوہر دکھائے ہیں لیکن اب چونکہ وہ ضعیف العمر ہو گیا ہے اور اس کو شعر کہنے اور شطرنج کھیلنے کے علاوہ کوئی کام نہیں رہ گیا اس لیے اسے معزول کر کے ملک تاج الدین کو بیٹا بادشاہ بنا دیا جائے۔

اس منصوبے کو مزید پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ان امراء نے ملک تاج الدین کو بیٹا کی قیام گاہ پر بادہ نوشی کی ایک محفل منعقدی اور خوب پی کر عالم مستی میں اول فول بکنے لگے۔

”جلال الدین غلیٰ ہرگز اس قابل نہیں کہ وہ عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے۔“

”میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔“

”میں اپنی تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔“

”وہ بوڑھا بوچکا ہے، کیا مقابلہ کرے گا۔ مارا جائے گا۔“

”کسی بہانے سے شکار پر لے جائیں گے۔ کہہ دیں گے شیر کھا گیا۔“

انہی امیروں میں سے ایک نے تمام باتیں جلال

الدین غلیٰ تک پہنچا دیں۔ وہ پہلے بھی ایسی ہرزہ سرائیاں سن چکا تھا لیکن اس مرتبہ کچھ زیادہ باتیں اس تک پہنچی تھیں۔

سلطان ان باتوں کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے ایک قاصد بھیج کر ان سب کو اپنے روبرو طلب کیا۔ جب وہ سب آچکے تو سلطان نے غلیٰ تلوار ان کے سامنے رکھ دی اور کہا۔

”اے نامرد! تم نشے میں بدست ہو کر آپس میں شیخیاں مارتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم یوں تیر ماریں گے اور یوں تلوار چلائیں گے۔ تم میں کون مرد ہے جو یہ تلوار اٹھائے اور میرے سامنے آئے۔ میں اس وقت بالکل تنہا ہوں۔

میرے ہاتھ میں کوئی تلوار نہیں۔ تم میں سے جس شخص کو بہادری کا دعویٰ ہے، وہ اٹھے اور میری تلوار سے میری گردن اڑا دے تاکہ میں یہ سمجھ سکوں کہ تم واقعی کسی مصرف کے ہو اور کوئی کام تمہارے ہاتھوں انجام پاسکتا ہے۔“

جب بادشاہ اچھی طرح دل کی بھڑاس نکال چکا اور اس کا غصہ کچھ کم ہوا تو ایک امیر ملک نصرت اپنی جگہ سے اٹھا اور بادشاہ سے مخاطب ہوا۔

”حضور کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ شرابی شراب

خدا کے سامنے نہیں لایا جاوے گا؟ اب جو خدا تعالیٰ نے ام کو ان کا ساتھی ملا کر دیا ہے تو اس کا میاں کی شکر ہے میں کچھ چاہے کہ میں ان کو آزار کر دوں، نہ یہ کہ ان کو قتل کر دوں۔“

اس کے بعد جلال الدین نے اپنے امیر ملک احمد کو

مخاطب کیا۔

”اے احمد! تو اپنا منہ زبان میں ڈال کر دیکھ اور

لو کہ ہم ملکوں کے کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم میں

کون سا بادشاہ ہوا ہے۔ گزشتہ سالوں میں، میں اور میرا بڑا

بھائی شہاب الدین دہلی میں سلطان ملین کی ملازمت کرتے

تھے۔ اس کے احسانات کا حق ہماری گردنوں پر بہت زیادہ

ہے۔ یہ کون سا انصاف ہے کہ ان کا (ملین کے وارث)

ملک ہم لے لیں اور انہیں سزا دیں۔ اگر بادشاہی مسلمانوں

کا خون بہا ہے بغیر ممکن نہیں تو مجھ میں ان کے خون بہانے کی

طاقت کون۔“

امراء دم بخود ہو کر اس کی باتیں سن رہے تھے۔ کسی پر

اثر ہوا ہی نہ رہا۔ بس یہ کہتے ہوئے اٹھ گئے کہ ایسے شخص

سے بادشاہی ہو چکی۔

امراء کا کہنا بھی کچھ ایسا غلط نہیں تھا۔ جلال الدین کی

بے جا نرمی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوروں اور ڈاکوؤں کو کھلی چھٹی مل

گئی۔ چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں عام ہو گئیں۔ اگر کوئی

جرم بڑا بھی جاتا تو بادشاہ اسے سزا دینے کے بجائے توبہ

کرانے اور آئندہ جرم نہ کرنے کا عہد لے کر چھوڑ دیتا۔

جلال الدین کی اس نرمی کی وجہ سے غلیٰ امراء اس

سے بہت برگشتہ ہو گئے اور کھلے بندوں اسے ملامت کرنے

لگے۔ اس کا نتیجہ علاؤ الدین غلیٰ ان حالات پر قابو پاسکتا تھا

لیکن جلال الدین نے اسے کڑھ کا حاکم بنا کر ملک چھوڑ کر

روانہ کر دیا تھا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ

یہ امراء اس سماجی ابتری کا تمنا شدی کہتے رہیں یا جلال الدین

کو معزول کر دیں۔ یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ ملکوں کا

ایک گروہ گرفتار کر کے جلال الدین کے روبرو پیش کیا گیا۔

اس وقت اس گروہ کا ایک ایک فرد مارے خوف کے تھر تھر

کاہ رہا تھا لیکن اس نرم خور بادشاہ نے ایک کو بھی قتل نہ کرایا

بلکہ حکم دیا کہ کشتیوں میں سوار کر کے ان کو بنگال کی طرف

لکھنؤ کی علاقے میں لے جا کر چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ

فلک بھورا لکھنؤ کی علاقے ہی میں پڑے رہیں اور پھر

اس طرف نہ آسکیں۔

جرموں کے لیے ایسی انوکھی سزا دیکھ کر امراء کی

”جلال الدین کی فوجیں میری تلاش میں ہوں گی۔ مجھے کچھ دنوں اپنے پاس پناہ دے دو۔ معاملہ ٹھنڈا ہوتے ہی میں اپنی جاگیر پر چلا جاؤں گا۔“

”میرے پاس جو کچھ ہے، آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔

آپ جب نیک چاہیں گے میرے مہمان رہیں گے۔“

زمیندار نے کہا لیکن دل میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

دو چار دن ہی گزر رہے تھے کہ ایک رات زمیندار

نے اپنے کچھ آدمیوں کو ساتھ لیا اور سوتے ہوئے ملک چھوڑ کر

رسیوں سے جکڑ دیا۔ اسی رات اسے گھوڑے پر ڈالا اور دہلی

پہنچ گیا۔ کسی نہ کسی طرح جلال الدین تک رسائی حاصل کی

اور ملک چھوڑ کر اس کے حوالے کر دیا۔

جلال الدین نے اس وقت بھی نرم خوئی کا مظاہرہ

کیا۔ ملک چھوڑ رہا تھا جس نے ہر بندہ بغاوت کی گنجی۔ اس کے

خلاف لشکر لے کر آیا تھا۔ سخت سزا کا مستحق تھا لیکن جلال

الدین نے اسے ملتان روانہ کر دیا اور حکم دے دیا کہ وہاں

اس کو ایک مکان میں عزت سے رکھا جائے اور عہدداشت کی

خانے۔ شراب، میوہ، کھانے اور کپڑے جو وہ طلب کرے

مہیا کیے جائیں۔

امراء اس وقت بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے

ایک زبان ہو کر جلال الدین کو تنبیہ کی۔

”جب اتنے بڑے سیاسی جرم پر اسے سزا نہ دی تو

آگے کیا امید ہے کہ دوسرے لوگ بغاوت نہیں کریں گے

اور فتنہ برپا نہیں ہوگا۔ پھر بادشاہ کی طرف سے کون سی سزا

ہوگی جس سے لوگ عبرت حاصل کریں گے۔ سلطان ملین

جس کی سختی اور ہیبت خداوند عالم کو ابھی یاد ہوگی اس قسم کی

بغاوتوں پر سختی سخت سزا دیتا اور کتنی خونریزی کرتا۔ اگر ہم

ملک چھوڑ کے قبضے میں آجاتے تو وہ غلیوں کا نام و نشان تک

باقی نہ چھوڑتا۔“

جلال الدین نے اپنی صفائی پیش کی۔

”آپ لوگوں نے جو کچھ کہا وہ میں بھی جانتا ہوں۔

بغاوتوں اور فسادات کے موقعوں پر بادشاہوں کی سزائیں

میں نے تجھ سے زیادہ دیکھی ہیں مگر اس کو کیا کروں کہ میں

اسلامی ماحول میں بوڑھا ہوا ہوں اور مجھے مسلمانوں کا خون

بہانے کی عادت نہیں۔ چند روزہ حکومت قائم رکھنے کے لیے

جو نہ دوسروں کے بعد رہی ہے اور نہ ہمارے بعد باقی رہے

گی۔ اسلامی احکام اور شریعت کے قوانین کو وہیں پشت ڈال

دوں اور حکم دے دوں کہ مسلمانوں کی گردنیں بے دریغ اڑا

دی جائیں؟ آج تو جو کچھ بھی ہے گزر رہی جائے گا لیکن کل

لیکن اس کا کیا علاج کہ خداوند تعالیٰ کی مرضی آپ کے ارادے کے خلاف تھی۔ آپ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہوئے اور بادشاہت مجھ بوڑھے کے ہاتھ میں آئی۔“

ملک احمد بھی اس مجلس میں شریک تھا۔ وہ صاحب

رائے بھی تھا اور نائب امیر حاجب بھی اور سلطان سے

قربت بھی رکھتا تھا، خاموش نہ رہ سکا۔ نہایت گستاخانہ انداز

میں بادشاہ سے مخاطب ہوا۔

”بادشاہ کو یا تو حکومت کرنا چاہیے اور بادشاہوں کے

طریقوں پر عمل کرنا چاہیے ورنہ پھر اسی محدود علاقے پر

جہاں اتنے سال گزارے ہیں، قناعت کرنا چاہیے۔ خداوند

عالم نے ان گردن زدنی ملک پر اتنی نوازش فرمائی، ان کو

شراب نوشی میں شریک کیا اور ان کی ہتھکڑیاں کھلوادیں۔“

دوسرے امراء نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

”حضور! ان واجب الفکر امراء پر جو مہربانیاں فرمائی

ہیں وہ جہاں داری اور فرماں روائی کے دستور کے خلاف

ہیں۔ ہماری رائے ہے کہ ان باغیوں کو معاف نہ کیا جائے۔

اگر انہیں قتل نہ کیا جائے تو ان کی آنکھوں میں سلاخیاں ضرور

پھر وادی جائیں تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔“

جلال الدین نے ان امراء کو جواب دیا۔

”تم لوگوں نے جو کچھ کہا، وہ بالکل درست ہے لیکن

میں مسلمان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتا۔ اس

وقت میری عمر 70 سال ہے۔ آج تک میں نے کسی مسلمان

کی جان نہیں لی تو بھلا اس عمر میں یہ کام کیسے کروں۔ اگر میں

ان لوگوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا ہوتا اور مجھے یہ لوگ قتل

کر دیتے تو قیامت کے روز ان لوگوں کو جواب دینا پڑتا نہ

کہ مجھے۔ میں نے کئی سال غیاث الدین ملین کا نمک کھایا

ہے، اب اس کے امراء کو قتل کرنا مجھے زیب نہیں دیتا اور یہ

فعل میری نمک حرامی کی دلیل ہوگا۔“

یہ امیر بوڑھے اور رحم دل بادشاہ کی بے موقع نرمی

سے رنجیدہ ہو کر اسے دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے

رخصت ہو گئے۔

☆☆☆

ملک چھوڑ کر خاں کے حملوں کی تاب نہ لا کر میدان

جنگ سے فرار ہو گیا تھا۔ کچھ دنوں کھیتوں میں چھپا رہا اور

پھر اس گاؤں کے زمیندار کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بھلا اسے

صورت سے کیا پہچانتا۔ جب اس نے بتایا کہ وہ ملک چھو

ہے اور جلال الدین کے لشکر سے شکست کھا کر بھاگ آیا ہے

تو زمیندار کی باتیں مٹ گئیں۔

کشی اختیار کریں گے تو پھر کل قیامت کے روز آپ خدا کو کیا جواب دیں گے۔“

سیدی مولہ کچھ بھیجتے تھے، تھے تو انسان۔ آہستہ آہستہ یہ باتیں ان پر اثر کرنے لگیں اور بالآخر قاضی کاشانی کی باتوں میں آکر سلطنت حاصل کرنے کے سامان فراہم کرنے لگے۔ سید صاحب نے پوشیدہ طور پر اپنے ہر مرید کو خطابات اور مناصب سے نوازنا شروع کر دیا۔ کئی راتیں اس منصوبہ سازی میں گزار گئیں اور بالآخر یہ طے پایا کہ سید صاحب کے دو نمایاں مرید برجین کوتوال اور تنہائی پہلوان جن پر سید صاحب کے بے شمار احسانات تھے، جیسے کے روز جب بادشاہ نماز کے لیے سوار ہو اس کی سواری تک پہنچ کر اس کا کام تمام کر دیں اور سید صاحب کے دس ہزار مرید اسی وقت ان سے بیعت کر کے ان کی بادشاہت تسلیم کر لیں۔

جب یہ منصوبہ تیار ہو رہا تھا اسی وقت ایک مرید، مریدوں کے ہجوم سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ قاضی جلال الدین نے اسے اٹھتے ہوئے دیکھا اور سیدی مولہ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

اس مرید کو یہ باتیں ناگوار گزری تھیں۔ اس نے چاہا کہ جب تک اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جائے، سلطان تک اس خبر کو پہنچا دیا جائے۔ وہ رات کے اندھیرے میں اندھیرا بن کر رخصت ہوا اور ”کوٹھ گل“ تک پہنچ گیا۔ اتنی رات گئے پہرے داروں نے دروازہ کھولنے اور سلطان سے ملاقات کرانے سے انکار کر دیا لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ وہ سیدی مولہ کی خانقاہ سے آیا ہے اور ایک عجیب و غریب سازش سے سلطان کو آگاہ کرنا چاہتا ہے تو پہرے داروں نے نرمی اختیار کی۔

سلطان جلال الدین اس وقت ملکہ جہاں کے ساتھ اپنی خواب گاہ میں تھا۔ اس نے جو ناوقت دروازے پر دستک کی تو ناگواری سے بستر سے اٹھا۔ اس کے محافظوں نے جب اسے خطرے کی اطلاع دی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ملاقات کے لیے تیار ہو گیا۔

سیدی مولہ کے مرید نے جو کچھ بتایا، اسے سن کر سلطان کے ہوش و حواس پر بجلی سی گری۔ ”میری مملکت کے نکلوں پر پلنے والے میرے خلاف ایسی سازش تیار کر رہے ہیں۔“

سیدی مولہ کی خانقاہ میں باتوں کا بازار لگا ہوا تھا کہ شاہی فوج خانقاہ کے دروازے پر پہنچی۔

حاجت روائی کرومگر ایک نصیحت یاد رکھنا۔ امیروں اور حاکموں سے زیادہ میل جول پیدا نہ کرنا۔“

سیدی مولہ نے دہلی پہنچ کر عظیم الشان خانقاہ تعمیر کروائی اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے لگے۔ کسی کو نقدی کی ضرورت ہوتی تو وہ بھی اسی خانقاہ سے ملتی لیکن ان کے طور طریقے عجیب تھے۔ جیسے کو جامع مسجد میں نماز کے لیے نہیں آتے تھے۔ نماز پڑھتے تھے لیکن نماز باجماعت ادا کرنے کے قائل نہیں تھے البتہ مجاہدہ و ریاضت بہت کرتے تھے۔ صرف ایک کپڑا اور چادر استعمال کرتے تھے۔ بیوی، کنیز یا خدمت گار رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ کسی سے کوئی چیز نہ لیتے تھے لیکن خرچ اتنا زیادہ کرتے تھے کہ لوگوں کو حیرت ہوتی۔ اکثر لوگ کہتے تھے کہ وہ ”سیا“ کا علم جانتے ہیں یعنی علم طلسم جانتے ہیں۔ اگر وہ کسی تاجر سے کچھ خریدتے تو فروخت کرنے والے سے کہہ دیتے کہ جاؤ فلاں پتھر یا اینٹ کے نیچے چاندی کے تنکے ہیں، وہ لے لو چنانچہ وہ ایسا کرتے اور چاندی کے تنکے یا سکہ ان کو مل جاتے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر حکمران تھا۔ ہر چیز اپنے مقام پر تھی۔ امور ملکی استقامت پذیر تھے۔ ملوک و امراء سے میل جول رکھنا ممکن ہی نہ تھا۔ ان امراء کو بھی ضرورت نہیں تھی کہ دعا کے لیے بزرگوں کی خانقاہوں میں جائیں یا سازشوں کے پاؤں دراز ہوں لیکن جب یکتا دیکھ کر ان کی کادور آتو یہ ایک طرح سے بے خبری اور غفلت کا دور تھا۔ سیدی مولہ نے حضرت فرید خٹکؒ کی نصیحت کو فراموش کر دیا اور ملوک و امراء سے گہرے مراسم پیدا کر لیے۔ جب عنان حکومت غلیوں کے ہاتھ میں آئی تو سیدی مولہ کی خانقاہ میں عوام کا ہجوم بھی پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ سازشوں کے دروازے بھی کھل گئے۔ یہی وہ دن تھے جب قاضی جلال الدین کاشانی سے ان کے مراسم بڑھے۔ یہ مراسم اتنے بڑھے کہ دوپٹی میں بدل گئے۔ یہ شخص کئی دن ان کا مہمان رہتا اور انہیں بادشاہ بننے کی ترغیب دیتا رہتا۔ اکثر یہ فرمودات ان الفاظ پر مشتمل ہوتے۔

”خداوند تعالیٰ نے آپ کو یہ قدرت اس لیے دی ہے کہ آپ اس کے بندوں سے رحم اور مہربانی سے پیش آئیں اور حکومت کو جو خدا کی نیابت ہے، خالموں کے ہاتھ سے چھین کر اپنے قبضے میں کریں۔ اہل دنیا کو خدا اور اس کے رسول کے فرماؤں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیں۔ اگر آپ اس عظیم الشان عہدے کو حاصل کرنے سے کنارہ

ان کو اپنے گھروں میں بھی نصب نہیں تھیں۔ یہ گرم بازاری جاری تھی کہ قاضی جلال الدین کاشانی کی قندہ پسند طبیعت نے اس موقع کو غنیمت جانا اور سیدی مولہ تک رسائی حاصل کر کے اپنے مقاصد پورے کرنے کی ترکیب سوچنے لگا۔ وہ یوں بھی ان کے دربار میں حاضر ہو سکتا تھا لیکن وہ خصوصی تعلق کی تمنا رکھتا تھا۔ کئی دن تک مسلسل سوچنے کے بعد وہ جلال الدین کے بیٹے خان خانا کی خدمت میں پہنچ گیا۔

”میں چاہتا ہوں آپ سیدی مولہ تک پہنچا دیں۔“

”ان کا مکان کھلا ہوا ہے جو چاہے جاسکتا ہے۔“

خان خانا نے جواب دیا۔

”میں چاہتا ہوں میرا ہاتھ تمام کر آپ لے جائیں۔“

”وہ کیوں؟“

”میں ان سے خصوصی تعلق کا متنی ہوں۔ آپ کے ساتھ جاؤں گا تو میری وقعت ہوگی۔“

جلال الدین کاشانی دوسرے دن کاٹنے کر کے اپنے گھر چلے گئے۔

خان خانا انہیں لے کر سیدی مولہ کے مکان پر پہنچ گیا اور ان کی تعریف ایسے الفاظ میں کی کہ سیدی مولہ ان کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

سیدی مولہ ملک جرجان سے فقیروں کے لباس میں دوسرے ملک میں آئے اور وہاں کے درویشوں اور صوفیوں سے ایک طویل عرصے تک فیضانِ قلبی حاصل کرتے رہے۔ یہاں سے فیض حاصل کرنے کے بعد وہ پھر اپنے وطن جرجان واپس چلے گئے۔ کچھ دن یہاں گزارنے کے بعد انہیں حضرت فرید خٹکؒ سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ آپ نے رخصت سفر باندھا اور اوجھن پہنچے جہاں بابا فریدؒ قیام پذیر تھے۔ بابا فرید کی روشن ضمیری نے دیکھ لیا کہ آنے والا کس پائے کا ہے۔ بڑی محبت سے خوش آئے اور مریدی کا اعزاز بخشا۔

سیدی مولہ بابا فرید کی سرپرستی میں سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ ایسی شدید محنت کی کہ خود ہیر کو مرید پر رشک آنے لگا۔ پھر اچانک سیدی مولہ کا دل اجدھن سے بھی اکھڑ گیا اور انہوں نے دہلی جانے کی اجازت طلب کی۔ ”تم شوق سے دہلی جاؤ، فقیروں اور درویشوں کی

کے نفع میں ہرزہ مرائی کیا ہی کرتے ہیں۔ اگر ہم آپ جیسے آقا کو کوئی گزند پہنچا دیں تو پھر ایسا شیعہ مالک ہمیں کہاں سے ملے گا اور اگر حضور ہمارے جیسے نمک خوار بیٹوں کو سزا دیں گے تو پھر ہم جیسے جاں نثار آپ کو کہاں سے ملیں گے۔“

ملک نصرت کے اس محبت آمیز جواب سے سلطان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان امراء کا اتنا سنگین جرم جس کی سزا موت بھی معاف کر دیا۔ اپنے ہاتھ سے شراب کے پیالے بھر بھر کے ان امراء کو دینے لگا۔

”میری جگہ اگر کوئی اور بادشاہ ہوتا تو وہ جہیں بری طرح قتل کرتا لیکن میں اس بڑھاپے میں غصے اور ظلم سے کنارہ کشی اختیار کر چکا ہوں۔ میں تم لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں کہ تمہیں شراب نوشی اور پیش کشی سے بالکل فرصت نہیں کہ دوسرا کوئی کام کر سکو۔ تم لوگوں کو میں معاف کرتا ہوں اور حکم دیتا ہوں کہ سب اپنی اپنی جاگیروں پر چلے جاؤ اور جب تک میں نہ بلاؤں یہاں مت آنا اور وہیں قیام کرنا۔“

جلال الدین کی نرم دلی نے لوگوں کی ہمتیں دراز کر دی تھیں۔ امراء عام طور پر یہ کہتے پھر رہے تھے کہ جب سلطان راہزنیوں تک کو سزا دینے کا روادار نہیں تو ہم پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کیسے ہوگی۔ یہ باتیں عام سنائی دے رہی تھیں کہ جلال الدین غلی نے حکومت تو حاصل کر لی ہے لیکن وہ حکومت کرنے کا اہل نہیں۔ وہ اراکین سلطنت جو جلال الدین کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے، ایسے سہارے ڈھونڈنے لگے جن سے کام لے کر وہ بادشاہ کو معزول کر سکیں۔ جب امراء کی چیرہ دستیوں بہت بڑھ گئیں اور سلطنت کا نظام تتر بتر ہو گیا تو شاہی ملازمین اور عوام نے سیدی مولہ نامی ایک بزرگ کی خانقاہ کا رخ کیا۔ سیدی مولہ ضرورت مندوں اور فقیروں کی روٹی کپڑے سے مدد کرتے تھے۔ مسافر اور غریب غراب روزانہ ان کی خانقاہ میں آتے اور اپنی اپنی ضروریات پوری کرتے۔ یہ خانقاہ سلطان بلبن کے زمانے سے موجود تھی لیکن جب جلال الدین تخت شاہی پر رونق افروز ہوا تو سیدی مولہ کی خانقاہ میں عوام کا ہجوم بھی پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ جلال الدین کا بڑا بیٹا خان خانا ان کا بے حد معتقد تھا۔ یہاں تک کہ اس نے سیدی مولہ کو اپنا منہ بولا باپ بتالیا اور ہر روز ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگا۔ دوسرے معززین اور امراء بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے دسترخوان سے ایسی ایسی نعمتیں کھاتے جو

آگئی۔ سیدی مولہ کے قتل کی خبر سنتے ہی وہ بیمار پڑ گیا تھا اور اب یہ بیماری بڑھتی جا رہی تھی۔ طبیب اس بیماری کی تفتیش سے عاری تھے۔ بس وہ بستر سے لگ گیا تھا اور اندر ہی اندر گھلتا جا رہا تھا۔ جلال الدین نے یہ خبر سن کر اسے بہار پور سے دہلی بلوایا لیکن حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

طبیب عاجز تھے کہ اس بیماری کو کیا نام دیا جائے۔ جلال الدین کے کانوں میں سیدی مولہ کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ”اس کا وبال تم پر اور تمہاری اولاد پر ضرور آئے گا۔“

”کہیں یہ اسی بددعا کا نتیجہ تو نہیں؟“ جلال الدین نے خود کلامی کی۔

اس نے اسی رات بھیس بدلا اور کسی کو ساتھ لیے بغیر سیدی مولہ کی خانقاہ پہنچ گیا۔ خانقاہ کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو دروازہ کھل گیا۔

”بھائی، میں قریب کے گاؤں سے آیا ہوں۔ سیدی مولہ کا مرید ہوں۔ ان سے ملنے آیا تھا لیکن یہاں آکر تو کچھ اور ہی معلوم ہوا۔ ان سے ملاقات نہیں ہوئی تو ان کی قبر پر فاتحہ ہی پڑھ لوں۔ کیا تم مجھے اندر نہیں آنے دو گے؟“

آنے والے نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو اور پھر دروازہ کھول دیا۔

جلال الدین، بادشاہ وقت، سر سے پاؤں تک کسی دیہاتی کا روپ دھارے سیدی مولہ کی قبر پر کھڑا تھا۔

”میں کسی مسلمان کا خون بہانے کا روادار نہیں۔ میں نے تو مجرموں کو بھی معاف کیا ہے۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں آپ کے قتل کے احکام جاری کرتا۔ یہ سب میرے بیٹے ارکلی خاں کی جلد بازی کا نتیجہ ہے۔ میرے ہاتھ صاف ہیں۔ میرا بیٹا اختیار الدین آپ کا عقیدت مند تھا۔ آپ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس حادثے کے بعد وہ بیمار پڑ گیا ہے۔ اب تو سلسلے بے ہوش ہے۔ وہ میرا ولی عہد ہے۔ میں آپ سے اس کی زندگی کی بجائے مانگتا ہوں۔ میرے گناہوں کی سزا اسے کیوں مل رہی ہے۔ اگر یہ سب آپ کی بددعاؤں سے ہو رہا ہے تو مجھے معاف کریں اور اگر اللہ کی یہی مرضی ہے تو میں راضی ہر ہوا ہوں۔“

وہ فاتحہ پڑھ کر سیدی مولہ کے حجرے سے باہر نکلا تو مریدوں نے اسے گھیر لیا۔

”خام جلال الدین نے ہمارے مرشد کو قتل کر دیا۔ یہ ایسا فعل بد ہے کہ اس کی سزا اسے ضرور ملے گی۔ جس سلطنت پر وہ اکڑتا ہے وہ سلطنت ہی باقی نہیں رہے گی۔“

جلال الدین نے اس قہر کو مزید پھینکنا مناسب نہ سمجھا لاکھ ارکلی خاں اس پر بھڑکے سیدی مولہ کی لاش کو ان کے حجرے سے نکال کر کہیں اور دفن کر دیا جائے۔

ابھی اس واقعے کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ جلال الدین کا بڑا بیٹا اختیار الدین خان خانان کی بیماری کی خبر

ثابت نہ ہو سکا لیکن بادشاہ کے نزدیک سیدی مولہ کا وجود خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جلال الدین نے آخری جھٹ پوری کی کہ شاید کوئی صورت نکل آئے۔ اس نے شیخ ابوبکر طوسی حیدری اور ان کے ساتھ دوسرے درویشوں کو کوٹشک کے قریب بلا دیا اور ان سے کہا۔

”ذرا دیکھو تو کسی کہ اس درویش سیدی مولہ نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا اور میرے ملک میں بد امنی اور فساد پھیلانے کے کیا منصوبے تیار کیے ہیں۔ میں انصاف تم لوگوں کے سپرد کرتا ہوں۔ تم جو مناسب سمجھو، فیصلہ کرو اور مجھے مطمئن کرو۔“

یہ سنتا تھا کہ ایک درویش نہایت بے باکی سے آگے بڑھا۔ اس کے پاس استر تھا جس سے اس نے سیدی مولہ کے جسم پر کٹی گھاؤ لگا دیے۔

”یہ تو نے مجھے زخمی نہیں کیا جلال الدین کی سلطنت کو زخمی کر دیا ہے۔“ سیدی مولہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اس کے بعد وہ بادشاہ سے مخاطب ہوا۔

”مجھے اپنے مرنے کا غم نہیں لیکن یاد رکھو کہ میرا لہو ایک نہ ایک دن رنگ لا کر رہے گا۔ اس کا وبال تم پر اور تمہاری اولاد پر ضرور آئے گا۔“

یہ کلمات سن کر جلال الدین سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ چاہتا تھا کہ آگے بڑھے اور سیدی مولہ کو درویشوں سے چھڑالے۔ اسی وقت اس کے بڑے بیٹے ارکلی خاں نے کوٹشک کے اوپر سے قتل بان کو اشارہ کیا۔ یہ اشارہ پاتے ہی قتل بان نے اپنے مست ہاتھی کو سیدی مولہ پر چھوڑ دیا۔

بادشاہ ابھی پوری طرح سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ اس دیوبند کے جانور نے آٹا فانا سیدی مولہ کو کھل کر رکھ دیا۔

جلال الدین کا بڑا بیٹا خان خانان سیدی مولہ کا عقیدت مند تھا اور ان کی خانقاہ میں وقت گزارا کرتا تھا۔ ارکلی خاں کو یہ سخت ناگوار تھا۔ ارکلی خاں نے خان خانان کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سیدی مولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

”ارکلی خاں! یہ تو نے کیا کر دیا۔“ جلال الدین زور سے گرجا۔

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ اس قہر کو کسی دن تو ختم ہونا ہی تھا۔ میں نے آج ختم کر دیا۔ سیدی مولہ جب تک زندہ رہتا آپ کے دشمنوں کو آپ کے خلاف بھڑکا رہتا۔ میں نے سازشوں کا دروازہ بند کر دیا۔“

”تو نے سازش کا نہیں، میری کامیابی کا دروازہ بند کر کے جو بات بھی نہایت دلیری سے دیے۔ سازش کا جرم

سیدی مولہ، قاضی کا شانی اور دوسرے لوگوں کو گرفتار کر کے بادشاہ کے حضور پیش کر دیا گیا۔ بادشاہ نے ان قیدیوں سے سازش کی بابت دریافت کیا۔ ان لوگوں نے اس قسم کے کسی بھی معاملے کے وجود سے صاف انکار کر دیا۔

بادشاہ کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا جس سے وہ ان لوگوں کو قاتل گردیتا لہذا اس نے حکم دیا کہ بہار پور کے جنگل میں ایک بہت بڑی آگ روشن کی جائے اور سیدی مولہ، قاضی کا شانی، برجن کووال اور تنھائی پھلون ننگے پاؤں اس پر سے گزریں۔ اگر سچے ہیں تو آگ کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔

اس حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے سیدی مولہ آگے بڑھے۔ قرآن کی آیات پڑھتے جاتے تھے اور نہایت دلیری سے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ جلال الدین بھی قریب کے خیمے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے یہ حال دیکھ کر رحم آگیا۔ اس نے چند علما کو اپنے پاس بلا دیا۔

”آپ لوگ شریعت کی روشنی میں وضاحت فرما میں کہ میرا یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں؟“

علمائے کرام نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔

”جلانا آگ کی فطرت ہے۔ کوئی بھی شخص خواہ وہ جھوٹا ہو یا سچا..... اگر وہ آگ میں گورے گا تو آگ اس کو جلا دے گی۔ اس قسم کے معاملات کا فیصلہ آگ کے ذریعے کرنے کی اسلام نے اجازت نہیں دی۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اس ارادے سے باز رہیں۔“

یہ سن کر جلال الدین اپنے ارادے سے باز آگیا اور اس نے آگ بجھانے کا حکم دے دیا۔

آگ بجھا دی گئی تھی لیکن سزا میں تو ابھی باقی تھیں۔ قاضی جلال کو جو اس قتلے کا بانی تھا، ہڈیوں کا قاضی مقرر کر کے وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ خان زادوں اور ملک زادوں کو بھی جلا وطن کر کے اطراف کے علاقوں میں بھیج دیا اور ان کی املاک ضبط کر لی گئیں۔ برجن..... اور

بتیا پالک کو جنہوں نے بادشاہ کو قتل کرنے کی ذمہ داری لی تھی، قتل کر دیا گیا اور سیدی مولہ کو اپنے ساتھ لے کر کوٹشک

محل لے جایا گیا۔ بادشاہ خود کو کوٹشک میں قیام پذیر ہوا اور سیدی مولہ کو کوٹشک کے پاس ہاتھ باندھے ہوئے ٹھہرے رہنے کا حکم دیا۔

جلال الدین نے سازش کے بارے میں سید صاحب سے سوالات کیے۔ سیدی مولہ نے ان سوالات کے جوابات بھی نہایت دلیری سے دیے۔ سازش کا جرم

”اتنی اہم بات ہم نے دوسروں کی زبانی سنی، آپ تو ہمیں اب بتا رہے ہیں۔“

”ہمیں ملکی معاملات سے فرصت ہی کہاں مل رہی تھی۔“

”ارنگی خاں تو یہاں ہے نہیں۔ کیا اسے خط لکھ دیا ہے کہ وہ دہلی آکر آپ کی نیابت کے فرائض انجام دے؟“

”ہمیں اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ ہم نے علاؤ الدین کو ولی عہد مقرر کیا ہے۔“

”بچے کے ہوتے ہوئے کیسے کیسے؟“

”ارنگی خاں بہادر سپاہی ضرور ہے لیکن حکمرانی کے لائق نہیں۔ وہ بادشاہ بن گیا تو مسلمانوں کا خون بہاے گا۔“

”اس نے سیدی مولہ کو قتل کیا کر دیا، سب مسلمانوں کا قاتل ہو گیا۔“

”علاؤ الدین کو بھی تو میں نے بیٹوں کی طرح پالا ہے۔“

”مگر بیٹا تو نہیں ہے۔ اگر اس کو ولی عہد بنانا اتنا ہی ضروری ہے تو ارنگی خاں کو موت کے گھاٹ اتار دو۔“

”اپنے ہی بیٹے کو مار دوں۔“

”یہ مارنا ہی ہوا کہ بیٹا ہوتے ہوئے باپ کے تخت سے محروم رہے۔“

”آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں رعایا کی بھلائی چاہتا ہوں۔“

”میں اپنے بیٹے کی خوشی چاہتی ہوں۔“

اس کے بعد کوئی بحث نہیں کی جاسکتی تھی۔ جلال الدین کی نرم خوئی نے کام دکھایا اور اسے ملکہ جہاں کی بات مانتی پڑی۔ ارنگی خاں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا اور شاہی لوازمات سے سرفراز کر کے دہلی میں چھوڑا اور خود رن حصہ نور کی طرف بڑھ گیا۔

رن حصہ نور کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اس نے ”جہاں“ کو گرجا دیا اور وہاں کے بعض بت خانوں کو تاراج کیا، بتوں کو توڑا اور جلایا۔ یہاں اس کو بہت سامانی قیمت ملا۔ اس کی آمد کا سن کر رن حصہ نور کا رانا اپنے رادوؤں، مقدموں، سربراہان و دروہ لوگوں اور عورتوں اور بچوں کے ساتھ قلعہ بند ہو گیا۔

جلال الدین نے رن حصہ نور کو بھیجے ہی حکم دیا کہ قلعہ گیری کی تیاری شروع کی جائے۔ اس نے حکم تو دے دیا تھا لیکن قلعہ کی مضبوطی دیکھ کر حیران تھا۔ یہ قلعہ دو پہاڑوں کے درمیان واقع تھا۔ محل وقوع ایسا تھا کہ پہاڑ کے نیچے سے نظر ہی نہ آتا تھا جب تک کہ پہاڑ پر چڑھنا نہ جائے۔ پہاڑ پر

”اس میں کتنی صداقت ہے؟“

”میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔“

”سنی سنائی باتوں کا کیا بھروسہ۔“

”میں نے تو یہ باتیں آپ کے کانوں میں اس لیے ڈال دیں کہ سلطان معظم آپ سے ضرور تذکرہ کریں گے۔ آپ پہلے ہی سے اپنا ذہن تیار فرمائیں۔“

”ٹھیک ہے۔ ایسی کوئی بات ہوئی تو میں بھرپور مخالفت کروں گی۔“

جلال الدین بھی ہمدردوں سے مشورے میں مصروف تھا۔

شہر میں یہ چرچا عام تھا کہ جلال الدین نے سیدی مولہ جیسے درویش کو قتل کر کے سخت غلطی کی ہے۔ اس کا عذاب اس کی اولاد پر ٹوٹے گا۔ دشمنوں نے یہ افواہ بھی پھیلا دی تھی کہ سلطان اسلام سے پھر گیا ہے۔ اسے درویشوں تک کا خیال نہیں۔ سلطان ملہن دشمنان اسلام کے خلاف ہمیشہ نبرد آزما رہتا تھا۔ اسے کبھی توفیق نہیں ہوئی کہ راجپوتوں یا ہندوؤں کے خلاف جنگ کے لیے نکلتا۔

یہ باتیں جب تو اس نے سوچا اس موقع پر وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دے جس سے لوگوں کا دھیان بھی بنے اور لوگ اسے اسلام دوست بھی سمجھنے لگیں۔ یہ داغ اسی وقت مٹ سکتا تھا جب وہ کسی مقام پر ہندو راجپوتوں سے ٹکرائے اور ان کے علاقے کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لے۔ اس نے سوچا کہ ہندو راجپوتوں کی بہادری ضرب الملش ہے۔ ان سے ٹکرایا جائے اور ان کے قلعہ رن حصہ نور پر قبضہ کر لیا جائے تو مزید علاقوں کی فتح کے دروازے بھی کھل جائیں گے۔ اس کی رعایا پر اس کی دھاک بھی بیٹھے گی۔ خوب اچھی طرح سوچنے کے بعد اس نے جہاد کا اعلان کر دیا اور سرداروں کو کئی بھرتیاں کرنے کا عام اعلان بھی کر دیا۔

جہاد کا اعلان ہوتے ہی ملکہ جہاں کو کنیز کی بات یاد آگئی۔ جب بادشاہ فوج کشی کے لیے روانہ ہوگا تو دہلی میں اپنا نائب مقرر کر کے روانہ ہوگا۔ اصولاً ارنگی خاں کو نائب مقرر ہونا چاہیے لیکن کنیز کے مطابق بادشاہ اپنے پیچھے علاؤ الدین کو ولی عہد مقرر کرنے کا ارادہ کر چکا ہے۔

وہ اس وقت کا انتظار کر رہی تھی کہ جب جلال الدین خود یہ ذکر چھیڑے۔ آخر وہ وقت آئی گیا۔ جلال الدین نے خود ذکر چھیڑا۔

”ہم مغرب رن حصہ نور کی طرف روانہ ہونے والے ہیں۔“

کا نشہ گہرا ہوا تو اس نے کیچے پر سر رکھ دیا۔

☆☆☆

سیدی مولہ کے قتل کے بعد ہی جلال الدین کے زوال کے آثار شروع ہو گئے۔ ہر روز طرح طرح کے واقعات پیش آنے لگے۔ دل میں ایسا وہم بیٹھ گیا تھا کہ جو واقعہ بھی پیش آتا، اسے سیدی مولہ کی بددعا سے تعبیر کیا جاتا۔ پھر وہ دل خراش خبر آگئی جس نے دروہ بام کو ہلا کر رکھ دیا۔ جلال الدین کے بڑے بیٹے اختیار الدین خان خانان کا انتقال ہو گیا۔ اختیار الدین نہایت سعادت مند شہزادہ تھا۔ ولی عہد تھا۔ حکمرانی کے آثار اس کے چہرے سے ظاہر تھے۔ وہ سیدی مولہ کے شوق میں گرفتار تھا۔ ان کے قتل کا ایسا صدمہ ہوا کہ جاں سے گزر گیا۔

اختیار الدین کی موت کا سبب سیدی مولہ کا عشق تھا لیکن محل سے لے کر عوام تک اسے سیدی مولہ کی بددعا کا نتیجہ سمجھا گیا۔ یہ ایسا غلطی نہیں تھا کیونکہ سیدی مولہ نے کہا تھا۔ ”اس کا وبال تم پر اور تمہاری اولاد پر آئے گا۔“ اس بددعا کا ایک پہلو یہ بھی سامنے نظر آ رہا تھا کہ اب حکومت ارنگی خاں کے ہاتھ میں جاسکتی تھی جو ہرگز حکومت کے لائق نہیں تھا۔ سلطان نے اس کے ازالے کے لیے اپنے پیچھے علاؤ الدین کو ولی عہد مقرر کرنے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ ملکہ جہاں کی طرف سے اس کی مخالفت کی جائے گی۔ اس ارادے کا ذکر اس نے اپنے کئی امیروں سے بھی کر دیا اور بات باہر نکل گئی۔

ایک کنیز جس نے یہ باتیں کہیں سے سن لی تھیں، انعام کے لالچ میں ملکہ جہاں کے پاس پہنچ گئی۔

”میں نے کچھ ایسی باتیں سنی ہیں جو آپ تک پہنچانا ضروری ہیں۔“

”اگر یہ باتیں میرے مطلب کی ہوئیں تو میں تیرا منہ مٹوئیں سے بھردوں گی۔“

”یہ بتائیے کہ اگر بڑے بیٹے کا انتقال ہو جائے تو ولی عہد کے بنایا جائے؟“

”اگر ایک اور بیٹا ہے تو یہ حق اسے پہنچانا چاہیے۔“

”شہزادہ ولی عہد کے انتقال کے بعد شہزادہ ارنگی خاں اس عہدے سے حق دار ہوتے۔“

”بالکل۔“

”لیکن سلطان معظم کی زبان پر تو کچھ اور باتیں ہیں۔ وہ اپنے پیچھے علاؤ الدین کو ولی عہد بنانے کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ جلال الدین کے حکم سے نہ ہوا ہو۔“ جلال الدین نے کہا۔

”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہمیں تو یہ لگتا ہے کہ اس عمر میں وہ اسلام ہی کے خلاف ہو گیا ہے۔ جو درویشوں کی قدر نہیں کرتا، وہ عام مسلمانوں کی بھلائی کیا سوچے گا۔“

جلال الدین نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور خانقاہ سے باہر نکل آیا۔ سیدی مولہ کے مریدوں کی آوازیں اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا محل تک آ گیا۔ پھر سے داروں نے بھی ایک دیہاتی کوکل کے سامنے کھڑے ہوئے دیکھا لیکن جلد ہی انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ دیہاتی نہیں خود جلال الدین ہے۔ یہ چند بیگونیوں بڑی دیر تک ہوتی رہیں کہ سلطان کو ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تھی کہ اسے ہمیں بدل کر محل سے باہر جانا پڑا۔

جلال الدین نے راہداروں کو پار کیا۔ کوکل محل کے دروازوں پر رکھے ہوئے شادیانوں پر چوٹ پڑی۔ اس کا مطلب تھا سلطان تشریف لارہے ہیں۔ ملکہ جہاں نے بستر پر پڑی ٹھکنوں کو درست کیا۔ کنیزیں شادیانوں کی آوازیں سن کر خود بخود کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ایک جانی پہچانی خوشبو نے ملکہ جہاں کو مجبور کر دیا کہ وہ دروازے کی طرف دیکھے۔ دروازے پر سلطان ہی کھڑا تھا لیکن اس کے بدن پر دیہاتیوں کا لباس تھا۔

”سلطان وقت! کیا آپ نے بادشاہی کو خیر باد کہہ دیا ہے کہ دیہاتیوں کا لباس زیب تن فرمایا؟“

”تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ ہم بہت پیاسے ہیں۔ ہمارا حلق تر کر دیجیے۔“ جلال الدین نے بستر پر بیٹھے ہوئے کہا۔

ملکہ جہاں نے تپائی پر رکھی صراحی سے شراب انڈلی، جام بنایا اور سلطان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

”آپ کی پریشانی ہم سے دیکھی نہیں دیکھی جا رہی ہے۔“

”آپ نے سیدی مولہ کے قتل کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے۔“

”اپنی پریشانی ہم سے خود بھی نہیں دیکھی جا رہی ہے۔“

”ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری سلطنت میں فتنہ آتا جا رہا ہے۔ ارنگی خاں نے ہمیں بہت دکھ پہنچایا ہے۔ اختیار الدین کی بیماری سے بھی ہم بہت پریشان ہیں۔“

”شاہی طبیب اس کے علاج معالجے میں مصروف ہیں۔“

ان باتوں کے درمیان وہ کئی جام ختم کر چکا تھا۔ اس

جاگیر کی آمدنی سے ایک نیا لشکر تیار کروں اور پھر ان راجاؤں کو شکست دے کر ان کی دولت شاهی خزانے میں جمع کر دوں۔“

جلال الدین نے لالچ میں آکر بغیر سوچے سمجھے اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی وہ دیوگیری کی طرف روانہ ہو گیا اور مشہور یہ کیا کہ مضافات چندیری کی لوٹ مار کے لیے جا رہا ہے۔

ایک عرصے تک بادشاہ دہلی جلال الدین کو علاؤ الدین کی کوئی خبر نہ ملی البتہ علاؤ الدین کا نائب جو اس کی موجودگی میں فرائض انجام دے رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ علاؤ الدین چندیری کی غارت گری میں مصروف ہے۔ چھ ماہ اسی طرح گزر گئے، علاؤ الدین کا ایک خط بھی بادشاہ کی خدمت میں نہ آیا۔ اسی زمانے میں علاؤ الدین کی بغاوت کی افواہ پھیل گئی۔ یہ افواہ دہلی کے چہرے بڑے کی زبان پر تھی لیکن جلال الدین نے ان افواہوں پر کان نہ دھرا اور علاؤ الدین کی طرف سے قطعاً بدگمان نہ ہوا۔

جلال الدین کو اطلاعات موصول ہوئیں کہ علاؤ الدین نے دیوگیری (دیوڑھ) فتح کر لیا ہے لیکن علاؤ الدین کی طرف سے اب بھی کوئی اطلاع نہ آئی۔ جلال الدین کی فکر مندی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے بہت سے ایسے واقعات سنے تھے کہ مال غنیمت کے چمکڑوں میں امرائے کبار نے بغاوت کر دی تھی۔ جلال الدین کے بالغ نظر مقررین بھی اس نتیجے پر پہنچ رہے تھے کہ علاؤ الدین نے کثیر دولت حاصل کر لی ہے۔ اب وہ یقیناً بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا۔ وہ بغاوت کا راستہ اس لیے بھی اختیار کرے گا کہ ملکہ جہاں اور اس کے درمیان رنجش ہے لیکن یہ لوگ یہ بات بادشاہ کے سامنے نہیں کہہ سکتے تھے۔

سخت گرمی میں بارش کے قطرے کی طرح یہ خبر آئی کہ علاؤ الدین تمام مال غنیمت کے ساتھ کڑھ سے دہلی کی طرف آ رہا ہے۔

یہ خبرن کر جلال الدین نے اپنے مشیروں سے تنہائی میں مشورہ کیا کہ علاؤ الدین دیوڑھ سے اس قدر مال و دولت اور ساز و سامان وغیرہ لے کر آ رہا ہے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا رہوں یا آگے بڑھ کر استقبال کروں؟

امیر ملک حبیب بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ وہ کڑوی سے کڑوی بات بادشاہ کے منہ پر کہہ دیا کرتا تھا، اس مرتبہ بھی خاموش نہ رہا۔

لکھ دیا کہ وہ دہلی آنے کی ہرگز کوشش نہ کرے اور ملکہ جہاں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ اس نے علاؤ الدین کو گرفتار کرنے کی پوری تیاری کر لی ہے۔ اس کے بعد اس نے ارگلی خاں کو ملتان کا حاکم بنا کر بھیج دیا تاکہ وہ ملکہ جہاں سے دور ہو جائے اور کوئی سازش تیار نہ ہو سکے۔

ابھی وہ ان اندرونی سازشوں میں گھرا ہوا تھا کہ ایک بیرونی جنگ میں الجھنا پڑ گیا۔ ہلاکو خاں کا ایک نواسہ ایک لشکر جرار سے کرہندوستان پر حملہ آور ہو گیا۔ رن جنہو رکوخ نے کرنے کا غصہ ابھی تک اس کے دل میں بھرا ہوا تھا۔ غصہ اتارنے کا یہ موقع خود بخود اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے بھی ایک لشکر جرار تیار کیا اور آگے بڑھا۔ ایک بہت بڑے میدان میں دونوں فوجوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ لڑائی کا آغاز ہوا اور دونوں لشکروں کے درمیان معرکہ آرائی ہوئی۔ گھسان کا رن پڑا اور بالآخر مغلوں کے مقابلے میں غلیوں کو فتح نصیب ہوئی۔ بے شمار غنیمتوں کے گھاٹ اتار دیے گئے اور چند نامی گرائی سرداروں کو زندہ گرفتار کر لیا گیا۔

اس دوران کچھ صلح پسند لوگوں نے فریقین کے درمیان صلح کی بات چیت اٹھائی۔ یہ بات چیت کامیاب رہی اور جلال الدین غلی اور مغلوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ مغلوں کا لشکر اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔

ابھی جلال الدین اس فتح کا جشن منا رہا تھا کہ اس کے پیچھے علاؤ الدین کا خط موصول ہوا جو اس وقت کڑھ کا حاکم تھا۔ اس نے اس خط میں ”تہاسہ“ پر چڑھائی کی اجازت طلب کی تھی۔ بادشاہ خود بھی یہ چاہتا تھا کہ علاؤ الدین مہمات میں گھرا رہے اور دہلی کا رخ نہ کرے۔

علاؤ الدین نے تہاسہ پر حملہ کیا اور خوب تباہی مچائی اور بے پناہ مال غنیمت بادشاہ کی خدمت میں روانہ کیا۔ بادشاہ نے اس کی خدمات کو سراہا اور شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کر کے اسے اودھ کے صوبے کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس فتح کے بعد علاؤ الدین کچھ اور سوچنے لگے۔ اس نے سوچا وہ دہلی سے دور رہے اور دوردراز کا سفر کرتا رہے تاکہ ملکہ جہاں کی سازشوں سے بچا رہے۔ اسے جلال الدین پر بھی زیادہ بھروسہ نہیں رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ ملکہ جہاں کے اثر میں ہے۔ اس کے بھڑکانے پر وہ کسی بھی وقت مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے بادشاہ کے نام خط لکھا۔

”چندیری کے آس پاس کے علاقوں میں بہت سے دولت مند ہندو راجا آباد ہیں۔ اگر اجازت ہو تو میں اپنی

ضرور ہے کہ تیرے بتائے ہوئے طریقہ کار سے بادشاہوں کا رعب عوام پر قائم ہو جاتا ہے لیکن وہ انسان کو اسلام سے اس طرح باہر نکال دیتا ہے جیسے بال غیر میں سے گزر جاتا ہے۔ پس جو میں کہتا ہوں اور کرتا ہوں، وہ مسلمان ہونے کے لحاظ سے کرتا ہوں اور اسی کا متلاشی رہتا ہوں۔“

امیر ملک حبیب بادشاہ کے یہ تہور کچھ کرسمس سا گیا۔ ”بادشاہ کی مہربانیوں نے مجھے گستاخ کر دیا ہے۔ میرے لیے بار بار فرمان ہوا ہے کہ بادشاہ کی حکومت اور دولت کی خیر خواہی کے لیے جو بھی مجھے معلوم ہو، وہ میں اسی وقت عرض کر دوں۔ اس موقع پر بھی کہ آپ رن جنہو رکوخ کے بغیر واپس جا رہے ہیں، میں یہ دیکھتا ہوں کہ لوگوں کے دلوں سے آپ کے احکامات کا اثر کم ہو جائے گا۔ آپ اسلام کی خدمت کے لیے نکلے تھے اور کافروں کو ان کے حال پر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اس سے میرا دل جل رہا ہے اور جو کچھ میرے دل میں آیا، میں نے عرض کر دیا۔ میرا کہنا تو یہ ہے کہ آپ سلطان محمود اور سلطان سنجر کا اتباع کیوں نہیں کرتے۔“

اس کی یہ باتیں سن کر بادشاہ ہنسا اور اس کی اصلاح کی۔ ”اے لڑکے، سلطان محمود اور سلطان سنجر کے سلاح دار اور رکاب دار ہم سے بہتر تھے۔ ہمارے لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس چند روزہ بادشاہی میں جو عاریتاً ہمارے پاس آگئی ہے، اپنے دل میں یہ خیال بھی لائیں کہ ہم بھی وہی کریں گے جو ان راست باز فاتحوں نے کیا ہے۔“

ملکہ حبیب جب مجلس سے اٹھنے لگا تو وہ سلطان کے قدموں میں گر پڑا اور عرض کیا۔

”جن حقائق کو علما اور عقلمندوں نے پسند کیا، وہ وہی ہیں جو خداوند عالم کے دل میں آئے ہیں۔ میں جو ان ہوں اور آپ کی مہربانی سے اس مرتبے پر پہنچا ہوں اس لیے میرے دل میں یہ خیالات آتے ہیں کہ ایسا ہو اور جلد ہو جائے۔“

چڑھتا اس لیے دشوار تھا کہ فصیلوں سے تیروں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔ نظریں نہ آتا تھا کہ تیرس طرف سے آتے ہیں جبکہ نیچے سے تیر چلائے جاتے تھے تو قلعے تک پہنچتے ہی نہیں تھے۔ اس قلعے کی فتح صرف اسی وقت ممکن ہو سکتی تھی جب پہاڑ کے اوپر پہنچا جائے۔ یہ صورت حال دیکھ کر اس نے ارکان دولت کو جمع کیا اور ان سے خطاب کیا۔

”میں چاہتا تو یہی ہوں کہ قلعے کا محاصرہ کروں۔ اس کے لیے مزید فوج بلواؤں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بھی لشکر طلب کروں لیکن قلعے کی مضبوطی یہ بتا رہی ہے کہ اس قلعے کو فتح کرنے میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شہید ہو جائے گی۔ میں اس جیسے دس قلعوں کے مقابلے میں بھی مسلمانوں کا بال بیکا ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ مال و اسباب جو اتنے مسلمانوں کے مرنے کے بعد ملے گا، دنیا میں میرے کس کام کا۔ اس وقت جبکہ ان مرے ہوئے مسلمانوں کی بیوائیں اور یتیم بچے میرے سامنے آکر کھڑے ہوں گے تو جو کچھ بھی اسی قلعے سے مجھے حاصل ہوگا، وہ میرے لیے زہر سے زیادہ مضر ہوگا۔“

”تو کیا یہ سمجھا جائے کہ آپ محاصرہ اٹھانے اور واپسی کا حکم دے رہے ہیں؟“ اس کے منہ پر چھ امیر ملک حبیب نے وضاحت چاہی۔

”تم نے بالکل صحیح سمجھا بلکہ میں وضاحت کر چکا۔“

”گستاخی معاف، مہمات سے اس خوف سے جان چھڑانا کہ سپاہیوں کی جائیں تلف ہوں گی، آئین جہانگیری کے خلاف ہے۔“

سلطان نے بھی ترکی پر ترکی جواب دیا۔

”فی الحال کھنوتی جانے کا ارادہ ترک کرنا چاہیے۔ بادشاہ اکیلا آ رہا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ پہلے اس کا کام تمام کیا جائے۔ اس کے بعد جب ارکلی خاں تخت نشین ہو کر ملکی انتظامات کی طرف توجہ کرے گا، ہم کھنوتی پر لشکر کشی کر کے بنگالہ پر قبضہ کر لیں گے۔“

علاء الدین نے اس رائے کو پسند کیا اور کڑھ ہی میں رکارہا۔

ملک حبیب ایک مرتبہ پھر آڑے آیا اور بادشاہ کو روکنے کی کوشش کی۔ دوسرے امیروں نے بھی سمجھایا کہ وہ کڑھ نہ جائے لیکن جلال الدین دولت کے لالچ میں بری طرح حواس باختہ تھا۔ وہ صرف پانچ سو سواروں کے ساتھ کئی کے ذریعے روانہ ہو گیا البتہ ملک حبیب کو یہ حکم دے دیا کہ وہ لشکر کو اپنے ساتھ لے کر خشکی کے راستے کڑھ پہنچے۔

علاء الدین کو جب بادشاہ کی روانگی کی خبر ملی تو اس نے دریائے گنگا کے پار تارے اپنے لشکر کے ساتھ ڈیرے ڈالے۔ جب شاہی چتر دور سے پانی پر نظر آیا تو علاؤ الدین کے لشکر نے بظاہر شان و شوکت کے اظہار کے لیے خود کو سرخ کر لیا لیکن دراصل مقصد کچھ اور تھا۔

علاء الدین نے اپنے بھائی الماس بیگ کو بادشاہ کے استقبال کے لیے روانہ کیا اور اسے ہدایت کی کہ جس طرح بھی ممکن ہو، بادشاہ کو اس کے ساتھیوں سے الگ کر کے تنہا کنارے پر لایا جائے۔ الماس بیگ اسی وقت روانہ ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

عرض کیا۔ ”اگر میں ایک دن بھی تاخیر سے پہنچتا تو علاؤ الدین خود کئی کرچکا ہوتا۔ اس نے میرے سمجھانے کے باعث خود کئی تو نہیں لی لیکن اس کے دل میں ابھی تک خوف باقی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آپ کے ساتھ آپ کے ساتھیوں کو دیکھ کر یہاں سے فرار ہو جائے۔ اگر آپ اس سے تہاہل کما سے تسلی دیں تو وہ مطمئن ہو جائے گا۔“

یہ سن کر بادشاہ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ سب کشتیوں میں بیٹھے رہیں اور خود چند مصاحبوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ الماس بیگ کو یہ بھی ناگوار تھا کہ یہ چند مصاحب بھی اس کے ساتھ کیوں ہیں۔

جلال الدین کی کشتی نے ابھی ٹھوڑا ہی راستہ طے کیا تھا کہ الماس نے عرض کیا۔

”یہ چند مصاحب جو آپ کے ساتھ ہیں، انہیں بھی خود سے جدا کر دیں۔ ورنہ ان لوگوں کو دیکھ کر علاؤ الدین کسی

دوسروں سے انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران میں علاؤ الدین کا بھائی الماس جو بادشاہ کا داماد بھی تھا، جلال الدین کے دل میں اپنے بھائی علاؤ الدین کی محبت کے نقوش گہرے کر رہا تھا۔ بادشاہ سے بار بار کہتا۔ ”بادشاہ سے علاؤ الدین کی ناراضی کی خبر بہت مشہور ہو گئی ہے۔ اس لیے مجھے یہ خوف ہو گیا ہے کہ کہیں میرا بھائی ندامت کی وجہ سے خودکشی نہ کر لے۔“

یہی الماس بیگ پوشیدہ طور پر علاؤ الدین سے خط کتابت کر رہا تھا۔ اسی کے کہنے پر علاؤ الدین نے ایک خط الماس بیگ کے نام لکھا۔

”اگر تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہو کہ بادشاہ میری جان کا دشمن ہے اور مجھے تل کرنا چاہتا ہے تو فوراً مجھے لکھو تا کہ میں نہر کھا کر اپنے آپ کو ختم کر لوں۔“

الماس بیگ نے منصوبے کے مطابق یہ خط بادشاہ کے سامنے رکھ دیا اور ایسی خوشامد نہ گفتگو کی کہ اسے خط کے مضمون پر پورا یقین آ گیا۔

جب الماس بیگ نے علاؤ الدین کو خط لکھ دیا کہ اس نے بادشاہ کو یقین دلادیا ہے تو علاؤ الدین نے الماس کے نام ایک اور خط لکھا جو بادشاہ کو نہیں دکھانا تھا۔

”اگر بادشاہ دولت کے لالچ میں کسی طرح تنہا چلا آئے تو ہمارا کام بن جائے۔“

اس خط کے موصول ہونے کے چند دن بعد الماس نے پھر بادشاہ سے ملاقات کی اور آنکھوں میں آنسو بھر کے کہنے لگا۔

”بہتر یہی ہے کہ حضور کیلئے ہی ”کڑھ“ کا سفر اختیار کریں۔ اس سے پہلے کہ میرا بھائی خودکشی کرے، آپ وہاں جا کر اسے تسلی دیں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم جاں نثار پہلے سے زیادہ آپ کے ممنون احسان ہوں گے۔“

بادشاہ، الماس بیگ کی باتوں میں آ گیا۔ علاؤ الدین کی طرف سے ایسا فکرمند ہوا کہ اسی وقت الماس کو حکم دیا۔

”تم جلد از جلد ”کڑھ“ روانہ ہو جاؤ اور وہاں پہنچ کر علاؤ الدین کو میری طرف سے دلاسا دو اور اطمینان دلاؤ۔ میں بھی جلد ہی پہنچوں گا۔ خبردار..... وہ خودکشی نہ کرنے پائے۔“

الماس کو اور کیا چاہیے تھا۔ حکم ملتے ہی کئی میں سوار ہوا اور سات روز کے سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچ گیا۔

دونوں بھائیوں کی ملاقات ہوئی۔

”خدا کا شکر ہے تیرے نشانے پر لگا۔“ الماس بیگ نے کہا۔

”اب کھنوتی کا سفر ضروری ہے یا نہیں؟“ علاؤ الدین نے اسی سے مشورہ چاہا۔

جلال الدین بھی ملک حبیب پر چراغ پا ہو گیا اور ملک کو چچی کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

”تم ہمیشہ ہی علاؤ الدین کی طرف سے بدگمان رہتے ہو۔ میں نے اسے آغوش میں پیلا ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ میرے حقیقی بیٹے میرے مقابلے پر اتر آئیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ علاؤ الدین میرے مقابلے پر اتر آئے۔“

ملک حبیب یہ کلمات سن کر سخت رنجیدہ ہوا اور بغیر کوئی بات کے مجلس سے اٹھ گیا۔

”عجب احمق بادشاہ ہے، اپنے ہاتھوں اپنے لیے گڑھا کھود رہا ہے۔“ یہ ملک حبیب کے دل کی آواز تھی جو دل میں ہی رہ گئی۔ وہ کسی سے نہ کہہ سکا۔

کوئی فیصلہ نہ ہو سکا اور بالآخر علاؤ الدین کا خط بنام جلال الدین آ گیا۔

”میں 31 تھی، تمام قیمتی گھوڑے اور گراں قدر ساز و سامان جو کہ میرے ہاتھ آئے ہیں، بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ میں ایک مدت سے حضور سے جدا ہوں اسی لیے میں اور میرے ساتھی عتاب شاہی کے خوف سے پریشان ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت اپنے قلم خاص سے ایک فرمان میرے اور میرے ہم سفروں کے نام لکھ کر بھیجا دیں تو بڑی عثایت ہوگی۔ اس کے بعد میں بڑے شوق سے بارگاہ سلطانی میں حاضر ہو جاؤں گا اور تمام مال و اسباب حضور کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔“

علاء الدین کا یہ خط پڑھ کر جلال الدین بھی اس کی مکاری کے دام میں بری طرح پھنس گیا اور اس کی محبت اور خلوص کا پہلے سے زیادہ دم بھرنے لگا۔

اس زمانے میں علاؤ الدین کھنوتی جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کا یہ ارادہ تھا کہ جب بادشاہ کڑھ کے لیے روانہ ہو تو وہ خود کھنوتی پہنچ کر جلال الدین کی مخالفت کا اعلان کر دے۔

جلال الدین ان تمام حالات سے بے خبر علاؤ الدین کی محبت کا دم بھر رہا تھا۔ اس نے ایک محبت بھرا فرمان اپنے قلم خاص سے لکھ کر دو خاص ملازمین کے ہاتھ علاؤ الدین کے پاس کڑھ روانہ کیا۔

یہ دونوں قاصد جب کڑھ پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ علاؤ الدین بغاوت پر کمر بستہ ہے۔ علاؤ الدین نے ان قاصدوں کو گرفتار کر لیا تاکہ جلال الدین تک کسی قسم کی اطلاع نہ پہنچ سکے۔

قاصدوں کی واپسی نہیں ہو رہی تھی۔ بادشاہ ہزار

”مال و دولت اور لشکر کی کثرت ہمیشہ بغاوت اور سرکشی کا سبب بنتی ہے۔ علاؤ الدین بھی یقیناً بغاوت کے راستے پر چل پڑا ہے ورنہ وہ آپ کی اجازت کے بغیر دکن کی مہم سر نہ کرتا۔ میں سمجھتا ہوں آپ آگے بڑھیں اور چند بری تک جائیں۔ جب علاؤ الدین کوشاہی لشکر کی آمد کی خبر ملے گی تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا کہ وہ تمام مال و متاع بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے۔“

بادشاہ کو اس موقع پر چاہیے کہ ان تمام مفسدوں کو جو سیدی مولہ کے قتل کے بعد علاؤ الدین کے گرد جمع ہو گئے ہیں، علاؤ الدین سے علیحدہ کر کے دور دراز ممالک میں بھیج دے اور علاؤ الدین کی جاگیر میں اضافہ کر کے اسے پوری طرح مطمئن کر دیا جائے۔“

”میں اسے اپنے ساتھ دہلی لے آؤں یا کڑھ کی طرف روانہ کر دوں؟“ جلال الدین نے پوچھا۔

”اگر حضور کی اجازت ہو تو اس مسئلے کو شاہی خاندان کے مسائل کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کروں۔“

”اجازت ہے۔“

”ملکہ جہاں اور علاؤ الدین کی ناراضی سے حضور باخبر ہیں۔ ان دونوں افراد کی رنجش اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ علاؤ الدین یہ فیصلہ کر چکے ہوں گے کہ وہ دہلی میں نہ رہیں، کسی دور دراز کے مقام پر قیام پذیر ہوں۔ اگر کسی وقت اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تو بغاوت یقینی ہوگی۔“

ملک حبیب احمدی کی تقریر ملک فخر الدین کو چچی کے نزدیک حقائق پر مبنی تھی لیکن اس نے بادشاہ کی خوشنودی کے پیش نظر اسے ٹالنا چاہا۔

”ابھی یہ بات پوری طرح پایہ تحقیق کو نہیں پہنچی کہ علاؤ الدین اس طرف آ رہا ہے لہذا اس وقت اس سلسلے میں غور و فکر نہ کر رہے۔ جب ان خبروں کی تصدیق ہو جائے گی تو ہم اپنے لشکر کے ذریعے اسے راستے میں روک لیں گے۔“

اس برسات کے موسم میں اس کا تعاقب کرنا مناسب نہ ہوگا لہذا وہ جہاں جائے اسے جانے دیا جائے۔“

ملک حبیب کو ملک فخر الدین کو چچی جیسے تجربہ کار کی زبان سے یہ الفاظ سن کر بہت غصہ آیا۔ اس نے ملک کو چچی سے کہا۔

”خدا کے لیے ضرورت سے زیادہ تن آسانی سے کام نہ لو ورنہ وقت ہم لوگوں کو دھوکا دے جائے گا۔ مجھے سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ جب علاؤ الدین بادشاہوں کی سی شان و شوکت سے کھنوتی پر حملہ کرے گا، اس وقت تم کیا کر گے؟“

ناقابل یقین

تویر ریاض

ما فوق الفطرت واقعات ہمیشہ سے لوگوں کو چونکا دیتے ہیں۔ اسے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک ناقابل یقین صلاحیت سے نوازا تھا لیکن... چند لمحات کے لیے... اور پھر وہ اس صلاحیت سے معذور ہو گئی مگر ان چند لمحات کی انڈیری اتنی گہری تھی کہ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس نے ان چند لمحات میں جو منظر دیکھا اسے یقین تھا کہ وہ کوئی مفروضہ نہیں تھا۔

ایک حادثہ اور غیر متوقع خواب کے مابین عجیب تعلق کا قصہ



جن کی وجہ سے اسے تیز چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس کے دونوں بازوؤں میں ایک ایک بلی تھی۔ کم از کم دور سے دیکھنے پر ایرین کو ایسا ہی لگا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اور وہ عورت تیزی سے اس کی خالی بس کی طرف چلی آ رہی تھی۔ اس نے ہانپنے کے گاؤں کے نیچے پا جامہ پہن رکھا تھا اور بیروں میں موٹے سلیپر تھے

اتار دیا۔

اس نازک وقت میں اسے وہ وقت ضرور یاد آیا ہوگا جب اس نے معز الدین کی قیاد کو قبول کرنے کے لیے آدھی بیچے تھے۔ ان لوگوں نے قیاد کو قبول کرنے کے بعد اس کی لاش کو دریاے جتنا میں بہا دیا تھا۔ اس وقت بھی صرف دریا بدل رہا تھا، منظر وہی تھا۔ قیاد کے خون سے دریائے جتنا سرخ ہوا تھا۔ لنگا کا پانی جلال الدین کی کے خون سے رنگین ہو رہا تھا۔ اسے مکافات عمل کہا جائے یا کچھ اور؟ اس نے قیاد کے تخت پر قبضہ کیا تھا، آج اس کے تخت پر اس کا بھتیجا جسے اس نے بیٹوں کی طرح پالا تھا، قبضہ کرنے جا رہا تھا۔

مکافات عمل کا یہ سلسلہ یہیں نہیں رک گیا۔ علاؤ الدین کے تمام سامی جو کل کی اس سازش میں شریک تھے، بہت ہی جلد اس خون ناحق کی سزا میں بری طرح اپنے انجام کو پہنچے۔ محمود بن سالم ایک سال بعد ہی کوڑے کے مرض میں مبتلا ہوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر گر رہا تھا۔ اختیار الدین پاگل ہو گیا۔ اس کی یہ کیفیت ہوئی کہ کہتا پھرتا تھا ”دوڑو..... جلال الدین کی ہاتھ میں تلوار لیے میرا سر کاٹنے آ رہا ہے۔“

علاؤ الدین کی جس نے یہ تمام سازش تیار کی تھی، اسے بھی چند سال عیش و عشرت کے نصیب ہوئے پھر اس کا خاندان بھی تنکوں کی طرح بکھر گیا۔ سیدی مولہ نے کہا تھا کہ میرا بوردنگ لا کر رہے گا، وہی ہوا۔ جلال الدین کے سر کو نیزے پر لٹکا رکھی گئی تھا یا گیا۔ اس کے دو بیٹوں اور داماد کو اندھا کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔ ملک جہاں قید خانے کی کال کوٹھری میں مرنے لگا۔

ملکہ جہاں سے حماقت یہ ہوئی کہ اس نے سب سے چھوٹے بیٹے سلطان ابراہیم رکن الدین کو تخت پر بٹھا دیا۔ اگر وہ ارکلی خاں کو بر وقت ملتان سے بلا لیتی تو اس کی بہادری باپ کے تخت کو بچا سکتی تھی۔ علاؤ الدین کو جب معلوم ہوا کہ ابراہیم رکن الدین تخت پر براجمان ہوا ہے تو اس کے حوصلے بڑھ گئے اور اس نے سارے ہندوستان کا بادشاہ بننے کا مہم ارادہ کر لیا اور نہ وہ تو لکھنؤ کی جانا چاہتا تھا۔

ملکہ جہاں کی غلطی نے تخت ہاتھ سے نکال دیا۔ سچ ہے کہ یہ غلطیاں نہ ہوں تو مکافات کا عمل کیسے ممکن ہو۔

خطرے کا گمان کر کے آپ کی عنایات سے مایوس ہو سکتا ہے۔ ”یہ چند مصاحب ہی تو ہیں۔ پھر بھی اگر تو چاہے تو میں انہیں غیر رخ کر دوں۔“

”بے شک.....“ تمام لوگوں نے ہتھیار اتار دیے۔ جب کشتی کنارے کے قریب پہنچی تو بادشاہ کے ان مصاحبوں نے دیکھا کہ علاؤ الدین ہتھیار بند ہو کر استقبال کے لیے آ رہا ہے۔

ایک امیر خرم نے الماس بیگ کی توجہ اس طرف دلائی۔ ”تمہاری خواہش کے مطابق ہم نے ہتھیار اتار دیے ہیں لیکن تم لوگ مسیح و اور لڑائی کے لیے تیار معلوم ہوتے ہو۔“ ان لوگوں نے بادشاہ کی توجہ بھی اس طرف مبذول کی لیکن بادشاہ اپنے بھتیجے کی محبت میں اتنا اندھا ہو رہا تھا کہ اس پر کچھ اثر نہ ہوا، صرف اتنا کہہ سکا۔

”میں تو اتنی دور سے سفر طے کر کے آ رہا ہوں۔ اس وقت روزے سے بھی ہوں لیکن اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ کشتی میں بیٹھ کر تھوڑی دور تک میرے استقبال کے لیے آتا۔“

الماس بیگ نے پھر بات بنائی ”میرا بھائی یہ پسند نہیں کرتا کہ خالی ہاتھ حضور کی خدمت میں آئے۔ اس کی یہ خواہش ہے کہ پیش قیمت ساز و سامان، قیمتی ٹھوڑے اور ہاتھی لے کر آپ کی پاپوسی کا شرف حاصل کرے۔“

جلال الدین کشتی میں بیٹھا کلام مجید کی تلاوت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ عصر کے وقت کشتی نے کنارہ چھڑا۔ بادشاہ نے کشتی سے باہر قدم رکھا اور علاؤ الدین نے آگے بڑھ کر اس کے قدموں پر سر رکھ دیا۔

”تو نے یہ سوچا بھی کیسے تھا کہ میں تیرے خلاف ہو جاؤں گا۔ اب دیکھ میں تجھے لینے خود آ گیا ہوں۔ اس بڑھاپے میں اور اتنا طویل سفر طے کر کے روزے کی حالت میں۔ چل اب ساتھ مل کر روزہ افطار کریں گے۔ عید سے پہلے ہی میری تعیند ہو گئی ہے۔“

علاؤ الدین نے یہ باتیں سنیں ضرور لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کو اشارہ کیا جو بادشاہ کے قتل پر متعین کیے گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے تلوار کا وار کیا۔ بادشاہ بے حواس ہو کر کشتی کی طرف بھاگا لیکن ایک دوسرے سپاہی نے بھاگتے ہوئے بادشاہ کو زمین پر گرا دیا اور اس کا سر کاٹ لیا۔ بادشاہ کے وہ ہمراہی جو کشتی میں تھے، انہیں بھی موت کے گھاٹ

باوجود ایرین نے بس کا دروازہ کھلا رکھا۔ بس سروس میں بیس سال کی ملازمت کے بعد اس میں غیر معمولی صبر اور برداشت آگئی تھی۔

وہ عورت جب قریب آئی تو معلوم ہوا کہ اس کے دو پالتو جانوروں میں سے ایک کتا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایرین کو دیکھا اور بس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔ ”میری جیب میں ایک ڈالر ہے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے سوئی۔“ ایرین نے کہا۔ ”لیکن تم پالتو جانوروں کے ساتھ بس میں سوار نہیں ہو سکتیں۔ چاہے وہ کتنے ہی خوب صورت کیوں نہ ہوں۔“

اس عورت نے اپنے پالتو جانوروں کی طرف دیکھا۔ ایرین کا خیال تھا کہ وہ کوئی جوان عورت ہوگی لیکن قریب سے دیکھنے پر وہ چالیس کے لگ بھگ نظر آئی۔ اس کے سنہری بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اپنے بال سنوارنے کا موقع نہیں ملا اور وہ بستر سے اٹھ کر سیدھی بس پکڑنے چلی آئی۔

”یہ میرے دوست ہیں۔“ اس عورت نے کہا۔ ”البتہ مددگار نہیں۔“

”اگر تم انہیں گھر پر چھوڑنا چاہو تو میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تم غالباً سامنے والے اپارٹمنٹ پکلیس میں رہتی ہو۔“

”ہاں۔“ اس عورت نے کہا۔ ”لیکن میں انہیں واپس نہیں لے جاسکتی۔ وہ انہیں مار ڈالے گا۔“

ایرین کے ماتھے پر پل پڑ گئے۔ گوکہ وہ دوستانہ مزاج رکھتی تھی لیکن اس نے کبھی لوگوں کے مسائل میں الجھنے کی کوشش نہیں کی لیکن اس عورت میں کوئی ایسی بات تھی جس کی وجہ سے وہ اپنا منہ کھولنے پر مجبور ہوئی۔

”کون ہنی؟ تم کسی کی بات کر رہی ہو؟“

”میرے اپارٹمنٹ میں ایک سیریل کٹر گھر آتا ہے۔“ ایرین نے اپارٹمنٹ پکلیس کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی کہ اگر یہ عورت سچ کہہ رہی ہے تو وہ اس کا چچا کرتا ہوا یہاں بھی آ سکتا ہے۔ اس نے بس کا دروازہ بند کیا اور بولی۔ ”بیٹھ جاؤ، میں تم سے کوئی کرایہ نہیں لوں گی۔“ اس نے چپکے سے پولیس کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اپنا نام کیا بتایا تھا؟“

☆☆☆

سارجنٹ ونس جوز کو ٹائٹ شفٹ پسند تھی کیونکہ دن میں کئی عجیب لوگ علاقے میں آوارہ گردی کرتے رہتے تھے

اور پٹرول آفیسر زیادہ تر ٹریفک کنکٹ جاری کرنے میں مصروف رہتے۔ جوز رات میں چیش آنے والے واقعات کو ترجیح دیتی تھی جس میں زیادہ تر عجیب لوگ ملوث ہوتے تھے۔

یہ بات نہیں کہ وہ ان واقعات سے تفریح لیتی تھی اور نہ وہ ان لوگوں پر بطور خاص توجہ دیتی جو دیکھنے میں عجیب لگتے تھے۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے مشکلات پسند تھیں۔ اس کے خیال میں ہر وہ رات اچھی تھی جس کا اختتام کسی مسئلے کے پراسن حل پر ہوتا۔ جوز کو ان عجیب لوگوں کی یہ بات پسند تھی کہ وہ اسے روایتی انداز سے ہٹ کر سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

اس گوری عورت کی مثال اس کے سامنے تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں آپ دیکھتے ہی پسند کرنے لگتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ باجاء پنے محوم رہی تھی لیکن اس نے اوپر ایک معمولی گاؤں بھی لیا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسی عورت کے مانند دکھائی دے رہی تھی جس کا گھر آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا ہو اور وہ یہ مشکل تمام اپنے جانوروں کو لے کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئی ہو۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔

”میرا نام کیٹی ہے۔“ اس عورت نے کہا۔ ”کیٹی تھامس۔ یہ میرے دوست پلٹ اور پکلیس ہیں۔“

جوز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ تم اپنے گھر سے کیوں نکل آئیں؟“

”میرے اپارٹمنٹ میں ایک سیریل کٹر موجود ہے۔ میں صرف اتنی دیر اس میں رہنا چاہتی ہوں جب تک وہ چلا نہ جائے۔“

جوز نے بس ڈرائیور کی طرف دیکھا جو اس کے پارنٹر کو اپنا بیان کھوا رہی تھی۔ ”کتنی! ضروری نہیں کہ لوگوں کے اپارٹمنٹ میں داخل ہونے والا شخص سیریل کٹر ہو۔ وہ کوئی چور بھی ہو سکتا ہے۔“ جوز نے کہا۔

”نہیں۔“ کیٹی نے کہا۔ ”وہ پانچ عورتوں کو قتل کر چکا ہے۔ جیسے ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہ بیرونی دروازے پر آگیا ہے، میں عقبی دروازے سے نکل آئی اور مجھے اپنے ساتھ لی فٹ اور پکلیس کو بھی لانا پڑا۔ ورنہ وہ مجھے گھر میں نہ دیکھ کر انہیں بھی مار دیتا۔ وہ بہت سفاک ہے۔“

”تم اس کے بارے میں مجھے مزید کیا بتا سکتی ہو؟“

”وہ سفید قام اور پینتیس سال کا ہے۔“ کیٹی نے کہا۔ ”وہ اپنی ماں کے ساتھ اسکاٹ لینڈ میں اپنے گیسٹ ہاؤس پر رہتا ہے۔ مئی کے لحاظ سے وہ ریکل اسٹیٹ ایجنٹ ہے لیکن اس کام میں اسے زیادہ آمدنی نہیں ہوتی کیونکہ

لوگ اس سے جلد ہی خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا نام جان فوگس ہے۔“

جوز نے یہ تمام معلومات اپنی نوٹ بک میں لکھیں۔ ”تم اسے کیسے جانتی ہو کیٹی؟ کیا وہ تمہارا ایجنٹ تھا؟“

”نہیں۔ میں نے اسے لیونگ روم کی کھڑکی سے دیکھا۔ وہ میرے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لہذا میں نے اپنے دوستوں کو ساتھ لیا اور عقبی دروازے سے نکل آئی۔ عین اس وقت وہ میرے دروازے میں نقب لگا رہا تھا۔“

یہ سننے کے بعد جوز نے فیصلہ کیا کہ اسے ضابطہ کی کارروائی کرنی چاہیے۔ اس نے کہا۔ ”بہتر ہوگا کہ ہم پولیس کی مدد ملائیں اور تمہارے اپارٹمنٹ کی تلاشی لی جائے۔“

کیٹی نے کہا۔ ”کیا تمہارے خیال میں یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اس کے جانے کا انتظار کریں۔ اگر تم نے اس کا سامنا کیا تو وہ ٹیش میں آ سکتا ہے اور پھر وہی صورت حال پیدا ہوگی جو ہم نی وی پر دیکھتے ہیں، یعنی پولیس پر فائرنگ، کاروں کا تعاقب اور اغوا۔ اگر کوئی اسے ناکام بنانے یا اس کے کام میں مداخلت کرنے کی کوشش کرے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے اور اس کی لیے وہ لوگوں کو قتل کرتا ہے۔ خصوصاً ایک خاص عمر کی عورتوں کو۔“

”خاص عمر سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”چالیس یا اس کے لگ بھگ۔ وہ اسی عمر کی عورتوں کی جانب متوجہ ہوتا ہے اور انہی سے نفرت بھی کرتا ہے۔ اس کا نشانہ غیر شادی شدہ عورتیں ہیں جو تنہا رہتی ہیں اور خود مختار زندگی گزارتی ہیں۔“

”تمہاری طرح؟“

”ہاں لیکن میں نہیں سمجھتی کہ عام حالات میں اس نے میرا نوٹس لیا ہوگا۔ وہ صرف اس لیے میرے پیچھے لگ گیا کیونکہ میں اسے پہچانتی ہوں۔“

”تم اسے کیسے پہچانتی ہو کیٹی؟“

”میں اس سے جہنم میں ملی تھی۔“

جوز کو اس کا جواب سن کر بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی۔ اگر کیٹی تھوڑی بہت پاگل تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی شخص اس کے اپارٹمنٹ میں موجود نہیں تھا۔ عام طور پر بیمار ذہن کے لوگ کسی واقعے کو بیان کرنے کے لیے اس طرح کے استعارے استعمال کرتے ہیں۔

”تم اس سے جہنم میں کب ملی تھیں؟“

کیٹی نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی

وضاحت کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ دو سال پہلے کی بات ہے۔ جب میرا کارڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور میں تیس سینڈنک مردہ پڑی رہی لیکن جہنم میں وقت کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اسی لیے میں اس سے جہنم میں مل سکی جبکہ وہ ایسا تک زمین پر زندہ ہے۔“

وہ جس مسکون انداز میں گفتگو کر رہی تھی، اس سے لگتا تھا کہ وہ کوئی براسرار سچ بیان کر رہی ہے پھر اس نے ایک اور حیران کن انکشاف کیا۔ ”میں جہنم میں دس ہزار چار سو تیس سیریل کٹرز سے ملی تھی۔“

”یہ تو بہت بڑی تعداد ہے کیٹی۔“

”وہ سب ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔“

جوز نے سوچا کہ اگر اس نے مزید تفصیل جاننے کی کوشش کی تو بات بہت طویل ہو جائے گی اور وہ جس مقصد سے آئی ہے، وہ پورا نہ ہو سکے گا۔ اس نے کیٹی سے کہا۔ ”میں مدد کے لیے فون کر رہی ہوں۔ اس کے بعد ہم اس موضوع پر مزید بات کریں گے۔ تم چاہو تو آفیسر اسمتھ کے ساتھ یہاں بیٹھو ورنہ اس ایرین کے پاس چلی جاؤ۔ تمہیں جو جگہ بھی محفوظ لگے۔“

”ٹھیک ہے۔“ کیٹی نے مطمئن انداز میں کہا۔

جوز آفیسر اسمتھ کے پاس گئی اور اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا پھر وہ بس سے نیچے اترتی اور اس نے مزید فون کے لیے فون کیا۔ اسے بتایا گیا کہ دس منٹ میں مدد پہنچ جائے گی۔ وہ واپس بس میں جانے والی تھی کہ شاید کیٹی سے مزید معلومات حاصل ہو سکیں مگر اچانک ہی اس کی نظر اپارٹمنٹ بلڈ میں ایک کھڑکی پر پڑی اور اس نے پردے کے پیچھے ایک سائے کو حرکت کرتے دیکھا۔ ”کیا یہی کیٹی کا اپارٹمنٹ ہے یا کوئی پڑوسی ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے ہے یا پھر واقعی جان فوگس وہاں موجود ہے اور ہمیں دیکھ رہا ہے؟“

☆☆☆

جوز نے اپنا ہتھیار نکال لیا۔ کیٹی کے اپارٹمنٹ کا دروازہ تقریباً آدھا ٹوٹا ہوا تھا۔ دروازے کی چوکت ٹوٹ گئی تھی اور اس کی تاب بیل مل کھا گئی تھی۔ انہوں نے ایک ایک کر کے تمام کمرے چیک کیے لیکن انہیں وہاں کچھ نہیں ملا پھر وہ ہاتھ روم میں گئی اور وہاں اس نے آئینے پر لپ اسٹک سے لکھی تحریر دیکھی۔

”کیا تم سمجھتی ہو کہ یہ اس نے خود لکھا ہوگا؟“ آفیسر اسمتھ نے پوچھا۔

اکتوبر 2018ء

”نہیں۔ میں نے پچھل بار ایسی ہی ایک تحریر دیکھی تھی۔ اس میں لکھا تھا، مجھے پڑو..... اگر پکڑ سکو۔“
 ”یہ تحریر اس سے مختلف ہے۔“ اسٹھ لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم سے اگلی مرتبہ ملاقات ہوگی۔“
 جوز نے اپنی کن ہولٹر میں رکھی اور پچھلی جیب سے دستاں کی جوڑی نکال کر پھینکی پھر اس نے ہاتھ روم کی دروازہ کھولی۔ ”یہاں کوئی لپ اسٹک نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ کئی لپ اسٹک استعمال کرتی ہے۔ میں نے اس کی سنگار میز پر بھی لپ اسٹک نہیں دیکھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے ساتھ لے کر آتا تھا۔“

☆☆☆

”دس ہزار چار سو بیس؟“ آفسر ڈیوس نے کار میں بیٹھ کر پیچھے مڑے بغیر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ جہنم میں اس سے زیادہ سیریل کلرز بھی ہوں گے؟“
 ”بالکل۔“ کئی پچھلی نشست پر اپنے پالتو جانوروں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔
 ”لیکن وہ تمام قاتلوں کو اس میں شامل نہیں کرتے۔ میں نہیں سمجھتی کہ انہوں نے اس فہرست میں ان لوگوں کو بھی شامل کیا ہوگا جنہوں نے ایک سے زیادہ لوگوں کو قتل کیا ہے۔“

آفسر بیگی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ایسا زاویہ اختیار کیا کہ وہ باقی لوگوں کو دیکھ سکے۔ ”پھر ان دس ہزار چار سو بیس لوگوں میں کیا خاص بات ہے؟“
 ”وہ بکے شیطان ہیں۔“ کئی نے جواب دیا۔
 ”تم بھوتوں کی بات کر رہی ہو۔ وہ صرف جہنم میں ہی نہیں بلکہ یہاں بھی ہوتے ہیں اور لوگوں کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔“
 ”وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔“ کئی نے کہا۔
 اس کے لہجے نے انہیں چونکا کر دیا۔ ”یہ وہی شخص ہے جو تمہارے گھر میں داخل ہوا تھا؟“

”ہاں۔“

”کہاں ہے وہ؟“

”سڑک کے پار۔ اس اولڈ موبائل میں۔“
 ایک کار اشارت ہو کر نازل رفتار سے چل دی اور دونوں آفسرز میں سے کوئی بھی اس شخص کی ایک جھلک نہ دیکھ سکا جو کار چلا رہا تھا۔
 بیگی نے کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ڈیوس! کیا تم نے اس کی لائسنس نمبر پلٹ دیکھی؟“

اس سے پہلے کہ ڈیوس کوئی جواب دیتا، کئی نے فرفر بولنا شروع کر دیا۔ وہ کار کا میک، ماڈل، رنگ، لائسنس پلٹ نمبر اور جس کے نام وہ کار رجسٹرڈ تھی، اس کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ”میری فوکس۔ یہ اس کی ماں کا نام ہے۔“ اس نے کہا۔
 ”کئی۔“ بیگی نے پوچھا۔ ”تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کار کس کے نام پر رجسٹرڈ ہے؟“
 ”میں نہیں جانتی کہ مجھے یہ کس طرح معلوم ہوا۔ بس تم نے پوچھا اور میں نے بتا دیا۔“
 ”کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس بیٹے پاور بال کی لاٹری میں کس کنٹ کو پہلا انعام ملے گا؟“

”میرا خیال ہے کہ میں صرف انہی معاملات سے متعلق سوالات کے جواب دے سکتی ہوں جو میں نے جہنم میں دیکھے۔“
 ڈیوس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”حیرت ہے کہ اس لاٹری کو چلانے والے جہنم میں نہیں گئے۔“

”بہر حال.....“ بیگی نے کہا۔ ”ہم اس کو نہیں روک سکتے۔ ہمارے پاس اس کی کوئی مقول وجہ نہیں ہے۔“
 ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ کئی نے کہا۔ ”اگر اس وقت اسے روکا گیا تو وہ تم پر حملہ کر سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ تم اسے پرسکون ہونے کا موقع دو لیکن تمہیں اس کے گھر کی نگرانی ضرور کرنی چاہیے تاکہ اس کی آمد و رفت پر نظر رکھی جاسکے۔ جب اس کی ماں کہے گی کہ وہ ساری رات گھر پر تھا تو تم اسے جھوٹا ثابت کر سکو گے۔“

ڈیوس اور بیگی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
 ”یہ مقول تجویز ہے۔“ ڈیوس نے کہا۔
 بیگی نے ریڈیو کے ذریعے ڈسچر کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔ ”ان لوگوں کو بتا دو کہ اس سے اچھے کی ضرورت نہیں۔ انہیں صرف یہ تصدیق کرنی ہے کہ یہ وہی شخص ہے اور یہ کہ وہ کس وقت گھر پہنچتا ہے۔“

”وہ باہر آ رہے ہیں۔“ ڈیوس نے کہا اور کار سے اتر کر جوز اور اسٹھ کا انتظار کرنے لگا جو کئی کی بلڈنگ کے سامنے بنا ہوا مختصر لان عبور کر رہے تھے۔ ”تم کار میں ہی آرام سے بیٹھو۔“
 بیگی نے اپنا سر کئی کی جانب گھمایا اور بولا۔ ”اس آدمی کا قد کتنا ہے؟“
 ”چھ فٹ پانچ انچ۔“ اس نے کہا۔ ”وزن دو سو تریچن پونڈ۔“

”یہ تو میرا سائز ہے۔“ بیگی نے یہ معلومات ڈسچر کو دے دیں پھر کئی سے پوچھا۔
 ”اس کے بالوں کا رنگ کیا ہے؟“
 ”سیاہ اور اس کی آنکھیں نیلی ہیں۔ اس نے سیاہ پتلون پہن رکھی ہے لیکن شاید وہ کار میں اپنی قمیص تبدیل کر لے۔“

باہر کھڑے ہوئے تینوں آفسرز نے آپس میں معلومات کا تبادلہ کیا پھر جوز کار میں جھانکتے ہوئے بولی۔
 ”کئی! میں تم سے ریکارڈ کی درستگی کے لیے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم نے بھی جان فوکس کے ساتھ ڈینیٹنگ کی ہے؟“

”نہیں۔“ کئی نے کہا۔ ”میں کبھی اس کی یا اس کی ماں کی دوست نہیں رہی۔ نہ ہی اس کے ساتھ میرا کوئی پیشہ ورانہ تعلق تھا۔ میں بھی اس کے کاروبار میں شامل نہیں رہی۔ میں نے بھی اس سے فون یا ای میل کے ذریعے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی آن لائن گروپ میں شامل رہی۔ میرا بھی اس کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رہا۔“

”اور نہ ہی اس نے مجھے تم سے کوئی رابطہ کیا؟“
 ”بالکل ٹھیک۔ آج رات وہ پہلی بار میرے اپارٹمنٹ پر آیا۔“

آفسر جوز کافی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ ”جانتی ہوں کہ میں ایک اچھی گواہ نہیں ہوں۔“ کئی نے کہا۔ ”میں گواہوں کے گھر سے میں کھڑے ہو کر جو وی کو سیریل کلرز کے بارے میں وہ سب نہیں بتا سکتی جو میں نے جہنم میں دیکھا لیکن آج رات جو کچھ پیش آیا، اس پر ایک رپورٹ ضرور بنا سکتی ہوں۔ شاید اس سے تمہیں کچھ مدد مل سکے۔“

جوز نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتی کہ تم آج کی رات اپنے گھر میں گزارو۔ اس کا دروازہ بے کار ہو چکا ہے۔ کیا تم چاہو گی کہ تم تمہارے لیے کسی ہوٹل میں انتظام کر دیں؟“
 ”ٹھیک ہے۔“ کئی نے جواب دیا۔

☆☆☆

جوز سرائی رساں اور نیگ کو ذاتی طور پر نہیں جانتی تھی، گوکہ وہ دونوں ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے تھے۔ البتہ کام کے سلسلے میں اس سے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ وہ اس کی قابلیت اور کام کرنے کے انداز سے متاثر تھی۔ گوکہ اس کی سپاٹ نظریں لوگوں کو گھبراہٹ میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ جوز سوچ رہی تھی کہ جب کئی کا اس سے سامنا ہوگا

تو وہ کس طرح اس کی نظروں کو برداشت کر پائے گی لیکن کئی نے اسے حیران کر دیا جب وہ ان دونوں کو ہونٹوں کے کمرے میں لے گئی۔

”معاف کرنا۔ میں ابھی تک باجامد ہی پہنے ہوئے ہوں۔“ اس نے اور نیگ سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ گھر سے نکلنے وقت اپنے لیے ایک بیگ تیار کر لیتی۔“

”آفسر جوز نے بتایا ہے کہ جب تم گھر سے بھاگیں تو کوئی تمہارے بیرونی دروازے پر ضرب لگا رہا تھا۔“ اور نیگ نے کہا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ تم محفوظ رہیں۔“ وہ کئی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے ہوئے بولا۔ جوز دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بیڈ کی پائنٹی پر کھڑی ہوئی تھی۔
 ”مجھے شروع سے بتاؤ۔“ سرائی رساں اور نیگ نے کہا۔ ”ہر وہ بات جو تمہیں یاد ہو۔“

”اس کا آغاز ساڑھے گیارہ بجے شب ہوا۔“ کئی نے کہا شروع کیا۔ ”مجھے اس کا پورا یقین ہے کیونکہ اس وقت میں ٹی وی پر اپنا پسندیدہ شو دکھ رہی تھی پھر میں نے ایک کار کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔“

اس کے بعد اس نے وہی سب باتیں دہرائیں جو وہ جوز کو بتا چکی تھی۔ اس میں سیریل کلرز کا بھی تذکرہ تھا جنہیں وہ جہنم میں دیکھ چکی تھی۔ جوز اس بارے میں پہلے ہی اور نیگ... کو بتا چکی تھی۔ اس لیے اس نے کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

کئی کا بیان ختم ہوا تو اور نیگ نے پوچھا۔ ”کیا تم بہت زیادہ مشہوری شوز دیکھتی ہو؟“

”بھی بھئی۔“ کئی نے کہا۔ ”مجھے ایسی فلمیں اور ٹی وی شوز پسند ہیں جو دلچسپ پس منظر میں بنائے گئے ہوں۔“
 ”کیا تمہیں خیال آتا ہے کہ ایک اچھی سرائی رساں بن سکتی ہو؟“ اور نیگ نے دوستانہ انداز میں پوچھا لیکن جوز جانتی تھی کہ وہ کئی کی نیت کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا وہ ایک ایسی عورت ہے جو یوریت کی وجہ سے پولیس کے ساتھ رابطے میں رہتا اور اس کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ ٹی وی پر سرائی رساںوں کو دیکھ کر اس طرح کے لوگوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

”دراصل.....“ کئی نے کہا۔ ”میرا مشاہدہ بہت اچھا نہیں ہے اور میں حادثے کے بعد سے بہت سی باتیں بھولنے لگی ہوں۔ اس کے علاوہ کسی بھی قسم کا تشدد مجھے اداس

کرتا ہے۔“

اور بیگ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے اس حادثے کے بارے میں بتاؤ۔“

”میں نہیں صرف وہی کچھ بتا سکتی ہوں جو پولیس اور ڈاکٹروں نے مجھے بتایا۔ مجھے ایک چوراہے پر ڈیلیوری ٹرک نے ٹکر ماری۔ جب مجھے اسپتال لے جایا جا رہا تھا تو میرا دل رک گیا اور انہوں نے دل کی دھڑکن بحال کی۔“

”کیا وہ ٹرک ڈرائیور بھی کوئی سیریل کلر تھا؟“

اور بیگ نے پوچھا۔ ”نہیں۔“ کئی نے کہا۔ ”وہ برا آدمی نہیں تھا بلکہ اس نے حادثے کے بعد مجھ سے معافی مانگی حالانکہ اس کی کمپنی نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے بات کرے۔“

اور بیگ نے نوٹ بک نکال کر اس پر لکھنا شروع کیا۔ جوز سوچ رہی تھی کہ کیا وہ واقعی کس کے بارے میں کچھ لکھ رہا ہے یا سوچ رہا ہے کہ اگلا سوال کیا کیا جائے۔

”جو دیکھا اس کے بارے میں بتاؤ۔“ اور بیگ نے کہا۔ ”کیا یہ کاغذات، نامی فلم کی طرح ہے؟“

کئی نے منہ میڑھا کرتے ہوئے کہا۔ ”تقریباً ویسی ہی ہے۔“

اور بیگ۔۔۔۔۔ مسلسل نوٹ بک پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس مرطلے پر جوز اپنے آپ کو سوال کرنے سے نہ روک سکی۔

”کیا تم مجھے ہو کہ لوگوں کو سزا دینے کے لیے خدا انہیں جہنم کی آگ میں جلاتا ہے لیکن مجھے اس پر یقین نہیں۔“

”میرا نہیں خیال کہ خدا لوگوں کو جہنم میں جلاتا ہے۔“ کئی نے کہا۔

اور بیگ کا چہرہ ہمیشہ کی طرح جذبات سے عاری تھا لیکن جوز جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ”کسی نے تو یہ آگ لگائی ہوگی۔ اگر خدا انہیں جلا رہا تو وہ خود اپنے آپ کو آگ لگا رہے ہوں گے؟“

کئی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے جہنم نہیں بنائی۔ وہ خود جہنم ہیں۔“

اور بیگ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم جہنم میں کیسے چلی گئیں۔ دیکھنے میں تو اچھی خاتون لگتی ہو؟“

”وہاں ہر کوئی جاتا ہے۔“ وہ پائیس چپکاتے ہوئے بولا۔ ”معاف کرنا۔ میں سمجھا نہیں۔“

”جہنم میں تو سب ہی جاتے ہیں لیکن زیادہ تر لوگ

وہاں رکے نہیں ہیں، وہ جلد ہی وہاں سے چلے جاتے ہیں۔“

”یعنی جہنم ایک انتظار گاہ کی طرح ہے؟“ اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، زیادہ تر لوگوں کے لیے۔“

”اگر تم مسٹر فوس کو پہلے سے نہیں جانتی تھیں تو تم نے اسے جہنم میں کیسے دیکھا؟“

”اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ وہ دوسروں سے الگ دکھائی دے رہا تھا۔“

”کیا اس نے تم سے بات کی؟“

”ہاں۔“

”اس نے کیا کہا تھا؟“

”اس نے کہا کہ اسے اب بھی کوئی افسوس نہیں ہے۔“

اور بیگ نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اس کا یقین ہے۔ ٹھیک ہے، کئی! تمہارے وقت کا شکریہ۔ تم گھر جا کر اپنے دروازے کی مرمت کروا سکتی ہو اور اگر چاہو تو اس ہوٹل میں مزید کچھ عرصہ قیام کر سکتی ہو۔ یہ تمہارے لیے زیادہ محفوظ ہے۔“

”میں یہاں کچھ عرصہ قیام کروں گی۔“ کئی نے کہا۔ ”میری واپسی تک پڑوسی گھر کا خیال رکھیں گے۔“

اور بیگ نے اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم اسے دوبارہ دیکھو تو مجھے فون کر دینا یا وہ تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اگر تم خطرہ محسوس کرو تو نوٹیارہ کو فون کر سکتی ہو۔“

کار کی طرف جاتے ہوئے جوز نے پوچھا۔ ”اب تمہارا کیا خیال ہے؟“

اور بیگ نے غصہ سے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جہنم کے بارے میں اس نے جو بتایا، وہ کچھ عجیب ہے۔ اس پر کوئی بھی یقین نہیں کر سکتا لیکن اس کے علاوہ ہم نے سب چپک کر لیا ہے۔ اس کا اپارٹمنٹ جائے وقوعہ کا منظر پیش کر رہا ہے اور ہمیں وہاں سے کچھ نشانات بھی ملے ہیں لیکن فوس گھر نہیں پہنچا۔ میں اس کی ماں سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ وہ بہت پریشان ہے اور نہیں جانتی کہ فوس کہاں ہے۔“

”اس کی ماں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

”اس کا انداز مدافعتانہ ہے۔ گوکہ ہم نے اس کے بیٹے پر شبہ ظاہر نہیں کیا۔ ہم نے صرف یہ کہا تھا کہ شاید وہ کئی کے علاقے میں ہونے والی مشتبہ سرگرمیوں کی گواہی دے

سکے لیکن وہ عورت بے وقوف نہیں ہے۔ اس نے مجھے اپنے وکیل سے بات کرنے کا مشورہ دیا۔“

جوز اپنی پینرول کار کے پاس جا کر رک گئی اور سراغ رساں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اس کے بارے میں جانتی ہے؟“

”یعنی یہ کہ اس کا بیٹا عورتوں کو قتل کر رہا ہے؟ یہ تو ہم بھی نہیں جانتے لیکن میری چھٹی حس مجھے ماں بیٹے کے بے چارے تعلق کے بارے میں بتا رہی ہے۔ اسی وجہ سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اور میری بھی۔۔۔۔۔ اس نے مشرق کی طرف ابھرتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا۔ ”میری شفقت ختم ہو رہی ہے۔ گھر جانے کا وقت آ گیا۔“

”تم خوش قسمت ہو۔“ سراغ رساں نے کہا۔ ”مجھے تو ابھی کاغذی کارروائی پوری کرنی ہے۔“

☆☆☆

”اگر تم فوس کو پہلے سے نہیں جانتی تھیں تو جہنم میں اس سے کیوں ملیں؟“

”اسے نظر انداز کرنا مشکل تھا۔“

جوز نے یہ اصول بتا رکھا تھا کہ شفقت ختم ہونے کے بعد وہ اپنا کام گھر لے کر نہیں جاتی تھی لیکن اس روز گھر جاتے ہوئے اس کا دماغ کئی کئی تھامس کے معاملے میں الجھا ہوا تھا۔ کسی نہ کسی طرح کئی نے فوس کو پہلے ضرور دیکھا ہوگا اور وہ ایک دوسرے پر کسی طرح اثر انداز ہوئے ہوں گے اور کئی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ قاتل ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص واقعی ایسا ہی تھا لیکن کئی کے اپارٹمنٹ میں لکھی ہوئی تحریر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”جہنم اگلی بار پکڑو گا۔“

کیا یہ ایک ہی براڈ کیپ اسٹک تھی؟ ابھی اس کی لیبارٹری سے تصدیق ہونا باقی تھی لیکن جوز کو اس کا یقین تھا۔ میڈیا کو یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ متاثرہ خواتین کے ہاتھ روم کے آئینوں پر لپ اسٹک سے کچھ لکھا جا رہا تھا لیکن وہ براڈ کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح کئی بھی اس سے لاعلم تھی۔

جوز نے سر جھٹک کر اپنے ذہن کو آزاد کیا۔ اب یہ دن کی شفٹ والوں کا کام تھا کہ وہ فوس کو تلاش کر کے اس سے پوچھ گچھ کرتے۔ اس نے معمول کے مطابق کافی شاپ پر گاڑی روکی اور وہاں سے گرم گرم ملک کافی کے تین ٹین بیک کر دئے۔ بچے ناشتے پر اس کا انتظار کر رہے ہوں گے

اور یہ کافی اس کا ایک حصہ تھی۔ اس کے بچے اب بڑے ہو رہے تھے اور ابھی ان کی کالج کی پڑھائی شروع ہوئی تھی اور وہ اسی کے ساتھ رہ رہے تھے لیکن وہ جانتی تھی کہ دونوں جلدی اپنا ٹھکانا تبدیل کر لیں گے اور اس کی علامات نظر آنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس کا خوب صورت بیٹا اور ڈچین بیٹی دونوں ہی اس سے مختلف تھے۔

اسے اپنا زمانہ یاد آ گیا۔ اس کی ماں نے نہ جانے کیا سوچ کر اس کا نام دیس رکھ دیا جس پر اسے بڑی شرمندگی ہوتی تھی تاہم وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتماد تھی۔ اس نے کم عمری میں ہی شادی کر لی۔ انیس سال کی عمر میں وہ ماں بن چکی تھی۔ اس نے ہر کام جلدی میں کیا، شاید اسی لیے اسے طلاق بھی جلدی ہو گئی۔

وہ ایسی کئی عورتوں کو جانتی تھی جنہیں اپنے شوہروں کے غیر ذمے دار ہونے کی شکایت تھی لیکن جارج اس کے برعکس تھا۔ اس نے ہمیشہ دو ششوں میں کام کیا جبکہ اسے بیسوں کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ جوز نے بھی پولیس میں ملازمت کر لی تھی۔ وہ اسے پورے دن میں یہ مشکل چند گھنٹوں کے لیے دیکھ پانی اور اس وقت وہ بری طرح تھکا ہوا ہوتا۔ اس کے بچے نو اور دس سال کے ہو چکے تھے اور وہ بستر میں اس کے برابر لیٹے ہوئے سو جتی۔ ”تم نے شادی کیوں کی تھی جارج۔ بچے کیوں پیدا کیے؟ جب تم ہمارے ساتھ رہتا نہیں چاہتے۔“

جب جارج نے اسے بتایا کہ وہ طلاق لینا چاہتا ہے تو اسے بالکل بھی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ اس کے طرز عمل سے وہ یہ اندازہ بہت پہلے لگا چکی تھی۔ وہ اس کے تھکے ہوئے چہرے کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ وہ چست و چالاک شخص کہاں چلا گیا جس سے اس نے شادی کی تھی؟ جس کی مسکراہٹ پر میں جان چڑھتی تھی اور وہ اس طرح میرا پیچھا کرتا جیسے میں دنیا کا سب سے قیمتی انعام تھی۔

اس نے اپنی کارڈ رائیو سے میں کھڑی کی۔ کافی کے ٹین اٹھائے اور بیرونی دروازے کی جانب چل دی لیکن اس پر نظر پڑے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ دروازہ آدھے سے زیادہ ٹوٹا ہوا تھا۔ کافی کے ڈبے اس کے ہاتھ سے گر گئے۔ اس نے اپنا ہتھوڑا نکالا اور ٹوٹے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ وہاں کا منظر بڑا ہی ہولناک تھا۔ اس کے دونوں بچے لیونگ روم میں موجود تھے۔ بیٹا جیس کاؤچ کے پاس کھڑا ہوا تھا اور بیٹی کچنی سلائیڈنگ دروازے کے پاس تھی۔ ایک بھاری بھر کم فحش نے

ایک بازو کے ذریعے کیتھی کو کندھوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک شکاری چاقو تھا جس کی نوک کیتھی کی گردن پر رکھی ہوئی تھی۔

”ہیلو ویش۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”میرا نام جان فوس ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم مجھے تلاش کر رہی ہو۔“

جوز نے کن انکھوں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔ اس کے بازو کیتھی اور فوس کی طرف پھیلے ہوئے تھے جیسے وہ اس آدمی کو ممانے اور کیتھی کو اس سے دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن اب وہ اپنی جگہ پر جمنا ہو گیا تھا۔ اس نے جوز کو نظروں ہی نظروں میں بتا دیا کہ اس کی کوئی معمولی سی حرکت بھی کیتھی کی زندگی کے لیے خطرناک ہو سکتی ہے۔

”اسے چھوڑ دو۔“ جوز نے اپنی من کا رخ فوس کے ماتھے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

اس نے پراسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم یہ سب یہاں میرے پاس پھینک دو۔ اس من کو حاصل کرنے کے بعد میں تم سے کہوں گا کہ اپنے بیٹے کو اس کرسی پر باندھ دو۔“ اس نے اپنی ٹھوڑی سے ڈانٹنگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے بعد اسی طرح برابر والی کرسی پر بیٹی کو بھی باندھ دینا پھر ہم دونوں بیڈروم میں کچھ وقت ساتھ گزاریں گے۔ مطلب پورا ہونے کے بعد میں واپس چلا جاؤں گا اور تمہارے بچوں کی جان بھی بچ جائے گی۔“

یہ ایک انتہائی بے ہودہ مطالبہ تھا جس کے پورا ہونے کی کوئی توقع نہیں تھی۔ اسی لیے اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے کہا۔ ”ورنہ میں اس کا گلا کاٹ دوں گا اس سے پہلے کہ تم مجھ پر قہر کرو۔“

جوز جانتی تھی کہ وہ اپنے بچوں کو بچانے کے لیے اس کی ہدایات پر عمل نہیں کر سکتی اور نہ ہی کوئی معاونانہ حرکت کرنا ممکن ہے۔ البتہ اسے باتوں میں لگا کر کچھ وقت حاصل کیا جاسکتا ہے۔ شاید اس دوران اسے کوئی موقع مل جائے۔ اس نے فوس سے پوچھا۔

”تمہیں میرے گھر کا پتا کیسے معلوم ہوا؟“

اس نے قہر لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے لیے بہت آسان ہے۔ میں جاننا ہی خرید و فروخت کا کام کرتا ہوں۔ اگر کسی نے کوئی مکان خریدا ہو تو اس کے ریکارڈ تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔ تم نے یہ مکان پندرہ سال پہلے خریدا تھا۔ اس وقت کے لحاظ سے یہ ایک اچھی سرمایہ کاری تھی۔“

”تمہیں میرا نام کس نے بتایا؟“

”میں بہت پہلے سے تمہارا نام جانتا ہوں اور بچ پوچھو تو تمہارا بہت بڑا مداح ہوں۔ تم نے میرے تمام کرائم سین محفوظ کر دیے تھے اور مجھے پکڑنے کے بہت قریب پہنچ گئی تھیں۔ اگر آج بھی تم پانچ منٹ پہلے پہنچ جاتیں تو ہمارا آنا سامنا ہو جاتا۔ ویسے میرے مطلب کی نہیں ہو۔ میں عام طور پر سفید فام عورتوں کا پیچھا کرتا ہوں لیکن تم میرے لیے بہت خاص ہو گئی ہو۔“

اس نے کیتھی کو اپنے قریب کر لیا۔ وہ اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا اور وہ کانپنے لگی تھی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ فوس نے پوچھا۔

جوز نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”اس سے تعاون مت کرو۔“

کیتھی اس کا اشارہ سمجھ کر نکلوانے لگی۔ فوس کا قد چھ فٹ سے بھی زیادہ تھا۔ اس لیے وہ کیتھی کو سہارا دینے کے لیے جھکا تو اس کی گرفت ڈھیلی ہونا شروع ہو گئی۔ جوز کو امید تھی کہ اس طرح اس کی چھاتی سامنے آجائے گی لیکن کیتھی صرف چند انچ ہی پسپائی تھی کہ اس نے اسے دوبارہ سیدھا کھڑا کر دیا۔ چاقو کی نوک اس کی کھال میں چھ رہی تھی۔

عین اس وقت سلاٹز دروازہ ٹھوڑا سا کھلا اور کیتھی تھامس اندر داخل ہوئی۔ اس نے ابھی تک وہی پاجامہ پہن رکھا تھا اور اپنے کتے کو اس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے وہ اسے فوس کو تحفے میں دینا چاہ رہی ہو۔ وہ اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔

”یہ دیکھو۔“ کیتھی نے کہا۔ ”یہ پی ٹی ٹی تمہارے لیے ہے۔“

کتے نے کیتھی کے بازوؤں سے چھلانگ لگائی اور سیدھا فوس کے منہ پر آیا۔ اس سے پہلے کہ فوس سمجھتا، اس کتے نے اپنے دانت اس کی ناک پر گاڑ دیے۔ اس نے کیتھی کو چھوڑ دیا جو لوٹ لگتی ہوئی اس سے دور چلی گئی۔

جوز نے فوس کے سینے کا نشانہ لے کر تین فارز کر دیے۔ فوس نے اپنے سینے پر پھینکتے ہوئے خون کے دھبے کو دیکھا پھر اس کی نظریں کیتھی پر جم گئیں۔ ”تم سے جہنم میں ملاقات ہوگی۔“ اس نے کہا اور سینٹ کی بوری کی طرح فرش پر گر گیا۔

”مجھے عیسیٰ پر آنا پڑا۔“ کیتھی نے کہا۔ ”کیونکہ وہ تمہارا گھر جانتا تھا۔ اس لیے مجھے بھی معلوم ہو گیا لیکن میں یہ

نہیں جانتی تھی کہ وہ تمہارے گھر پہنچ جائے گا اور جب مجھے معلوم ہوا، اس وقت تک کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کی۔“

جوز نے وہ سب کچھ سنا جو کیتھی کہہ رہی تھی لیکن وہ اس پر کوئی توجہ نہ دے سکی۔ اس نے کیتھی اور تھامس کو پکڑا ہوا تھا جو بری طرح رو رہے تھے۔ اسے ان کا رونا اچھا لگا۔ شاید اس طرح ان کے اندر سے وہ زہر نکل جائے جو اس نظام کے خلاف ان کے دل میں جمع ہو گیا تھا اور وہ گھر چھوڑ کر جانے کا ارادہ ترک کر دیں۔

”تمہارے بچے بہت ہوشیار ہیں۔“ کیتھی نے کہا۔

”انہوں نے بالکل وہی کیا جو انہیں کرنا چاہیے تھا۔“

☆ ☆ ☆

اور ریگا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ بھی ان کی گفتگو میں شامل ہو گیا۔

”ہم نے اس کے مکان کی تلاشی کے لیے وارنٹ حاصل کر لیا ہے۔ تمہارا مکان بھی ٹھوڑی دیر کے لیے ہماری تحویل میں رہے گا اور شاید تم لوگوں کو ناشتے کے لیے باہر جانا پڑے۔ ابھی ہمیں تمہارے بیان بھی لیتا ہیں۔“

جوز کچھ دیر اسے بغور دیکھتی رہی پھر ایک سوال اس کے ذہن میں آیا۔ ”اب اس کی ماں کیا کہتی ہے؟“

”اس کا کہنا ہے کہ اسے کسی بات پر یقین نہیں لیکن جب ہم نے اسے فوس کے مرنے کی اطلاع دی تو اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ ہم نے پہلے سے اس گیسٹ ہاؤس کے گرو پولیس والے تعینات کر دیے تھے جہاں فوس رہتا تھا۔ جب ہم بیرونی دروازے سے باہر آئے تو وہ پچھلے راستے سے گیسٹ ہاؤس میں جانے کی کوشش کرنے لگی تب ہم نے دیکھا کہ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔ تم نے ٹھیک ہی کہا تھا جوز۔ وہ شاید سب کچھ جانتی تھی۔“

پھر وہ کیتھی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”ابھی یہ کیس ختم نہیں ہوا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ تمہارا دیا ہوا اشارہ کارآمد تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمہارے پاس بقیت دس ہزار چار سو اکتیس سیریل کلرز کی فہرست ہوگی جنہیں تم نے جہنم میں دیکھا تھا۔“

کیتھی نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”نہیں۔ ابھی تک تو نہیں ہے۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور وہاں سے چلا گیا۔

”فہرست.....“ کیتھی نے کہا۔ وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی اور اس کی آنکھیں کسی ایک جگہ مرکوز نہیں تھیں جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں دیکھ رہی ہو۔

”کیتھی.....“ جوز نے کہا۔ ”کیا تمہیں ہوٹل واپس جانے کے لیے سواری چاہیے؟“

کیتھی واپس اپنے حال میں آتے ہوئے بولی۔ ”ہاں اگر تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔“

☆ ☆ ☆

جان فوس کے پاس سے کچھ ایسی چیزیں بھی برآمد ہوئیں جو اس نے اپنے مفتوحین سے نشانی کے طور پر حاصل کی تھیں۔ اور ریگا اور اس کا ساتھی والٹر انہی چیزوں کو ترتیب دینے اور ان پر کیبل لگانے میں مصروف تھے۔ اور ریگا کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ ان عورتوں کا کیتھی تھامس سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی وہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ رابطے میں تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ معلوم کر سکے گا لیکن فی الوقت یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ یہ سب کیسے جانتی تھی لیکن ابھی اس کا ایک اور حیرت انگیز روپ دیکھنا باقی تھا۔

اور ریگا اور اس کے ساتھی کو چند لمحوں کے لیے سستانے کا موقع ملا ہی تھا کہ ایک کلرک کیتھی کو لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ایک فولڈر پکڑا ہوا تھا۔

”میں آج بھی ایرین کی بس میں آئی ہوں۔“ کیتھی نے کہا۔

اور ریگا نے فولڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم میرے لیے کچھ لے کر آئی ہو؟“

”ہاں۔ میں نے دس ہزار چار سو بیس لوگوں کی فہرست ٹائپ کر لی ہے۔ مجھ پر یہ لازم ہو گیا تھا۔ جب تم نے مجھ سے اس کا ذکر کیا تو میں یہ کام کرنے بیٹھ گئی۔ اس میں دو گھنٹے لگ گئے۔“

اور ریگا نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو کافی بڑا کام لگ رہا ہے کیتھی۔“

”میں جانتی ہوں لیکن مجھے یہ کرنا تھا۔ تم نے مجھ سے اس کے لیے کہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ تمہارے کسی کام آجائے۔“ اس نے فولڈر اور ریگا کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس کی دو کاپیاں بنائی ہیں۔“

اور ریگا نے بے یقینی کے عالم میں وہ فولڈر لے لیا اور ایک کاپی والٹر کو پکڑادی۔ پھر اس نے ابتدا کی چند نام پڑھنا شروع کیے۔ ”پری پنک ہٹیل ٹیل، جوئے، جو، فونو.....“

پیشہ ور

ماہر خراباب

بعض اوقات انسان پیشہ ورانہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے ناپسندیدہ کام کرنے کے لیے بھی مجبور ہو جاتا ہے، جیسے کہ وہ ہوا مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا نکلا... جو کبھی اس کی پسند تھی... جس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں اور جس کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے... پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سارے ہی خوابوں کی تعبیریں الٹی ہو گئیں لیکن قسمت کا پھیر دیکھو کہ زندگی کے اس موڑ پر وہ اس کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو آزمانے چلی آئی تھی۔

محبت کے جھوٹے دعوؤں کا امتحان لینے والی ایک تالہ کا اجرا

براجمان تھا۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو سنہرے بالوں والی حینہ نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میرا دل گویا ایک ہل کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہت خوبصورت تھی بلکہ وہ دس سال کے بعد بھی اتنی ہی خوبصورت تھی بلکہ شاید وقت نے اس کے حسن میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔

مجھے صبح سات بجے کال کر کے آفس بلایا گیا جبکہ میں ان دنوں ایک کیس کی تکمیل کے بعد رخصت پر تھا۔ بقول میرے باس ڈاکٹر اور جاسوس کو کسی بھی ایئر جنسی کے لیے تیار رہنا چاہیے اور جب میں اسی ایئر جنسی کے بارے میں سوچتا ہوا دفتر پہنچا تو میرا باس اپنی دونوں ہاتھیں کانوں تک پھیلائے ایک سنہرے بالوں والی حینہ دلواز کے سامنے

ایک گھنٹے بعد اسے کچھ جرائم کی خبریں مل چکی تھیں اور اس نے فہرست میں موجود مزید چند ناموں پر نشان لگا دیے۔ ان میں سے دو کیلے فوراً اور ایک نیو میکسیکو میں تھا۔ دونوں جگہ اور ریگ کے جاننے والے موجود تھے۔

اس نے سوچا کہ اگر وہ ان لوگوں کو اس فہرست کی نقول بھیج دے تو وہ اس میں سے مزید نام تلاش کر سکتے ہیں۔

اور ریگ نے سب سے پہلے کریزی ٹائو سے شروع کرنے کے بارے میں سوچا۔ اس نے والٹر سے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ کیا کیٹی لچ پر آ سکتی گی۔“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ ہماری مزید مدد کر سکتی ہے؟“

”وہ پہلے ہی ہماری مدد کر چکی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک موقع اور دینا چاہیے۔ اب تک میں نے اس کی باتوں کو تنبیہ کی ہے نہیں لیا تھا۔ اس کا تیس سینڈ کے لیے جہنم میں جانا اور وہاں دس ہزار سے زیادہ لوگوں سے ملنا مجھے شخص اس کے تیل کی پرواز لگ رہا تھا لیکن جب اس نے فوگس کے بارے میں معلومات دیں تو میں چونک گیا۔ وہ ایک ایسے شخص کے بارے میں بتا رہی تھی جس سے وہ کبھی نہیں ملی پھر جب وہ فوگس کا پتہ چلا کرتے ہوئے جوز کے گھر پہنچی تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ غیر معمولی صلاحیتیں رکھتی ہے ورنہ اسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ فوگس اس وقت جوز کے گھر پر ہے اور اب اس فہرست نے تو مجھے چکر اکر رکھ دیا ہے۔ میں نے اس سے مذاق میں ایک بات بھی سنی اور وہ واقعی ان دس ہزار سے زیادہ لوگوں کی فہرست بنا کر لے آئی جنہیں اس نے جہنم میں دیکھا تھا یہ کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کے اندر کوئی مافوق الفطرت روح موجود ہے لیکن میں اس کی حقیقت جاننے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان پرانے کیسز کو حل کرنے میں اس کی مدد لی جائے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟“

”میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔“ والٹر بولا۔

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ انسان ہے یا کوئی جن بھوت لیکن اب تک اس نے جو کچھ کیا ہے، اسے دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ وہ پرانے کیسز حل کرنے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔“

اور ریگ نے کیٹی کا دیا ہوا فورڈ راز میں رکھا اور اس کا نمبر ملانے لگا۔ کیٹی نے چوتھی گھنٹی پر فون اٹھا یا تو وہ بولا۔

”کیا تم آج ہمارے ساتھ جاکر سکتی ہو؟“ انا لین فوڈ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”یہ ان کے جہنم والے نام ہیں۔ مجھے ان کے اصل نام اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتے جب تک میں انہیں یہاں نہ دیکھ لوں۔“ کیٹی نے کہا۔

”ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن اب میں کیا کروں۔۔۔۔۔ کیا انہیں فون تک میں دیکھا جائے؟“

”تم گولڈ سے مدد لے سکتے ہو۔ شاید میں بھی جہنم کچھ ایسی باتیں بتا سکتی ہوں جن سے تمہیں مدد ملے۔“

اور ریگ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کوشش کے لیے شکریہ کیٹی۔“

اس کے جانے کے بعد اور ریگ نے فہرست پر نظر ڈالی اور مسکرانے لگا لیکن فوراً ہی اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور وہ بولا۔ ”والٹر! تم نے چھتیس نمبر کا نام دیکھا؟“

”نہیں۔“

اور ریگ نے اسے وہ صفحہ دکھایا تو والٹر کی بھویر تن گئیں۔ ”کریزی ٹائو۔۔۔۔۔“

یہ وہ کیس تھا جسے انہوں نے غیر حل شدہ قرار دیا تھا۔ ایک ایسا مجرم جو نو جوان مردوں کو چھید کر ہوں سے باندھ دیا کرتا تھا۔ اور ریگ کے ذہن کے پردے پر فوراً ہی وہ پہلا مقتول آ گیا جس کی لاش انہیں ملی تھی۔ اسے اس بری طرح کس کر باندھا گیا تھا جس کی وجہ سے اس لڑکے کو مرنے سے پہلے شدید تکلیف ہوئی ہوگی۔

”نمبر دو سو ستانوے۔۔۔۔۔“ والٹر نے پڑھا۔

”اسپاکی۔“

”تم مذاق کر رہے ہو۔“ اور ریگ حیران ہوئے ہوئے بولا۔

والٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی نظریں فہرست میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ”نمبر تین سو سات۔“ اس نے ایک زرد مارکر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اور تین سو تیرہ۔ سلی اسٹرنگ اور ڈاکٹر پیپر۔“

اور ریگ نے بھی ایک زرد مارکر اٹھایا اور فہرست میں چند ناموں پر نشان لگائے لیکن وہ خاص طور پر ایک نام تلاش کر رہا تھا جو اسے پانچ ہزار چھ سو پچتر دس نمبر پر ملا۔ اسکا رلیٹ پیرل۔۔۔۔۔ اس شخص کی خبریں لپ اسٹیک کلر کے نام سے چلی تھیں لیکن وہ اور اس کا سامی ہمیشہ انہی لوگوں کو اپنا اصلی نام ہی بتاتے تھے اور انہیں پکڑنے کی کوشش اب بھی جاری تھی۔ اگر کوئی سراغ رساں اس فہرست کو دیکھتا تو اسے مزید کچھ جانے پہچانے نام مل سکتے تھے۔ اس نے کیٹی کے کہنے کے مطابق گولڈ سے مدد لی۔



”اور یہ ہیں مسٹر محسن میرے نائب جو آپ کا کس دیکھیں گے۔“

باس نے مسکراتے ہوئے میرا تعارف کروایا جو ایک غیر معمولی بات تھی۔

میں آگے بڑھا تب مجھے باس کی خوش خلقی کی ایک اور وجہ نظر آئی۔ پہلی وجہ اس کی خوبصورتی تھی۔ اس نے سیاہ شیون کی ساڑی پر بہت مختصر بلاؤز پہن رکھا تھا جو باس جیسے رنگین مزاج انسان کو خوش خلقی دکھانے پر مجبور کر سکتا تھا۔

”اور مس ساڑہ اچھے یہ ہماری کلاسٹ ہیں، محسن، ان کا کیس تم ذاتی توجہ سے حل کرو گے۔“

باس کی ٹار ہوتی نگاہیں ایک ہل کو بھی ساڑہ کے چہرے سے ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔ وہ بات مجھ سے کر رہے تھے مگر دیکھ ساڑہ کو رہے تھے۔

”انہیں تو میں پہلے سے جانتی ہوں فرقان صاحب۔“ وہ ایک ساحرانہ مسکراہٹ کے ساتھ نزاکت سے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

یہ بات حیرت زدہ کرنے کے لیے کافی تھی کہ اس نے ابھی تک مجھ جیسے معمولی انسان کو یاد رکھا ہوا تھا۔ وہ میری کلاس فلورہ چچی تھی اور شاید گرل فرینڈ بھی۔ شاید کال ففٹ میں نے اس لیے استعمال کیا کہ میرا اور پورے ڈیپارٹمنٹ کا خیال تو یہی تھا لیکن ساڑہ ایسا نہیں سوچتی تھی۔ میں اپنی کلاس کا ایک چھٹلا کا سچھا جاتا تھا جسے پڑھنے کے علاوہ اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی اور ایسے میں ساڑہ کا میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا بذات خود ایک حیران کن امر تھا۔ ان دنوں مجھے ساڑہ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ پارٹ ٹائم جاب سے ملی رقم سے میں اس کی خواہشات پوری کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا لیکن اس کی خواہشات زیادہ وسیع تھیں اور میری جیب مختصر۔

تب کلاس میں ایک نیا لڑکا آیا عثمان۔ جس کے باپ کی بے پناہ دولت نے اس کی طبیعت کو فلرٹ کی طرف مائل کر دیا تھا اور ایلے لڑکے کی نظر ساڑہ جیسی خوبصورت لڑکی پر نہ پڑے یہ کیسے ممکن تھا۔

لیکن اس سے بھی زیادہ توشیش کی بات یہ تھی کہ ساڑہ کی توجہ خاص بھی مجھ سے ہٹ کر اس پر مرکوز ہو چکی تھی۔ میں جتنا بھی بے حس اور چھٹلا نظر آتا تھا مگر تھا تو ایک انسان ہی، دل میں ساڑہ کے تعافلی نے حسد و رقابت کے بجائے جلا دیے تھے۔

کچھ عرصے بعد ہم وہ علاقہ چھوڑ کر ایک نسبتاً مضائقہ

علاقے میں منتقل ہو گئے اس طرح اسکول بدلا تو ساڑہ اور اس سے متعلق دل آزار یادیں بھی وہیں رہ گئیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انسان اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتا حالانکہ اس دوران کئی عورتیں میری زندگی میں آئیں کیونکہ اب میں ایک بیوقوف اسکول بوائے کے بجائے ایک خوب رو برسر روزگار انسان تھا۔

اور اب وہی قتالہ میرے سامنے ٹھہری تھی تاکہ اس کے شوہر اچھدی بے وفائی کے ثبوت اکٹھے کروں کہ اس کا شوہر ایک بھونرا مصنف مرد تھا جس کی توجہ بیوی سے زیادہ دوسری عورتوں پر رہتی تھی اور وہ اس بات کو بنیاد بنا کر طلاق لینا چاہتی تھی۔

”محسن تم نہیں جانتے میں تمہیں کھوکھلا چھپاتی ہوں۔ اچھدی ایک بے حس اور جذبات سے عاری انسان ہے جس کے لیے میری بے پایاں محبت کوئی معنی نہیں رکھتی اور وہ گھٹیا عورتوں کے ساتھ وقت بتاتا ہے۔“ وہ گھوگر لہجے میں بولی۔

میری آنکھوں سے چھلکتے ستاسی جذبات یقیناً اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں رہے تھے۔ اس کے لہجے کی نرمی کچھ اور بھی بڑھ گئی۔

جتنی دیر وہ میرے پاس رہی میرے دل کی دھڑکن اچھل پھٹل ہوتی رہی۔ یہ عورت تو کسی کو بھی دل کا مریض بنا دے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سوچا۔

اس کے گھر..... اچھدی کے آفس کا پتا اور تصویر ایک لفافے میں موجود تھی۔ میں نے ایک نظر تصویر کو دیکھا وہ موٹا اور بھدرا سا ایک اچھدی عرصہ تھا جس کی داغ و خوار شاید اس کی دولت تھی۔

☆ ☆ ☆ دوسرے دن اس کے آفس کی بلڈنگ کے باہر اپنی کار پارک کرتے ہوئے میں نے بالکل نہیں سوچا تھا کہ کامیابی اتنی بڑی اور غیر متوقع..... ہوگی۔ وہ اسی بلڈنگ سے باہر نکلا اور میں غیر ارادی طور پر اسے دیکھنے لگا۔ وہ آفس کے مخصوص قافل لباس میں تھا۔ اچھدی اس نے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر نظر ڈالی اور نمبر دیکھ کر اس کے مونے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ سیل فون کان سے لگا کر اس نے بات کرنا شروع کر دی۔ میری تمام توجہ اس کی گفتگو کی طرف تھی۔ وہ یقیناً دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی محبوبہ سے محو گفتگو تھا اور میں نے اچھی طرح اس ہونٹ کا نام اور دردمنہ لٹو کر لیا جہاں وہ رات کو ملنے والے تھے۔ وہ کار میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوا تو میں نے اس کی نظروں سے بچنے کے لیے اخبار اٹھا کر منہ کے آگے پھیلا لیا۔

☆ ☆ ☆

ان کے نکلنے ہی میں نے فوراً وہاں سے ہریا بستر مینا۔ اب میری گاڑی کا رخ اس ہونٹ کی طرف تھا جہاں ان کو ملاقات کرنا تھی ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میں اپنا ہوم ورک مکمل کر لیتا چاہتا تھا تاکہ اچھدی کوئی غیر متوقع صورت حال پیدا ہونے پر پلان بی تیار ہو۔

میرا یہ طریقہ کار ہمیشہ کام آتا تھا۔ وہ ایک دیلا پتلا ڈیڑھا تھا جو اس ہونٹ کی پچھلی گلی میں کچرا چھینٹنے نکلا تھا۔

”شش شش۔“ میں نے زور سے ہشکارا بھرا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر دائیں بائیں۔

”ہاں ہاں تمہیں ہی پکارا ہے۔“ میں نے ہزار کا ایک نوٹ ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ میرے نزدیک آیا۔ اس کی نظر نوٹ پر پڑی۔

”کیا بات ہے؟“ وہ کچھ سختی سے بولا۔ ”یہ نوٹ لینا چاہو گے۔ اور ایسے ہی چند اور نوٹ بھی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے تمکونہ لگا۔ ”کرنا کیا ہوگا؟“

میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ کیا کرنا ہوگا۔ اس کی آنکھیں یہ سب سن کر پچھلتی چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

یہ اسی ہونٹ کا لائڈری روم تھا جہاں میں ایک سیلی سی ڈائری بنے موجود تھا۔ رات کے اس پہر بہت مشکل تھا کہ کوئی مداخلت کرنا مگر احتیاط لازم تھی۔

وہی محب اللہ نے اس کمرے کی بیرونی دیوار کے پاس ایک سیڑھی لاکر رکھ دی تھی جس کے برابر والے کمرے میں میرا مطلوبہ جوڑا موجود تھا اور میں تمام ساز و سامان سے لیس تھا جس میں شیشہ بدلنے کے لوازمات کے ساتھ میرا کیمرا بھی موجود تھا۔ میں ایک شیشہ ساز کے روپ میں اس سیڑھی پر کھڑا تھا۔ حالانکہ شیشہ بدلنے والے راتوں میں کام نہیں کرتے لیکن یہ بات کوئی چھوٹا سبب دیکھی جاتی۔

میں نے ماحول سازگار دیکھ کر سیڑھی کھسکی جسے سازگار بنانے میں یقیناً محب اللہ کا بڑا ہاتھ تھا میں مطلوبہ کمرے کی بالکونی میں اتر گیا۔ بالکونی کے دروازے پر پردے تھے مگر میرے ڈیجیٹل کیمرے کو بس ایک معمولی سی بھری کی ضرورت تھی جو پھر آسانی مل گئی۔ میں نے تیزی سے کئی تصویروں بنائیں اور سامان سمیٹا ہوا بیچنے اتر گیا۔

☆ ☆ ☆

آج میں پھر سیٹھ اچھدی کے دفتر کے باہر موجود تھا۔ طویل

معلومات

☆ سب سے زیادہ لمبے لوگ ہالینڈ میں پائے جاتے ہیں۔

☆ دنیا میں سب سے زیادہ کھائی جانے والی سبزی آلو ہے۔

☆ آلو میں 78 فیصد پانی ہوتا ہے۔ اگر چھلے ہوئے آلوؤں کو دیر تک ابالا جائے تو حیاتین سی کا زیادہ حصہ ضائع ہو جاتا ہے۔

☆ کاغذ سب سے پہلے چین نے بنایا۔

☆ دنیا میں گلاب کی کم و بیش 792 اقسام ہیں۔

☆ بھٹی کا نام دیکھ کر گھبرنے لگا تھا۔

☆ پوری دنیا میں کم و بیش 3064 زبانیں بولی جاتی ہیں۔

☆ ہم بولتے ہیں تو 70 عضلات حرکت کرتے ہیں۔

☆ انسانی جسم میں کل 639 عضلات ہیں۔

☆ مسلمان محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

انتظار کے تمام لوازمات کے ساتھ شام کے سات بج چکے تھے۔ دفتری اوقات ختم ہونے لگے شام کے سات رات کے اندھیروں میں مدغم ہونے لگے لیکن سیٹھ کے باہر نکلنے کا کوئی چانس نظر نہ آیا۔

اور عین اس وقت جب میں پورا دن ضائع جانے پر دل جلاتا گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی لگا تھا، وہ عمارت کی سیڑھیاں اترتا نظر آیا اور اس سے چند قدم پیچھے ایک طرح دلد میں بائیں سالہ حسینہ لہرائی تل کھاتی ہوئی نظر آئی۔ اس وقت تمام بلڈنگ تقریباً سنان ہو چکی تھی وہ یقیناً ایک ہی آفس سے نکلے تھے۔

میں جلدی سے گاڑی کو تیار حالت میں لایا ان کے آگے بڑھتے ہی میں خاموشی سے ان کے پیچھے لگ گیا۔ اچھدی کا رخ اپنے گھر کے بجائے کہیں اور تھا۔ جلدی ایک پوش رہائشی کالونی میں گاڑی رکھ کر وہ اتر کر گھر کے اندر چلے گئے۔ وہ ایک خوبصورت مکان تھا جس کا گیٹ کسی بھی قسم کے گاڑیا یا چوکیدار سے خالی تھا۔

اوائلی دن تھے۔ موسم بہار شروع ہونے والا تھا مگر سردی کی شدت برقرار تھی۔ نرم دھوپ چار سو پچھلی ہوئی تھی۔ سلی زمین پر کئی روز بعد سورج کی حدت پڑی تو مٹی کی مہک پورے ماحول میں پھیل گئی۔

ٹھنڈاں چائے

مختار آزاد

انسان احساسات و جذبات کے سپارے بہت اچھی زندگی جی لیتا ہے مگر کبھی زندگی ہار بھی جاتا ہے۔ وہ جو اپنے گھر کا خوبصورت خواب آنکھوں میں سجائے اپنے معصوم بچوں کے لیے دنیا بھر سے خوشیاں سمیٹ لایا تھا اور ان کے لمس میں ہی اس کے لیے توانائی پوشیدہ تھی کہ دھیرے دھیرے زمانے کی گرم اور بے مروت فضا نے وہ خوبصورت چہرے اور دلگداز لمس کو اپنی کالی چادر میں چھپالیا۔

غفلت کے حکاروں میں سوز بچائی
ایک پر لگ کر تحریر



”زبردست۔“ وہ چچھائی۔ ”تم نے بہترین کام کیا ہے۔ اب دیکھنا میں کیسے سیٹھ امجد کو کئی کا ناچ نچاتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اسے بالکل احساس نہیں تھا کہ وہ میرے سامنے اپنی اصل شخصیت بے نقاب کر رہی ہے۔

”یقیناً.....“ میں نے مسکرا کر ایک اور لفافہ اس کے حوالے کیا۔

”تمہارے لیے بطور غامس۔“

میں نے وہ دیز لفافہ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور غور سے اس کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

اس نے نزاکت سے وہ لفافہ تھما، کھول کر دیکھا اندر موجود تصاویر دیکھ کر وہ کچھ چونکی، پہلی پھر دوسری اور تیسری تصویر دیکھتے تک اس کا گلابی چہرہ دھلے ہوئے لٹھے جیسا سفید ہو چکا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟“ اس نے جلدی سے لفافہ بند کر دیا اور چورنگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”اوہ تم باقی تصاویر تو دیکھو ان میں تم نے زیادہ خوبصورت بکواس کی ہے۔“

”ویسے تمہاری تصویریں بہت واضح آئی ہیں اور یہ شخص کون ہے تمہارے ساتھ؟ امجد تو نہیں لگتا۔ ہاں اس جتنا بھدا ضرور ہے۔ اس کا پانٹو تو نہیں؟“ میں نے لو فرنا انداز میں ایک آنکھ دبائی۔

”بہت مشقت ہوئی مجھے ہوئی کی بالکونی میں لنگ کر تصویریں لینے میں کافی رقم بھی خرچ ہو گئی مگر بے وفائی کا ثبوت بھی تو حاصل کرنا تھا۔“ میں نے اسے چھیڑا۔

”بکواس بند کر دو ذیل آدی۔ یہ سب کرنے کا تمہارا مقصد کیا ہے؟“ وہ دوبارہ آواز میں بولی۔

”بس پانچ لاکھ.....“ میں نے ساٹ انداز میں کہا۔

”اور یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ یہ رقم کس طرح مجھے تک پہنچانی ہے تب تک تم انہیں دیکھ دیکھ کر انجوائے کرو۔“

میں نے کرسی گھسیٹ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس کے گم ضم چہرے پر ایک نظر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

وہ ایک خود غرض اور احسان فراموش عورت تھی۔ ابتدا میں اس سے ہمدردی کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا وہ اس کی حرکات دیکھ کر بالکل فنا ہو چکا تھا۔ وہ جو کچھ میرے ساتھ کر چکی تھی اب اپنے شوہر کے ساتھ کر رہی تھی۔

اب میں اس سے رقم وصول کرتا یا نہ کرتا مگر اس کے سر پر لٹکی ہوئی کوار کا خوف ہی اب اس کی سزا بن گیا تھا۔

تھوڑی دیر انتظار کر کے میں بھی بیرونی دیوار پھلانگ کر ان کے پیچھے لپکا۔ کمر اتار حالت میں میرے پاس تھا۔

میں باہر نکلا تو نہ صرف تصویریں بلکہ ان کی ویڈیوز بھی ہاتھ آ چکی تھیں۔ اب یہ اتنا مواد جمع ہو چکا تھا کہ سارے کے حوالے کیا جاسکتا۔

☆☆☆

اس ریسٹورنٹ میں بیٹھے مجھے پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور وہ ابھی تک نہیں پہنچی تھی یا شاید میں ہی وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ میں نے صرف اسے کام مکمل ہونے کی اطلاع دی اور اس نے فوراً یہاں ملنے کا پروگرام بنالیا۔

اچانک ریسٹورنٹ کے دھندلے ماحول میں روشنی سی بھگ گئی وہ اب نئی پسندیدہ سیاہ رنگ کی جھلملائی ساڑی میں ملبوس اندر داخل ہوئی تھی۔

”کیا تمہیں یہ جگہ پسند آئی، یہ میرا پسندیدہ ریسٹورنٹ ہے۔“ وہ ایک ادا سے میری طرف جھکتے ہوئے بولی اور میں نے شیشا کرنگا میں ہٹائیں لیکن پھر تڑپتی نظر سے دوبارہ وہیں دیکھنے لگا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ میں غور سے اسے دیکھتے ہوئے بولا لیکن تم مجھے موقع دیتیں تو میں اس سے بھی بہتر جگہ کا انتخاب کرتا۔“

”اوہ ضرور اگلی بار یہ چوائس تم رکھ لیتا۔“ وہ بظاہر بے نیازی سے بولی تو میں نے قہقہہ لگا دیا۔

”دیکھتے ہیں فی الحال تو یہ لو۔“

میں نے ایک تصویروں کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے مسکرا کر وہ کھول کر دیکھا۔ ایک ایک کر کے تمام تصاویر دیکھتی گئی۔ وہ سب عام سی تصویریں تھیں اس میں ایسا کچھ نہیں تھا جو سیٹھ امجد کو کسی کیس میں الجھا سکتا۔ اس نے حیرت سے مجھ سے دیکھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“

تب میں نے اپنے موبائل میں محفوظ سیٹھ امجد کی ویڈیو بٹیر کر کے اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ کسی بھی طرح قابل اعتراض نہیں تھی۔ ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ لڑکی سیٹھ امجد کی بیٹی تھی۔ ایک ایسی بیٹی جسے وہ دنیا کے سامنے اپنانے سے قاصر تھا۔ کچھ دیر وہ ابھی ہوئی نگاہوں سے ان تصاویر کو دیکھتی رہی اور پھر اچانک اس کی نگاہوں میں چمک ابھری اور میں اس روشنی کا سبب جان گیا۔ وہ اب بھی سیٹھ امجد کو بلیک میل کرنے کی پوزیشن میں تھی۔ اس بیٹی کو دنیا کے سامنے نہ لانا یقیناً سیٹھ کی مجبوری رہی ہوگی اور وہ اس کا فائدہ اٹھا سکتی تھی۔

تھا بالکل اپنی ماں کی طرح مگر جب کچھ دنوں بعد انہوں نے گھر کا سامان باندھنا شروع کیا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ لفظ پریشانی لاتا ہے۔ اس لفظ کے بعد گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔

”اماں! ہم کہیں جا رہے ہیں؟“ اس نے گھر کا سامان سمیٹ کر باجمعی ہوئی ماں کو حیران نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس صبح ماں نے اسے اسکول جانے سے بھی روک دیا تھا۔

”بیٹا..... ہم دوسرے شہر جا رہے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

مل کو لے آف کے نام پر تالا لگا تو وہ لاہور آگئے۔ احمد علی کو نئے اسکول میں داخل کروادیا گیا۔ یہاں اس کے باپ کے جاننے والوں نے اسے ایک اور مل میں کام دلوا دیا تھا۔ دو تین سال کے بعد اسے کسی جاننے والے کی معرفت محکمہ ڈاک میں چراسی کی ملازمت مل گئی۔ وہ اب پکا سرکاری ملازم بن گیا تھا۔ یونہی لمبا عرصہ گزر گیا۔ کہ ایک دن اس کا باپ دل کا دورہ پڑنے سے چل بسا۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد اسے جھکے کے کچھ لوگوں کی کوششوں سے باپ کے کوٹے پر پوسٹ مین کی نوکری مل گئی۔ تب وہ انٹر میں پڑھ رہا تھا، اس نے تعلیم ادھوری چھوڑی اور بس! اب وہ صرف کام کا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کی ملازمت کو کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ ماں کو بخار چڑھا۔ لاکھ دوا دارو کی گمرے سوئے۔ ایک رات وہ بھی چل دی۔ وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اسی دوران اس کا تبادلہ گجرات کے ایک قصبے میں کر دیا گیا۔ گھر تو تھا ساری، سوچوڑنے میں تڑوکیا۔ اس نے مختصر سا سامان باندھا اور نئے شہر میں اپنی نئی زندگی شروع کرنے پہنچ گیا۔

گجرات میں کئی برس تک وہ ڈاک بانٹتا رہا۔ اسی دوران احمد علی نے تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ پرائیویٹ طور پر ایم اے کا امتحان پاس کیا، جس کے بعد اسے ترقی ملی۔ اب وہ قصبے کے ڈاک خانے میں پوسٹ ماسٹر لگا دیا گیا تھا۔ کئی برس وہ قصبے میں گزار چکا تھا۔ اس نے پیسے جوڑ جوڑ کر وہیں ایک پلاٹ خریدا۔ ایک دن وہ اپنے پلاٹ کو دیکھنے گیا تو اچانک اس کی نظر ایک دوشیزہ پر پڑی۔

وہ دوشیزہ ماہ انجم بھی۔ سبزیوں کے آڑھی کرم الہی کی بیٹی۔ وہ آٹھ جماعت پڑھی ہوئی تھی۔ اسے پہلی بار کیا دیکھا کہ احمد علی اپنا دل ہی ہار گیا۔ بس..... پھر اس کے بعد کیا تھا۔ اب اکثر احمد علی اپنے پلاٹ پر نظر آنے لگا۔ وہ ڈیوٹی سے فارغ ہو کر یہیں پہنچ جاتا۔ کبھی پلاٹ کی صفائی کرنے

لگتا، کبھی چوڑے سے کپڑے پہنچتا کہ جیسے کل ہی بنیادوں کی کھدائی شروع ہونے والی ہے۔ یہ بات تو صرف وہی جانتا تھا کہ محبت کا کل اس کے دل میں تعمیر ہونے لگا تھا۔

اس دوران احمد علی نے کئی بار ماہ انجم کو گلی میں آتے جاتے ہوئے دیکھا۔ خاموش نگاہوں کے راز وہ بھی بھانپ چکی تھی۔ اسے دیکھنے کے بعد پہلی بار احمد علی کے دل میں وہ جذبہ انگڑائی لے کر بیدار ہونے لگا جسے محبت کہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کی محبت عشق میں بدلتی گئی اور پھر اس نے کچھ دوستوں سے بات کی۔ دو تین بزرگ بیچ میں آئے، کرم الہی کے ہاں رشتے کی بات چلائی گئی اور پھر ایک دن ماہ انجم کے نور سے اس کا سونا آنگن رنگ دنور میں نہا گیا۔

احمد علی ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ راستہ اس کا جانا پہچانا تھا مگر آج..... وہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا تو دوسرا قدم اٹھانا دو بھر ہو رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن اس کا شروع سے ہی پسندیدہ تقریبی مقام تھا۔ اسے وہاں بیٹھ کر جانے پینا اور آتی جاتی ٹرینوں میں سوار اپنی مسافروں کو بتا کر کسی تعلق کے، ہاتھ ہلا کر الوداع کہنے میں بہت لطف آتا تھا۔

وہ چلتے چلتے ٹھک گیا تھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ کھڑا ہوا اور ہاتھ بڑھا کر کنارے کے سنگ میل کا سہارا لیا اور خالی خالی نگاہوں سے سڑک کو نکتے لگا۔ یہ بڑی سڑک تو تھی نہیں کہ آتی جاتی گاڑیوں کا شور ہوتا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اس کا ذہن ایک بار پھر ماضی میں پہنچ گیا۔

جب اس کے بچے چھوٹے تھے تو وہ ہر شام انہیں سائیکل پر بٹھا کر اس سڑک پر گھماتے کے لیے لے کر نکلتا تھا۔ بڑا بیٹا پیچھے کیرتیر پر بیٹھا تھا۔ دوسرا بیٹا آگے ڈنڈے پر اور سب سے چھوٹی بیٹی کو وہ سامنے باسکٹ میں بٹھا دیتا تھا۔ وہ سب ہنسنے کھیلنے، باتیں کرتے مڑے کرتے تھے۔ قریب میں کھیت تھے۔ اکثر بچے فرمائش کرتے کہ سائیکل روکو اور پھر وہ چاروں وہیں سڑک کنارے آکھ چھوٹی کھیلنے لگتے۔

تیززی سے ایک کار ہارن بجاتی گزری، وہ چونک گیا۔ اس نے جلدی سے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ ایسا لگا جیسے وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہو مگر وہاں تو دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ اب تک ماضی کے بحر میں گرفتار تھا۔ اس نے کندھے سے لٹکے بیگ کا فیتہ تھوڑا اور اوپر کی طرف کھسکایا اور آگے بڑھنے لگا۔

ریلوے اسٹیشن اور اس کا پرانا ساتھ تھا۔ اب بھی ہر شام وہ وہاں تک ٹہل کر آتا تھا مگر آج وہ گھر سے نکل کر وہاں جا تو رہا تھا مگر ٹھٹھانے کے لیے۔ وہ اپنے قصبے،

اپنی یادوں اور اپنی محبوب بیوی کی قبر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گاہی چھوڑ کر انجان منزل پر پہنچنے کے لیے ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر قبرستان واقع تھا۔ اس کی دیوار انجم کی قبر سڑک کے قریب تھی۔ وہ اس جگہ پر پہنچ کر رکا۔ ایک طائرانہ نظر قبرستان پر ڈالی اور سڑک سے اتر کر قبرستان میں داخل ہو گیا۔ وہ بیوی کی قبر کے قریب پہنچ کر رکا۔ کندھے سے تھماتا رہا۔ اس میں کچھ سدا بہار پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔ اس نے آج صبح ہی بارش سے وہ پھول توڑ کر اپنے ہاتھوں سے یہ گلدستہ بنایا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے پھول قبر کے سر ہانے رکھے۔ تھماتا قبر کے ایک کونے سے لگا یا اور فاتحہ پڑھنے لگا۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

ماہ انجم اور اس میں مثالی محبت تھی البتہ بچوں کے ہونے کے بعد اس کی توجہ بٹ گئی تھی۔ اکثر وہ بڑے پیار سے اس کی بے رخی کی شکایت کرتا تھا اور ہر بار اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ ”تمیں بچے تم پاؤ تو پھر پتا چلے گا۔“

یہ حقیقت تھی۔ خود احمد علی بھی اس بات کا اکثر اس کے سامنے اعتراف کرتا تھا۔ جب سے بچے اسکول جانا شروع ہوئے تھے، تب سے تو ماہ انجم کی مصروفیات اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ وہ خود تھوڑا بہت پڑھی لکھی تھی۔ اسے ہمیشہ سے اپنی تعلیم ادھوری رہ جانے کا احساس رہتا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ جب سے بچے ہوئے تھے، اس کی ایک ہی خواہش تھی سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں۔ وہ الکوٹی بیٹی کو ڈاکٹر بننا کر اپنی نا آسودہ خواہش کی تکمیل چاہتی تھی۔ وہ اپنی عمرانی میں ان کا ہوم ورک مکمل کراتی۔ خود احمد علی بھی اپنے سینے ہر ممکن کوشش کرتا تھا کہ بچوں کی پڑھائی میں بیوی کا ہاتھ بٹائے۔ یہ ان دونوں کی لگن اور محنت کا نتیجہ تھا کہ بچے بھی پڑھائی کے میدان میں غیر معمولی طور پر آگے تھے۔

آخر وہ دن آئی گیا جب ان کی محنت کا ثمر نظر آنے لگا۔ جس دن اس کے دونوں بیٹے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکا ر شپ حاصل کر کے امریکا گئے، وہ دن ان کی زندگی کا سب سے بڑا دن تھا۔ وہ دن جب بیٹی نے ایم بی بی ایس کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا، وہ دن ان دونوں کے لیے ہی بہت خاص تھا مگر ماہ انجم کے لیے تو یہ معراج تھا۔ بیوی کی قبر پر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے اسے یاد آ رہا تھا کہ بیٹی کے ڈاکٹر بننے کی خوشی میں اس روز کتنے چاکوے ماہ انجم نے ہارے محلے میں جلیبیاں، گلاب جان اور موتی چور کے لڈو

پائے تھے۔ کتنی خوش تھی وہ اس دن۔ لگتا تھا جیسے بیٹی نے نہیں، خود اس نے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا ہے۔

اسے وہ دن بھی یاد آ رہا تھا جب بیٹی کی شادی ہوئی تھی۔ وہ ان سب سے بہت دور جا رہی تھی۔ لڑکا لندن میں رہتا تھا اور اس کی بیوی کے دور کے ایک رشتے دار کا بیٹا تھا۔ وہ خود بھی ڈاکٹر تھا۔ اب بیٹی بھی بیادہ لندن جا رہی تھی۔ احمد علی کو یہ بھی یاد آ رہا تھا جس دن وہ لندن کے لیے روانہ ہونے والی تھی، اس روز اس کی بیٹی کتنی خوش تھی۔ وہ وہاں جا کر میڈیکل کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی مگر ماہ انجم..... وہ تو اس روز بالکل چپ تھی۔ اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں، چہرہ افسردہ تھا۔ وہ دھکی تھی اور گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی کوکھ سے جنم لینے والی اولاد ایک، ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ وہ بھی اس وقت چپ وہ سمجھ رہی تھی کہ اب اسے ان بچوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ جب بچوں کو ماں کی آغوش کی ضرورت تھی، تب وہ ایک مل بھی ان سے دور نہ ہوئی مگر اب جب اسے بچوں کے قریب ہونے کا احساس درکار تھا، تب سب انہیں چھوڑ کر جا چکے تھے۔

”دکھ نہ کر۔“ لاہور انٹر پورٹ پر بیٹی کو الوداع کہتے ہوئے ماہ انجم کی آنکھیں پھیک گئی تھیں، تب احمد علی نے اس کا ہاتھ تھام کر کھلی دی۔ قبر پر بیٹھ کر فاتحہ پڑھتے وقت وہ منظر اس کی آنکھوں میں گھوم رہا تھا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ اس شام جب وہ بیٹی کو الوداع کہہ کر گھر لوٹ رہے تھے تو کتنے اداس اور خاموش تھے۔ ماہ انجم تو اس سے بھی زیادہ دل گرفتہ تھی۔ دلوں کا حال جاننے کے لیے انہیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں گھر پہنچنے کی بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ ڈرائیور بہت لمبی رفتار سے بس چلا رہا تھا۔ کئی جگہ وہ رکا مگر ایک بار بھی ماہ انجم نے اپنے لب نہ کھولے۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے ٹیک لگائے اپنے آپ میں گم تھی۔ تب احمد علی نے سمجھ لیا کہ اس کی زندگی نئی راہ پر چل پڑی ہے۔

اسے یہ بھی یاد آیا کہ ایک بار وہ کسی ضروری کام سے بیوی کو لاہور لے کر گیا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے جانے پر تیار ہوئی تھی، وہ بھی اس شرط پر کہ مغرب سے پہلے لوٹ آئیں گے۔ وہ بچوں کو گھر پر ہی چھوڑ کر جا رہے تھے۔ سارا دن وہ بار بار بیٹی کہتی رہی۔ ”جلدی چلو، بچے گھر میں اکیلے ہیں۔“ حالانکہ اس وقت بیٹے میٹرک اور نویں کلاس میں پڑھتے تھے اور بیٹی ساتویں جماعت میں تھی۔ وہ اتنے چھوٹے بھی نہیں تھے واپسی پر بس ڈرائیور بہت تیز بس چلا رہا تھا مگر وہ بہت

ہے جین تھی۔ وہ رہ کر کھڑکی سے باہر جھانکتی، آسمان کی طرف دیکھتی اور پھر احمد علی سے کہتی۔ ”یہ گاڑی تیز کیوں نہیں چلا رہا؟“ وہ عصر کے وقت گھر پہنچے۔ بچے محسن میں ٹھیل رہے تھے۔ پورے دن میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نظر آئی تھی۔

وہ بیٹی کو اوداع کہہ کر گھر جا رہے تھے۔ اس کے چلے جانے کے بعد تو وہ بالکل ہی تنہا ہو چکے تھے۔ احمد علی سوچ رہا تھا کہ بچوں کو چند گھنٹے تنہا نہ چھوڑنے والی ماں اب کتنی تنہا ہوگئی ہے۔ وہ بیوی کے بارے میں سوچ رہا تھا مگر وہ خود کتنا اکیلا پڑ گیا تھا، یہ بات شاید ماہ انجم سوچ رہی ہوگی۔ کبھی بچے اسے خوش آمدید کہتے تھے مگر اس دن جب احمد علی نے گھر کا تالا کھولا تو۔۔۔ تنہائی نے بوڑھے جوڑے کو خوش آمدید کہا تھا۔

اولاد کے چلے جانے کے بعد ایک دن بیوی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا اور یہاں قبرستان میں آکر ڈیرے ڈال لیے تھے۔ خالی گھر، تنہائی اور سناٹے کا عذاب صرف احمد علی کے حصے میں رہ گیا تھا لیکن اب وہ بھی جا رہا تھا سب کچھ اپنے ذہن کے کہاں خانوں میں سمیٹ کر۔

”میں آج تیرے پاس آخری بار آیا ہوں۔“ اس نے جب سے رومال نکال کر کتبے پر پڑی گرد صاف کرتے ہوئے خود کلائی کی۔ اس کے بعد وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھا کتبے کو دیکھتا رہا۔ ماہ انجم اس کی بیوی ہی نہیں محبوبہ بھی تھی اور محسن مرحاج پر پہنچے جانے تو جذبے اظہار کے لیے الفاظ کے محتاج نہیں رہتے۔ یہی حال احمد علی کا بھی تھا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا مگر اس کا دل بائیں کر رہا تھا۔ دل، جس کی بات وہی سن سکتا ہے جس کا دوسرے سے رشتہ بھی دل کا ہو۔ ماہ انجم کی موت کے بعد بھی وہ دلوں کے رشتے برقرار تھے۔ کم از کم اس وقت احمد علی کو تو دیکھ کر یہی محسوس ہو رہا تھا۔

”اچھا۔۔۔ اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے یہ ظاہر تو خود کلائی کی بھی مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت وہ اپنا محبوبہ سے ہم کلام تھا۔ اس نے کیا جواب دیا۔ چہار سوسنا تھا مگر احمد علی کے دل نے وہ جواب ضرور سن لیا ہوگا۔

وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کھڑا ہوا۔ ”اوپر والے سے کہنا کہ اب ہمیں یہاں نہیں، وہاں ملوادے۔“ اس نے آسمان کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تو اللہ کی حافظہ ہے ہمارا۔“

یہ کہہ کر اس نے کندھے پر تھپا لٹکا یا اور تھکے تھکے قدموں اور شکستہ روح کے ساتھ قبرستان سے باہر نکلے گا۔ سڑک پر پہنچ

کر اس نے ایک بار پھر محبوبہ کی قبر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ہاتھ پلا یا اور سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔ نکت گھر، ریلوے اسٹیشن کے باہر بنا ہوا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے جیب سے بٹوا نکالا اور پیسے نکت گھر کی کھڑکی میں ہاتھ ڈال کر باہر کی طرف بڑھائے۔ نکت لے کر وہ چند سیڑھیاں چڑھا اور پلٹ فارم پر پہنچ گیا۔

”گاڑی کب آ رہی ہے؟“ اسے چائے کے اسٹال پر نکت چیکر نظر آیا تو اس نے پوچھا۔

”آدھا گھنٹا لیٹ ہے۔“ اس نے گرم گرم چائے کی چسکی لے کر کہا۔

”ارے بابو صاحب آپ۔۔۔۔۔“ اسی دوران چائے والے کی نظر اس پر پڑی تو اس نے گرجوٹی سے کہا۔ ”کہاں چل دیے آج؟“ اس نے احمد علی کے کندھے سے لٹکتے سفری تھیلے پر گہری نظر ڈالی اور معنی خیز انداز میں پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ارادہ تو ہے۔“ کچھ لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے گول مول جواب دیا۔

بھولا چائے والا بڑا باتونی تھا۔ وہ قصبے سے کافی دور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ ہر روز اپنی سائیکل پر یہاں تک آتا جاتا تھا۔ سائیکل بھی پلٹ فارم پر اس کے کھوکھے کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔

”کدھر کا ارادہ ہے بابو جی۔“ اس نے شرارت سے پوچھا۔ ”چائے پیو گے؟“ یہ کہہ کر اس نے جواب کا انتظار نہ کیا اور خود ہی کیتھلی میں پانی اور دودھ ڈالنے لگا۔ ”نو بھلا، اتنی سردی میں چائے سے انکار کون کرے گا اور وہ بھی سیری چائے۔“ اس نے احمد علی کو دیکھتے ہوئے فخر سے کہا اور کیتھلی چوبے پر رکھ دی۔

احمد علی اس سے اچھی طرح واقف تھا۔ اکثر یہاں آتا رہتا تھا۔ اسی لیے دونوں میں کچھ کچھ دوستانہ بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی۔ ویسے بھولا عمر میں تو اس کے بیٹے سے بھی چھوٹا تھا۔

”ویسے تمہاری چائے ہوتی مزیدار ہے۔“

”شکر ہے جی۔“ یہ کہہ کر وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”سچ بات تو منہ سے نکل ہی جاتی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ خود ہی ہنس پڑا، احمد علی بھی مسکرایا۔

بھولا چائے بنانے میں مصروف تھا۔ وہ طائرانہ نگاہوں سے پلٹ فارم کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت وہاں صرف دو چار ہی مسافر موجود تھے، تقریباً پورا پلٹ فارم

خالی تھا۔

”سن بھولے۔۔۔۔۔“ احمد علی نے پکارا۔ بھولا جھک کر امدادی کے نچلے خانے سے کچھ نکال رہا تھا۔ ”یہاں شیڈ کے نیچے کافی ٹھنڈ ہے۔“ احمد علی نے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے رگڑتے ہوئے کہا۔ ”میں سامنے دھوپ میں بیٹھا ہوں، وہاں چائے دے جاتا۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ اس نے جواب دیا اور پھر اپنے ہاتھ میں لگ گیا۔

احمد علی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ تھیرا اتار کر بیچ پر رکھا اور پھر خود بھی اسی سگنی بیچ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ خاموشی، سردیوں کی زرد دھوپ، سامنے سرسوں اور گہیوں کے سرسبز کھیت، پلٹ فارم پر جنگلی کبوتروں، چڑیاؤں اور میناؤں کی چپکار۔۔۔۔۔ کچھ دیر کے لیے وہ اپنا دکھ بھول کر اس منظر میں کھو گیا۔

اسے یاد آئے گا جب اس کے تینوں بچے چھوٹے تھے تو وہ چھٹی والے دن ناشتے کے بعد انہیں لے کر یہاں آ جاتا تھا۔ ایک تھیلے میں وہ کھانے پینے کی چیزیں بھی رکھ کر لے آتا اور پھر وہ دوپہر تک یہاں ٹھہرتے تھے۔ بچے سمجھتے کہ وہ انہیں تفریح کے لیے لاتا ہے مگر وہ سمجھتا تھا کہ سردیوں میں کم از کم بچوں کو ہفتے میں ایک دن چند گھنٹے تک ضرور دھوپ تاپنا چاہیے۔ جس سے وہ کئی موی بیماریوں سے بچ سکتے ہیں۔ یہ بات اس کی ماں کہا کرتی تھی۔ بچپن میں سنی یہ بات اسے خود صاحب اولاد ہونے تک یاد تھی۔

اچانک کوسے نے زور سے کائیں کائیں کی۔ احمد علی کا انتہاک ٹوٹ گیا۔ اس نے گردن موڑی۔ وہ برابر لگے نیم کے درخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ حدنگاہ تک فواد ی پٹوئی نظر آ رہی تھی۔ گاڑیوں کے آنے جانے سے پٹوئی کی اوپر سی چاندی جیسی رنگت اختیار کر چکی تھی۔ سورج کی کرنوں میں تو وہ اور چمک رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ بچوں کو گھمانے کے لیے یہاں لاتا تھا اور اگر گاڑی کے آنے کا وقت نہ ہوتا تو وہ لائن بنا کر اس پٹوئی پر ایک کے بعد ایک قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتے تھے۔ یہ ان کا ریل گاڑی ٹھیل ہوتا تھا۔ سب بچے اپنے سے آگے والے کی ٹھیل کا پچھلا دامن پکڑ کر ڈبے کی طرح جڑ جاتے تھے۔ احمد علی اس بچہ گاڑی کا انجن ہوتا تھا۔ وہ منہ پر کھڑی تھیلی رکھ کر انجن کی طرح سیٹی بجاتا اور جھمک جھمک کرتا آگے بڑھتا۔ اس وقت بچے جو شیلے انداز میں شور مچاتے تھے۔

”انجن جلدی چل، انجن جلدی چل اور تیز اور تیز۔۔۔۔۔“

احمد علی اپنی رفتار بڑھا دیتا تھا۔

جب گاڑی کے آنے کا وقت ہوتا تھا تو اس سے پہلے احمد علی ان بچوں کی آنکھوں کے سامنے پٹوئی پر دس پیسے کا سکہ رکھ دیتا تھا اور پھر وہ سب پلٹ فارم پر بیٹھ کر گاڑی کے آنے کا انتظار کرنے لگتے۔ سب کی نظریں اس طرف جبی ہوتی تھیں، جہاں سے گاڑی کو آتا ہوتا تھا۔ جیسے ہی انہیں دور سے آتا ہوا انجن نظر آتا، بچے خوشی سے تالیاں بجاتے، شور مچاتے اور پھر جب گاڑی گزر جاتی تو سب پٹوئی کی جانب اس طرف کو دوڑ پڑتے، جہاں انہوں نے سکہ رکھا ہوتا۔ دس پیسے کا سکہ گاڑی کے بوجھ تلے دب کر پھیل جاتا تھا۔

”یہ میں لوں گی۔“ اس کی بیٹی ہمیشہ اس چمک دار چھپے نکلنے کو حاصل کرنے کے لیے لڑتی تھی۔ بھائی بھی اسے لینے کے لیے پاؤں پیٹتے تھے۔ برسوں بیت گئے مگر اب بھی وہ تینوں چمک دار نکلنے کے لیے لڑ رہے تھے۔

پٹوئی پر چمکتا دھاتی نکلنا۔۔۔۔۔ وہ چمک دار دھاتی نکلنا، بچوں کے بچپن سے جڑی احمد علی کی ان گنت یادوں میں سے ایک یاد تھی جس میں ریلوے پلٹ فارم، پٹوئی اور انجن کبھی موجود تھے۔ پلٹ فارم کی سگنی بیچ پر بیٹھا احمد علی اس وقت انہی یادوں میں گھومتا تھا۔

بچے بڑے ہونے لگے تو ان کے کھیل بھی بدل گئے۔ وہ اور بڑے ہوئے تو ان کی زندگی کی گاڑی نے اپنی پٹوئی ہی بدل لی۔ احمد علی کی گاڑی کے ڈبے اب کسی اور پٹوئی پر دوڑ رہے تھے۔ احمد علی کی ریل گاڑی کے ڈبے تو چھوٹ چکے مگر وہ اب ایک اسٹیشن پر تھا۔ مدتوں سے اس نے خوشی کی سیٹی نہیں بجاتی تھی۔

”یہ لیں بابو جی۔“ بھولے نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اوہ۔۔۔۔۔“ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ ذرا غنودگی طاری ہوگئی تھی۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں، پٹوئی کی چمک آنکھوں پر پڑی۔ اس نے دونوں آنکھیں ملے ہوئے بھولے سے کہا۔

”ہاں جی۔۔۔۔۔ آج تو دھوپ بہت مزہ دے رہی ہے۔“ اس نے بھاپ اڑاتی چائے کا کپ اس کی طرف بڑھایا۔ ”دو گھنٹ بھر ہی سستی دور ہو جائے گی۔“ اس نے اپنے شوخ لہجے میں کہا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر کپ تھام لیا۔ ”ابھی آکر برتن لے جاؤں گا۔“ وہ واپس جاتے ہوئے بولا۔

احمد علی خاموش تھا۔ سرد موسم میں بھولے کی گرما گرم

لوگ آتے ہیں پنے کے لیے۔“ احمد نے بھولے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ وہاں اپنے اسٹال کی طرف بڑھ رہا تھا۔
”سردی، گرما گرم چائے، یہ دھوپ اور پھر آپ کی باتیں۔“ اس نے احمد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ملاقات تو یادگار بن گئی۔ آپ سے تو آئندہ بھی ملنے کو دل چاہے گا۔“ یہ کہہ کر وہ رکا۔ ”موبائل فون تو ہوگا آپ کے پاس؟“ اس نے پوچھا۔
”ہے تو کسی مگر لگتا ہے مجھے اب اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”کیا مطلب.....؟“ وہ چونکا۔ ”میں تو جا رہا تھا کہ آپ کا نمبر لوں اور کبھی بکھار دل چاہے تو آپ کو فون کر لیا کروں گا مگر.....“
”بیٹا میرے فون میں صرف تین نمبر ہیں اور تینوں میری اولادوں کے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے فون نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ”خود دیکھ لو ان نمبروں کو۔“ واقعی وہاں صرف تین کا ٹیکٹ نمبر تھے اے، بی اور سی۔

”یہ نام کس طرح آپ نے لکھے ہیں؟“ اس نے فون میموری میں محفوظ نمبروں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
وہ مسکرایا۔ ”اے سے احمد کمال، بی سے بدر جمال اور سی سے سندھ۔“ میری بیٹی سندھ۔“ بیٹی کا نام لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے جیسے سارے جہاں کی محبت بجلی بن کر چمک گئی تھی۔

”مگر صرف تین نمبر.....“ اس نے اکتے ہوئے کہا۔ یہ کہتے ہوئے جوادی آنکھوں سے حیرت جھلک رہی تھی۔ یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔
”آپ کا کوئی دوست نہیں ہے ایسا جس کے پاس موبائل ہو؟“
”ارے بھئی سب کے پاس ہے۔“ یہ کہہ کر وہ ہنسا۔ ”مگر جب میں ان سے بہ آسانی مل سکتا ہوں تو پھر اس کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔“ اس نے موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”خیر جی، یہ آپ کی سوچ ہے۔“ اس کے لہجے سے لگا جیسے وہ اس کی بات سے متفق نہیں مگر کچھ سوچ کر اختلاف کرنے کے بجائے خاموش ہو کر چائے ختم کرنے لگا۔
”ٹن، ٹن، ٹن..... پلیٹ فارم پر ٹرین آنے کی گھنٹی بجی۔“
جی، لگتا ہے گاڑی آنے والی ہے۔“ احمد علی نے کہا۔

”باؤ جی! آپ والی ٹرین آ رہی ہے، سامان سمیٹ لو.....“ اسی دوران بھولا چائے کے خالی برتن لیے پھنچا اور احمد علی کو مخاطب کر کے کہا۔
”اور پٹری والی گاڑی؟“ یہ سن کر جوادی نے سوال کیا۔

”وہ تو ابھی لیٹ ہے۔“ بھولے نے جواب دیا۔ ”ابھی تو کراچی جانے والی ریل آ رہی ہے۔“
”کتنے پیسے ہوئے؟“ جوادی نے جیب سے بٹو نکالتے ہوئے کہا۔
”ارے نہیں بھی، تم رہنے دو۔ تم اس شہر میں مہمان تھے اور ہم بہت اچھے میزبان ہیں۔“ احمد علی نے یہ کہتے ہوئے سو روپے کا نوٹ نکال کر بھولے کی طرف بڑھایا۔ ”باقی تیرے۔“ اس نے بھولے سے کہا۔

”بڑی مہربانی جی۔“ اس نے حسب عادت ہنستے ہوئے کہا۔
”سنو.....“ بھولا جانے کے لیے مڑا تو جوادی نے اسے روکا۔ ”مجھے تو ابھی کافی دیر بیٹھنا ہے یہاں۔ ایسا کرو کہ ایک چائے اور لے آؤ۔“

”ابھی لایا جی۔“ بھولا آگے بڑھ گیا۔
”بڑا کٹف کیا آپ نے۔“
”ارے نہیں بھئی.....“ احمد علی نے بے تکلفی سے کہا۔ ”تم اس شہر میں مہمان تھے، اب جا رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ بھر بھر کے لیے رکا۔ ”دیوے تو میں بھی اب اس شہر میں مہمان ہی ہوں بس چند منٹوں کا۔“

”کیا مطلب.....؟“ یہ سنتے ہی جوادی نے کہا۔ ”آپ تو یہیں رہتے ہیں نا۔“ اس کے لہجے سے حیرانی عیاں تھی۔
”رہتا تھا۔“ احمد علی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے حسرت سے کہا۔ ”مگر اب جا رہا ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“ یہ کہہ کر اس نے جوادی کی طرف گردن موڑی۔ ”اب ہم دونوں مہمان ہیں یہاں پر۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں، کیا آپ کراچی جا رہے ہیں؟“
”میں اولڈ راج ہوم جا رہا ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“
”کیا.....؟“ یہ سن کر وہ لگ بھگ بیچ اٹھا۔

”یہاں میری تنہائی بہت بڑھ گئی ہے۔“ احمد علی نے افسردگی سے جواب دیا۔ اس کی آواز ایک بار پھر بھر مچی تھی۔
وہاں جتنے ہوں گے سب میرے جیسے ہوں گے۔ اس لیے اپنایت زیادہ ہوگی ان انجینیئروں میں۔“ اس نے جوادی کی طرف دیکھ کر بنا کہا اور تھپلا سنبھالتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے سے ریل گاڑی آتی نظر آ رہی تھی۔

”آپ بچوں کے پاس بھی جا کر رہ سکتے ہیں تو پھر اولڈ راج ہوم.....“ جوادی نے اکتے ہوئے کہا۔
”مہنگائی بہت ہے مغرب میں۔“ احمد علی نے طنز پر انداز میں ہنس کر جواب دیا۔ ”اب وہ اپنے بچے پائیں یا مجھ بوڑھے کو۔“
جوادی خود یورپ میں کئی سال رہا تھا۔ اس کی بات اچھی

طرح سمجھ چکا تھا۔ اس نے فوراً موضوع بدل دیا۔ ”مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور جو کچھ اب ہونے جا رہا ہے، اسے سن کر بہت دکھ بھی ہوا۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔
احمد علی کا موبائل فون اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ ریل گاڑی اور قریب آ رہی تھی۔ اس نے بہت پہلے اس انجینیئری شہر سے رشتہ جوڑا تھا۔ اس ایک رشتے سے کئی رشتوں نے جنم لیا اور پھر ہر رشتہ اپنا نانا تا توڑتا چلا گیا..... اب وہ بھی تعلق کے آخری لرزے تا کو توڑ کر جا رہا تھا۔

ریل گاڑی بہت قریب آ چکی تھی۔ پھر وہ پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ احمد علی عین اپنے سامنے رکے ڈبے کی طرف بڑھا۔ وہ اندر داخل ہوا اور دروازے کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو معنی خیز مگر افسردہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک منٹ ہونے والا تھا۔ ریل گاڑی کا اس اسٹیشن پر اتنی ہی دیر کا اسٹاپ تھا۔ انجن نے زوردار سیٹی بجائی۔

احمد علی نے جوادی کی طرف الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس نے بھی ہاتھ ادا پر اٹھایا۔ ”ارے..... یہ آپ کا فون۔“ وہ چلا تے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔ گاڑی کسی بھی وقت چلنے والی تھی۔ ”یہ لیں۔“ اس نے قریب پہنچ کر فون اس کی طرف بڑھایا۔

”رہنے دو، مجھے اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ احمد علی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس فون کی بیٹری چارج رکھنا اور فون ہمیشہ آن رکھنا۔“ اس نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر اے، لی یا سی میں سے کسی ایک کا اگلے دو تین سالوں میں بھولے بیٹھے کوئی فون آجائے تو انہیں بتا دینا کہ مجھے تنہائی نے مار دیا۔“

”کیا.....؟“ وہ بہت حیران نظر آ رہا تھا۔
”ہاں۔“ اس نے اپنی بات کی تصدیق کرنے والے لہجے میں کہا۔ ”سنو..... انہیں تمہاری اور میری اس اتفاقی ملاقات میں ہونے والی ساری باتیں بھی تفصیل سے بتانا۔“
”لیکن.....“ جوادی نے ایک بار پھر فون اس کی طرف بڑھایا۔

”رہنے دو۔“ اس نے فون لینے سے پھر انکار کیا۔
گاڑی نے ایک اور سیٹی بجائی۔ پیویوں سے بریک بنے اور ہلکی سی گونگڑا ہٹ کے ساتھ ریل گاڑی رینگنے لگی۔ جوادی تیز قدم اٹھاتا ہوا ڈبے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا اور ایک بار پھر فون اس کی طرف بڑھایا۔

”بس کا رشتہ نہ رہے تو پھر چند بات میں رابطوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔“ شدید سردی میں جسم کو گرما گرم

چائے کی ضرورت پڑتی ہے، ٹھنڈے شربت جیسی چائے تو جسم میں اور کپکپاہٹ پیدا کر دیتی ہے۔“ احمد علی نے خود کلائی کی۔ گاڑی رفتار بڑھنے لگی تھی۔ جوادی پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ احمد علی نے اس کی طرف دیکھ کر ایک بار پھر الوداعی ہاتھ ہلایا۔

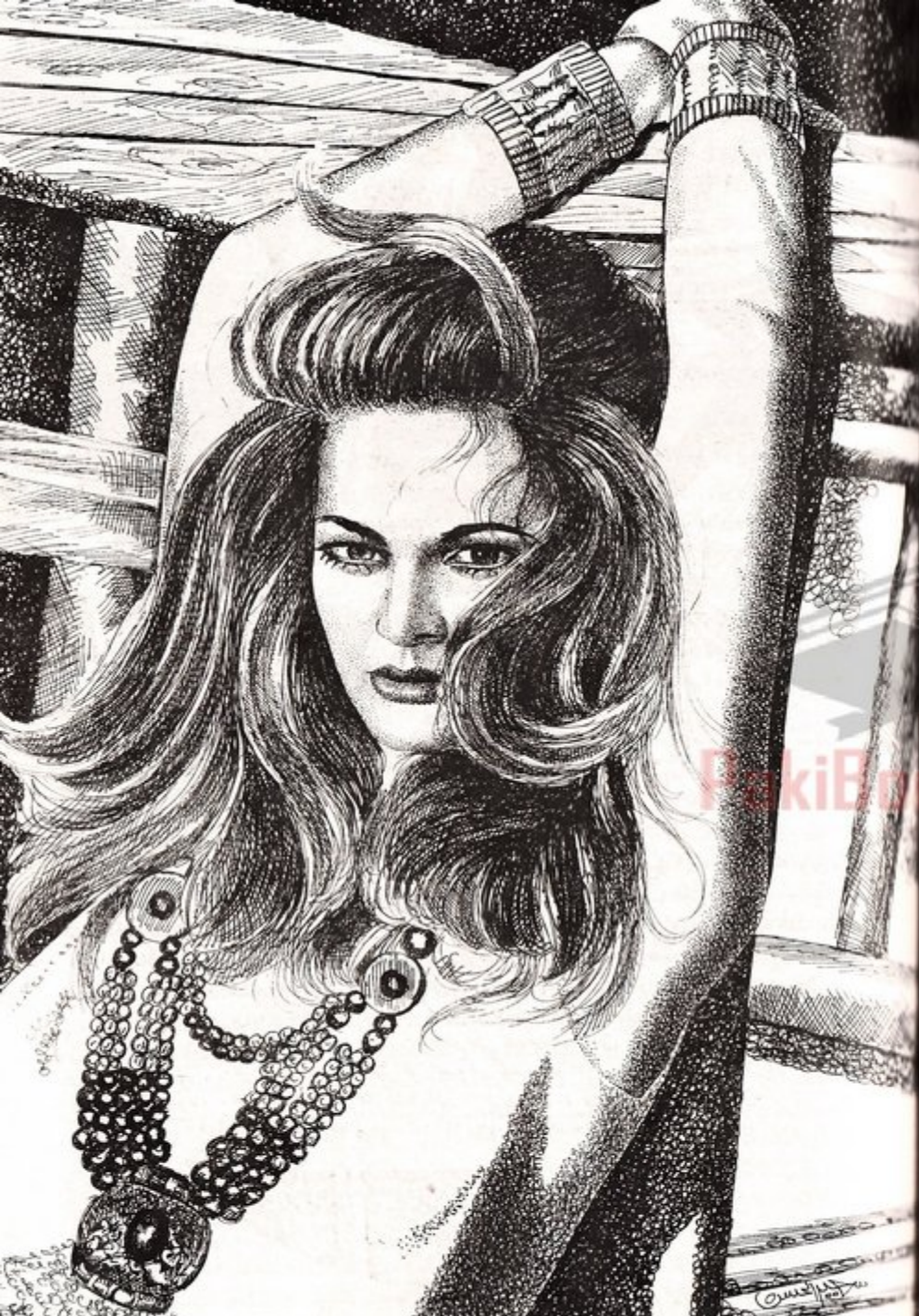
☆☆☆

انجن دسل دیتا ہوا پلیٹ فارم سے نکل رہا تھا۔ ٹرین دھیرے دھیرے رفتار بڑھتی جا رہی تھی اور احمد علی کا دل جیسے ڈوبا جا رہا تھا۔ اپنے گھر اور اپنے قصبے سے ہمیشہ کے لیے پھجڑ جانے کا احساس درد بن کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اتر جا رہا تھا۔ وہ بونگی کے کھلے دروازے پر کھڑا دھکی نظروں سے گزرتے ہوئے مناظر دیکھتا رہا۔ وہ اس ہوا میں رچی ہوئی عموں پرانی چاہتوں، محبتوں کی خوشبو اپنے وجود میں سینے کے لیے گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ غصہ غصہ غصہ ہوا کے جھونکوں سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں..... پھر چشم خیال نے اسے ماضی کی یادوں میں دھکیل دیا۔

اسے تین تینے تھپے بچے نظر آئے جو اس کے گھر کے آگن میں شوخیان کرتے، کھیل رہے تھے۔ چھوٹا بیٹا قلعہ گاریاں مارتا ہوا اس کی طرف لپکا..... احمد علی نے اسے اپنی آغوش میں سینے کے لیے دونوں ہاتھ آگے بڑھائے اور یکا یک اس کی مندی ہوئی آنکھیں دشت سے پھیل گئیں۔ وہ ریٹک چھوڑ چکا تھا، اس کے آگے ایک خلا تھا..... بھانک خلا جس میں ہوا سرسرا رہی تھی یا ٹرین کے پیویوں کی گونگڑا ہٹ گونج رہی تھی۔ اس نے کسی سہارے کو تھامنے کے لیے بے تابی سے ہاتھ چلائے لیکن اسے دیر ہو چکی تھی..... اس خلا میں اس کے تھامنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا..... بس ہوا تھی جسے تھامنا اس کے بس سے باہر تھا۔

ٹرین نے رفتار بڑھتی تھی..... چکا چوک کرتی اس ٹرین نے اپنے دھکی مسافر کو ہمیشہ کے لیے اسی زمین پر اگل دیا تھا جس کی چاہت کو مسافر کی تنہائی چاٹ گئی تھی۔

دوسری طرف جوادی اسٹیشن پر موبائل فون ہاتھ میں لیے احمد علی کی باتوں کی گونج میں ڈوبا ہوا تھا..... اسے کیا پتا تھا کہ کچھ دیر بعد ہوا کے دوش پر ایک بری خبر آنے والی تھی۔ وجود جب تک رہتا ہے تو ایٹموں اور بیگانوں کے کس کو ترستار ہوتا ہے، جب وہی نہ رہے تو پھر وہ صرف خبر بن جاتا ہے..... خبر کا کوئی لس نہیں ہوتا، وہ ٹیلی ویژن، کمپیوٹر، انٹرنیٹ یا پھر موبائل فون پر بھی آ سکتی ہے۔



بارہواں حصہ

رنگ آسمان

اے۔ آر۔ راجپوت

ماضی کی تنگ و تاریک مگر خوابناک راہداریوں سے جنم لینے والے ایسے کردار... جنہیں واقعات و شواہد نے خود ترتیب دے کر ان کی زندگی کی بے قرار یوں کو ایک ایسے مقصد میں ڈھال دیا جس کا ادھورا پن بے شمار ہلاکتوں کا سبب بن جاتا... لہذا اس کی تکمیل کے لیے وہ باغی فطرت انسان میدان جنگ میں یوں اتراکہ دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دینے والے گداز احساسات کو بھی بھول گیا لیکن... عشق تو پھر عشق ہوتا ہے... کوئی کتنا ہی بھولنا چاہے، عشق اپنا مسکن کبھی نہیں بھولتا۔ جس دل میں بس جائے اسے اپنے ساتھ ہی لے کر جاتا ہے... اور پھر ایک دن اچانک اس کے من کا موسم بھی بدل گیا کیونکہ... وہ فرنگی حسینہ دلی کے اس نوجوان کو دل دے بیٹھی تھی، جس کا ہر قدم آزمائش اور ہر نظر کسی امتحان سے کم نہ تھی، اس کے باوجود... خاک و خون کے اس کھیل میں نہ تو اس نے خوابوں کو بکھرے دیا اور نہ ہی جذبات کو بے لگام ہونے دیا۔ کیونکہ وہ آسمان پر بکھرے رنگوں کا مطلب جان گیا تھا۔

شرق و مغرب کے عجیب استراحت اور تاریخی جہول نخیروں کے عبرت
اثر اشاروں میں لہرائی دلچسپ داستان

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد کے دور کی داستان ہے۔ کوہِ شالیہ کے گھنے جنگوں اور سنگلاخ پہاڑیوں میں ایک مختصر قافلہ جو سفر ہے۔ اس قافلے کا سالار ایک انگریز پروفیسر ہنری برنارڈ ہے، جو ایک مختلف سوچ، وسیع دار اور مثبت خیالات کا حامل شخص ہے۔ ہندوستان کی قدیم اسراریت اور جستجو اسے لندن کے یہاں تک پہنچائی لاتی ہے۔ اس قافلے میں اس کی جوان اور حسین بیٹی رینا بھی شامل ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی فطرتاً جیس پسند اور ہم جو ہے۔ پروفیسر ہنری کا ایک اوباش بھتیجا رابرٹ اور اس کی آزاد خیال جوان بہن گارشیما سمیت ہیں۔ ملازمین میں ڈرائیور امجد خان، ادھیضر خان، مانیکل شاہ کے سائیکس کریم بخش کا اکلوتا بیٹا ہے۔ شوکت عرف شوکی، رینا کو دل بیٹھا ہے مگر مزاجاً احمق منڈی اور مغرور فطرت رابرٹ کو شوکی سے سخت قسم کی رقابت اور ذاتی عداوت ہے۔ پروفیسر ہنری کے برعکس رابرٹ، شوکی سمیت دیگر ملازموں کے ساتھ آقا و غلام جیسا رویہ رور رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر ہنری برنارڈ اپنی اس ہم جوئی کے دوران ایک پراسرار سبق کا کھوج لگاتا ہے۔ کوہِ شالیہ کی تین خود مختار ریاستوں پرفرنگی سامراج اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے مختلف سازشوں میں مصروف ہیں اور انہی سازشوں کو بیوتاؤں کے لیے پانچ مسلم اور جری جاننا گوریلوں کا گروپ اپنی جانیں جوہم میں ڈالے ہوئے ہے۔ اس گروپ میں علی رحمان ہے جو فرنگی ہے جو فرنگی آزادی کے سپہ سالار جنرل شیر خان کے ایک خاص کامنڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بارودی ماہر کہا جاتا ہے۔ دوسرا احسان جامو، جو کرنل نہال خان کا قریبی ساتھی ہے۔ شاہ زمان ان کا تیسرا ساتھی بذات خود ایک لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ گروپ ”کاروانِ مجاہد“ کہلاتا ہے۔ باقی دوسرا شریبل اور قیصر شاہ تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ سوداگروں کی جماعت اب حکومتوں کا کاروبار کرنے لگی تھی۔ غاصب فرنگیوں کو شہ قہاکہ منتشر مسلم باقی گروہ کوہِ شالیہ میں اپنی خفیہ کمین گاہیں بنا سکتے ہیں تاکہ نئے سرے سے اپنی طاقت کو یکجا کر سکیں۔ یوں بھی ان فرنگیوں کا ایک متعدد اپنا ”سلسلہ تسلط“ کوہِ شالیہ کی ان تینوں قابل ذکر ریاستوں تک دراز کرنا بھی تھا۔ لہذا کمکاری اور دھوکے بازی کا کھیل کھیلتے ہوئے فرنگی حکومت پہلے ریاست ناگرہ کے مہاراجا چندر گپتا کی طرف سے ظاہر دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور پھر مشترکہ طور پر باقی دو ریاستوں تریپال اور پالپن پور کے خلاف عسکری سازش کو عملی جامہ پہناتی ہے تاکہ عسکری کارروائیوں کا آغاز کیا جاسکے۔ تریپال میں مسلم نواب شہباز خان اور پالپن پور میں مہاراجا مہندر سنگھ گدی نشین ہوتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے حلیف ہیں۔ راج محل داخلی سازشوں کی زد میں ہے۔ مہارانی تجو بانی اپنے بیٹے ایسٹ کمار کوولی عہد کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہے مگر پرتاب کمار اس کی راہ کا سب سے بڑا پتھر ہے، جو مہاراجا چندر گپتا کی پہلی اور مرحومہ بیوی کے بطن سے تھا۔ مہارانی تجو بانی کی ایک جوان سال خوبصورت بیٹی سوچنا بھی ہے۔ مہارانی اپنے سوتیلے بیٹے ولی عہد پرتاب کمار کو راستے سے ہٹانے اور اپنے بیٹے ایسٹ کمار کا کاروبار راست صاف کرنے کے لیے کالی کے مندر کے مہاراجا باری بدری ناتھ کے ساتھ خفیہ کٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ بدری ناتھ جس کا اپنا ایک پراسرار اور شیطانی مفاد کالی کے مندر سے وابستہ ہے جو سوائے اس کے اور اس کے سیوک کاروں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بدری ناتھ اپنے پتھار یوں کے ذریعے ہنری برنارڈ کو قتل کر دیتا ہے۔ مہارانی تجو بانی پرتاب کمار کو مارنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اس کے دودھ میں زہر ملو اتتی ہے۔ تاہم گلاس کی تبدیلی کے بعد زہر ملا دودھ مہاراجا چندر گپتا کی لیتا ہے اور پرتاب کمار کے بجائے وہ موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ پرتاب کمار راجا بن جاتا ہے اور قتل کی تحقیقات کر داتا ہے۔ شک تجو بانی پرتاب کمار کے تاہم پرتاب کمار جو بانی کو زائیس دیتا مگر اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ادھر علی تریپال پہنچتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے تاہم اپنے بارے میں بتانے پر اور نواب شہباز کا نام لینے پر اسے رعایت دی جاتی ہے۔ علی کے پاس نواب شہباز کے لیے ایک پیغام ہوتا ہے مگر انسپکٹر اسے نواب کے بھائی سرانج کے پاس لے جاتا ہے۔ تاہم وہ نواب شہباز سے ملاقات کرنے کا کہہ کر سرانج سے اپنی جان چھڑاتا ہے مگر راستے میں کچھ لٹیرے پولیس کی گاڑی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے ان کے گھیرے سے نکلتا ہے اور نواب شہباز کے پاس پہنچ کر انہیں فرنگیوں کی سازش سے آگاہ کرتا ہے۔ ادھر اسی کے ہاتھوں فرنگی افسر بروجر کا قتل ہو جاتا ہے اور اسے قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ شوکی اینڈ کمپنی کے کھیموں میں آگ لگ جاتی ہے اور امجد خان، ننڈو بابا اور شانتا بل کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ پراسرار ہستی کے عجیب و غریب لوگ لگاتے ہیں تاہم رینا انہیں رام کر لیتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ لوگ ان کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بدری ناتھ ایک انگریز لڑکی کی بی بی چڑھ دیتا ہے۔ ماریا کا خنجر ایک لڑکی بانی کے پاس ہوتا ہے جو بدری ناتھ کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ پرس رام اسے سمجھاتا ہے کہ وہ خنجر ان کے لیے مصیبت بن سکتا

اربیہ کے یہ آخری الفاظ..... ”کہ تمہاری بات مان لینے کی صورت میں کیا میری جان بچ جائے گی اور میں اس منہ کو قید خانے سے زندہ سلامت بھی نکل جاؤں گی؟“ مفہوم یہی تھا کہ اربیہ قید خانے کے ان دونوں فرنگی پہرے داروں کی ”بات“ ماننے کے لیے تیار تھی۔

زمانہ نے اپنے سناتے ہوئے ذہن سے اربیبہ کے متعلق سوچا۔ اس کے اندر کوئی چیخا۔ ”سگ..... کیا اربیبہ محض اپنی برائی اور جان بچانے کی خاطر اپنی عزت کو داؤ پر لگانے والی تھی؟ کیا اربیبہ ایسی عورت تھی؟ وہ تو اسے ایک مضبوط اور بااعتماد اور وفادار عورت سمجھتا تھا۔

”ہرگز نہیں.....“ اس کے دل کی آواز نے ان الفاظ کو روک دیا۔ ”اے یہ بھی ان فرشتوں کے آگے اپنی عزت کا سودا نہیں کر سکتی۔ وہ جان دے سکتی تھی مگر اپنی عزت پر ایک ذرا آج بھی لانے والے عورت نہیں تھی۔“ مگر ایسی ہوتی تو وہ راج محل کے فرنگی افسرلیف بروچر کا خون کیوں کرتی، جس نے اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔“

تو پھر اس کے ان آخری الفاظ کا کیا مطلب تھا؟ اس نے الجھ کر سوچا۔

اس نے دروازے سے بدستور اپنا کان لگائے رکھا۔ پہلی والی مردانہ آواز ابھری۔

”ہم پر بھروسہ کر، چل تیار ہو۔ ویر مت کر۔“
 ”کیا ادھر ہی؟“ اسے اسیہ کی حیرت میں ڈولی ہوئی
 آواز سنائی دی۔ زمانہ کی کنشیاں ابھی تک سنسنار ہی تھیں۔
 ”یہ تو بڑی گندی جگہ ہے۔ تم ازم مجھے اچھی جگہ پر تو لے
 جاؤ..... جہاں بستر ہو، کچھ چٹا پلاٹا نا.....“

”ارے..... تو بھی مینے پلانے کا شوق رھتی ہے ے

بی؟“ یہ دوسرے پہرے داری آواز تھی۔ ذرا غور کرنے پر زمان کو ان کے لب و لہجے سے اندازہ ہوا کہ ایک پہلے والا پہرے دار فرنگی تھا اور دوسرا ہندوستانی۔

ارسطو کی اس بات پر یقینت زمان کے ہونوں
پر زہریلی منگرا ہٹ عود کرائی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ارسطو ان
دونوں بوس کا رپہرے داروں کے ساتھ کوئی کھیل کھیلنا
چاہتی تھی۔ وہ اپنے اس روایتی ”تھیسار“ کا استعمال خوب
اچھی طرح جانتی تھی۔

”کڑھ لے اٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسے اپنے کمرے میں لے چلتے ہیں۔ یہاں تو سارا اجماع کھٹکاڑ پھیلا ہوا ہے۔ ایک بستر تک نہیں ہے یہاں۔“

”ہوں..... تمہاری بات صحیح ہے مسٹر برڈ! چلو پھر دیر کس بات کی ہے۔“

زمانہ فوراً دروازے سے ہٹ کر ذرا پیچھے ایک تاریک گوشے میں سرک گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اریہ ان دونوں کے ساتھ کوئی ”گیم“ کھیلنا چاہتی تھی اور وہ اس کی مدد کے لیے تیار تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلنے کی آہٹ ابھری۔ زمان کی بے تاب نظریں دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے وہاں بالترتیب تین انسانی ہولو کو نمودار ہوتے دیکھا۔

سب سے آگے والا ایک دراز قامت آدمی تھا۔ اس کے گاندھے سے رائل جمبول رہی تھی۔ درمیان میں کسی عورت کا ہوا لہا تھا جسے زمان پہچان گیا تھا کہ وہ اریہ کے سوا روکوئی نہیں ہو سکتی تھی، جبکہ اس کے عقب میں ایک ٹھکے قد کا دھرا پھرے دار تھا۔ اس کی سر پر رائل جمبول نہیں تھی، لیکن اس نے ہاتھ میں ایک لمبی نال والا پستول دیکر رکھا تھا۔ وہ

کو لیے تاریکی سی راہداری کی طرف مڑ گئے۔ زمان نے چونکا جیتے کے مانند بے آواز اپنی جگہ سے حرکت کی اور نہایت محتاط روی کے ساتھ ان کے پیچھے ہولیا۔

راہداری زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی۔ چند قدموں کے بعد وہ تینوں دائیں جانب گھوم گئے۔ زمان ان کے پیچھے دبے پاؤں چلتا ہوا وہاں تک پہنچا مگر اس نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور موڑ والی دیوار کی آڑ کے پاس جا ٹھہرا اور ایک ڈر اسرا بھا کر دوسری جانب جھانکا۔

وہ تینوں ایک کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے، آگے والا پہرے دار کنڈی کھول رہا تھا۔ اسی دوران پیچھے کھڑے پہرے دار نے اپنے سامھی کو غائب کرتے ہوئے کہا۔

”مسٹر بڑا پیلے تم اس چھو کری کے ساتھ مزے کرو، میں یہاں پہرہ دیتا ہوں مگر ذرا جلدی..... ایسا نہ ہو کہ میری باری پر وہ سب یہاں آ جائیں۔“ اس نے اب اپنی لمبی نال والا پستول.... خاک کی تیکر کے بیٹھ میں اڑس لیا تھا۔

”فکرمات کرو مسٹر گرکھ! تمہاری باری بھی آ جائے گی۔“ فرنگی... معنی خیر انداز میں کہتا ہوا مذکورہ کمرے کا دروازہ کھول کر اسیہ کو لیے اندر داخل ہو گیا۔ گرکھ باہر کھڑا رہا۔

زمان نے لیخت اپنی جگہ سے حرکت کی اور دیوار سے چپکا چپکا گرکھ کی طرف سرکنے لگا۔ وہ اس وقت اپنے کان میں اٹکی ہوئی بیڑی نکال کر اسے دیا سلائی سے

سلاگنے میں مصروف تھا کہ زمان اس کے سر پر جا پہنچا، گرکھ کسی کی آہٹ محسوس کر کے فوراً چونکا۔ اس کا ہاتھ پستول اچکنے کے لیے بڑھا مگر تب تک اسے تاخیر ہو چکی تھی۔ زمان اس پر بجلی بن کر ٹوٹا اور اپنی دائیں ٹانگ کے گھسنے کی

بھر پور ضرب اس کے پیٹ میں رسید کر دی۔ ساتھ ہی پھرتی سے ایک ہاتھ اس کے منہ پر بھی رکھ دیا۔

دشمن کے ناپاک وجود سے گتے کا مقصد ہی یہی تھا کہ ضرب کی شدت بھر پور اور نتیجہ خیز ہو، وہی ہوا۔ گرکھ اس ضرب کو سہہ نہ سکا اور ایک ہی وار میں ڈھے گیا۔ زمان نے

پھر بھی آہستہ آہستہ اسے گرفت سے چھوڑا۔ وہ جھکا اور آخری وار اس کی منجی ہوئی گردن پر کھڑی ہتھیلی سے کیا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

”گرکھ! کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“ شاید کوئی بگلی کھڑ بڑا اندر موجود فرنگی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔ زمان نے دانستہ پھنسی پھنسی اور بوجھل سی آواز میں کہا۔

”مم..... میرا پیٹ..... ہائے..... درد.....“ ”کیا ہوا..... تمہارے پیٹ کو.....؟“ فرنگی کی آواز ابھری مگر دوسرے ہی لمحے وہ غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔

”یہ کیا حرکت کر رہی ہو؟ کتیا؟ میں تمہیں..... اس کی غصیلی آواز گولی چلنے کے دھماکے میں ایک پتھ بن کر ابھری۔

زمان سمجھ گیا کہ اندر اسیہ نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر کوئی گل کھلا دیا ہے۔ اس نے دروازے کو اپنے کندھے کی زوردار ضرب رسید کی اور اسے توڑا ہوا اندر آ گیا۔

منظر غیر متوقع نہیں تھا۔ وہی دروازہ قامت فرنگی پہرے دار خون کی چھپڑی میں فرش پر پڑا تھا اور اس کے قریب اریہ ہاتھ میں رائفل لیے کھڑی تھی۔

دونوں کی نگاہیں چاد ہوئیں اور جیسے صدیوں کے پھڑے دوبارہ مل گئے ہوں، وہ ایک دوسرے کی طرف لپکے۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو زمان! امیرادل کہتا تھا کہ تم زندہ ہو۔“ اریہ نے بے قرار سے کہا۔ زمان کو دیکھ کر اس کے انگ انگ سے مرتیں پھوٹ پڑی تھیں۔

زمان نے بھی بے قرار سے اریہ کو اپنے گلے لگا لیا تھا۔ ”اب جلدی کرو، یہاں سے نکلنے کی کرتے ہیں۔ وہ سب لوگ..... جھیل کی سمت گئے ہوئے ہیں۔ گولی کا دھماکا انہیں متوجہ نہ کر ڈالا۔“ اریہ نے کہا۔ دونوں فوراً وہاں سے نکلے اور راہداری میں آ گئے۔ زمان نے گرکھ کی گری

ہوئی سچ بکس (ماپس) اٹھالی تھی۔ ”مجھے ایوبویشن ڈمپ اور ان کے میگزین (اسلحہ و بارود خانے) کی تلاش ہے۔“ زمان نے کمرے سے باہر نکلنے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ مشن نمٹنا زیادہ اہم ہے۔“ اریہ نے بھی اسی حوصلے اور عزم سے کہا۔

زمان نے باہر پڑے گرکھ کا پستول اٹھا کر اریہ کے حوالے کر دیا تھا اور اس کے ہاتھ سے بڑی رائفل لے لی تھی۔

دونوں عمارت کے اندر منڈلاتے رہے اور بالآخر ایک ہال نما کمرے میں انہیں اسلحہ اور بارود کا ذخیرہ نظر آ گیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک عمارت کے باہر گزریں اور بہت سے لوگوں کا شور سنایا دیا۔

”دشمن..... شاید دشمن پلٹ پڑے ہیں زمان! جو کرتا ہے جلدی کرو۔“ اریہ نے جوش سے مرتعش آواز میں کہا اور زمان نے جلدی جلدی وہاں موجود فلیٹ جمع کیے اور انہیں دیاسلائی دکھا کر باہر آ گیا۔

اس کے بعد دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے عمارت

کے نکاسی والے دروازے کی طرف پہنچے لیکن وہاں پہنچنے ہی دونوں ٹھنک کر رکے۔ سامنے وسیع و عریض احاطے میں تین چار گاڑیاں اور پندرہ سولہ کے قریب مسلح فوجی دکھائی دیے۔

اگر یہ دونوں دروازے سے باہر نکلتے تو ان کے دیکھ لیے جانے کے واضح امکانات تھے، لیکن اگر وہیں کھڑے رہتے تو ذرا ہی دیر بعد ہی عمارت جہنم کا نمونہ پیش کرنے والی

تھی۔ وہ اس میں مجسم ہو جاتے۔ گویا دونوں طرف موت ان کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اگرچہ فوجیوں کی ابھی ان پر نظر نہیں پڑی تھی۔

”زمین پر لٹ جاؤ۔“ زمان نے اریہ سے یہ کہا اور پھر دونوں سینے اور کہنیوں کے بل جتنی جلدی ہو سکتا تھا،

عمارت کے دروازے سے دور نکلتے چلے گئے مگر تب تک..... اسی وقت ایک فرنگی نے چلا کر ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا تھا۔ زمان کو رینالڈ کی جیب بھی دکھائی

دی تھی۔ ”فائر.....“ انہیں رینالڈ کی چیخ ہوئی آواز سنائی دی۔ ان کے دل دھک سے رہ گئے مگر انہوں نے ہمت

نہیں ہاری اور سب سے پہلے زمان نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنی زینتی پوزیشن بدلی اور اریہ کا ہاتھ پکڑ کر قریب واقع جڑواں تھوں والے درخت کی جانب اندھا

دھند بھاگا۔ اسی وقت بیک وقت کئی رائفلوں نے فائر اگلے مگر

زمان، اریہ کا ہاتھ پکڑے بالآخر اس جڑواں تھے والے درخت کی آڑ لینے میں کامیاب ہوئی گیا لیکن جانتا تھا کہ یہ

آڑ بھی انہیں زیادہ دیر ان فوجیوں کی ہلاکت خیزی سے نہیں بچا سکے گی کیونکہ وہ ان کی نظروں میں آ چکے تھے اور یوں یہ

درخت زیادہ دیر ان کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب تمام مسلح فوجی چیتنے چلاتے

ہوئے اس طرف رائفلیں تانے دوڑے۔ اسی وقت عمارت کے اندر ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ وہ بولکھا گئے پھر

دوسرا دھماکا ہوا۔ وہ سارے زمین پر لٹ گئے، پھر تیسرا اور چوتھا..... اس کے بعد تو جیسے زلزلہ آ گیا۔ دھماکوں پر دھماکے

ہوتے چلے گئے۔ شعلے اور جلے ہوئے لہجے کے ٹکڑے اور نہ جانے کیا کیا لالہ.... اڑاؤ کر فضا میں بکھرنے اور گرنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر طرف آگ اور شعلوں کی برسات ہو گئی تھی۔

کانوں کے پردے دھماکوں سے پھٹے جا رہے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دونوں درخت کی آڑ سے

نکلے اور جنگل کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ دونوں اس وقت تک دوڑتے رہے جب تک کہ بے دم ہو کر گر نہ پڑے۔

نرم نرم گھاس نے انہیں جیسے اپنی گود میں سالیما۔ گھاس کافی اونچی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک بے حال سے اسی طرح پڑے رہتے رہے۔

انہوں نے گویا اپنے جسم کی ساری طاقت کو انگوٹوں میں جمع کر کے دوڑ لگانے میں بہت زور لگا یا تھا کیونکہ وہ

جلد سے جلد اس خطرناک مقام سے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے لیکن ابھی انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کتنی دور نکل آئے تھے۔

وہ شاید مزید تھوڑی دیر اور اسی طرح خاموشی سے پڑے سستاتے رہتے کہ اچانک انہیں کسی درندے کی دھاڑ سنائی دی۔ صرف زمان ہی یہ اندازہ لگا پایا تھا کہ یہ اسی فرنگی

آفسیر رینالڈ کے پالتو گھدار کی دھاڑ تھی۔ تین میں سے ایک گھدار کو زمان پہلے ہی ختم کر چکا

تھا۔ وہ دہل گیا۔ گویا رینالڈ اور فرنگی فوجی اس کے تعاقب میں تھے اور اس غصیت.... رینالڈ نے اپنے دونوں پالتو

گھدار ان کے تعاقب میں آزاد چھوڑ دیے تھے۔ ”اریہ.....! جلدی! اٹھو، ہم ابھی خطرے میں ہیں۔“

اس نے اپنی بے ترتیب سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”ذرا اور سستالینے دو زمان! تم شاید کسی درندے کی دھاڑ

سے پریشان ہو گئے ہو۔“ اریہ بدستور ہانپتے ہوئے بولی۔ ”یہ بات نہیں اریہ!“ زمان فکر و تشویش سے بولا۔

”کیونکہ یہ کوئی درندہ نہیں بلکہ اس موذی فرنگی آفسیر رینالڈ کا پالتو گھدار ہے اور یہ ایک نہیں دو ہیں۔“ کہتے ہوئے زمان

نے اریہ کو اس کی تھوڑی سی تفصیل بتادی۔ ”اوہ میرے خدا!.....!“ یہ سن کر اریہ دہشت زدہ

سی ہو گئی۔ ”تنت..... تو اس کا مطلب ہے کہ اس غصیت نے ہماری تلاش میں درندے دوڑا دیے ہیں۔“

”ہاں، جلدی! اٹھو.....!“ زمان نے مزید وقت ضائع کے بغیر اریہ کو بازو سے پکڑ کر سہارا دیا۔

زمان کا منصوبہ کچھ اور تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ انسانوں کے تعاقب سے تو بچا جاسکتا تھا مگر ان درندوں کے

تعاقب کو ہل دینا تقریباً ناممکنات میں سے تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جیسے اور شیر کے مقابلے میں گھدار زیادہ خطرناک

تیز رفتار اور پھرتیلا جانور ہوتا ہے۔ اگرچہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ گھدار پالتو تھے تاہم درندے تو تھے۔ اسی سبب اس

نے جلد ہی دوڑنا متوقف کر دیا اور اریہ کو ایک درخت

کھائی ہے تو اسے پورا کرو۔ میں بھی تو یہی کر رہا ہوں۔ یہ راج محل اور یہ تخت و تاج بہت جلد چمن جائے گا۔ ہو سکتا ہے تمہیں بھی باغیوں کی صف میں کھڑا کر دیا جائے اور تم ساری عمر قید خانے میں گزار دو پھر تمہیں بچھتاوا ہوگا کہ تم نے میری بات کیوں نہ مانی۔ بتاؤ مجھے..... تیار ہو؟“

شاہر داغ رابرٹ نے سیدھی سادی سوچنا کے سامنے جنگ و جدال کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ ہمت کھڑنے لگی۔ وہ رابرٹ سے محبت بھی تو کرنے لگی تھی۔ اب وہ اس کی ہر بات ماننے پر مجبور تھی۔

”شاباش.....! آؤ یہ سب چیزیں سنبھالو، اور سونے کے اس قید خانے سے نکل چلیں۔“ مکار رابرٹ اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا اور یوں دونوں نے قائلین پر بھرپور مال و اسباب جلدی جلدی سمیٹنا شروع کر دیا۔

یہ سارا سامان اپنی جگہ پیش قیمت تو تھا ہی مگر اس کی نوادراتی حیثیت اس سے کئی گنا زیادہ تھی۔ نقشین صندوقہ بھی کم اہمیت کا حامل نہ تھا، اس میں بھی سونے کے تاروں کی ڈیزائننگ تھی اور..... موتی جڑے ہوئے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جسے یہ آسانی ایک ہاتھ میں کسی چھوٹے سے بکسے کی طرح اٹھایا جاسکتا تھا۔ اس کے اندر جواہرات رکھے تھے۔

رابرٹ نے اسے کپڑے میں لپیٹ لیا تھا۔ باقی سامان کی اس نے بٹنی بنائی تھی۔ وہ اس نے اپنے کندھے پر ڈال لی۔

جس وقت یہ دونوں چوری چھپے راج محل سے نکل رہے تھے، ٹھیک اسی وقت باہر تارک آسمان میں بڑے زور کا کڑا کا ہوا۔ سوچنا کا دل دہل گیا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان پر دیکھا تو کھلے آسمان پر بجلی کی ایک چمکتی ہوئی دراڑ سی چمکتی دکھائی دی، یوں جیسے آسمان جگ گیا ہو۔ سوچنا کو یوں لگا جیسے اس کا دل کسی نے کھینچ لیا ہو۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہاں راج محل کے اندر لوٹ جائے مگر وہ اس کی ہمت نہ کربانی۔

رابرٹ نے ایک گھوڑا اس مقصد کے لیے پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا۔ اس پر زین کسی ہوئی تھی۔ رابرٹ نے پہلے سہارا دے کر سوچنا کو گھوڑے پر سوار کیا اور اس کے بعد خود بھی اس کے پیچھے سوار ہو گیا۔

رات کی اس شدید طوفانی بارش میں جب سوچنا، رابرٹ کے ساتھ گھوڑے پر سوار کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو رہی تھی تو اس کی خوبصورت آنکھیں بھی مینہ

”تم..... تم مجھے روکو گی؟ ڈیر سسٹر! کیا تم اپنے بھائی کو نہیں جانتی ہو؟“ اس کے لہجے میں تہدید نمایاں تھی۔

”اچھی طرح جانتی ہوں، مگر شاید تم مجھے نہیں جانتے ہو۔“ گارشیا نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ ”اگر تم نے میرا ساتھ چھوڑا تو میں ابھی جا کر راج محل میں چلا چلا کر..... بتا دوں گی کہ تم یہاں کی ایک راجبھاری کو مال و اسباب کے ساتھ بھاگ کر لے جا رہے ہو۔“

گارشیا کے یہ کہنے کی دیر تھی کہ رابرٹ کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور پھر وہ ہوا جس کی سوچنا کو تو کیا، خود گارشیا کو بھی شاید توقع نہ تھی۔ رابرٹ نے کسی بھیڑیے جیسی غراہٹ اپنے حلق سے خارج کی اور دونوں ہاتھوں سے، بہن کا گلا دبوچ لیا۔ سوچنا نے یہ دیکھا تو کھنٹی کھنٹی چیخ مار کے رہ گئی اور تھر تھر کانپنے لگی۔

گارشیا کے حلق سے کھنٹی کھنٹی آوازیں برآمد ہونے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرت جیسے ثبوت ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی گردن کو بھائی کے ہاتھوں کے ٹھٹھے سے چھڑانے کی بے سود دنگ و دو کرتی رہی لیکن رابرٹ دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا چلا گیا۔ یہاں تک کہ گارشیا نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے اور تب رابرٹ نے اس کے جمولتے بدن کو چھوڑ دیا۔ گارشیا قائلین پر بے بس و حرکت گر پڑی۔

”تنت..... تم نے اپنی بہن کو مار ڈالا.....!“ سوچنا لرزتی آواز میں رابرٹ سے بولی۔

رابرٹ ایک لمحے کو ڈرا کر کہیں سوچنا کا اس کی طرف سے دل خراب نہ ہو جائے، لہذا وہ ایک دم چالاک لومڑی بن کر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

”سوچنا! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ دیکھو، میں تم سے کس قدر محبت کرتا ہوں کہ تمہاری خاطر، اپنی محبت کی خاطر میں نے اپنی بہن کو بھی نہیں بخشا..... اور تم بھی تو یہ قربانی دے رہی ہو۔ یہی محبت ہے سوچنا! محبت اور جنگ میں صرف اپنے مفاد پر نظر رکھو، جو تمہارا راستہ کھوٹا کرے اسے راستے سے ہٹا دو، ورنہ پھر خود مرنے کے لیے تیار رہو۔ ہم بہادر ہیں، اپنی محبت کی بہ خوبی حفاظت کرتا جانتے ہیں پھر تم خود ہی تو دیکھ رہی تھیں کہ گارشیا بلا وجہ اپنے مفاد کی خاطر ہمارا راستہ کھوٹا کر رہی تھی۔ درحقیقت یہ ہماری کامیابی ہے جل گئی تھی۔“

سوچنا پچھلی پچھلی آنکھوں سے بھی قائلین پر گری گارشیا کی لاش کو دیکھتی اور بھی رابرٹ کا منہ ہنسنے لگتی۔

”دیر مت کرو سوچنا! میرے ساتھ جینے مرنے کی قسم

سمندر کی سطح پر گردش کرتی رہتی تھیں۔ اب ان کا رخ اسی جانب تھا۔

☆☆☆

”سسٹر.....! میرا مقصد اب پورا ہو چکا..... اب میں بہت جلد تمہیں خدا حافظ کہنے والا ہوں۔“

اپنی بہن گارشیا کو کمکاری سے مسکراتے ہوئے دیکھ کر بالآخر رابرٹ نے اس سے چھپنا مناسب نہیں سمجھا۔

”تمہارا مقصد تو پورا ہو گیا برادر.....!“ یہ کہتے ہوئے گارشیا چند قدم چلتی ہوئی سر اسیدھی کھڑی سوچنا کے قریب آگئی اور ایک نگاہ طعن اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔ ”مگر..... میرا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا ہے.....“

”ہاں! ٹھیک ہے ڈیر سسٹر!“ رابرٹ بے پروائی سے بولا۔ ”تم لگی رہو اپنے مقصد میں، ایک نہ ایک دن شوکی تمہارا ہو جائے گا۔“ اس نے جیسے بہن کو بھلانے کی کوشش کی۔ یہ سن کر گارشیا کے ہونٹوں پر بڑی کینہ توڑی مسکراہٹ ابھری اور پھر وہ اسی لہجے میں بھائی سے بولی۔

”لیکن تم نے میرے اس عزم میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا، برادر کہ اگر شوکی میرا نہ ہوتا تو میں اسے رینا کا بھی نہیں ہونے دوں گی۔“

”ہاں.....!“ رابرٹ نے اس کی بات کا جیسے تمسخر اڑایا۔ ”میں نے تو تم سے کوئی مدد نہیں لی، خود ہی سب کچھ کیا۔ تم بھی ایسا کیوں نہیں کرتی ہو۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں تمہاری فضولیں ضد کے آگے اپنا بنانا یا جھیل بگاڑ دوں۔“

بھائی کی اس بات نے گارشیا کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ شعلہ بار لہجے میں بولی۔

”تم مجھ سے دغا بازی نہیں کر سکتے رابرٹ! ہم دونوں اب تک اپنے اپنے مفادات اور مقاصد..... کے لیے ساتھ رہے ہیں۔ تم مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“

”کون روکے گا مجھے..... ہاں! بولو.....؟“ رابرٹ آنکھیں نکال کر بہن پر چڑھ دوڑا۔

”میں روکوں گی۔“ گارشیا بھی جیسے تم شوکت کر بولی۔ سوچنا ایک طرف ڈری سہی کھڑی ان دونوں بہن بھائی کو حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔

بہن کے اس جارحانہ انداز نے رابرٹ کو ہل بھر کے لیے تو کم صدمہ سا کر دیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ غصے سے دانت چرس کر بولا۔

پر جلدی سے چڑھا دیا۔

”تم بھی اوپر آ جاؤ.....“ اریہ نے ایک موٹی شاخ پر کھنٹے کے بعد زمان سے کہا۔

”نہیں، میں اس درندے کو نشانہ بناؤں گا۔“ زمان نے اریہ سے ابھی اتنا کہا تھا کہ اسے اپنے عقب میں موجود قد آدم جھاڑیوں میں کوئی دھاری دار شے تیزی سے حرکت کرتی ہوئی اپنی جانب بڑھتی محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کو اس کا سانس رک گیا مگر اس نے فوراً اپنے حواس بحال رکھتے ہوئے رائفل سیدھی کرتے ہوئے درخت کے تنے کے تھ پوزیشن بنائی۔

اگلے ہی لمحے اس نے طوفانی رفتار سے اپنی طرف آتے ہوئے گلدرا کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ جنگل کے دم یہ خود سے سناٹے میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا اور گلدرا کی چٹکھاڑا ابھری۔ وہ اس کے پیروں کے قریب آکر ”دھپ“ سے گر تھا۔

زمان نے گہری نظروں سے جانچا، وہ ابھی زندہ تھا۔ اس کا پیٹ تیزی سے پھول اور پچک رہا تھا۔ واضح تھا کہ ابھی اس کی سانس چل رہی تھی۔

کئی درندے گولی نکلنے ہی گر جایا کرتے ہیں اور پھر اچانک لپک کر حملہ کر ڈالتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ زمان ابھی اس پر دوسری گولی چلانے کی تیاری میں تھا کہ گلدرا ایک وحشیانہ سی غراہٹ کے ساتھ دوبارہ اٹھا اور اس سے پہلے کہ گلدرا اس پر حملہ آور ہوتا، زمان نے ٹریگر دبا دیا۔ اس بار اس نے گلدرا کی پیشانی کا نشانہ لیا تھا۔ گلدرا کھنٹی کھنٹی غراہٹ سے گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

”اریہ.....! جلدی بیچے اترو.....“ زمان نے شل پڑتے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے اسے نکارا۔ ایک خوشنوار درندے سے مقابلے نے اس کے اعصاب شل کر ڈالے تھے۔

اریہ نے اس کی آواز سنتے ہی درخت سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ دونوں پھر دوڑ پڑے۔

مراد نے انہیں بتایا تھا کہ جزیرے میں قابض فرنگیوں کے ہیڈ کوارٹر (جسے زمان تباہ کر چکا تھا) کے علاوہ جینی نما چھوٹی سی عارضی بندرگاہ بھی بنی ہوئی تھی۔ اسی بندرگاہ کے قریب ہی کرنل اینڈرسن اور اب کیپٹن پیس کی ہاؤس بوٹ ٹائپ رہائش بھی تھی۔

یہ بوٹ ”سی باک“ ایسی بحری جہاز کے قریب ہی پانی میں ہلکورے کھاتی رہتی تھی۔ اس پر بڑی بڑی سرچ لائٹیں نصب تھیں جو ہر وقت سی باک اور اس کے ارد گرد

برساری تھیں۔ اس کا سندر سا چہرہ بارش اور انگوں سے بھیکا جا رہا تھا۔

چالاک لومڑا اپنی روایتی کہانی کے مطابق بکری کے مینے کو بالآخر بھلا پھلا کر اپنے جڑوں میں دبائے اپنی کمین گاہ کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔

گھوڑا دھواں دھار اور شرانے دار بارش میں مناسب رفتار کے ساتھ کوہ شمالیہ کی آخری حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ دونوں بارش سے بھیک چکے تھے۔ رابرٹ نے ایک چالاک کی بھی کسوچنا کارا بھکاری والا شاہی لباس اتروا دیا تھا اور اسے عام سالباں پہنا دیا تھا۔

خود اس کا اپنا مختصر آ ذاتی سامان بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے سوچنا کو بھگا دیا تھا کہ اس نے راستے میں ملنے والے لوگوں کو کیا جواب دینا تھا۔

پلو سے ایک گھنٹے تک یہ سفر جاری رہا، سوچنا آرام و آسائش کی زندگی میں ملنے والی ایک نازک اندام لڑی تھی۔ سفر کی اس پرتکمان مسافت نے اسے نڈھال سا کر کے رکھ دیا تھا۔ رابرٹ نے محبت سے اپنا ایک ہاتھ اس کے گرد دھانک کر رکھا تھا اور اپنے جسم کی گرمی کو اس کے جوان اور نوجوان بدن کی آج میں رلا ملا کر اسے گرمائے ہوئے تھا۔

وہ اب کوہ شمالیہ کی حدود پار کر کے ہر دور کے گھنے جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ بارش کا زور اب ٹوٹنے لگا تھا۔ جنگل بھیک رہا تھا۔ ابھی بھی کہیں دور کوہ شمالیہ کی چوٹیوں کی جانب آسانی تھی۔ کالج بھر کو کڑا کا ہوتا ہوا پھر گہرا سکوت طاری ہو جاتا تھا۔

چالاک لومڑے جب دیکھا کہ وہ اس منصوبے میں کامیاب رہا ہے تو اس نے سوچا سوچنا کو بھلا نا ضروری ہے۔ اسے ایک نئی دنیا کا مزہ چکھنا ہوگا۔ ایک نئی اور انوکھی لذت سے روشناس کرنا ضروری تھا تاکہ اس کے دل و دماغ کا سکندر ختم ہو جائے اور وہ ایک نئی لذت، سرشاری اور اس کی محبت کے نشے میں فقط اسی کے بارے میں سوچتی رہے اور اپنے ماضی کو بیکس فراموش کر دے۔

اس نے ایک گھٹیا کے قریب گھوڑا روک لیا۔ دونوں نیچے اترے۔ سوچنا کو گھوڑے سے نیچے اتارتے ہوئے رابرٹ نے اسے بے اختیار اپنے سینے سے لگا لیا اور دیوانہ وار اس کا گھبراہٹ اور سندر چہرہ جو منا شروع کر دیا۔

بارش کے پانیوں میں بھیک ہوا سوچنا کا بدن گیلیا ہو رہا تھا، اس پر سفر کی تکان غالب تھی لیکن جیسے ہی چالاک رابرٹ نے محبت کی آج دی تو سوچنا کی یہ تھکن اس کے

..... انگ انگ کو توڑنے لگی۔ محبت اس کے بدن کو توڑ رہی تھی، سفر کی تھکاوٹ ایک مزہ بن کر ابھر رہی تھی۔ ایک سرور جگا رہی تھی۔ سوچنا ایک نوجیز اور نودیدہ کلی بنی تھی۔ ایک ذرا ہاتھ لگاتے ہی جج جج مٹی۔

رابرٹ اسے اسی سرشاری کے عالم میں گھما کے اندر لے گیا۔

باہر گھوڑا ایک درخت سے بندھنا م آلود گھاس چرنے میں مصروف رہا۔ بھیکے ہوئے جنگل میں گہرا سکوت طاری تھا۔ ایسے میں ایک گیدڑ کہیں سے نمودار ہوا اور گھما کے قریب ایک نسبتاً اونچی ٹیکری پر چڑھ گیا پھر اپنا تھوڑا نیم روشن آسمان کی جانب اٹھا کر محسوس آواز نکال کر رو دیا۔

پھر اپنا وجود جھرجھرا کر بھاڑا اور ٹیکری سے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا۔ گھما کے قریب تھوڑا اٹھا کر دیکھا، تھوڑا آگے بڑھا۔ اندر لسانی وجود کی موجودگی محسوس کی اس نے تھوڑے سے ایک "نچ" خارج کی اور ایک طرف کو جا کر تاریک جنگل میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

علی، راجا پر تاب کمار سے ملنے کے بعد اپنے سفید براق گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے بھٹکاتا ہوا اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ وہاں اس کا نائب سالار اقبال خان موجود تھا۔ اپنے سالار کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اس کے احترام میں اسٹھ کھڑا ہوا۔ علی کو شرمندگی سی ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ اقبال خان ایک نواب زادہ تھا۔ یہ اس کا بڑا چاہن تھا کہ وہ یہاں میدان جنگ میں خود کو نواب زادہ نہیں بلکہ علی کا ایک ماتحت سمجھی ہی سمجھے ہوئے تھا۔ یوں علی بھی اسی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ مگر کر بولا۔

"نواب زادہ صاحب! آپ کا یوں میرے احترام میں کھڑے ہونا مجھے شرمندہ کرتا ہے۔"

"گرز نہیں۔" اقبال خان بولا۔ "میں یہاں صرف آپ کا ایک ماتحت سمجھی ہوں اور آپ کا ہر حکم بجالانا میرے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ آپ راجا پر تاب کمار سے ملنے گئے تھے، کیا کہا انہوں نے آپ کے تحفظات اور خدشات کے بارے میں؟"

اقبال خان نے دانستہ موضوع بدل دیا۔ علی نے ایک گہری ہکاری خارج کی اور فرش کے ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اقبال بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"جب میں وہاں پہنچا تو ان کا سینا پتی موج سنگھ بھی وہاں پہلے سے... موجود تھا۔ میں نے اس کی ناراضی کی پروا

کیے بغیر راجا پر تاب کمار سے صاف صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ جب تک فرنگی افواج کو شمالیہ کی سرحدوں میں موجود ہے، ہمیں ہر حال ان سے جنگ کا خطرہ رہے گا۔" علی نے بتایا۔

"دوران گفتگو مجھے احساس ہوا کہ راجا پر تاب کمار بھی کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتا تھا کیونکہ جب میں نے اس کے ایک سوال کے جواب میں یہ بتایا کہ ان کا سینا پتی موج سنگھ فرنگیوں کی پسا پتی کو جھجھے ہوئے ہے اور میری کسی بات کو خاطر میں نہیں لارہا ہے تو پر تاب کمار نے کچھ تنبیہ نظروں سے اپنے سامنے کھڑے سینا پتی کو گھورا۔ خیر بعد میں انہوں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے خدشات پر صاف کرتے ہوئے اپنے سینا پتی موج سنگھ کو حکم دے ڈالا کہ اتحادی افواج کے سالار کے مشوروں پر آئندہ حرف بہ حرف عمل کیا جائے۔" علی اتنا بتا کر چپ ہو رہا۔

اقبال خان خاموشی سے چند تینے کے لیے کچھ سوچتا رہا۔ علی بھی اس درمیان میں چپ رہا لیکن اسے بدستور سوچنا پھر بھی کی مسکراہٹ سے بولا۔

"آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟"

"آں..... ہاں!" وہ جیسے خیالات کے بہنور سے ابھرا۔ "مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ ہماری عسکری منصوبہ بندی اور چالوں کو کوئی اندر کا آدمی سبوتاژ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"کیا یہ اندر کا آدمی ہم میں سے ہے؟" علی نے سوال کیا۔

"ایسا لگتا تو نہیں لیکن زیادہ شبہ مجھے ناگرہ کی فوج کا ہے۔"

"آپ کے شبے کی کوئی ٹھوس وجہ؟"

"میں ابتدا سے ہی یہ بات محسوس کر رہا ہوں۔"

اقبال نے کہا۔ "ہماری جنگی چالیں جب کامیاب ہونے لگتی ہیں تو اس کے آگے روڑے لگائے جاتے ہیں۔ پہلے پہل تو ایسا ہی لگتا تھا مجھے کہ اختلافات روایتی سے ہیں لیکن ہر بار جب ایسا ہونے لگے تو ذہن کا ٹھکانا لازمی ہو جاتا ہے۔"

علی بھوس کیلئے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اقبال اسے ایک زیرک دماغ آدمی لگا، جس کا ذہن اندر کی ادھر گہری بات پر کھنے کا ہنر جانتا تھا۔

"ابتدا میں جب ہم دشمن پر جوابی حملہ کر رہے تھے تو وہ اتنا موثر نہیں ہو پا رہا تھا، اگر یہی حال رہتا تو دشمن اب تک ناگرہ پر قابض ہو چکا ہوتا لیکن تم نے فوراً ہٹا دیا کہ خرابی اتحادی افواج کی طرف سے تھی۔ تم نے فوراً اپنا گھوڑا بھگا لیا اور موج سنگھ کے پاس پہنچے۔ بقول تمہارے وہ خرمستی

کے عالم میں اپنے خیمے میں موجود تھا۔ اسے آخر کس بات کی تسلی تھی؟ لیکن تمہاری بات پر اس کے ہوش ٹھکانے آئے اور ہمارے ساتھ مل کر انہوں نے دوسری جانب سے فرنگی افواج پر بھرپور حملہ کیا تو بات بنی۔ اب دوبارہ وہی ہونے جا رہا تھا، یعنی دفاع کی جیت کو جیتے ہوئے تھے یہ لوگ..... حالانکہ تم نے موج سنگھ کو اپنی تشویش سے بھی آگاہ کیا مگر وہ تو اپنی جگہ سے جلد راجا پر تاب کمار تک پہنچا کر اپنا سینہ بھلا نا چاہتا تھا۔ تم وہاں پہنچے تو وہی ہوا۔ بات ہماری ہی درست تسلیم کی گئی۔"

یہ ساری صراحت سن کر علی بھی ہونٹوں میں انگلی داب کر رہ گیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اس نے اس طرح کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ اس کی بات کا مطلب سمجھتے ہوئے.... متشکر سے لہجے میں اقبال سے مخاطب ہوا۔

"اقبال صاحب! تو آپ کا مطلب ہے کہ دشمن کا کوئی غدار یا جاسوس ہماری مفوض میں موجود ہے؟"

"ہماری مفوض میں نہیں، موج سنگھ کی صف میں۔"

اقبال خان نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ یہ اس کا کوئی بہت ہی قریبی ساتھی ہے سینا پتی جس کی بات کو جھٹلاتا نہیں ہے۔"

"کون ہو سکتا ہے؟"

"اس غدار کا کھوج لگانا لازمی ہے، ورنہ فرنگی اسے خریدنے میں دیر نہیں کریں گے۔"

"ٹھیک ہے پھر....." بالآخر علی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں ابھی ایک ہوشیار اور مستعد آدمی کو موج سنگھ کے پاس بھیجنے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"آپ صرف میدان جنگ کی حکمت عملی اور اس پر نگاہ رکھیں، یہ کام میرے لیے چھوڑ دیں۔" اقبال خان نے تدبیر سے کہا۔ "اب آئندہ آپ کی کیا حکمت عملی ہے؟"

علی نے ایک دتی نقشہ قائلین پر پھیلادیا اور اقبال خان کو کچھ بتانے لگا۔

جنگی حکمت عملی تیار ہوتے ہی علی نے دشمن کے "تین حدے" پر واقع جنگی میں یکم پر ہلا بول دیا۔ اتحادی افواج اور ناگرہ کی فوج نے، شکست کا ماتم کرنے والے فرنگی دشمنوں کے نہ صرف چھٹے چھڑا دیے بلکہ ان کے دو اہم افسروں کو قیدی بھی بنالیا۔ بچی نہیں بلکہ مال غنیمت کے طور پر کافی سارا اعلیٰ پٹہ بشول تو ہیں ان کے ہاتھ لگیں۔ یہ سارا سامان علی نے جتنی قیدیوں سمیت اپنے قبضے میں کر لیا۔

اور پھر جو رام کا غدار جاسوس آتما شکہ جو متواتر اپنی ناپاک کوششوں میں اب تک ناکامی کا ہی منہ دیکھ رہا تھا،

جہانگیر بکس

450/-	انسان اور یوتا	475/-	معظم علی	550/-	اورنگزادہ گئی	550/-	آخری معرکہ
300/-	پاکستان سے دیوار تک	550/-	خاک اور خون	500/-	گمشدہ قافلہ	475/-	دہلی کی تاریخ
450/-	آخری چٹان	450/-	کلیسا اور آگ	300/-	داستان مجاہد	300/-	ثقافت کی تلاش
225/-	سوسال بعد	599/-	قافلہ حجاز	425/-	محمد بن قاسم	625/-	قیصر و کسری
325/-	سفید جزیرہ	300/-	پورس کے ہاتھی	500/-	یوسف بن تاشفین		
475/-	شاہین						

سبق آموز کتب سلسلہ

دورنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین



165/- اقوال حضرت علی المرتضیٰ

165/- اقوال آنحضرت کرام

195/- حکایات گستان سعدی

140/- اقوال شمسعدی

180/- حکایات رومی

170/- دلچسپ و عجیب حقائق

199/- حکایات بوستان سعدی

150/- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں

180/- ایمان افروز سبق آموز

165/- بڑے لوگوں کے روشن واقعات

042-35757086

022-2780128

021-32765086

051-5539609

042-37220879

اردولفت

(جامعے ستوبین)

مفتی محمد رفیع الرحمن صاحب مدظلہ کے ساتھ اردو زبان سے کاپی ہلاکت

جہانگیر بک ڈپو

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

حلق سے کراہی نکل گئی۔ وہ جھکے جھکے انداز میں روشنی کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اندھیری اور تنگ گچھا کے اندر موجود تھا۔ وہ حیران و پریشان تھا۔

عالم بے ہوشی سے اس کا ذہن دھیرے دھیرے بیدار ہوا تو اسے بالترتیب سب یاد آتا چلا گیا۔ کیسے وہ رینا کی تلاش میں کالی کے مندر تک پہنچا اور وہاں اس کا اور اس نابکار مہا پجاری بدری کا تھک کا خون ٹکراؤ ہوا۔ جس کے نتیجے میں بدری کا تھک اپنی ہی کسی شیطانی قوت کے زیر عتاب آکر اچانک نہیں غائب ہو گیا۔ مندر بھی تباہ ہو گیا تھا اور رینا.....؟

”وہ کہاں گئی؟“

رینا کا خیال آتے ہی وہ بے چین ہو گیا۔ اسے یاد آیا کہ وہ اس کے سامنے آئی تھی، ایک تو قتل گئی تھی اور دوسری اصلی، جبکہ اصلی والی صدمے سے بے ہوش ہوئی تھی اور پھر اسے بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ کالی کا مندر کھنڈر بن چکا تھا مگر یہ کون سی جگہ تھی؟ اسے یہاں کون لایا تھا؟

وہ اب اپنے متعلق سوچنے لگا۔ تب اس نے تنگ و تاریک سی گچھا سے باہر نکلے کا ارادہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ باہر تیز اور بریلی کاٹ دار ہوا میں چل رہی تھیں۔ اسے سردی محسوس ہونے لگی۔ وقت دن کا ہی تھا مگر شاید آسمان پر چھائے گہرے بادلوں اور کالی گھٹاؤں نے جھکے جھکے اندھیرے کا سماں پیدا کر رکھا تھا لیکن پھر بھی وہ ہمت کر کے گچھا کے سرے تک آیا اور جب باہر بھاگ کر دیکھا تو بری طرح دہل کر رہ گیا۔ اگر وہ جلدی سے پیچھے کو نہ ہٹ جاتا تو کئی سو فیٹ کی بلندی سے نیچے بریلی چٹانوں میں جا کر تباہ کالی کے مندر کے بعد شوشی کے لیے یہ ایک نیا ”اسرار“ تھا مگر اسے سمجھنے سے بھی ہنوز قاصر ہی تھا۔

بدری کا تھک سے خونی مقابلے اور ایک طرح سے اس موذی مرد و شیطان کو شکست دینے کے بعد وہ خود بھی زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے رینا کی فکر لاحق تھی۔

اس کا جانے کیا حشر ہوا ہوگا؟ وہ جلد سے جلد اسے تلاش کر کے اس کی خیریت جاننا چاہتا تھا لیکن اپنے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا تھا اور وہ بھی اتنی بلندی پر واقع غار کے اندر.....؟ کون اسے یہاں اٹھا کر لایا تھا اور کیوں؟

وہ ہمت کر کے پھر غار کے سرے تک گیا۔ تاہم اب وہ دیوار سے چپکا ہوا اور دھیرے دھیرے آگے بڑھا تھا کہ کہیں پھر تیز بریلی کاٹ دار ہوا میں اسے..... نیچے دھکیلے

اپنے ”گورے“ آقاؤں کی شکست پر تملایا گیا لیکن گندی کھنکی کی طرح اس نے بھی شریہلانے کا موقع ڈھونڈ لیا۔ اس شاندار فتح کے بعد وہ فوراً سینا پتی موج سنگھ کے کان بھرنے جا پہنچا۔

”یہ کیا بات ہوئی مہاشے جی..... فتح ہماری اور مال غنیمت سارا اتحادی فوجی سمیٹ کر چلے گئے؟“

موج سنگھ اس وقت فتح کے جشن کی تیاری کے انتظامات کروا رہا تھا۔ بے لگاری سے بولا۔

”تو کیا ہوا شکھ جی! لے جانے دو..... ہمارے پاس بھگوان کی کرپاے سب کچھ ہے۔ ہم ان غاصب فرنگیوں سے اپنی دھرتی بچانے میں کامیاب ہو گئے، یہی ہمارے لیے بہت ہے۔“

”پر تو مہاشے جی! اس جنگ میں ہم بھی تو برابر کے شریک تھے..... ہمارا بھی تو حق بنتا ہے؟“

موج سنگھ فطرتاً ہی ایک مثبت ذہنیت کا آدمی تھا۔ وہ کسی کے برکائے میں کم ہی آتا تھا۔ باقی روایتی انسانوں کی طرح اس کی بھی کچھ کمزوریاں تھیں۔ وہ تھوڑا بے پروا اور تساہل پسند تھا مگر سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا نائب آتما شکھ ایک فضول سی بحث چھیڑنے کی کوشش کر رہا تھا مگر یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس کا یہ ”فضول“ سی بحث چھیڑنے کا اصل مقصد کیا تھا؟ تاہم وہ بولا۔

”شکھ جی! اب چھوڑو ان باتوں کو..... ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، یہ کیا کم ہے؟ اب ہم چند لوگوں کے مال غنیمت پر آپس میں بیٹ لڑ پڑیں۔ میری بات تو چھوڑو خود را جا پر تاب کنار اس بات کو سخت ناپسند کریں گے۔ اسی لیے تم اپنا دار مار نہ کھپاؤ اور جیت کے جشن کے مزے اڑاؤ۔“

آتما شکھ اس جواب پر اپنا سامنے لے کر رہ گیا۔ اس کی کوئی چال کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ ہو جاتی تو کہیں نہ کہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ اسے اب یہ ڈر ہونے لگا تھا کہ وہ پچھو رام کو کیا جواب دے گا؟

☆☆☆

شوکی کو ہوش آیا تو وہ ایک دم بڑبڑا سا گیا۔ اس کے گرد کالی گچھ تاریکی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ کہیں وہ اس جہان سے ہی تو نہیں سدھا کر گیا۔ اس کی تصدیق کے لیے اس نے اپنے جسم کو چھوا اور اسے حرکت دی۔ درد کی ٹپس اس کے وجود میں اتری اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے خود کو ایک کھال کے بستر پر پایا تھا۔ پھر اسے روشنی دکھائی دی۔ وہ کھڑا ہوا تو اس کا سر کسی مٹی چھت سے ٹکرایا۔ اس کے

تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ کسی بلند ترین پہاڑی
سلسلے کے ایک غار کے اندر موجود ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں
آ رہا تھا کہ وہ اتنی اونچائی پر لایا کس طرح گیا تھا اور اب
اسے لانے والا خود کہاں غائب تھا؟

اچانک اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ اس سارے پراسرار کھیل میں اس سفیدری نمائے کو فراموش کر گیا تھا جس نے مہا پجاری بدری ناتھ سے لڑائی کے دوران اس کی کئی خطرناک مرحلوں میں مدد کی تھی۔ یہی نہیں، بدری ناتھ کے شیطانی حربوں کو بھی ناکارہ کر ڈالا تھا۔ پراسرار گنڈے کی مورفی، اس کا بدری ناتھ کے روپ میں آنا اور اسی کو منت ملامت کرنا۔ اس کھوڑی کی وہ بات بھی اسے یاد آگئی جو اس نے بڑے غیظ میں کہی تھی کہ اس کی وجہ سے کالی کے مندر میں ایک اور ایسی ہستی بھی آگئی تھی جو ان کی سب سے بڑی دشمن تھی۔

وہ ہستی کون تھی؟ ہنسی سوچنے لگا۔ کہیں وہی تو اسے یہاں لے کر نہیں آئی تھی؟ اس کے اندر طرح طرح کے خیالات جنم لینے لگے لیکن پھر رینا کا خیال پریشان کرنے لگا تو اس نے انہیں ذہن سے جھٹکا اور صرف رینا کے متعلق ہی سوچنے لگا۔

وہ اپنی ہٹ کا لپکا تھا۔ حرکت کرنا جانتا تھا۔ نچلا بیٹھنا
اسے کہاں آتا تھا۔ اس کی فطرت میں ہی کھوجنا اور آگے
بڑھنے کا عنصر غالب تھا۔ لہذا اس نے یہاں سے نکلنے کا حتمی
فیصلہ کر لیا۔

اس بار اس نے سوچ سمجھ کر قدم اٹھایا۔ وہ کسی حلدی بازی سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس نے اگلے قدم بڑھائے۔ کھال کا بستر اٹھایا۔ سردی سے بچنے کے لیے وہ اس نے اپنے جسم کے گرد اونچی طرح سے لپیٹ لیا۔ اب اسے سردی کا احساس کم ہو رہا تھا۔ وہ دوبارہ غار کے سرے پر پہنچا۔

یہ کوئی برف پوش پہاڑی وادی تھی۔
فکر مند ہونے لگا کہ نہ جانے وہ اپنے اصل مقام و منزل
سے کتنی دور یہاں لاکر پھینک دیا گیا تھا لیکن اب تو وہ
مطمئن تھا کیونکہ اس نے عزم کر لیا تھا کہ وہ یہاں سے نکل
کر رہے گا۔

اس نے ایک چوپائے کو اس طرح چٹائی دیواریوں پر چلتے دیکھا تو سوچا کہ وہ تو انسان ہے، اس کے لیے کیا مشکل ہو سکتی ہے؟ یہ سوچ کر اس نے حوصلہ پکڑا اور اللہ کا نام لے کر ایک پاؤں بیچ کر رکھا۔ پاؤں تھوڑا بڑا، وہ سنبھلا پھر آگے کو بڑھا..... ذرا پیسلا، لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنا توازن برقرار رکھا اور اب تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ غار سے باہر تھا۔

اب اس کے نیچے لاجھو وخطرناک برقی
سہرائیاں تھیں۔ یعنی اگر اس کا پاؤں پھسل جاتا تو وہ نیچے
ان ابھری ہوئی نوکوں میں پرودیا جاتا۔ ایسی خوفناک
موت کا تصور ہی اس کے لیے سوہان روح تھا مگر اس نے
ہمت نہیں ہاری اور اسی طرح چٹائی دیواروں کا سہارا لیے
وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔

دفعاً تجانے کیا ہوا کہ وہی پہاڑی بکر ابد کا۔ برف کے سنگ ریزے اس کے کھروں کے نیچے سے پھسلے اور اتھاہ گہرائیوں میں جا لڑکھ۔ بکر نے جب لگائی تھی۔ اس کے دو بڑے بڑے سینگ خاصہ نکمیلے تھے۔

اس نے شوکی کو مکر دے ماری۔ شوکی کا لہو خشک ہو گیا۔ اس نے ایک نکر کو کسی طرح سہ لے کر جاتا تھا کہ اگر لے کر وہ نہیں سہ پائے گا۔ لہذا اس نے مکرے کو پہلا ہشکارے دیے پھر اسے پچکارنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن مکر ابھی ایک ہٹا تھا، وہ اپنی عمل داری میں شوکی کو بالکل پھنسنے کر رہا تھا۔

اس نے دوسری نگر رسید کی۔ ساتھ ہی اس نے اپنے
تھوٹنے سے..... مخصوص آواز بھی نکالی۔

شوکی کا ایک ہاتھ چٹائی رننے سے نکل گیا۔ شوگر مگر جھرتے بچا۔ اس کا دل اچھل کر قلع میں آڑا اٹکا۔ وہ پچھتانے لگا کہ اس کی بیوی کرنے سے پہلے اس بکرے کو آگے نکل جانے دیتا لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب تو وہ واپس اپنے غار کی جانب بھی نہیں پلٹ سکتا تھا۔ نہ ہی وہ بکرے پر کسی قسم کے حملے کرنے کی پوزیشن میں تھا۔

بکرے نے تاک کر ایک اور زوردار ٹکرا سے رہے
کی۔ شوکی کے حلق سے مارے خوف کے چیخ خارج ہوئے

کیونکہ شوکی کے دونوں ہاتھ جھوٹ گئے تھے۔ ایک پاؤں بھی رپٹ گیا تھا۔۔۔۔۔ وہ بلندی سے بیچے آ رہا تھا اور سیدھا کئی سو فٹ کی گہرائیوں میں گرنے لگا تھا۔ اتنی بلندی سے گرنے کا مطلب اس کی دردناک موت تھا۔ شوکی نے دردناک موت کے تصور کے باعث اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

اچانک اسے پول لگا جیسے اس کے تیزی سے بچنے
کھائی میں گرے وجود کو کسی نے تھام لیا ہو۔ وہ وہیں ٹھہر
گیا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اسے کوئی
نظر نہ آیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہی رسی مناسفدہ شے اسے
دکھائی دی جواب اپنا جھم پھیلنا بچی تھی اور شوکی کے جسم
کو گویا اپنے غیر مرئی ہاتھوں کے جھولے میں اٹھا کر دوبارہ
اسی غار کے اندر لے آئی تھی۔

شوکی نے دردناک موت سے بچ جانے پر پہلے تو
اطمینان کی سانس لی، اس کے بعد وہ چھٹی چھٹی آنکھوں سے
اپنے اس پر اسرار محسن کو دیکھنے لگا، جواب دہرے
دہرے کھڑے لگا تھا۔

”تنت..... تم کون ہو؟ بتاتے کیوں نہیں؟“ اور.....
اور مجھے یہاں کیوں لائی ہو؟“ اس نے ہمت کر کے پوچھ
ہی لیا۔ وہ سفید سے اجاگب پھر اپنی ہیبت اور خجندہ لئے کئی
اور دوسرے ہی لمحے شوکی کی جھیلی ہوئی آنکھوں نے ایک
حیران کن منظر دکھا۔

ایک انتہائی حسین و جمیل عورت اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ شوکی اس کے حسن کی ایک جھلک دیکھ کر اپنی جگہ مبہوت سا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

پنجو رام بدحواس ساہور ہاتھا۔ اس پر اپنی غیر متوقع ناکامی کے باعث سخت بوکھلاہٹ اور بدحواسی طاری تھی۔ اس نے یہ سارا غصہ آتماشلکہ پر اتارا۔

”تف ہے تم پر..... میدان جنگ میں رہتے ہوئے
بھی تم اتنا نہیں کر پائے کہ ہمارے آقاؤں کی شکست کو فتح
میں بدل دیتے؟“

آتما فکلمہ اس کے سامنے شرمندہ اور چہرہ جھکائے
خاموش کھڑا تھا، پھر اسی انداز میں بولا۔

”میں نے تو بہت کوشش کی تھی پر بھو! پرنتو ہمارے
آقاؤں کی قسمت ہی خراب تھی۔“

”اب کیا ہوگا؟ میں اور تم اسی طرح ہاتھ باندھے ساری عمر راج محل میں گزار دیں گے۔“ بچھورام بولا۔

اب بھی یہی کریں گے۔ ہم پر کسی نے غداری کا شبہ تو نہیں کیا ہے۔۔۔۔۔“ آخر حاکم نے اپنی عقل کے مطابق ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

”الغبت ہے تم پر، مدح و ہجو اویسیاں سے.....“
 بھجورام جھلا گیا۔ اٹما فکھ اپنا سامنے لے کر چلا بنا۔
 بھجورام اپنے کمرے میں بے چینی سے بیٹھنے لگا۔ اس کی سمجھ
 میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ نوبو بانی کے پاس کیانے لے کر
 جائے؟ لیکن جانا تو تھا ہی۔ لہذا وہ ہمت کر کے وہاں پہنچا۔
 ادھر نوبو بانی بھی اس کی بے چینی سے خطرہ سمجھی۔
 بھجورام جب وہاں پہنچا تو اس نے فوراً پر امید نگاہوں سے
 اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پھجورام! تم یقیناً مجھے بددعا دیے آئے ہو گے کہ اب ہم سریر آرا حکومت ہونے والے ہیں۔ ہمارے آقا جنگ جیت گئے؟ انہوں نے راج محل پر قبضہ کر لیا؟ اس مورکھ موئے پر تاب کمار کو قیدی بنالیا گیا؟ اب میں ناگرہ کے سنگھاسن پر کرب براجمان ہوں گی؟ تم..... تم بولتے کیوں نہیں ہو پھجورام..... جب کیوں کھڑے ہو؟“

”ہمارے آقا (فرنگی) جنگ مارچے ہیں کجوبانی!“
 بالآخر پھجورام نے نکلے ہوئے منہ سے یہ بری خبر سنا لی تو
 کجوبانی کو جیسے سکتہ سا ہوا گیا، وہ ایک تک اس کا چہرہ کھتی رہ
 گئی۔ اسے جیسے پھجورام کی بات پر تعین ہی نہیں آیا۔ وہ
 چلا کر اور اس کا گھر بیان کجوجو ذکر ہوئی۔

”یہ ی..... تم کیا کہہ رہے ہو پچھورام؟ یہ
یہ..... کیسے ہو سکتا ہے؟ ت..... تو کیا میں ساری

عمر اسی طرح یہ ماتی لباس پہنے اس منحوس قید خانے میں
بند رہوں گی؟ انہیں بچھورام.....! ہرگز نہیں۔ تمہیں حساب

دینا ہوگا۔ ان رت جکوں کا جو تم نے میرے ساتھ ناگرہ کے تختہ اقتدار کی آس میں گزارے۔ ان خلوتوں کا بھی

جو تم نے میرے ساتھ، ایک مہارانی کی شان اور عزت کو روندتے ہوئے بتائے۔ نہیں بچھورام !.....!

ہرگز نہیں۔ تمہیں اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔ مجھے راج محل کے سنگھاسن پر بٹھانا ہوگا، ورنہ..... ورنہ..... میں اب تمہیں

بھی نہیں بخشوں گی، میں تو جیسی ہوں ویسی ہی ہوں لیکن تمہیں بھی راج محل میں اتنی آسانی سے زندگی بتانے نہیں

وں کی۔ چنچ چنچ کر سب کو بتا دوں گی کہ تمہاری اصلیت کیا ہے۔ تم کون ہو؟ ایک ادنیٰ غلام کی حیثیت سے تم نے

مداری جیسے ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ نہیں

لیں۔ یاد رہے اس میں آپ اپنی طرف سے کوئی معروف اضافہ (یہاں معروف سے مراد منقہ ہے) کرنا چاہیں تو اس کی خط میں منجانب سے پہلے ہی سے لکھ دی گئی ہے۔
راجا پر تاج کمار نے اپنی بات ختم کر کے خط پہلے نواب شہباز کی طرف بڑھا دیا۔ وہ پہلے تو حیران حیران کی نظروں سے خط کو دیکھتے رہے، پھر جیسے جیسے وہ اس کی عبارت پڑھتے گئے ان کے چہرے پر جوش کی سرخی آتی چلی گئی۔

پورا خط پڑھ لینے کے بعد ان کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انہوں نے ایک نگاہ راجا پر تاج پڑائی اور ہولے ہولے اپنے سر کو بھی انداز میں جنبش دیتے ہوئے وہ خط مہاراجا مہندر سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔ ان کے بعد خط علی اور اقبال خان کو بھی پڑھنے کے لیے دیا گیا۔ سب سے آخر میں ان کے مشیروں نے بھی خط پڑھا۔
اس خط کی عبارت یہ تھی.....

”عزت مآب ملکہ عالیہ! ایک معاہدے کے تحت ہندوستان کی جواز داریاں ہیں اور جو اپنی اپنی عمل داری میں اپنے داخلی و خارجی مسائل کے لیے خود مختار ہیں اور ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ کی غیر مشروط و قادیاری کا دم بھی بھرتی ہیں، ان پر کمپنی کے سپاہیوں نے اچانک اور بلا جواز دھاوا بول دیا۔ ایک وقت میں ریاستوں ناگرہ پالن پورا اور ترپال پر حملہ کیا اور عام لوگوں پر وحشیانہ گولہ باری کی گئی۔

”ان کا مقصد محض ریاستوں کے خزانوں، ذاتی جائیداد اور دولت پر قبضے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے خیال میں اس ناروا پالیسی کے باعث ان معزول حکمرانوں کے ساتھ ساتھ ریاست کے عوام میں بھی انگریزوں کے خلاف شدید نفرت اور غم و غصے کے جذبات ابھرے ہیں۔ اسی طرح ماضی میں راجا راجپوت کے محل میں کس کر راجا کی مام ریاست اور ذاتی جائیداد اور دولت پر قبضہ کر کے انہیں ہر چیز سے بے دخل کر دیا گیا تھا۔ جہانسی کی رانی کو معزول کرنے کا بھی زبردست رد عمل سامنے آیا تھا، کیونکہ کشمی پالیسی عوام میں بے حد مقبول تھی۔ لہذا میں ملکہ عالیہ کی حکومت کے اعلیٰ حکام کو خبردار کرتا ہوں کہ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی کے احق و فرمان (گورنر رونی کا سٹور، جنرل مائیکل شاہ، ڈان کیو سٹور وغیرہ) کی یہ پالیسی جاری رہی تو اس سے انگریزوں کے مفادات کو سخت

لیکن ابھی اس عظیم تقریب کا اصل مقصد باقی ہے۔“
راجا پر تاج کمار اتنا کہہ کر راجا۔ سب لوگ حیرانی اور کچھ الجھی ہوئی نظروں سے راجا کا چہرہ دیکھنے لگے۔
”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے صرف چار معزز افراد کے ساتھ ایک الگ نشست کا بندوبست کیا ہے جو ذرا سنجیدہ نوعیت کی ہے اور اہم بھی..... کیونکہ یہ موقع بھی ایسا ہے کہ ہم سب یہاں ایک چھتری تلے موجود ہیں۔“

اس کے بعد راجا پر تاج نے پالن پور کے مہاراجا مہندر سنگھ، ترپال کے نواب شہباز خان، ان کے بیٹے اقبال خان اور علی ریحان کو اس آخری نشست گاہ میں آنے کی دعوت دی۔
البتہ راجا پر تاج نے بالخصوص مہاراجا مہندر سنگھ اور نواب صاحب سے اپنے چند ایک مشیروں کو بھی ساتھ لانے کا کہہ دیا تھا۔

نواب صاحب نے تو کسی مشیر کو ساتھ نہیں لیا، اگرچہ ان کے بھی خدام اور مصاحبین و مشیر ساتھ آئے تھے مگر علی اور اپنے بیٹے اقبال کی موجودگی میں انہیں ان کی چندال ضرورت نہیں پڑی تھی۔ البتہ مہندر سنگھ نے دو مشیر اپنے ساتھ کر لیے تھے۔

یہ نشست ایک شانہ کمرے میں طے پائی تھی۔ وہاں کھانے پینے سے متعلق کسی بھی قسم کے لوازمات نہیں تھے۔ صرف تخت نما چوٹی آرام دہ نشستیں تھیں، جن پر دلکش..... بستر بچے ہوئے تھے۔ نقشین اور سونے کی کڑھائی کے ہوئے گاؤں کی بھی ان پر دھرے پڑے تھے۔

پر تاج کمار کے ہمراہ بھی صرف ان کا ایک ہی مشیر خاص، سترام داس موجود تھا۔

”اختیار کے دوران میں اب ایک مختصری تجویز اپنے بھی خواہوں کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔“ راجا پر تاج نے کہنا شروع کیا۔ پانی سب اس کی طرف متوجہ تھے۔ پھر اس نے اپنے ساتھ بیٹھے سترام داس کی طرف دیکھا اور مخصوص انداز میں اپنے سر کو جنبش دی تو اس نے فوراً اپنے لباس سے ایک بڑا سا کاغذ نکال کر سب کے سامنے پھیلا دیا۔

سب کی نظر اس پر تاج پر تاج کمار سے ہٹ کر اس کاغذ پر جم کر رہ گئی تھی۔

”یہ وہ خط ہے جو میں نے انگلستان ملکہ عالیہ کو روانہ کرنا ہے۔ آپ پہلے اسے باری باری پڑھ

کھلا دیے۔ اسی لیے اس نے سوچا کہ ابھی شیورائے سے جا کر ملنا قبل از وقت ہوگا۔ اسے کچھ دن بعد روانہ ہونا چاہیے۔ جب تک ”یہاں“ اور ”وہاں“ کی صورت حال کچھ واضح نہیں ہو جاتی۔

تاہم اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب نجوبائی کی تخلیق گاہ کارخ..... نہیں کرے گا، یوں بھی اب وہاں اس کے جانے کا کوئی جواز..... کب بچا تھا.....؟

☆☆☆

اتحادی افواج کو ناگرہ کے راج محل میں فتح کے جشن میں بڑی عزت و تکریم کے ساتھ مدعو کیا گیا تھا۔
ترپال کے نواب شہباز خان نے علی کو فریاد جذبات سے اپنے محلے سے لگایا تھا۔ پالن پور کے مہاراجا مہندر سنگھ نے بھی علی کو خراج تحسین پیش کیا تھا کیونکہ ناگرہ کے راجا پر تاج کمار نے علی الاطلاق اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا کہ اس جنگ کی عظیم فتح کا سہرا علی ریحان کے سر جاتا ہے، اس نے اپنی بہترین جنگی حکمت عملی اور بہادری سے فرنگیوں کو عبرت ناک شکست سے دو چار کیا تھا۔

غرضیکہ راج محل میں ان سب کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ فتح کی اس عظیم الشان تقریب میں ترپال اور پالن پور کے نواب اور مہاراجا، ان کے خاندان کے افراد نیز مشیر، مصاحبین وغیرہ..... سب ہی موجود تھے۔
راجا پر تاج کمار نے راج محل میں ہی اس جشن والی تقریب کا شاندار اہتمام کیا تھا جبکہ پوری ریاست کے محل چوچوں میں بھی راجا کی طرف سے لوگوں کو انواع و اقسام کے کھانے، نواکھات (فروٹ وغیرہ) اور مٹھائیاں تقسیم کی گئی تھیں۔

عصر کے وقت سے شروع ہونے والی یہ پروقار تقریب رات گئے تک جاری رہی تھی۔

یوں تقریب جب اختتام کو پہنچنے لگی تو راجا پر تاج کمار نے مدعوین خاص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میرے معزز، دوست احباب اور میرے ہم عصر سریر آرا ساتھیو! ہمارے بے مثال اتحاد نے آج کئی گنا زیادہ طاقت رکھنے والے فرنگی دشمنوں کے دانت کھٹے کر ڈالے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری یہ عظیم الشان ریاستی یکجہتی ہمیشہ اسی طرح قائم و دائم رہے گی۔“ اتنا خطاب کر کے راجا پر تاج بڑا راک اور پھر کہنا شروع ہوا۔
”یوں تو ہم نے یہ جشن فتح کی خوشی میں منایا ہے،

پچھورام! میں اتنی آسانی سے تمہیں یہاں کے عیش نہیں کرنے دوں گی۔ یا پھر تم ہمیشہ کے لیے راج محل چھوڑ کر دور نکل جاؤ..... اتنی دور کہ میں تمہارا سایہ بھی دوبارہ یہاں نہ دیکھوں۔“

یہ سب کہتے کہتے نجوبائی بری طرح ہانپ گئی۔ وہ غصے اور غم کے مارے کانپنے لگی تھی۔ اس میں اپنے پیروں پر کھڑے رہنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

وہ بہ مشکل ایک نشست کی پشت گاہ کا سہارا لے کر اس پر ڈھبے جانے کے انداز میں گری گئی۔ وہ از حد دل گرفتہ اور مایوس ہو رہی تھی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو پچھورام، جواب میں پیچھے نہیں ہٹا لیکن اب معاملہ اور ہو چلا تھا۔ اس نے ٹھوڑی دیر تک دانستہ خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اس کے بعد جب اس نے نجوبائی کو ٹھہر ٹھہر کر سانس لیتے پایا تو بولا۔

”نجوبائی! آپ کا میرے لیے جو حکم ہو میں اس کے لیے دست بستہ تیار ہوں۔ اگر آپ کی خوشی اسی میں ہے تو میں جنگ کی راہ لیتا ہوں۔“ پچھورام کا لہجہ ایک دم مؤبدانہ ہو گیا تھا۔ وہ مزید بولا۔

”پرتو ایک بات بتائے دیتے ہیں نجوبائی! آپ بہت جلد زراش ہو گئی ہیں۔ جنگ میں ہارجیت تو ہوتی ہی ہے۔ پرتو میں کل ہی دہلی جا کر بھوگر صاحب سے ایک ملاقات کروں گا اور اس وقت تک وہاں نہیں لوٹوں گا جب تک کہ کوئی نئی اور اہم خبر نہ آجائے..... آگے آپ کا جو حکم ہو۔“ وہ اتنا کہہ کر سر جھکا کر چپ ہو رہا۔

”ہمارا اب کچھ بھی کہنے کو سن نہیں چاہ رہا ہے پچھورام! بس ہمیں تنہا چھوڑ دو۔“ نجوبائی نے ایک ہاتھ کھڑا کیا اور اس کی جانب دیکھنا بھی گوارا کیے بغیر اس سے کہا۔ پچھورام خاموشی سے واپس پلٹ گیا۔

اپنے اقامتی گوشے میں آکر وہ عجیب غصے کا شکار ہو گیا تھا۔ کیونکہ نجوبائی نے اسے کوئی مسکت جواب نہیں دیا تھا۔ پچھورام کو اس کی مایوسی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں نجوبائی دل شکستہ اور مایوس ہو کر راج محل میں اس کا بھانڈا نہ چھوڑ دے۔

کہنے کو تو وہ نجوبائی سے یہ کہہ آیا تھا کہ وہ اگلے دن صبح سویرے شیورائے بھوگر سے ملنے نکل جائے گا تاکہ فرنگیوں کی طرف سے نئی صورت حال کا علم ہو سکے لیکن اب وہ ڈر رہا تھا کہ نجوبائی جیسے سے اس کے خلاف کوئی عمل نہ

ہفت روزہ



موسم کی بدلتی صورتیں
اکتوبر کے شمارے کی باتیں

اولین صفحات

خود اعتمادی کا میابی کی کنجی ہے جس کے ذریعے ہر منزل پر پہنچا جاسکتا ہے۔ ایک کم ہمت شخص کی داستان حیات، کاشف زبیر کے قلم سے.....

انگاریے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک جینپن کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتی طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت سے برسر پیکار نوجوان کی سرگزشت..... عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

سورق کے رنگ

جرائم کی دنیا سے منسلک ہو جانے والوں کا عبرت انگیز ماجرا مسائل و مصائب سے گھبراہٹ کے غلط راہوں کا انتخاب کرنے والوں کا انجام

جیتی نکتہ چینی

آپ کے تہرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

بے سدھ ایک کمرے میں پڑے ہوئے کسی خادم نے دیکھا تھا۔ چونکہ یہ راج محل کے مہانوں میں سے تھے اور یہی لوگ جانتے تھے کہ یہ رینا کے حوالے سے راجا پر تاب کے خاص مہمانوں میں سے ہیں۔ اسی لیے اسے ہوش میں لانے کی تنگ و دو کی جانے لگی۔

شاہی ویدوں اور حکیموں نے گارشا کا نیلا پڑتا چہرہ اور گردن کے گرد پڑے نیل، جواہریوں کے تھے، دیکھتے ہی بے ہوش ہو گیا تھا کہ اسے گھاگھونٹ کر مارنے کی کوشش کی گئی تھی مگر شاید ”مارنے والا“ کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھا اسی لیے اس نے ادھ موڑ کر گارشا کے جسم کو چھوڑ دیا تھا۔

تھوڑی کوششوں سے گارشا کو ہوش آ گیا مگر گلے کی دکن کی وجہ سے وہ ابھی بات کرنے سے قاصر تھی۔ لہذا اسے آرام کرنے دیا گیا۔

گارشا نے پہلے تو دل ہی دل میں اپنی جان بچ جانے کی خوشی محسوس کی، اس کے بعد اس کے پورے وجود میں اپنے خود غرض اور سفاک بھائی رابرٹ کے لیے نفرت کی لہریں دوڑ گئیں جس نے اس کے سینے میں آتش انتقام کے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ وہ رابرٹ سے انتقام لے لے گی جو اسے اپنی طرف سے ماری چکا تھا۔ اب وہ کیوں اس سے رعایت برتے؟ وہ سوچ رہی تھی کہ جب وہ سب کے سامنے یہ انکشاف کرے گی کہ..... رابرٹ، راجا کی سوجنا کو جیتی زور جواہر اور نادر نمونوں کے ساتھ یہاں سے بھاگے گیا ہے تو راجا پر تاب کمار پر کیا گزرسے گی؟ اسے جلد سے جلد یہ حقیقت بتا دینی چاہیے تاکہ رابرٹ کو ہندوستان چھوڑنے سے پہلے ہی گرفت میں لے لیا جائے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پڑے جانے کے بعد رابرٹ کو اس ناقابل معافی اور سنگین جرم کی کس قدر سخت سزا مل سکتی تھی۔ البتہ سوجنا کے خاموش غیاب کا ابھی تک کسی کو پتا نہ چلا تھا۔

ادھر رینا کی حالت بھی کم غیر نہ تھی۔ شوکی کو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بھولی تھی۔ راجا پر تاب اس درمیان میں تقریب وغیرہ کے سلسلے میں مصروف رہا تھا۔ رینا کی مجبوری نگاہوں کے سامنے بار بار شوکی کا چہرہ دکھانے لگا تھا۔ رینا سے وہ دل خراش منظر بھلائے نہیں بھولتا تھا جب اس نے نیم وا آنکھوں سے اپنے دیوانے محبوب کو

تاکہ اپنا بھی پیٹ بھر سکیں۔ وہ جانتے تھے کہ یہ سب اس گوری چڑی والی فرگن رینا کی وجہ سے ہے اور راجا اس کے عشق میں گوڈوں گوڈوں اتر چکا ہے۔ وہ سنے راجا کو اس کے ”اثر“ سے بھی نکالنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے وہ دہی باتیں ذہن میں رکھی تھیں، پہلی تو یہ کہ رینا کو گلے سے ہی نہیں ناگہ سے بھی بے دخل کر دیا جائے مگر کچھ زیرک دماغ اور اتنی الوقت نوکر شاہی نے اس خیال کو رد کر دیا اور کہا گیا کہ رینا کی شادی راجا پر تاب سے ہو جانی چاہیے۔ تب ہی ان کے دماغ سے عشق کا بھوت اتر سکا ہے اور وہ ”دوسری طرف“ بھی متوجہ ہو سکتے ہیں۔ آخر کو ان کی رگوں میں بھی ایک مہاراجا کا خون گردش کر رہا تھا۔ شرب و شباب جن کا ہمیشہ سے دتیرہ رہا ہے۔

بہر کیف..... پہلے اس خط پر نواب شہباز خان کی مہر لگائی گئی اس کے بعد مہاراجا مہندر سنگھ اور راجا پر تاب کمار کی بھی شاہی مہر اس خط میں ثبت کر کے خط برطانیہ مملکت عالیہ کی طرف بذریعہ فرستادہ روانہ کر دیا گیا۔

پہلے پہل اس اہم خط کو ملکہ تک پہنچانے کے لیے شاہی نیا خانے کا استعمال عمل میں لایا جانے والا تھا مگر پھر موجودہ حالات میں اس خط کے منعمون کے افشا ہونے کا احتمال محسوس کرتے ہوئے اسے دقتی طور پر روانہ کرنے کا حتمی فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کے لیے راج محل کے ایک پرانے اور فادار شخص کا انتخاب کیا گیا۔ اسے منتخب کرنے والے راجا پر تاب کے مشیر..... اور ان کے سربراہ سترام داس نے اس نام کی حتمی اور باضابطہ طور پر منظوری دے دی تھی۔ نیز اسے راز میں بھی رکھا گیا تھا۔ البتہ سینا پتی موج سنگھ کو اس کا علم تھا اور اس کے ذریعے آتما شک کو بھی پتا لگ گیا۔ یہ بات پچھو رام تک بھی پہنچنا لازمی تھی کیونکہ آتما شک اسی کا خاص آدمی اور فدار جاسوس تھا۔

پچھو رام کا دل خوشی سے بلبوں اچھل پڑا اور وہ اپنی فراست پر خود ہی فخر سے لہک اٹھا کہ شیورائے بھوکر سے ملنے میں جلد بازی سے کام نہ لے کر ایک سنہری موقع اس کے ہاتھ آ گیا تھا لہذا وہ شاہی خفیہ ایجنسی کی روانگی سے ایک دن پہلے ہی خاموشی سے شیورائے بھوکر سے ملنے کے لیے دہلی روانہ ہو گیا کیونکہ وہ ان دنوں وہیں تھا۔

☆☆☆

راج محل میں شوریج کیا۔ گارشا کو سب سے پہلے

نقصان پہنچے گا اور ملکہ عالیہ کی حکومت ہندوستان میں غیر مقبول اور عدم استحکام کا شکار ہوگی، کیونکہ اس طرح کسی ملک کے عوام کے ساتھ ظلم و نا انصافی کا سلوک کر کے ان پر زیادہ دیر حکومت نہیں کی جاسکتی۔

”غیر سگالی کے طور پر برٹش آرمی کے دو اہم جنگی قیدی کرنل اینڈرسن اور میجر ڈی فارست کو ہم رہا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

”ہاں! ساتھ ہی ملکہ عالیہ کی خدمت میں، میں ریاست ناگہ کا نونائب راجا پر تاب کمار، اپنے دو پڑوسی ریاستی حکمرانوں تریپال کے نواب شہباز خان اور پالن پور کے مہاراجا مہندر سنگھ، جنہیں عزت و تاب کی طرف سے سرکاری طور پر ”راجا“ اور ”مہاراجا“ کی تسلیم شدہ حیثیت کی مہر بھی جاری کی گئی، ان کی ترجمانی کرتا ہوں، ثبوت کے طور پر مذکورہ حکمرانوں کی مہریں خط میں ثبت ہیں۔“

”خط آپ نے پڑھ لیا۔ اب میں آپ دوستوں کی رائے لیتا چاہوں گا۔“ راجا پر تاب کمار نے آخر میں ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

نشت گاہ میں چند تانے کے لیے سمجھیری خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد ماسوائے علی رحمان کے سب نے متفقہ طور پر اس خط کو موجودہ غیر یقینی حالات کے عین مطابق قرار دے کر اسے معرفت کی سند عطا کر ڈالی۔

علی کے خیال میں راجا پر تاب کمار کا یوں براہ راست ملکہ عالیہ سے مخاطب ہونا مناسب نہ تھا۔ اس میں سازش کا احتمال ہو سکتا تھا مگر جانے کیا بات تھی کہ اپنے اس خیال کی اس کے پاس سر دست کوئی ٹھوس توجیہ بھی نہ تھی اسی لیے وہ خاموش ہی رہا۔

اس کے بعد یہ نشت برخاست کر دی گئی۔

☆☆☆

جیسا کہ مذکور ہوا..... اس خط کا مشورہ راجا پر تاب کمار کے مشیر خاص سترام داس نے دیا تھا۔ وہاں کچھ ایسے مصاحبین اور وزراء بھی تھے جو راج محل میں اپنے امور کے علاوہ شراب و کباب کے عادی تھے، مگر نیا راجا ایسا کوئی شوق نہیں رکھتا تھا لہذا اس نے راج محل میں ایسی تمام چیزوں پر پابندی تو نہیں لگائی تھی، مگر کھلے بندوں اور آزادانہ اس کا استعمال ممنوع ہو گیا تھا، لہذا..... نوکر شاہی اپنی ”پیٹ پوجا“ کے لیے حرکت میں آ گئے تھے۔

اب یہی لوگ اسے ”غراب“ کرنا چاہتے تھے

دووں ساتھیوں کی بھی فکر ہے۔ ار یہ اور شاہ زمان کو اپنے مشن پر گئے کئی روز بیت چکے ہیں۔ ان کی بھی کوئی خبر نہیں آئی..... اب میں ان دونوں کی مدد کے لیے فوراً سے پیشتر روانہ ہونا چاہتا ہوں۔ ان کا شن اپنی جگہ بہ حد اہمیت کا حامل تھا۔ پتا نہیں وہ دونوں کس حال میں ہوں، لہذا اب مجھے اجازت دیں اور ممکن ہو سکے تو میری بہمنی تک روانگی کا بھی بندوبست کر دیں۔“

اقبال نے کچھ کہنا چاہا، لیکن نواب شہباز نے اسے اشارے سے خاموش کر دیا یا پھر علی سے بولے۔

”میں جانتا ہوں برخوردار! تم ایک عبادتہ زندگی گزار رہے ہو۔ یہ مردود فرنگی ہماری جنگ آزادی (1857ء) کی ناکامی کے بعد ہندوستان میں پوری طرح سے اپنے قدم جما چکے ہیں، مگر اس زوال میں تمہارے جیسے حریت پسندوں اور مجاہدوں کا بھی حوصلہ کمال کا ہے۔“

”ایک سچے مسلمان کی اللہ کے بھروسے پر اور امید آزادی کی جستجو میں ثابت قدمی ایک دن درخشاں فتح کی نوید ضرور سناتی ہے۔ ہم تمہیں اپنے اس عظیم مقصد سے روکنے کا بالکل بھی حق نہیں رکھتے۔“ وہ اتنا کہہ کر لمحہ بھر کو توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

”لیکن علی! بہتر ہوتا کہ تم صبح صادق کو ہی روانہ ہو جاتے، اب شام ہو رہی ہے اور پھر رات ہونے میں کیا دیر لگے گی۔ تمہارا سفر بھی طویل ہے۔ آگے جیسا تم مناسب سمجھو۔“

علی نے پرسوج انداز میں اپنے ہونٹ سمجھنے لیے تھے۔ درحقیقت اس نے شاہ زمان اور اریہ کی مدد کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے فوج آزادی کے سالار جنرل خیر خان سے بھی ملاقات کرنا تھی۔ انہیں اب تک کے اپنے مشن اور پانچ ساتھیوں کے بارے میں آگاہی بھی دینا تھی جن میں تین تو ابتدا میں ہی شہید ہو گئے تھے، تاہم اسے اندازہ تو تھا کہ ان کی زیر زمین اعلیٰ قیادت ان کی جانب سے بے خبر نہیں ہوگی۔ ان کے جاسوس انہیں بھی پل پل کی اطلاع دیتے ہی ہوں گے لیکن باوصف اس کے علی ایک ملاقات اپنے سالار جنرل خیر خان سے کرنا بہ حد ضروری سمجھتا تھا۔

لہذا اس نے نواب شہباز کو اپنی یہ مجبوری بتا دی اور اسی وقت روانگی کے بندوبست کی درخواست بھی کر دی۔

”اچھا بیٹا! جیسا مناسب سمجھو لیکن ایک گزارش ہماری بھی سن لو تو تمہاری مہربانی ہوگی۔“ نواب شہباز نے علی کی

شاہ زمان کی گھڑتاری تھی۔ وہ ایک اہم اور خطرناک مہم پر بھی روانہ ہو چکے تھے، ان کی بھی ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ وہ ان کی طرف سے بھی فکر مند تھا اور اب ان کی مدد کو جانے کے لیے بے چین تھا۔

چنانچہ ایک پورا دن آرام کرنے کے بعد اگلے روز شام کو پری محل کی نشست گاہ میں باپ بیٹا اور علی چائے پینے اور باتوں میں مشغول تھے تو علی نے اسی دوران ہی اپنے آئندہ کے پروگرام سے نواب شہباز اور ان کے بیٹے اقبال خان کو آگاہ کر دیا۔

دونوں باپ بیٹا اس کی بات پر چونک پڑے۔ شہباز تو علی کے رخصت ہونے کی بات پر ہی اداس سا ہو گیا، لہذا فوراً بولا۔

”علی بھائی! تم اب اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت اختیار کر چکے ہو۔ میرا کوئی بھائی نہیں، لیکن اللہ جانتا ہے کہ میں نے تمہیں صرف زبان سے ہی نہیں بلکہ دل سے بھی بھائی مانا ہے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے، بلکہ ادھر ہی رہو گے۔“

”اقبال بیٹا بالکل سچ کہہ رہا ہے برخوردار علی!.....“ نواب شہباز خان نے بھی اپنے بیٹے کی حمایت و تائید میں علی سے پریشانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میں یہی سمجھوں گا کہ میرے دو بیٹے ہیں۔ تم بھی تو آخر کو میرے بیٹے جیسے ہی ہو۔“

علی ان دونوں باپ بیٹے کے اپنے بارے میں ایسے خیالات جان کر دل ہی دل میں بے حد متاثر ہوا اور اس کا اظہار بھی کر ڈالا۔ بولا۔

”میں آپ کے خیالات کو انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں نواب صاحب! اور پھر اقبال صاحب..... یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا سراشی کی جانب تھوڑا سا گھمایا اور بات جاری رکھی۔

”انہیں تو میں نے واقعی پہلے ہی روز سے ایک بھائی کی طرح ہی پایا ہے۔ میدان جنگ میں انہوں نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑا اور نہ ہی مجھ پر یہ ظاہر کرنے کو شش کی کہ وہ میرے نائب سالار نہیں بلکہ ایک نواب زادے ہیں۔“

علی نے اتنا کہہ کر تھوڑا توقف کیا پھر گہری متانت سے دوبارہ بولا۔

”درحقیقت ہم جس راہ کے سپاہی ہیں، ہمیں جب تک اپنی اصل منزل نہیں مل جاتی، ہم کسی بھی جگہ کو زیادہ دیر تک اپنا ٹھکانا نہیں بنا سکتے۔ دوسرے، مجھے اپنے

کریم بخش کا اگلا پتا ہے۔ اس نے میری ہی نہیں بلکہ ہمارے قافلے کے ہر فرد کے لیے اپنی جان کی بازی لگائی ہے۔“

راجا پر تاب کو اس وقت اپنے ”معاملہ دل“ کی پڑی ہوئی تھی۔ مسکرا کر بولا۔

”اچھا تم فکر مت کرو..... میرے آدمی اس کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں، امید ہے کہ کل تک وہ شوکت حسین کو ڈھونڈ کر لے آئیں گے۔“

”مجھ میں نہیں آتا کہ میں نے شوکی کو اپنی آنکھوں سے مندر کے کھنڈرات تلے شدید زخمی حالت میں دے پڑے یا پتا تھا، پھر مجھے صدمے کے باعث ہوش نہ رہا، بعد میں شوکی غائب تھا۔“ رینا بولی۔

بار بار شوکی کے تذکرے سے راجا پر تاب کو کوفت ہونے لگی تھی۔ وہ رینا کا دھیان اس طرف سے ہٹانے کی غرض سے بولا۔

”تمہاری تلاش میں نکلے ہوئے میرے ساتھیوں نے بھی شوکی کو ایسی ہی حالت میں دیکھا تھا۔ اسی لیے مجھے لگتا تو یہی ہے کہ وہ مشکل ہی زندہ بچا ہو۔ کھنڈرات کے لمبے میں دب کر وہ ہلاک ہو چکا ہوگا۔“

”نہیں..... نہیں..... فارغا ڈیک راجا صاحب! اس بے چارے کے لیے ایسے ظالم الفاظ اپنے منہ سے مت نکالیں۔“ رینا نے تڑپ کر کہا۔ ”وہ بے چارہ ایک غریب مگر بہت دلیر اور اپنی ذات میں سچا آدمی ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے، بھگوان کرے وہ زندہ ہو۔ ہم نے تو یوں ہی اپنے ایک خیال کا اظہار کیا تھا۔“ راجا پر تاب نے کہا پھر وہ اس سے ادھر ادھر کی گفتگو کرتا رہا۔ اسے تنہائی میں رینا کی سنگت میں بیٹھنا اور اس پر دوش انگریز دو شیزہ سے باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ اسی وقت اپنا حال دل اس کے سامنے کھول ڈالے اور اس کا بھی اپنے متعلق عنایت لینے کی کوشش کرے، مگر کچھ سوچ کر اس نے یہ کام کل تک کے لیے چھوڑ دیا۔

☆☆☆

علی کے پاس ترپال (پری محل میں) اب رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ وہ ترپال سے ہی نہیں بلکہ کوہ شمالیہ سے ہی کوچ کر جانا چاہتا تھا۔

وہ اپنی اب تک کی مہمات کو کامیابی سے تمام کر چکا تھا۔ لہذا اب اسے اپنے دو عزیز ترین ساتھیوں ار بیہ اور

کالی کے مندر کے لمبے میں دبے ہوئے معزوب حالت میں پڑے پایا تھا۔ تب سے ہی ہوگا شوکی کی جانب سے تشویش نے اسے ادھ موا کر رکھا تھا کہ پتا نہیں اس دیوانے فرزانے کا کیا حال ہوا ہو

اسے اندازہ تھا کہ شوکی اس بدقش اور شیطان پجاری بدری ناتھ کی قید سے اسے چھڑانے کے لیے ہی اس سے جا بھڑا تھا۔

کتنا دلیر تھا وہ.....! مجھے پانے اور ایک شیطان کے قبضے سے رہائی دلانے کے لیے اپنی جان کی پروا کیے بغیر کالی کے مندر چلا آیا تھا؛ کیونکہ اسے اس بات کا یقین کی حد تک شبہ تھا کہ اسے (رینا کو) اغوا کرنے والے کون اور کس کے ساتھی ہو سکتے تھے۔ وہ سوچنے لگی۔

ادھر راجا پر تاب جب اپنی مصروفیات وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اس کے پاس آیا تو رینا کو اس نے ہنوز دم زدہ معزوب اور تشویش میں مبتلا پایا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ موجودہ جنگی حالات کی وجہ سے شاید وہ پریشان ہے۔ رینا اسے ایسی دکھ زدہ حالت میں بھی پیاری محسوس ہو رہی تھی۔ عجیب حسن تھا اس کا بھی..... وہ مسکراتا اور بولے سے کھٹکھٹاتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو رینا اسے دیکھتے ہی بڑی بے قراری سے اس کی جانب بڑھی۔

”آ..... آپ..... نے شش..... شوکت حسین کا کچھ پتا چلایا؟“

رینا کو ایک معمولی ملازم کے لیے اس قدر بے چین اور تشویش زدہ پا کر راجا پر تاب کما کر ایک لمحے کو حیران سا رہ گیا پھر بولا۔

”میں کوشش کر رہا ہوں، لیکن کیا تمہیں واقعی شوکی نے اغوا نہیں کیا تھا؟“ راجا پر تاب نے دھیرے سے پوچھا۔

”ہرگز نہیں..... بھلا وہ کیوں میرے ساتھ ایسی حرکت کرے گا۔ یہ سارا کیا دھرا اس غیبت مہا پجاری بدری ناتھ کا ہے۔“ رینا نے اسے اس بارے میں مختصراً صراحت بیان کر دی۔

بالآخر راجا پر تاب کما رے رہا نہ گیا۔ وہ بولا۔

”ایک معمولی ملازم کے لیے تمہارا اس قدر بے چین ہونا مجھے عجیب ہی لگا ہے۔“

”ایسی بات نہیں.....“ رینا نے چور سے لہجے میں بہت دھیرے سے جواب دیا۔ ”وہ میری ذمے داری ہے۔ وہ اکل مائیکل کے خاص، پرانے اور وفادار ملازم

کھاوت

☆ جو شخص کسی کا قہقہہ قبول کر لیتا ہے وہ خود کو فروخت کر چکا ہوتا ہے۔ (برطانوی کہاوت)
☆ خطا کرنا انسان کی فطرت ہے، کی ہوئی غلطی کو مان لینا مردانگی ہے۔ (عربی کہاوت)
☆ جب دو آدمی آپس میں جھگڑیں تو سمجھ لو دونوں خطا دار ہیں۔ (ڈچ کہاوت)
☆ جو ذرا سی بات پر دوست نہ رہا، وہ کبھی دوست تھا ہی نہیں۔ (پرنگالی کہاوت)
☆ جب بچے اور سیدھے روئے کو دروازے سے دھکیل دیا جاتا ہے تو چال پالوی دیوان خانے میں آتی ہے۔ (انگریزی کہاوت)
☆ نقل کے لیے بھی عقل چاہیے۔ (فارسی کہاوت)
☆ نفرت اور محبت دونوں اندھی ہوتی ہیں۔ (مشرقی کہاوت)
☆ پیٹ بھرا ہونے پر تے کی صیحت کرنا آسان ہے۔ (اطالوی کہاوت)
☆ ادب لوگوں کے لیے ڈھال ہے۔ (عربی کہاوت)
☆ ایک ہزار قابل انسان مر جانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا کہ ایک احمق کے صاحب اختیار ہونے پر ہوتا ہے۔ (عربی کہاوت)
☆ چالوں کے دل میں جس اعتقاد کا وزن رکھو گے، اودھر ہی جھک جائے گا۔ (جرمن کہاوت)
☆ نگہ دہی اعتقاد کو حائل کرتی ہے۔ (فارسی کہاوت)
☆ زرا زادی ہے اور غلطی غلامی۔ (جرمن کہاوت)
☆ مغل کو افلاس سے جو تکلیف پہنچتی ہے، دولت مندوں کو دولت کی حرص اس سے زیادہ تکلیف پہنچاتی ہے۔ (چیک کہاوت)
☆ نگہ دہی میں قرض بہت مشکل بات ہے۔ (عربی کہاوت)

☆ عدالتوں سے انصاف حاصل کرنے کے لیے تین چیزیں درکار ہیں (1) مرنوح (2) سچ قارون (3) صبر الوب (عربی کہاوت)
مرسلہ: محمد الیاس، بلوچستان

اعراض نہیں، لیکن ان سے ایک وعدہ لے لو کہ اس کے بعد ہمارے مشورے سے نواب صاحب اور اپنے شوہر اقبال سے بھی یہ بات کریں گی۔
ہو میاں ایک دم خوش ہو گئے۔ فوراً یہ کہہ کر پلٹ گئے کہ وہ ابھی پوچھ کر جواب دے دیتے ہیں۔
اس کے جانے کے بعد علی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کیا وہ اپنی اصلیت آشکار ہو جانے کے بعد اب کوئی نئی چال یا سازش کھیلنا چاہتی تھی؟ کیا اس کے خدار باپ سراج خان نے اپنی بیٹی کا بھانڈا اچھوٹے پر اسے کوئی نئی ہانی پڑھائی تھی؟
بہر کیف..... علی نے یہ سب سوچتے ہوئے ایک گہری ہکاری خارج کی۔ یوں اس نے بھی تہہ کر لیا تھا کہ اسے مہر النساء کی بات پر ذرا بھی گڑبڑ کا احساس ہوا تو وہ اس کا اظہار سب سے پہلے اس کے شوہر اقبال خان سے کرے گا۔

گھر ایک ہی تھا اور مقام بھی..... لہذا ہو میاں فوراً ہی جواب لے کر علی کے سامنے حاضر ہو گئے۔
”میں نے آپ کا پیغام چھوٹی بی بی تک پہنچا دیا علی بھائی!“ وہ دلی آواز میں بولا۔ ”انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ وہ خود بھی یہی چاہتی ہیں، لیکن پتا نہیں کیا بات ہے وہ یہ بات سب سے پہلے آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتی ہیں۔“

”ہوں..... شکیک ہے، کب اور کہاں ملنا ہے؟ لیکن ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہم روانگی کے لیے تیار ہیں۔“ بالآخر علی نے گوگو سے انداز میں پوچھا۔ یہ پوچھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کے وجود میں ایک عجیب سی سسکی کا احساس ہوا تھا کہ..... اگر کل کے کسی فرد کی ان پر نگاہ پڑ گئی تو کہیں بات کا بیٹھو بی نہ بن جائے۔ مہر النساء نے اسے عجیب امتحان میں ڈال دیا تھا۔
پوچھنے جواب دیا۔ ”بس! آپ ابھی تشریف لے چلے ہمارے ساتھ۔“
علی تھوڑا سا ہچکچایا اس کے بعد پھر کے ساتھ چل پڑا۔

☆☆☆

خاصا قافلہ طے کرنے کے بعد شاہ زمان نے ٹھہر جانا ضروری سمجھا۔ وہ دونوں اب خطرے سے کافی دور نکل آئے تھے۔ دشمن بکھر گئے تھے۔ ان کا ایمونیشن دمپ تباہ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے یہ لوگ جزیرے میں

کی آواز بھی مدھم تھی۔

”ہاں، بولو! میں سن رہا ہوں۔“
”علی بھائی!.....“ وہ پھر اٹھنے لگا لیکن ہمت کر کے کہہ ہی دیا۔ ”وہ..... چھوٹی بی بی..... نے آپ کے لیے ایک پیغام دیا ہے۔“
”چھوٹی بی بی.....؟“ علی نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”چھوٹے صاحب کی بیگم.....؟“
”جی بالکل! وہ آپ..... سے ملنا چاہتی ہیں۔“ اس کی بات سن کر علی کے چہرے پر ایک حیرت انگیز سنجیدگی کھنڈ آئی اور پھر وہ ہو میاں سے اسی لہجے میں بولا۔

”ہو میاں! تم جانتے ہو کیا کہہ رہے ہو تم؟ اور اس وقت کہاں کھڑے ہو؟ مت بھولو کہ تم اس عزت دار خاندان کے ایک پرانے اور قابل اعتماد ملازم ہو۔“
”میں اچھی طرح جانتا ہوں..... علی بھائی!“ وہ جیسے ٹھکانے کے انداز سے بولا۔ ”اسی بات کا تو مجھے بھی ڈر تھا کہ آپ برائے نام جا میں۔“

”بات برائے نام کی تو بالکل ہے۔“ علی نے ترش لہجے میں کہا۔ ”کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اپنے معزز اور عزت دار میزبان کی پردہ نشین بہو کے کہنے پر ان سے ملاقات کو چیلن جا میں گئے؟ ہرگز نہیں، ان سے کہو کہ جو بات بھی کہنا ہے وہ اپنے خاندان سے کریں اور پھر وہ مجھ سے بات کریں گے۔“

ہو میاں کا منہ خشک ہونے لگا تھا، وہ بار بار اپنے سوکھے پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرے جارہا تھا۔ بولا۔
”علی بھائی! جن باتوں کی آپ وضاحت کر رہے ہیں، ان کا مجھے ہی نہیں خود چھوٹی بی بی صاحبہ کو بھی اندازہ ہے مگر وہ بات ہی ایسی ہے کہ وہ صرف آپ سے کہنا چاہتی ہیں۔ خدارا مان جا میں۔ چھوٹی بہو مجھے اپنا بھائی کہتی ہیں اور مجھ سے انہوں نے اس وعدے کے ساتھ متیں بھی کر ڈالی ہیں کہ وہ یہ بات خاندان کی عزت ہی کی خاطر کر رہی ہیں اور مزید یہ کہ وہ اپنے شوہر ہی سے نہیں بلکہ سر صاحب جنہیں وہ ابا جان کہتی ہیں، ان سے بھی کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کی ایک مجبوری ہے کہ وہ پہلے آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتی ہیں۔“

ہو میاں اتنا کہہ کر چپ ہو رہا اور علی اپنی تلخ روئی بھلا کر کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا پھر بولا۔
”شکیک ہے، اگر ایسی بات ہے تو ہمیں کوئی

طرف بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا کر بولا۔
”کیوں شرمندہ کرتے ہیں نواب صاحب! آپ حکم کریں۔“ اس کی بات سن کر انہوں نے ایک نگاہ قریب بیٹھے اپنے بیٹے اقبال پر ڈالی اور علی سے بولے۔
”ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے اس نیک اور عظیم مقصد میں ہمارے فرزند ارجمند اقبال کو بھی ساتھ شامل کر لو، تاکہ ہمارا ضمیر بھی مطمئن رہے کہ آزادی کی اس جنگ میں ہم بھی پیچھے نہیں ہیں۔“

”آپ سب اس جنگ میں شامل ہیں نواب صاحب!“ علی نے فوراً کہا۔ ”جس کا تازہ ترین ثبوت ہماری فرگیوں کے خلاف کوہ شالیہ پر جارحیت کا منہ توڑ جواب ہے۔ ماشاء اللہ آپ کے فرزند ارجمند نے اس جنگ میں دلیری سے دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا اور ان کے دانت کھٹے کر ڈالے تھے لیکن ان کا ابھی ریاست میں رہنا ضروری ہے۔ فرگیوں کی تازہ کار سازشوں کا نقشہ، ان کا طریقہ کار تینوں ریاستوں کا زمانہ جنگ میں اتحادیہ سب اقبال صاحب کی نظروں کے سامنے ہے۔ فرگی یوں تو اب کچھ دنوں تک اپنا زخم چاٹ رہے گا، لیکن یہ وہ دوبارہ بھی منصوبہ بندی کرے تو اس کا جواب اسی طرح منصوبہ بندی سے دینے کے لیے اقبال خان یہاں موجود ہے۔ تاہم مجھے نہیں لگتا کہ فرگی اب دوبارہ کوہ شالیہ پر چڑھائی کی جرأت کر سکتا ہے۔“

علی کی باتوں سے اب دونوں باپ بیٹا مطمئن نظر آرہے تھے۔ لہذا علی روانگی کی تیاری میں مشغول ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے میں تھا۔ اچانک اسے دروازے پر کسی کی آہٹ کا احساس ہوا۔ وہ اس وقت اپنا کمر بند درست کر رہا تھا۔ فوراً دروازے کی طرف اپنا رخ پھیرا تو چونک پڑا۔

دروازے پر شیخ خالد المعروف ہو میاں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات تھے۔
”ارے، ہو میاں!..... تم..... آؤ..... آؤ..... رک کیوں گئے؟“ علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ہو ادھر ادھر دیکھتا ہوا اب آہٹ چلا اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ علی کو اس کے انداز پر حیرت ہوئی۔ وہ یہاں پرانا ملازم تھا مگر اس کا انداز یوں چوروں کا سا دیکھ کر علی چوٹے بغیر نہ رہ سکا تھا۔
”وہ..... وہ..... علی بھائی! ایک بات..... کہنا تھی..... آ..... آپ سے.....“ وہ انگ انگ کر بولا۔ اس

اپنی طاقت بنائے فردوش تھے۔
 کسی محفوظ مقام پر ٹھہرنے کا مقصد صرف سستان ہی
 نہ تھا بلکہ شاہ زمان کورات کا انتظار تھا۔ یوں بھی وہ دونوں
 اب اپنی منزل کے قریب ہی تھے۔
 دونوں نے ادھر ادھر سے کچھ کھائی کر پیٹ کی آگ
 بجھائی اور منتظر رہے کہ کب جزیرہ رات کی سیاہ چادر
 اوڑھتا ہے۔
 یوں رات ہونے تک خیریت ہی رہی۔ دونوں نے
 اللہ کا نام لیا اور ساحل کی خشک ہوا میں آگے بڑھ گئے۔
 جنگل میں خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ آگے بڑھتے رہے۔
 ان کی خوش قسمتی تھی کہ جنگل اس عارضی بندرگاہ تک،
 یعنی ساحل تک چلا گیا تھا۔ البتہ جس ریتیلے مقام پر سمندر کی
 موجیں سرخ رہی تھیں وہاں سے لگ بھگ سو کڑے فاصلے پر
 جھاڑیوں اور موٹے تنے والے درختوں کی بہتات ختم
 ہوئی تھی اور ان کی جگہ گنے چنے پام کے درختوں نے لے
 لی تھی۔
 ساحل سے جہاں جنگل کی حدود ختم ہوتی تھی، اس
 کے آخری سرے پر پہنچ کر دونوں رک گئے۔ شاہ زمان کو
 یہاں سے سمندر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جزیرے کی
 طرف سے جنگ و جدال کی فضا کی بے چینی یہاں بھی
 دیکھنے میں آ رہی تھی۔
 ساحل پر پہراخت تھا۔ ایک چھوٹا ٹرک اور جیب
 پام کے جھنڈ کے پاس کھڑی تھی۔ ایک بڑا بحری
 جہاز ساحل سے تقریباً چالیس پچاس ناٹیکل میل کے فاصلے
 پر سطح آب پر بھگورے لے رہا تھا۔ وہ لنگر انداز تھا اور اس
 کے دائیں جانب..... ایک بڑی سی بوٹ بھی دکھائی دے
 رہی تھی۔ یہ ایک خوبصورت..... ہاؤس بوٹ تھی۔ کرل
 اینڈرن کی جگہ نوتھینا کی کپٹن جیمس اسی بوٹ میں اپنی نئی
 نوٹیلی وہن کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔
 ساحل پر ایک بڑا سا چوبلی پلیٹ فارم بنایا گیا تھا،
 جو اندر کافی دور تک سمندر میں جاتا نظر آ رہا تھا۔ وہاں
 ایک بڑی سی باربردار لائے تھی اور ساحل پر ایک کافی بڑی
 گودام نما عمارت بھی دکھائی دی تھی، جو پام کے درختوں
 کے درمیان گھری ہوئی تھی۔ وہاں بھی پہرے دار
 موجود تھے۔
 شاہ زمان اور اریہ جھاڑیوں کی اوٹ سے بڑے
 غور غور سے ان مقامات کا جائزہ لے رہے تھے۔
 ”سی ہاک تک پہنچنا تو مجھے محال ہی دکھتا ہے“

”ہاں! لیکن وہ اور بات تھی۔“ زمان نے سنجیدہ
 لہجہ میں کہا۔ ”یہاں خطرہ زیادہ ہے، ہم جیسے جیسے قریب
 لگاؤں گے، جان کا خطرہ بڑھتا جائے گا، کیونکہ ہم نے
 لنگر انداز ہونے سے سترھ گھنٹے تک پہنچنا ہے۔“ زمان
 نے کہا تو اریہ بولی۔
 ”کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہمیں ٹارگٹ تک پہنچنے
 میں کتنی دیر لگ جائے گی؟“
 ”گذا! یہ اچھا سوال کیا تم نے۔“ وہ بولا۔ ”پانی
 کے اندر جتنی تیز رفتار سی تیر سکتے ہیں، ہمیں تیرنا ہوگا۔ کم
 سے کم رفتار میں بھی ہمیں راستے میں دوبارہ سربھاگنے کی
 ضرورت پڑے گی، لیکن میں چاہتا ہوں، ایسا صرف ایک
 بار ہی ہو کیونکہ دوسری بار سربھاگنے میں ساحل اور جہاز
 پر موجود کسی پہرے دار فرنگی کی گولی کھو پڑی میں سوراخ
 کر سکتی ہے۔“
 ”اف..... خدا نہ کرے..... ایسا کیوں بولتے ہو
 زہان!.....“ اریہ ایک لمحے کو کھپکھپا کر بولی۔ زبان کی بات
 نے اس کی ریزہ کی ہڈی میں سردہری دوڑا دی تھی۔
 ”مشن جب خطرناک ہو تو میں اسی سفاکی کے
 ساتھ اس کا تشفیہ چھینتا ہوں۔“ زمان نے گہری متانت سے
 کہا۔ ”اب بتاؤ کتنی دیر تک سانس روک سکتی ہو پانی کے
 اندر.....؟“
 ”پانی کے اندر تیرنا پڑے گا..... جس کے باعث
 سانس زیادہ بچھوٹی ہے۔ دوبار تو سرفکا لٹانی پڑے
 گا۔ ویسے ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے۔“ وہ
 آخر میں کچھ سوچتے ہوئے بولی۔
 ”کون سی بات؟“
 ”ہم سانس لینے کے لیے کسی کھوکھلے تنے کا سہارا
 کیوں نہ لیں؟“
 ”اوہ.....“ اچانک زمان کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”کیا
 ترکیب بتائی ہے۔ دیکھو، میں خود کو کتنا بڑا تیس مارخاں سمجھے
 ہوئے ہوں اور اتنی سی بات میرے ذہن سے سو ہو گئی،
 حالانکہ یہ ایک آزمودہ اور روایتی طریقہ ہے۔ آؤ اوہیں
 جنگل کا رخ کرتے ہیں اور ایسی کوئی شے تلاش کر کے مشن
 کا آخری مرحلہ طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔“
 تھوڑی دیر بعد یہ دونوں ایک سے ڈیڑھ فٹ کی
 کھوکھلی شاخیں منہ میں دبائے پانی میں اتر چکے تھے۔
 اب یہ دونوں مقررہ گہرائی میں اتر کر ایک مختار
 اندازے کے مطابق اپنے ہدف کی جانب تیزی سے

تیرتے جا رہے تھے۔ جب انہیں سانس لینا ہوتی تو وہ سطح
 آب سے ذرا نیچے صرف اسی قدر... اور آتے کہ ان کے
 منہ میں دلی کھوکھلی ٹکلیاں سطح آب سے ابھر کر آسکین ان
 کے پیچھے مڑوں میں منتقل کرتیں اور پھر یہ دوبارہ نیچے مخصوص
 گہرائی تک چلے جاتے۔
 چنانچہ اسی طرح انہیں دوبار کے بجائے تین سے
 چار بار آسکین لینا پڑی تھی۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ زمان
 کا اندازہ غلط تھا۔ بلکہ اس کے باعث ایک تو انہوں نے مقررہ
 رفتار سے زیادہ تیراکی کی تھی، چونکہ آسکین لینے میں اب
 کوئی خاص خطرہ نہ تھا اسی لیے تیزی کے باعث انہیں
 آسکین بھی بار بار لینا پڑی تھی۔
 انہیں سردی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ پانی نے ان
 کے جسم پر بڑے بڑے ڈالے تھے۔ یہ ایک الگ تشویش لاحق
 ہونے لگی تھی انہیں کہ وہ جلد از جلد اپنی منزل تک پہنچنے کی...
 کوشش کرتے۔
 جلد ہی انہیں سی ہاک کا لمبا چوڑا پینڈا نظر آ گیا۔ فرط
 جوش سے ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ وہ ایک
 لمبا چکر کاٹ کر ہاؤس بوٹ کی طرف بڑھے جی ہاک کے
 قریب ہی سمندر میں لنگر انداز تھی۔
 زمان سب سے پہلے ہاؤس بوٹ میں اتر کر کپٹن
 جیمس کو اس منصوبہ بندی میں شمولیت کی عبرت ناک سزا
 دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی خواہش تھی کہ وہ کرل
 اینڈرن کو بھی زندہ نہیں چھوڑے گا جو خود جہاز اور اس
 کے ساتھیوں کا قاتل تھا لیکن کپٹن جیمس کو بھی شاہ زمان
 نے اس کا چیلنا ہی سمجھا ہوا تھا اور چونکہ وہ بھی اس
 رسوائے زمانہ چوری کے منصوبے کی سپورٹ میں ایک
 فرنگی آفیسری تھا اسی لیے اسے عبرت کا نمونہ بنانا
 ضروری تھا۔
 وہ ہاؤس بوٹ کے دنبالے والی جگہ کے قریب اور
 اس کی دیوار کے ساتھ چپکے ہوئے سطح آب سے
 ابھرے۔
 سب سے پہلے شاہ زمان نے اپنا سر نکالا تھا اور اس
 کے بعد اریہ نے۔ ان کے آس پاس پانی بھگورے لے
 رہا تھا۔ دور تک سمندر تاریک تھا۔ ساحل کی جانب سے
 روشنیاں غمٹائی ہوئی نظر آتی تھیں یا پھر قریب لنگر اندازی
 ہاک پر نصب سرچ لائٹیں۔
 دنبالے کی جانب ان سرچ لائٹس کی روشنی کم ہی پڑ
 رہی تھی۔ وہ اسی سمت سے اب بوٹ کے اندر سوار ہونے

سزائے انتظار

شاہکار لطیف

جب سچے خلوص و محبت میں لالچ و طمع کی ملاوٹ ہو جائے تو جذبات میں منافقت پیدا ہو بی جاتی ہے... مغرب کے آزاد ماحول میں بھی والدین کی شفقت اور اولاد کی محبت دلوں کو مسحور کر دیتی ہے اور اس ماحول کا حصہ ہونے کے باوجود والدین کے دلوں میں چھپی محبت اور امید اولاد کی بے اعتنائی پر آج بھی افسردہ ہو جاتی ہے۔

مخادپرست رشتوں کے لیے انوکھی سزا کا انتخاب

انتہائی غصیلی طبیعت کے مالک ہیں اور اب کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کے بعد تو وہ ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو کہیں وہ ہمیں جانکد اسے عاق نہ کر دیں۔

”اسی تشویش کی وجہ سے میں بھی ان سے بات کرنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔“ پیٹر نے کھیانے لہجے میں

”اگر ڈیڈ اسی طرح اپنی دولت لٹاتے رہے تو ایک دن ان کا بینک بیلنس زیرو ہو جائے گا اور ہم دونوں ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ ہمیں جلد از جلد کچھ کرنا ہوگا۔“ پیٹر نے اپنے چھوٹے بھائی جاسن سے فکر مند اندہ لہجے میں کہا۔

”مگر ہم ڈیڈ کوروک بھی تو نہیں سکتے؟“ جاسن نے پر خیال لہجے میں جواب دیا۔ ”تم جانتے ہو کہ ڈیڈ ویسے بھی

پر پورٹ ہول ٹائپ روشندان اور شیشے کی کھڑکیاں نصب تھیں۔

شاہ زمان نے سامنے کے دروازے سے جانے کے بجائے عقبی سمت کے ایک نسبتاً چھوٹے دروازے کا رخ کیا، جو اسے پہلی ہی نگاہ میں دکھائی دے گیا تھا۔

تھوڑی سی کوشش سے یہ دروازہ کھلا تو دونوں اندر ایک خوبصورت سے چکن میں موجود تھے۔

دبے پاؤں وہ چکن کے اندرونی گوشے میں کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھے تو انہیں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔

”ڈارلنگ جیس! پلیز مان لونا میری خاطر..... وہ یاقوت اور لعل..... میرے دل و دماغ میں انک کر رہ گئے ہیں۔“ یہ ایک نرم اور میٹھی سی سوانی آواز تھی۔

”مائی سوٹ ہارٹ! یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔“ یہ آواز کسی جوان مرد کی تھی۔

”کیوں.....؟ تمہارے لیے کیا مشکل ہے ڈارلنگ! تم خزانے اور اس جزیرے کے ہی نہیں بلکہ اس عظیم الشان شپ سی ہاک کے مالک بھی ہو۔“

زمان نے ان دونوں کی گفتگو سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ دونوں اس کے ”شکار“ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتے تھے، اسی سبب زمان کا ہاتھ اپنی گمن کی طرف چلا گیا تھا۔

”وہ تو خشک ہے، میرے لیے ان دونوں چیزوں کا حصول کوئی مشکل بھی نہیں مگر مائی ڈارلنگ! از ایلا! میں ان سارے معاملات سے خوش نہیں ہوں۔ ہم نے یہاں قلم و جبر کی جو فضا قائم کر رکھی ہے، اس پر میں کڑھتا ہوں اور چوری کے اس مال کو میں اپنے اوپر حرام بھی سمجھتا ہوں۔“

ایک فرنگی آفیسر کے منہ سے یہ الفاظ سن کر زمان اور اریبہ ایک لمحے کے لیے گنگ سے ہو کر رہ گئے تھے۔ زمان کا رائل کی جانب بڑھنے والا ہاتھ وہیں رک گیا تھا۔

اسی وقت ایک آواز پر وہ دونوں چوٹے۔ وہ آواز ایسی ہی تھی جیسے کوئی مونوٹ تیزی سے اسی طرف بڑھی چلی آ رہی ہو۔

(جاری ہے)

کی تنگ و دہلیز تھے۔

یہ دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی تھی کہ ہاؤس بوٹ ویران نظر آ رہی تھی۔ یعنی اس میں کچھ خاص پہرا وغیرہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ تاہم زیادہ پہرا سی ہاک پر نظر آ رہا تھا۔

ممکن تھا کہ یہاں اس کی کوئی خاص ضرورت نہ سمجھی گئی ہو۔ بہر حال یہ ان دونوں کے لیے ایک اچھا موقع تھا، لہذا وہ دونوں مختار روی کے ساتھ باری باری ہاؤس بوٹ کے دہانے میں اتر گئے۔

وہ وہاں ایک کونے میں دیواری آڑ میں ہو کر چند ثانیے کے لیے سستانے کھڑے ہو گئے۔ مسلسل تیرتے رہنے کے سبب ان کا جسم شل ہو گیا تھا۔ اس پر مستزاد سردی نے انہیں ادھ مو اکڑا لیا تھا۔ شاہ زمان کے مقابلے میں بے چاری اریبہ تو تھر تھر کا پ رہی تھی۔

”چلو، ہمت کرو اریبہ! اندر کی محفوظ گوشے میں چل کر پہلے اپنی حالت درست کرتے ہیں۔ کم بخت سردی تو جیسے ہڈیوں کے گودے میں اترتی محسوس ہو رہی ہے۔“ شاہ زمان نے ہلکی سرگوشی میں کہا اریبہ نے کپکپاتے سر کے ساتھ ہولے سے اٹھائی جنبش دی۔ اس کا چہرہ سردی کے سبب نیلا پڑ رہا تھا، آنکھیں اور ناک متورم ہو رہی تھیں۔

وہ دونوں دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھے۔ ابھی وہ ایک تپتی سی راہداری میں چند قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ انہیں خشک کر رکنا پڑا۔ آگے ایک پہرے دار کا ہولا دکھائی دیا تھا۔ اس کے کندھے سے رائل جھول رہی تھی۔ وہ رینگ کے ساتھ لکاسگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔

شاہ زمان چاہتا تو اسے چند سیکنڈوں میں ہی انٹرا غفل کر ڈالتا مگر ابھی اس نے ایسا کرنا ضروری نہیں سمجھا، وہ کسی کو اپنی یہاں موجودگی کا شبہ بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

چنانچہ وہ دونوں راستہ بدل کر ایک ایسی جگہ آ کر رہے جہاں ان کے سامنے ایک چکر دار زینہ اوپری منزل کی جانب جاتا نظر آ رہا تھا۔

یہ بوٹ ایک منزلہ کی بہت احتیاط کے ساتھ زینے طے کرتے ہوئے وہ آگے اوپری منزل تک پہنچے تو انہیں ایک خوبصورت سا کینین بنا نظر آیا، جس کی دیواروں

کہا۔ ”اب تو مجھے شبہ ہونے لگا ہے کہ ان کی ذہنی حالت بھی درست نہیں رہی۔“

”میں تمہاری رائے سے متفق ہوں۔“ جاسن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اب دیکھو، پچاس ہزار ڈالر کی خطیر رقم انہوں نے یتیم بچوں کی دیکھ بھال کرنے والے ایک ادارے کو چندے کے طور پر دے دی ہے۔ کیا کوئی ہوش مند امریکی ایسا کر سکتا ہے؟ ایک دو ہزار ڈالر کی بات ہوتی تو شاید ہمیں بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا مگر پچاس ہزار ڈالر کماتے کماتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ ڈیڑھ کو سو چنا چاہیے کہ یہ پیسے ان کی اولاد کا حق ہے اور وہ ایسا کر کے ہماری حق تلفی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔“

”یہی تو مسئلہ ہے کہ ڈیڑھ کی اور ہماری سوچ میں بہت زیادہ فرق ہے۔“ پیٹر چمکی سی مسکراہٹ سے بولا۔ ”وہ موت کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور اس طرح پیسہ لٹا کر انہیں ذہنی سکون ملتا ہے۔ اپنی دانست میں وہ انسانیت کی بھلائی کے لیے پیسہ خرچ کر رہے ہیں۔ اب تو وہ ہر سٹے کو اپنی ویل چیئر پر چرچ بھی جانے لگے ہیں۔“

”انسانیت کی بھلائی کے لیے یہ پیسہ خرچ کرنا ہے تو ہم پر کر لیا کریں۔ آخر ہم بھی تو انسان ہی ہیں۔“ جاسن نے جملائے ہوئے لہجے میں کہا تو پیٹر بے اختیار ٹھکھلا کر ہنس پڑا۔

”ارے اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”ابھی ڈیڑھ کے بینک اکاؤنٹ میں بہت مال پڑا ہے اور پھر یہ گھر اور ڈیڑھ کی زمینیں بھی تو ہیں۔ پچاس ہزار ڈالر سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔“

”میں مانتا ہوں کہ پچاس ہزار ڈالر کے جانے سے ڈیڑھ کی دولت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی۔“ جاسن نے ٹھنکی لہجے میں بولا۔ ”مگر مجھے خدشہ ہے کہ یہ شروعات ہے۔ جب تک ڈیڑھ کو کینسر کا مرض لاحق نہیں ہوا تھا، کیا انہوں نے بھی چندے کے طور پر اتنی بڑی رقم دی؟ ایک صحت مند آدمی اور بیمار آدمی کی سوچ میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک صحت مند آدمی میں جینے کی تمنا ہوتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو انجموت کرتا ہے اور اگر اس کے پاس پیسہ ہو تو اس کی زندگی بہت پر لطف ہو جاتی ہے مگر اس کے برعکس ایک مرتے ہوئے شخص کی سوچ اور خیالات بہت مختلف ہوتے ہیں۔ سر پر منڈلانے والا موت کا خطرہ اس کے چہرے کی مسکراہٹ تک چھین لیتا ہے۔ ڈیڑھ بھی ڈہری اذیت میں مبتلا ہیں۔ پیچھے پھڑوں کے کینسر نے انہیں جسمانی تکلیف سے

تو دو چار کر ہی رکھا ہے مگر لہجہ بہت قریب آتی موت نے انہیں ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا ہے اور شاید انہوں نے اپنی ذہنی اذیت کم کرنے کے لیے ہی یتیم بچوں کے اس ادارے کو پچاس ہزار ڈالر کی خطیر رقم چندے میں دے دی ہے۔ ورنہ ڈیڑھ ایسے دریا دل تو نہ تھے۔“

”مگر ان کی یہ دریا دلی ہمارے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔“ جاسن کی بات کا جواب دیتے وقت پیٹر کے چہرے پر موجود تشویش کے تاثرات گہرے ہو گئے۔ ”ہمیں نہیں معلوم کہ ڈیڑھ کب تک زندہ رہیں گے؟ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک سال تک زندہ رہ پائیں گے۔ پیچھے پھڑوں کے کینسر کا ابھی تک کوئی مؤثر علاج دریافت نہیں ہوا۔ ڈیڑھ کے زندہ رہنے کے امکانات معدوم ہو چکے ہیں، مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنی جلدی اس دنیا سے رخصت ہوں گے۔ شاید ہمیں ایک سال تک انتظار کرنا پڑے۔“

”میں اتنا طویل انتظار نہیں کر سکتا۔“ جاسن نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے خدشہ ہے کہ وہ آنے والے وقتوں میں پچاس ہزار ڈالر سے بھی بڑی رقم چندے کے طور پر دیں گے۔“

”مگر ہم کبھی کیا کہتے ہیں۔ ڈیڑھ اس دولت کے مالک ہیں۔ وہ جیسے چاہیں اپنی رقم خرچ کر سکتے ہیں۔ یہ گھر، زمینیں سب کچھ ان کے نام پر ہے۔“ پیٹر بے بسی سے بولا۔

”میرے خیال میں ہمیں ڈیڑھ سے براہ راست بات کرنی چاہیے۔“ جاسن پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ”یہ ممکن ہے کہ ڈیڑھ کو ہماری بات سمجھ میں آجائے۔“

”میں تمہاری رائے سے متفق ہوں۔“ پیٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مگر ڈیڑھ ہمیں کام چور اور ٹکھٹو سمجھتے ہیں۔ وہ ہماری بات کو اتنی اہمیت نہیں دیں گے۔ اس لیے میں نے جیکو لین کو فون کر کے تمام صورت حال سے مطلع کر دیا ہے۔ ڈیڑھ سے وہی بات کرے گی۔ ڈیڑھ اس کی باتوں کو اہمیت بھی دیتے ہیں۔ جیکو لین نے بھی اس بات پر شدید حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ڈیڑھ نے اتنی بڑی رقم بطور عطیہ دے دی ہے۔ اسے ڈیڑھ کی ذہنی صحت پر بھی شبہ ہونے لگا ہے۔ وہ آج شام تک پہنچ جائے گی۔“

”تم نے اچھا کیا کہ جیکو لین کو بلا لیا۔ شاید بیٹی کی بات ڈیڑھ کی سمجھ میں آجائے۔“ جاسن نے ٹھنکی لہجے میں کہا۔ ”وہ پیسے بھی انہوں نے جیکو لین کو ہمیشہ ہم پر فوقیت دی ہے کیونکہ اس نے اپنی تعلیم مکمل کی ہے جبکہ ہم ایسا نہیں کر پائے۔ جیکو لین اب ایک پروفیشنل ڈاکٹر بن چکی ہے۔ خود

کمانی ہے، محض اپنے شوہر پر ہی انحصار نہیں کرتی جبکہ اس کے برعکس ہم دونوں نے نہ ہی اپنی تعلیم مکمل کی اور نہ ہی ہم نے کبھی ملازمت کی ہے۔ آج بھی ہمارے اخراجات کا تمام تر انحصار ڈیڑھ پر ہی ہے۔“

پیٹر نے حلق سے ایک خطرناک سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”بہر حال جیکو لین کو آئیے دو، اس سے بات ہو جائے بھی ڈیڑھ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔“

پیٹر جاسن اور جیکو لین کے بہن بھائی تھے۔ ان کے ڈیڑھ کا نام مسٹر ہارڈ تھا۔

مسٹر ہارڈ نے اپنے نام کی طرح خاصی سخت مزاج طبیعت پائی تھی۔ انہوں نے زندگی گزارنے کے کچھ اصول اور ضابطے طے کر رکھے تھے اور وہ ان اصولوں اور ضابطوں پر خود بھی سختی سے عمل کرتے تھے اور اپنی اولاد سے بھی یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ بھی ان ضابطوں کے اندر رہ کر اپنی زندگی بسر کریں۔ مسٹر ہارڈ ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے پاس دولت و جائیداد کی کوئی کمی نہیں تھی۔ یہ ساری جائیداد ان کی موت کے بعد وراثت میں ان کی اولاد کو ہی ملنے والی تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ مسٹر ہارڈ اس بارے میں ذرا مختلف نظریہ رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ان کے بیٹوں اور بیٹی کا تمام تر انحصار محض باپ سے ملنے والی وراثتی جائیداد پر ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ انہیں اپنے قدموں پر بھی کھڑا ہونا چاہیے۔

مسٹر ہارڈ کی بیوی ان کے بچوں کے بچپن میں ہی وفات پا چکی تھی۔ اگرچہ مسٹر ہارڈ بہت سخت گیر طبیعت کے مالک تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں اور بیٹی کی پرورش بڑی محبت اور ناز و نعم کے ساتھ کی تھی اور دوستوں کے مشورے کے باوجود دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ورنہ وہ جس خاندان سے تعلق رکھتے تھے ان کے لیے اچھے رشتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ انہوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے وہ سارے جتن کیے جو ایک باپ کے طور پر وہ کر سکتے تھے۔

ان کی بیٹی جیکو لین ان کی امیدوں پر پوری اتاری تھی۔ وہ پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بن چکی تھی اور شادی کرنے کے بعد اس گھر سے رخصت بھی ہو چکی تھی۔

مسٹر ہارڈ کو اس بات کی بے انتہا خوشی تھی کہ ان کی بیٹی نے ڈاکٹر بن کر ان کا سفر خیر سے بلند کر دیا تھا مگر ساتھ ہی انہیں یہ غم بھی کھائے جا رہا تھا کہ ان کے دونوں بیٹے پیٹر اور جاسن خاصے کام چور اور ٹکھٹو ثابت ہوئے تھے۔ وہ اپنی

تعلیم بھی مکمل نہیں کر پائے تھے۔ مسٹر ہارڈ کی بیٹی جیکو لین تو ترقی کر کے ڈاکٹر بن چکی تھی مگر ان کے بیٹوں نے اگر ترقی کی بھی تھی تو بس کچھ فارغ رہ کر باپ کی کمائی پر عیش کرتے رہتا۔ اگرچہ مسٹر ہارڈ اپنے بیٹوں کی حرکات سے سخت نالاں تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنے نالائق اور ٹکھٹے بیٹوں کا جیب خرچ بھی بند نہیں کیا تھا۔ وہ پیٹر اور جاسن کو ہر ماہ جیب خرچ کی مدد میں خاصی معقول رقم دیتے تھے۔ زندگی کا سفر یونہی رواں دواں تھا مگر پھر ایک دن مسٹر ہارڈ پر یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ وہ پیچھے پھڑوں کے لاعلاج کینسر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ مسٹر ہارڈ کو اکثر اوقات سانس لینے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ شروع شروع میں تو انہوں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی مگر پھر ان کا یہ مرض بڑھتا چلا گیا تو انہوں نے ڈاکٹر کو چیک کرایا۔

کچھ ٹیسٹ ہونے کے بعد ان پر یہ خوفناک حقیقت منکشف ہوئی کہ اب وہ اس دنیا میں زیادہ عرصے کے مہمان نہیں ہیں۔ پیچھے پھڑوں کا یہ لاعلاج مرض کسی بھی وقت ان کی زندگی کا چراغ گل کر سکتا ہے۔ ان کے پاس چند ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کی زندگی تھی۔

مسٹر ہارڈ بہت باہمت اور حوصلہ مند انسان تھے۔ اس لیے انہوں نے بڑی جرأت سے اپنی اس بیماری کا سامنا کیا۔

اگر کسی انسان کو یہ بتادیا جائے کہ اب اس کے پاس بہت تھوڑی زندگی باقی رہ گئی ہے تو اس کی سوچ اور مزاج میں تغیر پیدا ہو جاتا نظری ہی بات ہے۔ پیچھے پھڑوں کے کینسر میں مبتلا ہونے کے بعد مسٹر ہارڈ کے مزاج میں بھی خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ خاصے حساس اور زورورج طبیعت ہو گئے تھے۔ کسی دوسرے کے کام آنا انہیں اچھا لگنے لگا تھا۔ کسی کی مدد کر کے انہیں دلی سکون ملتا۔ انہوں نے ہر سٹے کے دن چرچ جانا شروع کر دیا تھا اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے رقم بھی خرچ کرنا شروع کر دی تھی۔

طبیعت میں طبعی پیدا ہونے کے باوجود کبھی وہ اپنے ٹکھٹو بیٹوں کی وجہ سے چڑچڑے پن کا بھی شکار ہو جاتے تھے۔ انہیں دل ہی دل میں اس بات کا شدید دکھ تھا کہ ان کے دونوں بیٹے اس قابل ہی نہیں کہ وہ زندگی کی دوڑ میں اپنا راستہ بنا سکیں۔ انہیں تو شاید اب اپنے باپ کی بھی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ وہ مسٹر ہارڈ کے کمرے کا رخ اسی وقت کرتے تھے جب انہیں اپنے اخراجات کے لیے رقم درکار ہوتی۔

مسٹر ہارڈ کی دیکھ بھال ان کے ملازمین ہی کرتے

تھے۔ ایک ڈاکٹر بھی روزانہ آکر انہیں چیک کرتا تھا وہ اپنے بیروں پر چلنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے وصل چیز کا استعمال کرنے لگے تھے۔ مسٹر ہارڈ نے جب سے خیراتی اداروں کو چندہ دینا شروع کیا تھا، ان کے قلبی سکون میں اضافہ ہو گیا تھا۔

یہ مسٹر ہارڈ کے خیالات اور سوچ تھی جبکہ ان کے بیٹوں پیٹر اور جاسن کی سوچ اپنے باپ کے بالکل برعکس تھی اور اس سلسلے میں ان کی بہن جیکو لین بھی ان کی ہمنوا تھی۔ اس کا بھی یہ خیال تھا کہ اس کے ڈیڈ کا بیماری کی وجہ سے ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ بھلا کوئی ہوش مند انسان بھی اتنی خطرہ رقم چندے کے طور پر دے سکتا ہے۔

جیکو لین کے لیے یہ صورت حال تشویش ناک تھی۔ وہ تو اپنے والد کی وراثتی جائیداد میں سے اپنا حصہ وصول کر کے ایک ذاتی کلینک کھولنے کے خواب دیکھ رہی تھی مگر اس کے بھائیوں نے اسے فون پر یہ خبر سنا کر پریشانی سے دو چار کر دیا تھا کہ اس کے والد مسٹر ہارڈ پر ان دنوں انسانی ہمدردی کا دورہ پڑا ہوا ہے اور وہ اس سلسلے میں بے دریغ اپنی دولت بھی خرچ کر رہے ہیں۔ پچاس ہزار ڈالر زکوٰۃ کا آغاز ہے۔

مسٹر ہارڈ کو روکنا ضروری ہو گیا تھا اس لیے جیکو لین شام سے بھی کچھ پہلے پہنچ گئی۔ اس وقت وہ پیٹر اور جاسن کے کمرے میں موجود تھی اور ان سے اسی سلسلے میں بات چیت کر رہی تھی۔ وہ تقریباً ایک ماہ بعد وہاں آئی تھی مگر اس نے باپ سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈیڈ سے وہ بعد میں مل لے گی۔ پہلے اس معاملے کو حل کرنا ضروری ہے۔ شاید اس لیے کہ دولت کی اہمیت باپ سے زیادہ تھی۔

”تم دونوں نے اچھا کیا جو مجھے مطلع کر دیا۔ ورنہ نہ جانے ڈیڈ مزید کتنی دولت اسی طرح لٹا دیتے۔ بہر حال اب میں انہیں قائل کر لوں گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات کو تسلیم کرتے ہوئے آئندہ ایسی غلطی نہ کرنے کا وعدہ بھی کریں گے۔“ جیکو لین پُر خیال لہجے میں بولی۔

”وہ تمہاری بات کو اہمیت دیتے ہیں اسی لیے تو ہم نے جنہیں بلایا ہے۔ ورنہ ہم خود بھی ان سے بات کر سکتے تھے۔ ڈیڈ کے خیال میں ہم دونوں بھائیوں سے بڑا بے وقوف اور احمق پورے امریکا میں نہیں ہے۔“ پیٹر نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

”ویسے ڈیڈ کی رائے اتنی غلط بھی نہیں ہے۔“

جیکو لین طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”اگر تم دونوں اپنی تعلیم مکمل کر لیتے تو شاید آج تمہاری بابت ڈیڈ کا نظریہ خاصا مختلف ہوتا۔ انہوں نے جنہیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کے خواب دیکھے تھے اور اس سلسلے میں تم دونوں کو شہر کے ٹھیک ترین اسکول اور کالج میں بھی داخل کروایا۔ مگر تم نے ڈیڈ کے سارے خواب چکنا چور کر دیے ہیں۔ اسی لیے وہ جنہیں احمق، کاہل اور ٹھٹھو قرار دیتے ہیں مگر تمہارے برعکس میں نے ان کی امیدوں اور اعتماد کو محسوس نہیں پہنچائی۔ میں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور ڈیڈ کی خواہش کے مطابق ڈاکٹر بھی بن گئی۔ اسی لیے ڈیڈ کی نگاہوں میں میرا مقام تم دونوں سے کہیں اونچا ہے۔ وہ میرا ہر مشورہ اور رائے پوری توجہ سے سنتے ہیں۔“

”بہتر ہے کہ ہم دونوں پر اپنی زبان کی نشتر زنی کرنے کے بجائے تم اصل مدد کی طرف دھیان دو۔“ پیٹر ناگوار لہجے میں بولا۔ ”یہ مت بھولو کہ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود تم حیثیت میں ہم دونوں سے زیادہ نہیں ہو۔ ہمیں وراثت میں تم سے کچھ زیادہ ہی جائیداد ملے گی اور ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہاں انسان کا اصل رتبہ اور مقام دولت کے ترازو میں ہی توला جاتا ہے۔“

”دولت کمانے اور پیسے بٹھائے دولت مند بن جانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ پیٹر نے جیکو لین کو اس کی حیثیت کا احساس دلایا تو اسے بھی خفہ آ گیا۔ ”میں کم از کم آج اس پوزیشن میں تو ہوں کہ ڈیڈ کی دولت کے بغیر بھی ایک اچھی زندگی گزار سکتی ہوں مگر تم دونوں سے اگر وراثت میں ملنے والی جائیداد چھن جائے تو تم دونوں امریکا کے کسی بونٹل میں برتن دھوتے ہوئے نظر آؤ۔“

”میرے خیال میں تم دونوں غیر ضروری بحث میں الجھ رہے ہو۔ ہمیں آپس میں بحث و تکرار کے بجائے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ڈیڈ کو آئندہ اپنی دولت لٹانے سے کیسے روکا جائے۔“ جاسن نے مفادماندہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”میں آج رات کے کھانے پر ڈیڈ سے بات کروں گی۔“ جاسن کی بات سن کر جیکو لین نفی میں لہجے میں بولی۔ ”بہتر ہے کہ رات تم دونوں بھی آوارہ گردی کرنے کے بجائے کھانے کی میز پر موجود رہنا۔ اب جو بھی بات ہوگی سب کے سامنے ہی ہوگی۔ فی الحال میں ڈراڈیڈ کے کمرے میں جا رہی ہوں تاکہ انہیں اپنی آمد کے بارے میں مطلع کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عیادت بھی کر لوں۔“

”ڈیڈ کے ملازمین تمہاری آمد کے بارے میں انہیں

مطلع کر چکے ہوں گے۔“ پیٹر نے جواب دیا۔ ”بہر حال تم ان کی عیادت کر لو۔“

جیکو لین نے اس بار خاموشی سے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا اور پھر پیٹر اور جاسن کے مشترکہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، کیا جیکو لین ڈیڈ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی؟“ اس کے جاتے ہی جاسن نے پیٹر سے پوچھا۔

”اسی لیے تو اسے بلایا ہے۔“ پیٹر نے جواب دیا۔ ”بہر حال رات کے کھانے پر گھر میں ہی موجود رہنا۔“

”اوکے!“ جاسن نے مختصر سا جواب دیا اور پھر خاموشی سے سر جھکا لیا۔

☆☆☆

رات کے کھانے پر وہ سب اکٹھے ہو گئے۔ مسٹر ہارڈ کے باورچی نے ان سب کی پسند کے مطابق کھانا تیار کیا تھا۔ جیکو لین اپنے والد کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ ایک طرف پیٹر اور جاسن بھی کرسیوں پر برابر اجماع تھے۔ ”تم لوگ کھانا کیوں نہیں شروع کر رہے؟“ مسٹر ہارڈ نے جیکو لین، پیٹر اور جاسن کو کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاتے نہ دیکھ کر استفسار کیا۔

”وہ دراصل ڈیڈ آج میں آپ سے بہت ضروری بات کرنے کے لیے بڑی مشکل سے اسپتال کی ڈیوٹی سے وقت نکال کر آئی ہوں۔“ جیکو لین نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔ ”اچھا۔ ذرا میں بھی تو سنوں کہ میری بیٹی کو مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟“ مسٹر ہارڈ نے بغور جیکو لین کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”جو معاملہ میں آپ سے ڈسکس کرنا چاہتی ہوں، وہ پیسوں سے متعلق ہے۔“ ”کہو، میں سن رہا ہوں۔“ مسٹر ہارڈ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”وہ ڈیڈ..... دراصل میں آپ سے کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ نے اب خیراتی اداروں کو ضرورت سے کچھ زیادہ رقم ہی دینی شروع کر دی ہے۔ میں اس قسم کے اداروں کو رقم دینے کی مخالف نہیں ہوں۔ انسانیت کی بھلائی کے لیے رقم خرچ کرنا اچھی بات ہے مگر ایک ساتھ پچاس ہزار ڈالر زر کی خطرہ رقم محض چندے کے طور پر دے دینا کہاں کی دانشمندی ہے؟ آپ کو سوچنا چاہیے کہ اس رقم پر آپ کی اولاد کا زیادہ حق جاتا ہے۔“ جیکو لین نے بڑے بچے تھے الفاظ میں مسٹر ہارڈ کے سامنے سارا مدعا رکھ دیا۔

”اوہ..... تو ان دونوں نکلوں نے یہ جرم تک پہنچا دیا ہے۔“ مسٹر ہارڈ نے جیکو لین کی آمد کا مقصد جانتے ہی خشکیں لگا ہوں سے پیٹر اور جاسن کو گھورتے ہوئے کہا۔ ان کے چہرے پر ہلکے سے غصے کے تاثرات اٹھ ائے تھے۔ ”ڈیڈ! ہم نے کیا غلط کیا ہے؟ آپ ہماری بات تو سنتے ہی نہیں۔ اس لیے ہم نے جیکو لین کو بلایا ہے کہ شاید آپ کی پڑھی لکھی ڈاکٹر بنی آپ کو سمجھانے میں کامیاب ہو جائے۔“ بات کرتے ہوئے جیکو لین کے پڑھے لکھے ہونے کے ذکر پر نہ چاہتے ہوئے بھی پیٹر کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ اسے ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا تھا کہ تعلیم کی وجہ سے جیکو لین کی اہمیت ان سے زیادہ ہے۔

”میرے خیال میں، میں ڈیڈ سے زیادہ بہتر طریقے سے بات کر سکتی ہوں اور تم دونوں نے بھی مجھے اسی لیے بلایا ہے۔ لہذا اپنا منہ بند رکھو۔“ جیکو لین نے برہم نگاہوں سے پیٹر کو گھورتے ہوئے کہا تو پیٹر ہونٹ پیچھ کر خاموش ہو گیا۔ ”دیکھو بیٹی۔“ مسٹر ہارڈ سنجیدہ لہجے میں بولے۔ ”یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس سے پہلے کسی خیراتی ادارے کو اتنی بڑی رقم نہیں دی ہے۔ مگر میری سادہ زندگی اور آج کی زندگی میں بہت نمایاں فرق ہے۔ پہلے میری نگاہوں میں دولت کی بہت اہمیت ہوا کرتی تھی۔ میں ہر اس کاروبار میں پیسے لگا رہا تھا جہاں سے جتنی منافع حاصل ہونے کی امید ہوتی تھی۔ کاروباری طبقے میں میری قابلیت اور ذہانت کو آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے مگر سچی بات تو یہ ہے کہ کچھ پچھڑوں کے لاعلاج کینسر میں مبتلا ہونے کے بعد سے میری سوچ اور خیالات میں بہت بڑی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ انسان کو دوسروں کے غموں اور مصیبتوں کا صحیح ادراک ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ خود بھی کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ اب مجھے ہر پہل موت کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ ایسی حالت میں، میں جسمانی تکلیف میں تو مبتلا تھا اور ساتھ ہی سخت ذہنی اذیت میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔ مگر جب سے میں نے دہی انسانیت کی خدمت کے لیے پیسا خرچ کرنا شروع کیا، مجھے ایسا قلبی سکون حاصل ہوا ہے جسے شاید میں الفاظ میں بیان نہ کر پاؤں۔ تم پچاس ہزار ڈالر زر کی شکایت لے کر میرے پاس آئی ہو۔ میں تو جلد ہی اپنی آدھی جائیداد انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف کرنے والا ہوں۔“

”کیا؟“ جیکو لین، پیٹر اور جاسن پر اپنے ڈیڈ کے آخری الفاظ کی ہم کی طرح گرے۔ وہ تینوں ہونٹ صورت

بنائے مسٹر ہارڈ کا منہ جھکنے لگے۔

”ہاں میرے بچو! میں نے اپنی آدمی جاکماد ایک ٹرسٹ کو دیے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تم تینوں کے لیے باقی آدمی جاکماد بھی بہت ہے۔“ مسٹر ہارڈ نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

”آپ ہمارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے..... ڈیڈ۔“ پیٹر نے پھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کون روکے گا مجھے؟“ مسٹر ہارڈ نے پیٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔

”کیا تم میں اتنی جرأت ہے کہ اپنے باپ کے مد مقابل کھڑے ہو سکو۔ تم ہر ماہ اپنے جیب خرچ کے لیے میرے سامنے بیٹکی ملی بنے کھڑے رہتے ہو۔ کیا تم مجھے ایسی وصیت کرنے سے روک پاؤ گے؟“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا ڈیڈ۔“ مسٹر ہارڈ کا دھمکی آمیز لہجہ سنتے ہی پیٹر کو ہوش آ گیا اور اس نے بات کرتے ہوئے حتی الامکان اپنا لہجہ بھی نرم کر لیا۔

”میرے کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے ڈیڈ کہ ایسا کر کے آپ اپنی اولاد کی حق تلفی کر رہے ہیں۔ کیا آپ کو اپنی اولاد کے حق کا قطعی کوئی خیال نہیں؟“

”کیا حق صرف اولاد کا ہی ہوتا ہے۔“ مسٹر ہارڈ نے زہر خند لہجے میں پیٹر کو جواب دیا۔

”کیا باپ کا کوئی حق نہیں ہوتا؟ تم سب جانتے ہو کہ میں اس وقت شاید اپنی زندگی کے آخری دور سے گزر رہا ہوں مگر اس کے باوجود تم دونوں میرے کمرے میں کئی کئی دنوں بعد ہی تشریف لاتے ہو اور

جیکو لین تم بھی ایک ماہ بعد مجھ سے ملنے کے لیے آئی ہو اور وہ بھی میری عیادت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ تمہیں میرا

پچاس ہزار ڈالر چندے میں دینا ہضم نہیں ہو رہا۔“ جیکو لین

”نہیں نہیں ڈیڈ! ایسی بات نہیں ہے۔“ جیکو لین

کھانے سے لہجے میں بولی۔ ”دراصل آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں ایک اسپتال میں ملازمت کرتی ہوں۔ وہاں سے

وقت نکالنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔“

”بس بس۔“ مسٹر ہارڈ نے جیکو لین کو مزید بولنے سے روک دیا۔

”میں نے تمہارے اسپتال چند دن پہلے فون کیا تھا۔ وہاں سے پتا چلا کہ تم ایک ہفتے کی چھٹی پر ہولنڈا

مصرفیت کا بہانہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”میں نے یہ چھٹی پکنک منانے کے لیے نہیں لی تھی ڈیڈ۔“ جیکو لین رسائیت سے بولی۔ ”دراصل میں لاس

لیے ایک ہفتے تک اس فری میڈیکل کیپ کا حصہ بنی رہی تھی۔ آپ کو تو اپنی بیٹی پر فخر ہونا چاہیے کہ وہ ایسے فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔“

”تم میرے پرانے دوست مسٹر جوزف کو تو جانتی ہی ہو؟“ مسٹر ہارڈ نے موضوع سے ہٹ کر ایک اور سوال کیا تو

جیکو لین چونک پڑی اور پھر حیرت بھرے لہجے میں بولی۔

”شاید آپ انکل جوزف کی بات کر رہے ہیں؟ مگر یہ آپ کو ان کی اچانک یاد کیسے آگئی؟“

”جوزف، ان دنوں امریکا کے ایک مشہور پکنک پوائنٹ پر گیا ہوا ہے۔“ مسٹر ہارڈ نے سنجیدہ لہجے میں جواب

دیا۔ ”چند دن پہلے اس نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ اس نے جنہیں وہاں اپنے شوہر کے ساتھ سیر و تفریح کرتے دیکھا

ہے۔ غالباً اسپتال سے چھٹیاں بھی تم نے تفریح پر جانے کے لیے حاصل کی ہیں اس لیے میرے سامنے کسی فری میڈیکل

کیپ کا ڈھونگ رچانے کی ضرورت نہیں۔ شاید پیٹر یا جانسن کے فون کرنے اور میرے پچاس ہزار ڈالر چندے

میں دینے کا علم ہونے پر تم اپنے تفریحی دورے کو ترک کر کے سیدھا یہاں پہنچی ہو۔ آخر تمہاری وراثتی جاکماد کا

معاملہ ہے، اس لیے تمہاری فکر مندی سبب ہے۔“

”وہ دراصل ڈیڈ بات یہ ہے کہ.....“ جیکو لین سے فوری طور پر کوئی جواب نہ نہ پڑا۔

”رہنے دو جیکو لین..... میرے سامنے مزید چھوٹ

بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مسٹر ہارڈ سخت لہجے میں

بولے۔ ”میں تمہیں اپنے بھائیوں سے مختلف سمجھتا تھا۔ میرا

خیال تھا کہ تم اپنے بھائیوں جیسی لاپٹی سوچ کی حامل نہیں ہو

مگر آج احساس ہوا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے یہ لازم

نہیں ہو جاتا کہ انسان کے خیالات اور سوچ بھی اعلیٰ

ہو جائے۔ بہر حال میں تم تینوں کو اپنے فیصلے کے بارے میں

آگاہ کر چکا ہوں۔ میں اپنی آدمی جاکماد غریب اور نادار

لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والے کسی ادارے

سے بھی محروم کر دے گی۔“ یہ کہتے ہوئے مسٹر ہارڈ نے اپنے ایک خاص ملازم کو آواز دی۔

ڈیوڈ نامی ملازم ان کی آواز سن کر فوراً حاضر ہو گیا۔

”ڈیوڈ! مجھے میرے کمرے میں لے چلو۔ میرا آج

کھانا کھانے کو دل نہیں چاہ رہا.....“ مسٹر ہارڈ نے تھکسانہ

لہجے میں کہا تو ڈیوڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسٹر ہارڈ

کی دھمکی کو کھانے کی ٹیبل سے پیچھے ہٹ لیا۔

ڈیوڈ نامی ملازم جیل چیمبر کو دھکیلتا ہوا مسٹر ہارڈ کے

کمرے کی جانب بڑھ گیا جبکہ جیکو لین پیٹر اور جانسن

ہونٹ جھنجھٹے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ انہوں نے جیکو لین کو

اس لیے بلوایا تھا کہ وہ مسٹر ہارڈ کو دوبارہ کسی خیراتی ادارے

کو چندے میں خطیر رقم دینے جیسے احقانہ فعل سے روک سکے

مگر یہاں تو معاملہ ان کی توقع سے بھی زیادہ مبہم ہو چکا تھا۔

مسٹر ہارڈ تو اپنی آدمی جاکماد ہی ایسے کسی ادارے کو دینے کا

اعلان کر چکے تھے۔ آج انہوں نے خلاف توقع جیکو لین کو

بھی کھری کھری سنا دی تھی۔

اگرچہ کھانا میز پر لگ چکا تھا مگر مسٹر ہارڈ کے معمم

ارادے جان کر ان تینوں کی بیچوک بھی مر گئی تھی۔ ان کے

لیے یہ احساس خاصا تکلیف دہ تھا کہ جس دولت کو پانے کے

وہ خواب دیکھ رہے ہیں، اس میں سے آدمی دولت کسی

ٹرسٹ کے نام ہونے والی ہے۔

”میں کمرے میں جا رہا ہوں۔ میرا کھانا کھانے کو

دل نہیں چاہ رہا۔“ پیٹر نے اٹھتے ہوئے کہا تو جانسن بھی اٹھ

کھڑا ہوا۔ جیکو لین نے بھی ان کی تقلید کی۔

وہ سب پیٹر اور جانسن کے مشترکہ کمرے میں

آگئے۔ جیکو لین نے اندر داخل ہوتے وقت دروازہ بند کیا

اور پھر کمرے میں موجود ایک کرسی پر براجمان ہو گئی۔ پیٹر

اور جانسن پہلے ہی صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ان سب کے

چہروں سے غمگندی اور پریشانی مترشح تھی۔ وہ تینوں کافی

دیر تک یوں بیٹھ بیٹھے رہے۔

”تم نے دیکھا جیکو لین..... ڈیڈ کیسا بے وقوفانہ

اقدام سرانجام دینے جا رہے ہیں؟“ کچھ دیر بعد پیٹر نے

خاموشی کو توڑا۔

”ڈیڈ کا دماغی توازن مکمل طور پر بگڑ چکا ہے۔ مجھے ان

کے لہجے سے ہی اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ اپنے کبے پر ہر صورت

عمل کریں گے۔“ جیکو لین نے شکر لہجے میں جواب دیا۔

”ہمیں ڈیڈ کو ہر صورت روکنا ہوگا۔“ جانسن پُر زور

احترام

پولیس کے ایک سپاہی کو رات کے وقت ایک کنوئیں سے بچاؤ بچاؤ کی آوازیں آرہی تھیں۔ سپاہی نے کنوئیں میں سی ڈال کر کھینچنا شروع کیا۔ جب وہ اوپر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا افسر ہے۔ سپاہی افسر کو دیکھ کر گھبرا یا اور اس نے فوراً سی چھوڑ کر سلیپٹ کر دیا۔

کنجوس

بس میں سوار ایک کنجوس گراہم کم ادا کر رہا تھا اور برابر جھگڑا کیے جا رہا تھا۔ کنجوس کو جو غصہ آیا تو وہ مسافر کا بس اٹھا کر باہر پھینکنے لگا۔ مسافر طیش میں آ کر چلا یا۔ ”ایک تو مجھ سے زیادہ گراہم گھٹنے کی فکر میں ہو اور ہمارے بچے کو بھی باہر پھینک رہے ہو۔“

مرسلہ۔ راجیلہ شفیق، نیو کراچی

لہجے میں بولا۔

”ہم ان کے ساتھ زبردستی کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔“ جیکو لین پُر خیال لہجے میں بولی۔ ”اگر ہم نے

ان کے ساتھ کسی قسم کا سخت برتاؤ کیا تو وہ ہمیں باقی آدمی

جاکماد سے بھی عاق کر سکتے ہیں۔ کھانے کی میز پر وہ ایسا

کرنے کی دھمکی بھی دے چکے ہیں۔“

”مگر ہم یوں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بھی تو نہیں بیٹھ

سکتے؟“ پیٹر غصیلے لہجے میں بولا۔ ”میں نے اس دولت کو

حاصل کرنے کے لیے بہت انتظار کیا ہے۔ میں اب مزید

انتظار نہیں کر سکتا۔“

”ڈیڈ کی موت تک تو انتظار کرنا ہی ہوگا۔“ جانسن

نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ”مگر مجھے نہیں لگتا کہ ڈیڈ اتنی جلدی

اس دنیا سے رخصت ہوں گے نہ جانے ہمارا انتظار کب ختم

ہوگا۔“

”اگر یہ انتظار ختم نہیں ہو رہا تو پھر اس انتظار کو اپنے

ہاتھوں ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔“ جیکو لین نے سفاکانہ لہجے

میں کہا تو پیٹر اور جانسن بری طرح چونک پڑے۔ جیکو لین

کے چہرے پر بڑے عجیب سے تاثرات تھے۔ اس کا چہرہ

بڑا بمیلا نک لگ رہا تھا۔

”جیکو لین! کیا تمہاری بات کا وہی مطلب ہے جو میری سمجھ میں آ رہا ہے۔“ پیٹر نے تحیر لہجے میں کہا۔

”ہاں۔“ جیکو لین نے جواب دیا۔ ”میری بات کا وہی مطلب ہے جو تمہیں سمجھ میں آ رہا ہے کہ اگر اپنی آدمی جاکدا کو کسی ٹرسٹ میں جانے سے بچانا چاہتے ہو تو ڈیڈ کو خاموشی کے ساتھ دوسری دنیا رخصت کر دو۔ ان کی موت پر کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔ سب یہی سمجھیں گے کہ وہ پیچھے پھڑوں کے کینسر کی وجہ سے انتقال کر گئے ہیں۔“

”تم ہمیں ڈیڈ کو قتل کرنے کا مشورہ دے رہی ہو؟“ اس بار جانسن بولا۔ پیٹر کی طرح اس کے چہرے پر بھی حیرت کے تاثرات موجود تھے۔ یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جیکو لین انہیں قتل جیسے مذموم اور بھیا تک فعل کے ارتکاب کا مشورہ بھی دے سکتی ہے۔

”ختم بالکل ٹھیک سمجھے ہو۔“ جیکو لین کا لہجہ مزید سفاکانہ ہو گیا۔ ”اس مسئلے کا یہی حل ہے۔ ڈیڈ کی موجودہ زندگی خاصی تکلیف دہ ہے۔ وہ کینسر کے مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے روزی رپے ہیں اور روز مرہ پر ہیں۔ کیوں نہ انہیں ایک ہی بار مار دیا جائے۔ بادی انظر میں دیکھا جائے تو تم انہیں قتل نہیں کرو گے بلکہ ایک تکلیف دہ زندگی سے نجات دلاؤ گے۔“

”مگر جیکو لین وہ ہمارے ڈیڈ ہیں۔ ہم اپنے باپ کو کیسے مار سکتے ہیں؟“ جانسن معترض لہجے میں بولا۔

”جب انہیں اس بات کا احساس نہیں رہا کہ ہم ان کی اولاد ہیں تو پھر ہمیں بھی ان کا کوئی احساس نہیں ہونا چاہیے۔“ جیکو لین پر زور لہجے میں بولی۔ ”ڈیڈ کی کافی یا چائے میں اگر خاموشی سے زہر ملا دیا جائے تو ڈیڈ کو اس دکھ بھری زندگی سے نجات مل جائے گی۔“

”مگر ان کے لیے چائے یا کافی تو ان کا باورچی بناتا ہے۔ اس کے سامنے ہم کافی میں زہر کیسے ملائیں گے؟ اور پھر زہر کا بندوبست کہاں سے کیا جائے گا؟“ پیٹر نے کہا تو جانسن نے ایسی نگاہوں سے اسے دیکھا جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو کہ یہ بات پیٹر نے کی ہے۔

”تم بھول رہے ہو پیٹر کہ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔“ جیکو لین نے رسائی سے جواب دیا۔ ”زہر کا بندوبست کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ باورچی کو ڈانگ دینا بھی زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔“

”یہ تم دونوں کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔“ جانسن نے بے یقینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے جیکو لین۔۔۔۔۔۔“ پیٹر نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”اگر آدمی جاکدا کو کسی ٹرسٹ کی نذر ہونے سے بچانا چاہتے ہو تو پھر ڈیڈ کو دوسری دنیا رخصت کر دینا ہی اس مسئلے کا بہترین حل ہے۔“

”میں بھی تم دونوں کی طرح ڈیڈ کی موت کا خواہاں ہوں۔“ جانسن نے کہا۔ ”مگر تم دونوں ایک بات بھول رہے ہو اور وہ یہ کہ اگر ڈیڈ کی موت پر کسی کو شک ہو گیا اور معاملہ پولیس تک پہنچ گیا تو پولیس ڈیڈ کا پوسٹ مارٹم کروائے گی اور پوسٹ مارٹم رپورٹ میں سب ظاہر ہو جائے گا کہ ڈیڈ کی موت کینسر سے نہیں بلکہ زہر سے ہوئی ہے۔ میں اس منصوبے میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔ میں نوجوانی میں جیل نہیں جانا چاہتا۔“ جانسن نے جیکو لین اور پیٹر کو صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔

جانسن کی دلیل سے صرف نظر پیٹر کے لیے بھی یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہ تھا کہ اپنے ڈیڈ کا قتل انہیں قانون کی گرفت میں بھی پھنسا سکتا ہے۔

”جانسن ٹھیک کہہ رہا ہے، جیکو لین۔ اس طرح تو ہم قانون کے شکنجے میں بھی پھنس سکتے ہیں۔“ پیٹر جو کچھ دیر پہلے تک اپنے ڈیڈ کو دوسری دنیا رخصت کرنے کے بارے میں جیکو لین کا ہمنوا بنا ہوا تھا، پولیس کا ذکر آتے ہی ہلکی ہلکی بن گیا۔

”میرے خیال میں ہمیں کچھ اور سوچنا چاہیے۔“

”تم دونوں بھائی بچپن سے ہی خاصے ڈرپوک اور بزدل واقع ہوئے ہو۔“ پیٹر کو پیٹر ابدلتے دیکھ کر جیکو لین استہزائیہ لہجے میں بولی۔ ”میں اب بھی کہہ رہی ہوں کہ ہمارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے کسی کو شک نہیں ہوگا۔ بس تم دونوں کو تھوڑی سی جرأت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔“

”نہیں جیکو لین۔“ پیٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ڈیڈ کا معائنہ کرنے کے لیے ایک ڈاکٹر روزانہ آتا ہے۔ اگر ہم نے ڈیڈ کی چائے یا کافی میں زہر ملا دیا تو اس کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ان کا ڈاکٹر شک میں مبتلا ہو جائے۔ میرے خیال میں جانسن کی رائے ٹھیک ہے۔ ہمیں اتنا بڑا رسک نہیں لینا چاہیے۔“

”تو پھر تم دونوں بھڑاؤ میں جاؤ۔“ جیکو لین غصیلے لہجے میں بولی۔ ”میں دوسرے کمرے میں سونے کے لیے جا رہی ہوں اور صبح ہوتے ہی واپس روانہ ہو جاؤں گی۔ بہتر ہے کہ اب ڈیڈ کی آدمی جاکدا پر ہی اکتفا کر لو۔ جو ہم تینوں میں قانون کے مطابق تقسیم ہوگی۔“

”دیکھو جیکو لین! تم خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔“ پیٹر ناصحانہ لہجے میں بولا۔ ”مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔ ڈیڈ کا ذاتی باورچی ان کے لیے چائے یا کافی تیار کرتا ہے اگر ہم میں سے کوئی بچن میں جا کر اس کی نظروں سے بچ کر کافی میں زہر ملا بھی دیتا ہے تو اس بات کی گارنٹی ہے کہ ڈیڈ کافی پی لیں گے؟ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈیڈ کے لیے بنائی گئی کافی ان کا خاص ملازم ڈیوڈ یا معائنے کے لیے آنے والا ڈاکٹر پی لیتا ہے کیونکہ ڈیڈ کی عادت ہے کہ وہ پہلے اپنے باورچی کو کچھ بنانے کا حکم تو دے دیتے ہیں مگر جب ان کی من پسند ڈش تیار کر دی جاتی ہے تو اچانک ان کا موڈ بدل جاتا ہے اور وہ کافی ڈیوڈ نے پی لی تو پھر ایک صحت مند آدمی کی اچانک موت کسی کو غم نہیں ہوگی اور معاملہ لازماً پولیس تک جائے گا۔ اس طرح ہم مشکل میں بھی پھنس سکتے ہیں۔“

”مجھے اپنے بزدل اور ڈرپوک بھائیوں سے اسی جواب کی توقع تھی۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ تمہارے اندر ہمت و جرأت کا فقدان ہے؟ بہر حال میں سونے جا رہی ہوں۔ اب جاکدا کا نصف ہی ہماری ملکیت میں آئے گا۔“ یہ کہتے ہوئے جیکو لین ابھی اور ہر پختی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی جبکہ پیٹر اور جانسن نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اگرچہ وہ دل ہی دل میں جیکو لین کی اس تجویز سے شفق تھے کہ جاکدا بچانے کے لیے ڈیڈ کو دوسری دنیا رخصت کر دینا ہی بہتر ہے مگر اپنی بڑی دلا نہ طبیعت کی وجہ سے وہ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں کر پاتے تھے۔ پولیس کا خیال آتے ہی ان کا دل دھلنے لگا تھا اور انہوں نے جیکو لین کو بھی انکار کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے جیکو لین ان سے ناراض ہو کر کمرے سے چلی گئی تھی۔

جیکو لین اگلے دن صبح سویرے ہی واپس روانہ ہو گئی۔ اس نے جاتے وقت پیٹر جانسن یا اپنے ڈیڈ سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد کافی دنوں تک اس نے نہ ہی انہیں فون کیا اور نہ ہی وہ مسٹر ہارڈ سے ملنے کے لیے آئی۔

پیٹر اور جانسن کی زندگی بھی پہلے کی طرح رواں دواں ہو گئی۔ وہ دل ہی دل میں اب آدمی دولت پر ہی اکتفا کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے مسٹر ہارڈ کو کوئی مرتبہ اپنے خاص ملازم ڈیوڈ اور ڈرائیور کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ کر کہیں جاتے بھی دیکھا تھا۔

پیٹر اور جانسن کو یقین تھا کہ ان کے والد گاڑی میں اپنے وکلاء کی ٹیم سے ملنے جاتے ہیں۔ شاید وہ اپنی وصیت

تیار کر رہے تھے۔ جس کے مطابق آدمی جاکدا ان کی اولاد کے لیے اور آدمی کسی ٹرسٹ کے نام کی جانی تھی۔

پیٹر اور جانسن اب بڑی بے یقینی سے اپنے باپ کی موت کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد ان کے ڈیڈ کی آدمی جاکدا ان کے قبضے میں آجائے۔ انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا اور ایک دن مسٹر ہارڈ انتقال کر گئے۔

پیچھے پھڑوں کے لاعلاج کینسر میں مبتلا مسٹر ہارڈ بالآخر موت سے ہار گئے تھے۔ جیکو لین بھی اپنے والد کی موت کی خبر سنتے ہی پہنچ گئی۔ مسٹر ہارڈ کی موت پر تعزیت کے لیے آنے والوں کا تاننا بندھ گیا۔

پیٹر، جانسن اور جیکو لین تعزیت کے لیے آنے والوں کی تعزیت قبول کرنے کے لیے موجود تھے۔ شام تک مسٹر ہارڈ کی آخری رسومات ادا کرتے ہوئے انہیں ایک تابوت میں ڈال کر سپرد خاک بھی کر دیا گیا۔

جب مسٹر ہارڈ کے تابوت کو قبر میں اتارا جا رہا تھا تو جیکو لین پچکیاں لے لے کر رونے لگی اور اس کے آس پاس موجود مرد و خواتین اسے تسلی دینے لگے۔

پیٹر اور جانسن اپنی بہن کو روتے دیکھ کر سوچ رہے تھے کہ جیکو لین کو یقیناً ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ واقعی کمال کی ایکٹری تھی۔ ورنہ مسٹر ہارڈ کی موت پر ان دونوں سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

مسٹر ہارڈ کے تابوت کو سپرد خاک کرنے کے بعد پیٹر، جانسن اور جیکو لین گھر واپس آ گئے۔ اب تعزیت کرنے والے افراد کی بھی خاصی بڑی تعداد واپس جا چکی تھی۔ تاہم کچھ قرعہ غریب و اقا رب اب بھی موجود تھے۔

پیٹر، جانسن اور جیکو لین اپنے ان رشتے داروں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ جیکو لین کا چہرہ رونے کی وجہ سے سو جھا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے دکھ اور غم کے تاثرات موجود تھے۔ وہ واقعی میں غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔

مین اسی لمحے ڈرائنگ روم میں ایک بوڑھا شخص داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی ان تینوں نے اسے پہچان لیا۔ یہ ان کے ڈیڈ مسٹر ہارڈ کے وکلاء کی ٹیم کا ایک سینئر وکیل تھا۔ اس کے ساتھ پولیس کی وردی میں بیٹوں ایک سارجنٹ بھی تھا۔

وکیل کی آمد کا مقصد تو سب کی سمجھ میں آتا تھا۔ شاید وہ مرحوم مسٹر ہارڈ کی وصیت کے بارے میں بات کرنے آیا تھا مگر اس کے ساتھ ایک پولیس افسر کی آمد کی وجہ جیکو لین، پیٹر اور جانسن میں سے کوئی بھی نہ سمجھ پایا۔ وہ پولیس افسر

عقباتی نظروں سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لے رہا تھا۔
 ”مسٹر پیٹر یقیناً آپ مجھے جانتے ہوں گے۔ میں آپ کے مرحوم ڈیڈ مسٹر ہارڈ کا وکیل ہوں۔“ اس بوڑھے نے پیٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے آپ سے..... آپ کے بھائی جانسن اور بہن، جیکو لین سے علیحدگی میں بات کرنی ہے۔ میں آپ کے مرحوم والد مسٹر ہارڈ کی وصیت کے سلسلے میں یہاں حاضر ہوا ہوں۔“
 ”میں آپ کو جانتا ہوں۔“ پیٹر نے بھی انہی انداز میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”آپ کا نام مسٹر مورس ہے اور آپ میرے مرحوم ڈیڈ کے خاصے پرانے وکلاء میں شامل ہیں۔ مگر وصیت کے معاملات چند دنوں بعد بھی تو حل کیے جاسکتے ہیں..... اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ ابھی تو ہمارے گھر میں تعزیت کے لیے آئے ہوئے عزیز واقارب بھی موجود ہیں۔“
 ”آپ کے ڈیڈ مسٹر ہارڈ کی وصیت میں اسی بات کی تاکید کی گئی ہے کہ ان کی موت کے بعد جیسے ہی ان کی تدفین ہو جائے اس وصیت پر فوری طور پر عمل درآمد کرایا جائے۔ اس لیے مجھے مجبوراً آنا پڑا ہے۔“ مورس نامی وکیل نے جواب دیا۔
 ”مگر اتنی بھی کیا جلدی تھی۔“ اس بار جانسن نے اعتراض کرنا چاہا مگر مورس کے ساتھ آئے ہوئے سارجنٹ نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔
 ”بہتر ہے کہ آپ تینوں بہن بھائی علیحدگی میں مسٹر مورس کی بات سن لیں۔“ سارجنٹ نے درشت لہجے میں کہا۔ ”اوکے.....“ پیٹر نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اسے دیکھ کر ایک طرف بیٹھے جانسن اور جیکو لین بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔
 ”آئیں وکیل صاحب۔“ پیٹر نے کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ مورس نامی وکیل، جانسن اور جیکو لین بھی اس کے پیچھے ہو لیے جبکہ پولیس افسر وہیں کھڑا رہا۔
 ”اب بتائیں مسٹر مورس کہ آپ کو ڈیڈ کی وصیت کے بارے میں اتنی جلدی کیوں ہے؟“ کمرے میں داخل ہوتے ہی پیٹر نے اس بوڑھے وکیل سے سوال کیا۔
 ”بات یہ ہے کہ آپ لوگوں کو یہ گھر خالی کرنا ہوگا۔ میری معلومات کے مطابق جیکو لین تو یہاں رہائش پذیر نہیں ہے۔ یہ اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے مگر آپ دونوں بھائی اسی گھر میں رہتے ہیں۔ بہر حال آپ کو اس گھر سے ماسوائے اپنے کپڑوں کے کسی اور شے کو لے جانے کی

اجازت نہیں ہے۔ آپ کے والد نے آپ کو بتایا ہی ہوگا کہ وہ اپنی آدمی جانکاد ایک ٹرسٹ کے نام کر رہے ہیں۔“ مورس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
 ”مگر باقی آدمی جانکاد تو ہمارے نام ہی ہے پھر آپ ہمیں یہ گھر خالی کرنے کا کیوں کہہ رہے ہیں۔ کیا یہ گھر بھی ٹرسٹ کے نام چلا گیا ہے؟“ پیٹر نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔ اس کی طرح جانسن اور جیکو لین کے چہرے پر بھی مورس کی بات سن کر حیرت کے تاثرات ابھر آئے تھے۔
 ”یہ گھر آپ تینوں بہن بھائیوں کے نام ہی ہے۔“ مورس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کے والد نے اپنی آدمی جانکاد بھی آپ تینوں کے حوالے کرنے کے سلسلے میں آپ کے مرحوم والد نے اپنی وصیت میں کچھ قواعد و ضوابط اور شرائط بھی عائد کی ہیں اور اب یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں آپ تینوں سے ان شرائط کی پاسداری کراؤں۔ بہر حال پہلے آپ یہ خط پڑھ لیں۔ یہ آپ کے والد نے اپنی وصیت تیار کراتے وقت مجھے دیا تھا۔“ یہ کہتے ہوئے مورس نے جیب سے ایک سرسبز لافانڈ نکال کر پیٹر کے حوالے کر دیا۔ ”میں نے یہ خط پڑھا تو نہیں مگر آپ کے ڈیڈ نے مجھے بتایا تھا کہ اس خط میں انہوں نے وہ تمام وجوہات لکھ دی ہیں جن کی بنا پر وہ یہ وصیت تیار کرانے پر مجبور ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس خط کو پڑھتے وقت ان کے دونوں بیٹوں اور بیٹی کے سوا اور کوئی موجود نہ ہو۔ اس لیے میں باہر آپ لوگوں کا انتظار کر رہا ہوں۔“ اپنے آخری الفاظ ادا کرتے ہی مورس کمرے سے باہر نکل گیا اور جاتے جاتے اس نے دروازہ بند کر دیا۔
 ”یہ کیا خط ہے؟“ جانسن نے پیٹر کے ہاتھوں میں موجود لافانڈ دیکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔
 ”یہ خط سرسبز ہے۔“ پیٹر پر خیال لہجے میں بولا۔
 ”اس کا مطلب ہے کہ ڈیڈ چاہتے تھے کہ یہ خط ہمارے سوا کوئی اور نہ پڑے۔“
 ”اے کھولو تو۔“ جیکو لین بے چین لہجے میں بولی تو پیٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لافانڈ کھول کر اس میں موجود نقیص کاغذ نکال لیا۔ تحریر خاصے خوشخط انداز میں لکھی گئی تھی۔ جیکو لین اور جانسن پیٹر کے شانہ بشانہ کھڑے ہو گئے۔ اب وہ تینوں بیک وقت اپنے باپ کی لکھی گئی اس آخری تحریر کو پڑھ سکتے تھے۔ ان کے والد مسٹر ہارڈ نے وہ

خط کچھ اس طرح شروع کیا تھا۔
 ”میری وصیت کے مطابق یہ خط تم تینوں کو اس وقت ملے گا جب میں اس جہان فانی سے کوچ کر چکا ہوں گا۔ دیوے تو میری وصیت کے بارے میں تمہیں میرے وکلاء ٹیم کے انچارج مسٹر مورس سے بھی معلوم ہو جائے گا۔ تاہم پھر بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تم تینوں کو اس قسم کی وصیت تیار کرانے کی وجوہات سے آگاہ کر دوں، مگر اس سے پہلے میں اپنی اولاد کو کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں یا پھر سمجھ لو کہ کچھ جگہ ناچاہتا ہوں۔“
 ”جب تمہاری ماں کا انتقال ہوا تو عزیز واقارب کے مشوروں اور خواہش کے باوجود میں نے دوسری شادی محض اس لیے نہیں کی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم پر سوتیلی ماں کا سایہ بھی پڑے۔ میں نے اپنی تمام خواہشات کا گلا کھونٹ دیا..... اپنی اولاد کی خاطر اور پوری زندگی یونہی گزاری۔ حالانکہ تمہاری ماں کی موت کے وقت میں جوان تھا۔“
 ”اگرچہ میں کچھ سخت گیر طبیعت کا مالک بھی واقع ہوا تھا مگر اس کے باوجود میں نے تمہاری پرورش بڑی محبت اور چاہت سے کی اور تمہاری ہر جائز ضرورت بھی پوری کی۔ میں نے تمہیں اعلیٰ تعلیم دلوانے کے لیے بھی وہ تمام جتن کیے جو بطور باپ میرے فرائض میں شامل تھے مگر افسوس کہ تم تینوں میں سے صرف جیکو لین ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر پائی۔ اگرچہ جانسن اور پیٹر اعلیٰ تعلیم مکمل نہیں کر پائے تھے اور میں انہیں کامل کام چور اور نکاحا سمجھتا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے ان کی زندگی کی ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ آخر وہ میرے بیٹے تھے۔“
 ”زندگی یونہی گزری تھی مگر پھر ایک دن مجھے پتا چلا کہ میں بھی پھپھڑوں کے علاوہ مرض میں مبتلا ہو گیا ہوں اور اب اس دنیا میں کچھ ہی عرصے کا مہمان ہوں۔ یہ خبر میرے لیے بڑی روح فرسا تھی۔ زندگی چھین جانے کا احساس کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا صحیح ادراک مجھے اسی وقت ہوا۔ بہر حال میرا مرض علاوہ تمہاں لیے میں نے اسپتال کے بجائے گھر پر ہی اپنی زندگی کے آخری ایام گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ سوچا تھا کہ یہ خبر میری اولاد پر بھی بجلی بن کر گرے گی اور میرے بیٹے اور بیٹی ہر وقت میری تیمارداری میں لگے رہیں گے۔ چلو اپنی اولاد کے ساتھ ہنسنے کھیلنے میرا آخری وقت اچھا کٹ جائے گا۔ یہ ایک بے وقوف باپ کی اپنی اولاد کی بابت خوش فہمیاں تھیں جو جلد ہی دور ہو گئیں۔ جیکو لین اپنی نوکری کی مجبوریوں کا رونا رو کر مینے میں ایک آدھ بار بھی مجھ سے ملنے

آئی۔ جبکہ میرے دونوں بیٹے بھی کبھی کبھار ہی میرے کمرے کا رخ کرتے تھے۔ میں بس اپنے ملازمین کے ساتھ ہی بات چیت کر کے وقت گزار لیتا تھا۔“
 ”ان دنوں اپنی اولاد کی عدم توجہی کا شکار ہو کر مجھے بڑی شدت سے اپنی کم مائیگی اور بے توقیری کا احساس ہونے لگا۔ میری سگی اولاد میرے ساتھ ایسا کرے گی، کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں نے ان کی بڑی محبت اور توجہ سے پرورش کی تھی مگر جب مجھے ان کی توجہ اور محبت کی ضرورت تھی تو وہ مجھ سے گویا بالعلق سے ہو گئے تھے۔ میں اس وقت بیماری کی وجہ سے جسمانی اذیت میں تو مبتلا تھا ہی مگر اپنی اولاد کے رویے نے مجھے ذہنی اذیت میں بھی مبتلا کر دیا تھا۔“
 ”ان دنوں میں نے مختلف خیراتی اداروں کو چندے کے طور پر رقم دینا شروع کر دی۔ اس طرح مجھے خاصا قلبی سکون حاصل ہونے لگا۔“
 ”میں جانا چاہتا تھا کہ میری اولاد مجھ سے اتنا بالعلق ہو کر کیوں بٹھ گئی ہے؟ میرے دونوں بیٹے میری موجودگی میں کیا بات چیت کرتے ہیں؟ اپنی اس تجسس فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجھے ایک انوکھا آئیڈیا سوچا اور میں نے اپنے ایک ملازم کے ذریعے پیٹر اور جانسن کے مشترکہ کمرے میں ایک خفیہ کیمرا نصب کر دیا۔ میں نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر محض شغل کے طور پر یہ حرکت کی تھی کہ ذرا دیکھوں تو کسی کمرے میں میرے دونوں بیٹے اپنے کمرے میں میرے بارے میں کیا گفتگو کرتے ہیں؟ کیمرا نصب ہونے کے بعد اب میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک چھوٹی سی اسکرین پر پیٹر اور جانسن کی تمام گفتگو سن سکتا تھا اور انہیں دیکھ بھی سکتا تھا۔“
 ”کہتے ہیں کہ علم قدرت کی بہت بڑی نعمت ہے مگر کبھی کبھی لاعلمی بھی قدرت کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ میں نے اپنے بیٹوں کے مشترکہ کمرے میں خفیہ کیمرا نصب کر دیا اس نعمت کو خود ہی ٹھوک مار دی تھی۔“
 ”یہ بڑا کرناک اور اذیت ناک احساس تھا۔ کاش میں اس بات سے انجان رہتا کہ میرے بیٹے جانکاد حاصل کرنے کے لیے میری موت کے خواہاں ہیں۔ ان سے اب مزید صبر نہیں ہو رہا۔ انہیں یہ بات بھی سخت ناگوار گزری ہے کہ ان کے باپ نے ایک ٹرسٹ کو پچاس ہزار ڈالر دے دیے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے مجھ سے بات کرنے کے لیے میری بیٹی جیکو لین کو بھی بلایا ہے۔ بہر حال جیکو لین آئی اور میں نے کھانے کی میز پر تم تینوں کو صاف صاف بتا



موت سے پہلے

منظر امام

محبت میں اکثر ناکام عاشق اپنی جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ وہ جو لمحے لمحے سے خوشی کشید کرنا چاہتا تھا، مقدر نے اتنا ہی اسے اندھیروں میں دھکیل دیا۔۔۔ اور جب زندگی کی واحد خوشی نے بھی منہ موڑ لیا تو اس کے پاس جینے کا کوئی جواز نہیں رہا۔

قدم قدم پر ٹھوکر کھانے والے ایک مجبور و بے بس عاشق کا اجرا

زندگی اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔
لیکن اب اسے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔
اسے مرنا تھا۔ موت جو تمام غموں سے نجات دلا دیتی ہے۔
انسان سکھ اور بے کسی کی چار اوڑھ کر سو جاتا ہے۔ کوئی اس کو پریشان کرنے والا نہیں ہوتا۔ وفا اور بے وفا کی کا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ دنیا میں چاہے کچھ بھی ہوتا رہے، اسے کوئی پروا نہیں ہوتی۔
اس نے سنا تھا کہ انکیشن میں ایک پارٹی نے دھاندلی کی ہے۔ دوسری پارٹیاں اس کے خلاف انکیشن لے رہی ہیں۔ دوسری طرف دنیا میں ایشی جنگ کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے لیکن۔۔۔ سب اندھے بیٹے زندہ لوگوں کے ہوتے ہیں۔ موت کے بعد کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔

کے بعد میں نے تم تینوں کے لیے ایک انوکھی سزا سوچ لی۔ سزائے انتظار۔۔۔ یعنی انتظار کی سزا۔ تم تینوں سے چند ماہ کا صبر نہیں ہو رہا تھا۔ پیٹر اور جاسن فوری طور پر میری موت کے خواہاں تھے۔ جیکو لیکن بھی یہی خواہش رکھتی تھی کیونکہ اسے اپنا ذاتی کلیک بنانا تھا مگر اب میرے مرنے کے بعد بھی تمہارا انتظار ختم نہیں ہوگا کیونکہ میں نے اپنی وصیت میں تمہارے اس انتظار کو بہت طویل کر دیا ہے۔ میری آدھی جائیداد ٹرسٹ کو ملے گی اور میری موت کے فوراً بعد ملے گی مگر میری باقی آدھی جائیداد میری اولاد کو اپنے باپ کی موت کے تیس برس بعد ملے گی۔ تم تینوں میں جس تک اس گھر میں بھی دخل نہیں ہو سکو گے۔ جاسن اور پیٹر کو اس گھر سے صرف اپنے پڑے لے جانے کی اجازت ہوگی۔ میرے تمام ملازمین جن کا انچارج میرا خاص اور بااعتماد ملازم ڈیوڈ ہے، اس گھر کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہوگا۔ ملازمین کو تیس سال کی ایڈوانس تنخواہ دی جا چکی ہے۔

”وصیت کے ساتھ میری ذہنی صحت کا ایک سرٹیفکیٹ بھی منسلک کیا گیا ہے۔ اس لیے مجھے باطل قرار دے کر تم تینوں اس وصیت کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کر سکو گے۔ تم تینوں سے تھوڑا سا صبر نہیں ہو رہا تھا۔ اب تمہیں تیس برس تک صبر کرنا ہوگا۔ جیکو لیکن کو ذاتی کلیک بنانے کا خواب تیس برس تک ملتوی کرنا ہوگا۔ پیٹر اور جاسن کو تیس برس تک اپنے غم بولتے پر جینا ہوگا کیونکہ مقررہ وقت سے پہلے انہیں جائیداد میں سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ ان دونوں کو اپنی رہائش کا انتظام بھی خود کرنا ہوگا۔

”میرے دکھاء کی ٹیم کے سینئر وکیل مسٹر مورس اب میری وصیت پر عمل درآمد کروائیں گے اور اس سلسلے میں وہ پولیس کا تعاون حاصل کرنے کا بھی حق رکھتے ہیں۔ اس لیے اگر پیٹر اور جاسن نے کوئی پرتشدد مزاحمت کی تو انہیں جیل بھی جانا پڑ سکتا ہے۔ ویسے وہ دونوں خاصے بزدل واقع ہوئے ہیں۔ اس لیے پرتشدد مزاحمت کے چانس خاصے کم ہیں۔ سزائے انتظار۔۔۔ ایک شکست خوردہ اور زخم خوردہ باپ کی طرف سے اپنی خود غرض اولاد کو دی جانے والی سزا کا نام ہے۔ اب تم ایک ایک دن گن کر تیس برس پورا ہونے کا انتظار کرو گے۔ اگر تم نے میرا خط پڑھ لیا ہے تو پھر اپنی خود غرضی کا خمیازہ جھٹکنے کے لیے تیار ہو جاؤ کیونکہ تمہاری سزائے انتظار کا آغاز ہو گیا ہے۔ تمہارا ابد نصیب باپ۔۔۔ ہارڈ۔“

دیا کہ میں اپنی آدھی دولت ایک ٹرسٹ کو دے رہا ہوں۔ یہ کہہ کر میں اپنے کمرے میں چلا گیا اور پھر میں نے تم تینوں کی وہ گفتگو سنی جو تم نے کمرے میں جا کر کی تھی۔
”یہ سن کر رو جتنے کھڑے ہو گئے کہ جیکو لیکن نے اپنے بھائیوں کو مجھے راستے سے ہٹانے کا مشورہ دیا۔ اگر میں نے جیکو لیکن کو اسکرین پر اپنی آنکھوں سے یہ بات پیٹر اور جاسن سے کہتے نہ سنا ہوتا تو شاید میں بھی یقین نہ کرتا کہ میری بڑی لکھی ہوئی اپنی گھٹیا اور خرابی سوچ کی مالک ہو سکتی ہے مگر مجھے یقین کرنا پڑا۔ اب کانوں سے سنا اور آنکھوں سے دیکھا تو غلط نہیں ہو سکتا۔۔۔

”میرے دونوں بھتیجیوں نے تو کیا ہی کہنے۔ انہوں نے آپس میں گفتگو و شدید کرنے کے بعد جیکو لیکن کی تجویز رد کر دی مگر اس لیے نہیں کہ ان کے دل میں اپنے باپ کے لیے عزت یا احترام کا کوئی جذبہ موجود تھا بلکہ انہوں نے یہ تجویز اس لیے رد کر دی کہ انہیں پڑے جانے کا خوف تھا۔ میرے دونوں بیٹے بچپن سے ہی خاصے بزدل واقع ہوئے ہیں۔

”اپنی تجویز رد ہونے کے بعد اگلے دن جیکو لیکن واپس چلی گئی اور پھر جب تم دونوں اپنے معمول کے مطابق آوارہ گردی کرنے نکلے تو میں نے بھی اپنے ملازم کے ذریعے تمہارے۔۔۔ کمرے سے وہ کبیرا اتار دیا کیونکہ مجھے اب مزید کچھ جاننے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے سامنے میری اولاد کے اصل چہرے ظاہر ہو چکے تھے۔

”اپنی اولاد کے چہرے بے نقاب ہونے کے بعد میرے اندر بچنے کی تمنا ختم ہوئی۔ میں حسرت و یاس کی ایک تصویر بن کر رہ گیا۔ میں نے سنا تھا کہ ہمارے معاشرے میں دولت حاصل کرنے کی دوڑ نے رشتوں کا تقدس پامال کر دیا ہے۔ اپنی اولاد کی صورت میں، میں اس کا عملی نمونہ بھی دیکھ چکا تھا۔

”میں نے اس کیمرے کی تمام ریکارڈنگ ضائع کر دی۔ اس لیے نہیں کہ مجھے اپنی اولاد سے کوئی ہمدردی تھی بلکہ اس لیے کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس ویڈیو ریکارڈنگ کو کوئی دوسرا دیکھے اور کہے کہ مسٹر ہارڈ کی اولاد اتنی گھٹیا اور خود غرض ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ ساتھ میری تربیت پر بھی انکی انکیشن۔

”بہر حال اس وقت میں نے بھی ایک فیصلہ کیا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ تم تینوں کو کوئی ایسی سزا دوں کہ تمہیں زندگی بھر اپنی خود غرضی اور گھٹیا پن کا احساس ہوتا رہے۔ چاہتا تو تم تینوں کو اپنی جائیداد سے عاقق کر دیتا مگر مجھے لگا کہ یہ تمہارے لیے مناسب سزا نہ ہوگی اور پھر بڑی سوچ بچار

سنہری اصول

☆ جو باتیں تم لوگوں کے سامنے نہیں کر سکتے، ان کی پیٹھ پیچھے بھی مت کرو۔

☆ زندگی کی راہوں میں اس طرح پھول بکھیرو کہ جب پیچھے مڑ کر دیکھو تو گلستان نظر آئے۔

☆ احسان کا بدلہ ادا نہ کر سکو تو زبان سے شکریہ ضرور ادا کرو۔

☆ اپنے زخم ایسے لوگوں کو مت دکھاؤ جن کے پاس مرہم نہ ہو۔

☆ حکمت کے سمندر میں وہ لمحہ تلاش کرو جو تمہیں سب سے ممتاز بنادے۔

☆ جو کچھ مانگتا ہے، اپنے رب سے مانگ۔ جو واپسی کا تقاضہ نہیں کرتا۔

☆ شمع بن کر بزمِ ہستی میں زندگی بسر کرو تاکہ دوسرے بھی منورہ سکیں۔

☆ جس آدمی کے پاس کتاب ہو۔ وہ تنہا نہیں رہتا۔

مرسلہ۔ ریاضِ بٹ، حسن ابدال

سفر کرتی رہوں۔“

”بالکل، بالکل ایسی ہی سوچ میری بھی ہے۔ میں اسی لیے اس پارک میں آتا ہوں کہ یہاں پارک کی دلکشی بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے اور ریل کی آوازیں بھی کسی انجانی منزل کی طرف بلاتی ہیں۔“

”چلو۔ منزل انجانی سہی لیکن ہمیں ایک عہد ضرور کر لینا چاہیے۔“ نورین نے کہا۔

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ زندگی کا سفر چاہے جیسا بھی ہو ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ دینا ہے۔“

حمید یہ سن کر سرشار ہو گیا تھا۔ کل کا بد قسمت انسان آج کا خوش نصیب ترین انسان بن گیا تھا۔ نورین جیسی لڑکی نے اس انداز سے الفت کا اظہار کیا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اس کے ساتھ محرومیوں کا چکر شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے دفتر سے اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اس کے پاس نے اس سے کہا تھا۔ ”مسٹر حمید بھیرا خیال تھا کہ میں تمہیں ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بنا دوں گا لیکن اب

ہے۔ یہ ہمارا اصول ہے۔“ اس طرح کی زندگی تھی اس کی۔ کوئی خوشی نہیں کوئی امید نہیں۔ ہر طرف مایوسی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایسے میں اس کی ملاقات نورین سے ہو گئی۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی جس نے حمید سے محبت کی۔ اس کو اپنانے کا اظہار کیا۔

حمید نے بتایا اسے زندگی میں سوائے محرومیوں کے اور کچھ بھی نہیں ملا۔

نورین مسکرا دی۔ بہت ہی امید افزا مسکراہٹ تھی اس کی۔ ”تو کیا ہوا۔ کیا تم زندگی کی دوڑ سے تھک کر بیٹھ جانا چاہتے ہو؟“

”بیٹھ جانا چاہتا تھا لیکن اب نہیں۔“

”وہ کیوں؟“

”اس لیے کہ اب تم مل گئی ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”مجھے جینے کا ایک نیا حوصلہ مل گیا ہے۔ اب میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی پوری توانائی کے ساتھ۔“

”یہ بات ہوئی نا۔“ نورین چمک اٹھی۔ ”اسے کہتے ہیں مردانگی۔ پتا نہیں لوگ ہر ایسے سوچ پر مردانگی کیوں کہتے ہیں۔ یا عورت میں بھی تو ہوتی ہے۔ حوصلہ ہوتا ہے تو مردانگی کی ضد میں اسے عورتانگی کیوں نہیں کہتے؟“

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔ خیر میں اس پر احتجاج کروں گا۔ تم اطمینان رکھو۔“

اس دن دونوں کے موڈ بہت خوشگوار تھے۔ خاص طور پر حمید بہت خوش تھا۔ اس قسم کی کوئی خوشی اسے پہلی بار ملی تھی۔

اس کے بعد اس کے حالات میں بہتری آتی شروع ہو گئی۔ وہ جس دفتر میں کام کرنے لگا تھا، اس کے پاس نے یہ عنایت دیا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد اسے ہیڈ بنا دیا جائے گا۔ کسی نے کہا تھا کہ اگر انسان کو محبت حاصل ہو جائے اور یہ محبت خالص ہو تو اس پر برکتیں نازل ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ قدرت اس کی مدد کرنے لگتی ہے۔ شاید اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہونے والا تھا۔

اسے نورین کی محبت بھی حاصل ہو گئی تھی اور اس کے لیے امکانات بھی پیدا ہونے لگے تھے۔

وہ اپنی دنیا کی جنت بنانے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ دونوں شام کا وقت اسی پارک میں گزارا کرتے۔ نورین کو ریل گاڑی کی سیٹی بہت پسند تھی۔ وہ کہا کرتی۔ ”یہ جو ریل ہوتی ہے، یہ انسان کو زندگی کے سفر کی یاد دہانی کرائی دیتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں زندگی بھر کسی ریل ہی میں

سیراؤں کرتا رہوں۔ اتنی تنخواہ مل جاتی تھی کہ جیسے تیسے گزر بسر ہو جاتی تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اس کی ماں کپڑے بھی سیا کرتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں یہ ہنر تھا جو اس وقت کام آ رہا تھا۔

اس کے باپ نے حمید کو ایک اسکول میں داخل کر دیا تھا۔

وہ ایک ذہین طالب علم ثابت ہوا تھا۔ دونوں میاں بیوی اپنے بیٹے کی کامیابیاں دیکھ دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔ نہ جانے کیسے خواب ان کی آنکھوں میں ہوں گے۔ خواہشوں کا یہی حال ہوا کرتا تھا اور جب یہ خواب بکھر جائیں تو ایک ایسے کرب کی کیفیت ہو جاتی ہے جس کا بیان ناممکن ہوتا ہے۔

اس نے میٹرک کیا۔ آگے بڑھتا رہا، ماسٹر تک کر لیا لیکن اس کے لیے خواب دیکھنے والے ہی نہیں رہے۔ اس کے والدین ایک حادثے میں انتقال کر گئے۔ وہ زخمی ہو کر اپنے چاچا کے گھر آ گیا۔

چاچا اسے اپنے گھر میں زیادہ عرصہ نہیں رکھ سکے کیونکہ حمید نے ان کی بیٹی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ شروع ہی سے انتہائی بدتمیز اور پھوہڑا لڑکی تھی۔ حمید کے ماں باپ بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اس کو اپنی بیوی بنا کر ان کی روحوں کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسی لیے اسے اس گھر سے لکھنا پڑا جبکہ اس لڑکی کو بھی اس کی کوئی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی۔

حمید اپنے چاچا کے گھر سے کچھ دنوں کے لیے اپنے ایک دوست کے پاس آ گیا۔ یہ قیمت تھا کہ اس کی جاب ملے ہوئی تھی۔ ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔

اس نے کچھ دنوں کے بعد ایک چھوٹا سا قلیت کرائے پر لے لیا۔ یہ بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

وہ جہاں بھی جاتا، اس سے دریافت کیا جاتا۔ ”بھائی آپ کی فیملی کتنی ہے؟“

”نہیں بھائی، میری کوئی فیملی نہیں ہے۔“ جب وہ جواب دیتا تو لوگ بدک جاتے۔

”نہیں بھائی، ہم کسی ایسے کو قلیت نہیں دے سکتے جس کی کوئی فیملی نہ ہو۔“

”اگر کسی کے ماں باپ مر چکے ہوں، اس کا کوئی نہ ہو تو کیا اس کے لیے اس معاشرے میں کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا؟ کیا وہ سڑکوں پر ہا کرے؟ کیا کرے؟“

”بھائی، جذباتی یا ناراض ہونے کی ضرورت نہیں

اس کے سامنے کئی بچے کھیل رہے تھے۔ یہ بچے زندگی سے بھرپور تھے۔ ان کے شور سے پورا پارک گونج رہا تھا۔ وہ پارک ایک ایسے جگہ کے قریب تھا جس کے بچے سے ریلوے لائن گزرتی تھی۔ حمید نے اپنی موت کے لیے جو طریقہ سوچا تھا وہ بہت آسان تھا۔ اسے ریل کے اوپر جا کر کھڑے ہو جانا تھا اور آنے والی ریل کو دیکھتے رہنا تھا۔

ریل جیسے ہی قریب آتی وہ ریل سے چھلانگ لگا دیتا۔ دیوید ریل اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرتی ہوئی گزر جاتی۔ کہاں ہی ختم۔ نہ کوئی اچھٹ نہ کوئی پریشانی۔ نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا۔

ایک لڑکے کی بال اس کے پاس آ کر رک گئی۔ اس نے بال اٹھا لی۔ وہ لڑکا بھی دوڑتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔ ”انگل یہ بال میری ہے۔“ اس نے کہا۔

”اچھا۔“ حمید مسکرایا۔ اتنی دیر کے بعد وہ مسکرایا تھا۔ اس نے بال واپس کر دی۔ وہ لڑکا اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا۔

اس نے وقت دیکھا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔

یادوں نے اس پر حملہ کر رکھا تھا۔ جیسے شدید کھیاں اپنے چہرے سے ایک ساتھ نکل پڑی ہوں۔ کیسی کیسی یادیں..... بچپن کی..... اسکول کی، اس زمانے کے دوستوں کی..... اس زمانے کے مزیدار کھیلوں کی، آپس کے چھوٹے موٹے جھگڑوں کی..... اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ جب انسان کا آخری وقت قریب آتا ہے تو دنیا بھر کی یادیں اس کو گھیر لیتی ہیں۔

دھندلے موت کے لئے کرجب افتاد آتے ہیں مجھے بھولے ہوئے لوگوں کے چہرے یاد آتے ہیں ایسا ہی اس وقت ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی میں کامیابی تو بہت تھی۔ ناکامی ہی ناکامی تھی۔ سخت محنت اور کوشش کے باوجود وہ زندگی کے کسی لحاظ پر کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ نہ جانے کچھ لوگوں کی نقد پر ایسی کیوں ہوتی ہے؟

اس کے والدین ایک ساتھ ایک حادثے میں انتقال کر گئے تھے۔ زندہ رہ جانے والا صرف وہ تھا۔ زخمی تو وہ بھی ہوا تھا لیکن اس کو موت نہیں آئی تھی۔ وہ اسپتال سے اپنے چاچا کے گھر آ گیا تھا، کیونکہ وہی اب بڑے تھے۔

اس کے باپ کے پاس جائیداد نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اپنا گھر تک نہیں تھا۔ یہ لوگ کرائے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتے تھے۔ اس کا باپ ایک ٹیکسری میں

416

چار و ناچار

ملک صفدر حیات

اقتدار کی ہوس چاہے کسی بھی سطح پر ہو ہمیشہ غلط سمت میں سفر کرتی ہے اور اپنے راستے کی تمام رکاوٹیں پیروں تلے روندتی ہوئی انتہائی سفاکی سے آگے بڑھتی ہے... یہ ہوس جس کے دل میں بھی گھر کر جائے اور اسے اگر اپنے سگے بہن بھائی بھی بوجہ محسوس ہونے لگیں تو ان کے خون سے بھی ہاتھ رنگنے میں وہ دیر نہیں کرتا... اب یہ اور بات کہ اس غلطی کا احساس اسے تمام عمر خون کے آنسو رلانے مگر وقت نکل جانے کے بعد ایسی غلطیوں کی تلافی بھی ممکن نہیں ہوتی... سوائے پچھتانے کے کچھ نہیں بچتا... لیکن پچھاوٹوں کے باوجود مجرموں کے لیے وقف سزا اس کی منتظر رہتی ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی فرار حاصل کرنا چاہے مگر ملک صفدر جیسے قانون کے محافظ اسے اس کے انجام تک ضرور پہنچاتے ہیں۔

ملک صاحب کی کنیت کے پیچھے انداز اور مجرموں کا عبرت ناک انجام

اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ”میں وڈے رانا صاحب، رانا مظفر کا چھوٹا بیٹا ہوں جی۔“ پھر اس نے لاچار شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”اس ذلیل انسان نے بڑی گھٹیا حرکت کی ہے تمہارے دار صاحب۔“

میں رانا مظفر سے بھی ملا نہیں تھا، صرف اس کا نام سن رکھا تھا۔ رانا مظفر موضع ظفر پور کا چودھری تھا۔ ظفر پور گاؤں کا نام مظفر کے والد چودھری رانا ظفر کے نام پر رکھا گیا تھا۔ موضع ظفر پور میرے تھانے سے ایک میل کے فاصلے پر شرق میں واقع تھا۔ رانا ریاض کے نام سے تعارف کرانے والے اس نوجوان کی عمر بائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ شکل سے غصہ ور اور بات چیت سے خاصا دکھا لگتا تھا۔ رانا ریاض جس شخص کو زد و کوب کر رہا تھا، اس کا نام

ایک ٹھنڈی ٹھار صبح میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک عجیب و غریب ہنگامہ میرا منتظر تھا۔ میں نے تھانے کے برآمدے میں لگ بھگ نصف درجن افراد کو دیکھا جن میں دو نمایاں تھے۔ ایک انتہائی غریب، مجبور اور مسکین صورت جبکہ دوسرا خوش لباس، صاحب ثروت اور رعب و اب والا تھا۔ طاقتور، کمزور کو دبانے، ڈرانے اور دھمکانے کے لیے لات جوتے سے اس بے چارے کی مرمت کر رہا تھا۔

”یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم لوگوں نے...؟“ میں نے بہ آواز بلند کہا پھر زور آور خوش حال صورت شخص کو گھورنے لگا۔

”میرا نام رانا ریاض ہے جناب۔“ وہ بڑے فخر سے

ہوئے کہا۔ ”شکر ہے!“

اصل میں، صغریٰ بی بی کی لاش کی بے حرمتی کے حوالے سے میں جس خطرناک بلکہ شرمناک زاویے پر سوچ رہا تھا، ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ مجھے شکر ادا کرتے سن کر رانا ریاض نے شکایتی نظر سے مجھے دیکھا اور اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ملک صاحب! کیا آپ اس واقعے کو بہت معمولی سمجھ رہے ہیں؟“

”نہیں ریاض، ایسی کوئی بات نہیں۔“ میں نے اس کی تضحیک کے لیے جلدی سے وضاحت کر دی۔ ”میری نظر میں یہ ایک انتہائی افسوسناک اور ناقابلِ مذمت واقعہ ہے۔ خیر، تم مجھے بتاؤ کہ اس کے بعد کیا ہوا؟“

”جناب! میں غصے کے عالم میں سیدھا گورکن کے پاس پہنچا۔“ وہ اپنی کارگزاری سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ”یہ ذلیل انسان بڑے مزے سے سو رہا تھا۔ میں نے لائیں مار کر اسے جگایا اور اس واقعے کے بارے میں پوچھتا چھ کی۔ اس نے اپنی مکمل لاعلمی ظاہر کر دی لیکن تھانے دار صاحب! مجھے اس نمک حرام کی بات کا یقین نہیں ہے۔“

”تمہارے خیال میں اس واقعے کا ذمہ دار گورکن صدور ہے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جناب! یہ تو دور دو چار کی طرح بالکل سیدھی بات ہے۔“ وہ خشکی آمیز لہجے میں بولا۔ ”گورکن قبرستان کے اندر ہونے والی ہر سرگرمی سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ پتا ہی نہ ہو۔ میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ امی جی کی لاش کے ساتھ جو مذموم کارروائی کی گئی ہے، وہ یا تو صدور کی حرکت ہے اور یا پھر یہ جانتا ہے کہ یہ کام کس کا ہے۔“

”منطقی طور پر دیکھا جائے تو رانا ریاض کی بات وزن سے خالی نہیں تھی، تکنیکی زبان میں وہ متاثرہ پارٹی تھی لہذا میں نے اس کے ”وثوق“ کی تصدیق کا کوئی ثبوت نہیں مانگا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”رانا ریاض! تم اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ میں معاملے کی تین تین جگہ کی کوشش کرتا ہوں۔ جس کسی نے بھی صغریٰ بی بی کی لاش کے ساتھ یہ مذاق کیا ہے وہ میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکے گا۔“

اپنی ہی دھن میں بول چلا گیا۔

”امی جی کو دفنانے کے بعد میں نے ایک بندے کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ پورے چالیس دن تک امی جی کی قبر پر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔“ وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے جس بندے کو اس کام پر مامور کیا، وہ بڑا نیک اور پرہیزگار ہے۔ وہ مسجد میں فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد سیدھا قبرستان جاتا اور امی جی کی قبر کے پہلو میں بیٹھ کر قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔“

وہ سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے اسے ٹوکنا مناسب نہ جانا، البتہ میں اس سوچ میں ضرور ڈوبا رہا کہ انسان کیسا عجیب و غریب جاندار ہے۔ یہ ہر معاملے میں اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ رانا ریاض کا فرض بنتا تھا کہ وہ اپنی ماں صغریٰ بی بی کی بخشش کے لیے خود کچھ پڑھے پڑھاے۔ اگر وہ قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا تو کم از کم اپنی والدہ کے لیے دعائے خیر تو کر سکتا تھا لیکن اس نے شارٹ کٹ تلاش کر لیا تھا۔ ایک نیک آدمی کو اس کام پر لگا کر وہ بری الذمہ ہو گیا تھا۔

”آج صبح جب وہ بندہ امی جی کی قبر پر پڑھائی کرنے گیا تو اس نے وہاں ایک عجیب منظر دیکھا۔“ رانا ریاض نے بتایا۔ ”کسی منحوس شخص نے امی جی کی قبر کو کھول کر ان کی لاش کو باہر نکال لیا تھا۔ امی جی کی لاش قبر کے پہلو میں مٹی کے اوپر پڑی تھی۔ مجھے جیسے ہی اس واقعے کی اطلاع ملی، میں فوراً قبرستان پہنچ گیا۔ میں نے.....“

”کیا صغریٰ کی لاش کفن کے اندر ہی پھنی ہوئی تھی یا.....؟“ میں نے قطع کلائی کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

”جی..... ویسے تو امی جی کی لاش کفن کے اندر ہی پھنی ہوئی تھی لیکن.....“ اس نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”لیکن چہرے کی طرف سے کفن کی گرہیں کھلی ہوئی تھیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے ان کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی ہو۔“

میں نے اپنی تسلی کی خاطر تصدیقی لہجے میں پوچھا۔ ”بس، تمہاری امی جی کے کفن کو چہرے کی جانب سے کھولا گیا تھا۔ اس کے علاوہ لاش کے ساتھ اور کسی قسم کی چیز چھڑا تو نہیں کی گئی؟“

”نہیں جناب.....!“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”جو میں نے بتایا، بس اتنا ہی۔“

میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے

میں نے ایک کانٹیل کو بلا کر حکیمانہ انداز میں کہا۔ ”رانا صاحب! اور صدور کے سوا باقی تمام افراد کو برآمدے سے باہر نکال دو۔“

کانٹیل نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ ان میں زیادہ تر افراد رانا ریاض کے حاشیہ بردار تھے۔ جب برآمدے میں صرف رانا ریاض اور صدور رہ گئے تو میں نے رانا ریاض سے کہا۔

”تم انصاف کی امید لے کر میرے پاس پہنچے ہونا تو اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔ تمہارے ساتھ انصاف کیا جائے گا لیکن دونوں فریقین کو فرداً فرداً سننے کے بعد۔ پہلے تم میرے کمرے میں آؤ اور اپنی گفتگو سنو۔“

اتنا کہہ کر میں پلٹا پھر گورکن سے کہا۔ ”صدور! جب رانا صاحب میرے کمرے سے نکل جائیں پھر تم میرے پاس چلے آنا۔“

تھوڑی دیر کے بعد میں اور رانا ریاض روبرو بیٹھے تھے۔ ایک کانٹیل نے گرما گرم چائے کے دو کپ لا کر ہمارے سامنے سجادیے۔ میں نے چھوٹے رانا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”چائے نوش کرو اور مجھے کھل کر بتاؤ، ایسا کون سا واقعہ پیش آ گیا ہے جس نے تمہارا پاراسائوس آسمان تک پہنچا دیا ہے؟“

رانا ریاض نے اپنی گفتگو میں ”امی کی لاش کی بے حرمتی“ اور ”امی کی لاش کے ساتھ حرکت“ کے الفاظ استعمال کیے تھے جس سے میرا ذہن ایک خاص نوعیت کے مجرمانہ فعل کی طرف جا رہا تھا۔ یہ بات میرے علم میں تھی کہ رانا منظر کی اہلیہ یعنی رانا ریاض کی امی جی کا چند روز پہلے انتقال ہوا تھا۔ میں اپنی پیشہ ورانہ مصروفیت کے باعث اس فحشی میں جا نہیں سکتا تھا۔ اس تھانے میں میری تقریر کو ابھی دو ماہ ہوئے تھے۔ ابھی تک رانا منظر سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی تاہم مجھے پتا چلا تھا کہ وہ ایک معقول اور بھلا مانس چودھری تھا۔

”ملک صاحب! رانا ریاض نے کہا شروع کیا۔“ آپ کو پتا ہے نا، ابھی تین دن پہلے امی جی فوت ہوئی تھیں.....؟“

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مگر مجھے افسوس ہے کہ محکمہ جاتی مصروفیات کی بنا پر میں صغریٰ بی بی کی تدفین میں شرکت نہیں کر سکا تھا۔“

اس نے میرے اظہارِ افسوس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور

صدور و معلوم ہوا۔ صدور کی عمر پچاس سے تجاوز تھی۔ وہ موضع نظر پور کا گورکن تھا۔

میں نے بڑے تحمل سے رانا ریاض کی بات سنی پھر گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔ ”اس بے چارے سے ایسی کیا خطا ہوئی جو تم اسے بری طرح پیٹ رہے ہو؟“

”تھانے دار صاحب! اس بدبخت نے امی جی کی لاش کی بے حرمتی کی ہے۔“ رانا ریاض غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔

”رحم سرکار!“ صدور و دونوں ہاتھ جوڑ کر ملتے جلتے لہجے میں بولا۔ ”میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں جی۔“

رانا صاحب خواہ مخواہ مجھ پر خشک کر رہے ہیں۔ ”اوئے خواہ مخواہ کی ناچاز اولاد۔“ رانا ریاض، صدور کو کھانچ مارنے کے لیے آگے بڑھا۔

میں نے اس کا بازو پکڑ لیا پھر ایک جھکا دے کر خشکی آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”رانا ریاض! کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس وقت تم کہاں کھڑے ہو؟“

”جی.....“ میرے سوال پر اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ”یہ تھانہ ہے جناب۔“

”ہوں.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اس تھانے کا انچارج کون ہے۔ میرا مطلب ہے، یہاں کا تھانے دار کون ہے؟“

”ظاہر ہے جی.....“ وہ یہ دستوراً الجھن بھرے انداز میں بولا۔ ”تھانے دار آپ ہیں۔ ملک صفدر حیات صاحب۔“

”شاباش!“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر بڑی رसान سے کہا۔ ”برخوردار! میں تمہارے ابا جی رانا منظر کی بڑی عزت کرتا ہوں اس لیے تم سے زری کے ساتھ پیش آ رہا ہوں ورنہ تمہاری جگہ اور کوئی ہوتا اور اس انداز میں میرے تھانے میں آکر شور شرابا کر رہا ہوتا تو میں پہلی فرصت میں اسے حوالات میں بند کر چکا ہوتا اس لیے.....“

میں نے لحاظی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”اس تھانے کے اندر تم مجھے ہی تھانے داری کرنے دو تو یہ تمہارے حق میں سودمند ثابت ہوگا۔“

”ملک صاحب! آپ کو بالکل اندازہ نہیں کہ اس کہنے نے امی جی کی لاش کے ساتھ کیا حرکت کی ہے۔“ وہ خوشنوار نظر سے صدور کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو شکر کریں کہ یہ ابھی تک زندہ نظر آ رہا ہے ورنہ میرا دل تو بھی کھہر رہا ہے کہ اس بد ذات کے کٹورے کے چیل کو کھلا دوں۔“

زودہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہوسکا ہے، اچانک قبرستان کی طرف سے کسی کا گزر ہوا ہوا اور پکڑے جانے کے خوف سے بدری اپنا کام ادھورا چھوڑ کر بھاگ گیا ہو۔“

صدر کی بات میں اچھا خاصہ وزن تھا۔ رانا ریاض نے مجھے بتایا تھا کہ صفائی کا کفن چہرے کی طرف سے کھلا ہوا تھا۔ اگر صدر کی سوچ کو درست مان لیا جاتا تو بادی انظر میں یہی سمجھ میں آتا تھا کہ بدری کفن چہرے یا کفن کی چوری کی نیت سے صفائی بی بی کی قبر کھولنے والا کوئی شخص کسی ہنگامی صورت حال میں اپنا کام نامکمل چھوڑ کر قبرستان سے نکل گیا تھا۔

”چاچا! اس قبرستان میں کب سے کام کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”سرکار! میں تو پیدا ہی اسی قبرستان میں ہوا ہوں۔“ اس نے عاجزی بھرے انداز میں بتایا۔ ”مجھ سے پہلے میرا باپ قمر الدین عرف قمر داس قبرستان کا گورکن ہوا کرتا تھا۔ میرے ماں باپ کی لاشیں بھی اسی قبرستان میں دفن ہیں۔ آج تک ظفر پور کے کسی دستیک کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ پتا نہیں، چھوٹے رانا صاحب کو اچانک مجھ سے کیا دشمنی ہوئی ہے۔“

بات کے اختتام پر وہ آبدیدہ ہو گیا۔ میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ”کیا تم نے بدری کفن چور کا ذکر رانا ریاض کے سامنے کیا تھا؟“

”نہیں جناب۔۔۔۔۔“ وہ لٹی میں گردن جھکتے ہوئے بولا۔ ”رانا صاحب نے تو آتے ہی مجھ پر چڑھا کر دی تھی۔ مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ اس بری طرح مجھے پیٹ رہے تھے کہ میری تومت ہی ماری گئی تھی۔ بدری کا نام بھولے بیٹھے سے بھی میرے دماغ میں نہیں آیا۔“

”چاچا! غور سے میری بات سنو۔“ میں نے بے حد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ ایک سپاہی کو بھیج رہا ہوں۔ تم دونوں یہاں سے سیدھے صورت گرجاؤ گے اور شام سے پہلے بدری کفن چور کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آؤ گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔۔۔۔۔؟“

میرے تھانے سے موضع ظفر پور ایک میل کی دوری پر مشرق میں واقع تھا اور صورت گرجا نامی گاؤں تھانے سے جنوب مشرق میں لگ بھگ چھ میل کے فاصلے پر واقع تھا جبکہ ظفر پور اور صورت گرجا میں چار میل کا فاصلہ حائل تھا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ لوگ ظفر پور کوچے کے بغیر صورت گرجا میں اور شام سے پہلے بدری کو گرفتار کر کے تھانے لے آئیں۔

”جی، بالکل سمجھ گیا۔“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے

نازک لمحات میں وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے رہا تھا۔ اگر وہ بہت اچھا اداکار نہیں تھا تو پھر وہ واقعتاً صفائی کی قبر کے ساتھ پیش آنے والے واقعے سے بے خبر تھا۔

”فرض کر لو کہ میں نے تمہاری بات کا یقین کر لیا۔“ میں نے صدر کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جلدی سے میرا دوسرا کام بھی کر دو۔۔۔۔۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”آپ کے دوسرے کام کے بارے میں، میں حتی طور پر تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن۔۔۔۔۔“

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے تیز آواز میں سوال کیا۔ ”لیکن کیا چاہا۔۔۔۔۔؟“

”وہ جی۔۔۔۔۔ مجھے ایک بندے پر شک ہے۔“ وہ جربز ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرا دھیان بار بار اسی کی طرف جا رہا ہے۔“

میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تم کس بندے کی بات کر رہے ہو؟“

”بدری۔۔۔۔۔!“ اس نے جواب دیا۔

”اس بدری کا حدود اربعہ بیان کرو۔“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ”اور یہ بھی بتاؤ، یہ بندہ رہتا کہاں ہے؟“

میرے استفسار کے جواب میں گورکن صدر نے جو تفصیل بتائی، اس کے مطابق بدر الدین عرف بدری نامی وہ شخص موضع صورت گرجا کے رہنے والا تھا۔ پورے علاقے میں بدری کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ وہ تک کر کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ دو چار بار وہ مردوں کے کفن چوری کرتے ہوئے بھی پکڑا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ”بدری کفن چور“ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے بیوی بچے نہیں تھے اور نہ ہی کوئی رشتے دار۔ بنیادی طور پر وہ صورت گرجا سے تعلق رکھتا تھا لیکن اکثر و بیشتر وہ صورت گرجا سے باہر دور و نزدیک کے مختلف گاؤں دیہات میں گھومتا پھرتا پایا جاتا تھا۔

اس تفصیل کی روشنی میں اگر موجودہ صورت حال میں گورکن صدر کو دھیان بدری کی طرف گیا تھا تو اس میں الجھنے کی کوئی بات نہیں تھی لیکن ایک بات شروع ہی سے میرے دماغ میں ٹھنک رہی تھی۔ اس پچاس کو نکالنے کے لیے میں نے صدر سے پوچھا۔

”چاچا! اگر صفائی کی قبر کو بدری نے کھولا ہے تو پھر اس نے کفن چوری کیوں نہیں کیا۔ یہ تو اس کے ”پیشہ ورانہ اصول“ کے خلاف ہو گیا نا۔۔۔۔۔؟“

”جناب! یہ بات تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔“ وہ ابھین

ہوں کہ اس معاملے سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ آپ مجھے رانا جی کے غضب سے بچائیں۔۔۔۔۔ آپ کو اللہ کا واسطہ۔“ اس نے میرے جملے میں موجود ”پہ شرط یہ کہ“ کے الفاظ پر توجہ نہیں دی تھی یا تو میرے الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آئے تھے اور یا پھر وہ پریشانی کے سبب اس پر غور نہیں کر پایا تھا۔

”چاچا! میری بات غور سے سنو۔۔۔۔۔ میں نے آگے کو جھکتے ہوئے راز دارانہ انداز میں کہا۔ ”اگر میں چاہوں تو چھوٹا رانا یا اس کا باپ جہیں جہیں نہیں لگائے گا لیکن میں ایسا اس وقت چاہوں گا جب تم میرے دو کام کرنے کا وعدہ کرو گے۔“

”آپ حکم کریں مائی باپ۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔ ”دو کیا، میں آپ کے دوسو کام کرنے کو تیار ہوں۔“

”دوسو نہیں، صرف دو۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”نمبر ایک، مجھے یقین دلاؤ کہ صفائی بی بی کی لاش کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ نمبر دو، یہ جس کسی کی بھی حرکت ہے تم اس بندے تک مجھے پہنچاؤ گے۔“

”تھانے دار صاحب! اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“ وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ”جب سیدہ واقعہ رونما ہوا تو اس وقت میں اپنے کارٹر میں سو رہا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا چھوٹے رانا صاحب نے آتے ہی مجھے مارنا شروع کر دیا۔ وہ صفائی بی بی کی قبر اور لاش کے بارے میں مجھ سے طرح طرح کے سوال کر رہے تھے لیکن میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، ان کو کیا جواب دیتا۔ وہ مجھے مارتے ہوئے تانگے میں ڈال کر تھانے لے آئے اور یہاں بھی آپ کے آنے سے پہلے انہوں نے میرے ساتھ بہت زیادہ مار پیٹ کی ہے۔ ابھی تین دن پہلے تو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے صفائی بی بی کی قبر کھودی تھی۔ دڑے رانا صاحب کی بیوی کی موت کا مجھے سخت دکھ تھا۔ میں بھلا ان کی لاش کی بے حرمتی کیسے کر سکتا ہوں پر۔ چھوٹے رانا صاحب کو میری بات کا اعتبار ہی نہیں آ رہا۔“

بات کے اختتام پر اس نے رحم طلب نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس دوران میں میری نگاہ مسلسل اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھی۔ صدر کی آنکھوں سے جھلکتے تاثرات کو دیکھ کر میں اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا تھا کہ ان

انداز میں کہا۔ ”تم فکر نہیں کرو۔“ میں نے اس کی براہمجھنے خواہش پر تسلی کا مہم رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اس بڑے کا وہ حشر کروں گا کہ اس کا ایک ایک جوڑ بول اٹھے گا۔۔۔۔۔ صفائی بی بی کی قبر کو کس نے کھولا ہے۔“ وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

”ملک صاحب! میرے لیے کیا حکم ہے؟“ ”تم چپ چاپ اپنے گھر جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”تھوڑی دیر میں، میں بھی ظفر پور آ رہا ہوں۔“

”کیا میں امی جی کی لاش کو دوبارہ قبر میں اتار کر قبر کو بند کر دوں؟“

”نہیں!“ میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”جب تک میں وقوعہ کا تفصیلی معائنہ نہ کروں، کسی بھی چیز کو ادھر ادھر نہیں کرنا اور لوگوں کو بھی صفائی بی بی کی قبر سے دور ہی رکھو۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”سمجھ گیا ملک صاحب۔“

”کیا دڑے رانا صاحب گھر پر ہیں؟“ ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا۔

”نہیں جناب! وہ ایک ضروری کام سے آج صبح لاہور گئے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”امید ہے، شام تک واپس آ جائیں گے۔“

”ٹھیک ہے، تم چلو۔“ میں نے کہا۔ ”تھوڑی دیر میں، میں بھی نکلیں رہا ہوں۔“ وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

صدر الدین عرف صدر و چاچا میرے سامنے میز کی دوسری جانب ایک چوبلی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے خوف مترشح تھا۔ میری معلومات کے مطابق صدر کی رہائش قبرستان کے ایک حصے میں تھی جہاں وہ اپنی بیوی شاداں کے ساتھ مستقل قیام پزیر تھا۔ صدر کی شادی کو لگ بھگ پچیس سال ہو گئے تھے لیکن یہ جوڑا ابھی تک اولاد ایسی نعمت سے محروم تھا۔

”آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ میں نے اس کا خوف دور کرنے کی غرض سے کہا۔ ”رانا ریاض یہاں سے جا چکا ہے اور میں بے گناہوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا پہ شرط یہ کہ۔۔۔۔۔ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو اس نے بے تابانی سے کہا۔ ”تھانے دار صاحب! میں رب کی قسم کھا کر کہتا



MARHABA LABORATORIES (PVT.) LTD.

کیونکہ صحت ہے مہمات
مرحباً اسپاگھول



ہوئے بولا۔
”اور جب تک تم بدری کو لے کر نہیں آجاتے، اس مشن کا ذکر کسی سے نہیں کرو گے۔ ٹھیک ہے؟“
”جی، ٹھیک ہے۔ میں آپ کی ہدایت پر عمل کروں گا۔“
صدر روکی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے اسے کانشیل بشارت کے ہمراہ صورت نگر روانہ کر دیا۔
بشارت کو میں نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ ہر قیمت پر بدری کفن چور کو گرفتار کر کے تھانے لانا ہے۔ اس نے مجھے شکم کی تعمیل کا یقین دلایا تھا۔
☆☆☆
جب میرا تھکا موعظ ظفر پور میں داخل ہوا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ سورج اگرچہ آسمان پر موجود تھا تاہم اس کی تمازت میں دم نہیں تھا۔ خشکی خم ٹھونک کر ماحول کی ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے کوشاں دکھائی دیتی تھی۔ یہ ماہ جنوری کا ایک روايتی منج بست دن تھا۔
تھانے سے میں دو افراد کو اپنے ساتھ لایا تھا جن میں سے ایک کا تعلق پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تھا یعنی کانشیل وحید اور دوسرے شخص کا نام تھا فیروز دین عرف بابا فیروزہ۔ بابا فیروزہ پرائیویٹ طور پر پولیس کی مدد کرتا تھا جس کا اسے معاوضہ بصورت انعام دیا جاتا تھا۔ اس کا تعلق سراغ رسانی یعنی کھوج سے تھا۔ عرف عام میں وہ ”کھوجی بابا“ کے نام سے مشہور تھا اور کھراٹکا لے کے شعبے میں وہ مسلح بھر میں بڑا ماہر اور تجربہ کار سمجھا جاتا تھا۔
ہمارا تھکا قبرستان کے قریب پہنچا تو رانا ریاض مجھے دور ہی سے نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی رانا فیاض بھی تھا۔ میری معلومات کے مطابق رانا فیاض شادی شدہ تھا اور اس کے تین بچے بھی تھے جبکہ رانا ریاض ابھی تک بچلری گھوم رہا تھا۔ ریاض کے برعکس فیاض نرم خور اور ٹھنڈے مزاج کا لاکھ تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے مجھ سے ملاوا بولا۔
”دیکھیں نا ملک صاحب! ہماری کتنی بے عزتی ہو رہی ہے۔ کسی نامراد نے ہماری ماں کی قبر کھود کر ہمارا مذاق اڑایا ہے۔“
”مہر رانا صاحب!“ میں نے رانا فیاض کا شانہ چھپتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ”جس بھی بدبخت نے یہ مذموم حرکت کی ہے، میں اس کا حشر نشر کروں گا۔ آپ اپنی آنکھوں سے اس کا عبرت ناک انجام دیکھو گے۔“
”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”میرے کیچے میں تو اسی وقت ٹھنڈ پڑے

سے پہلے مذکورہ کفن چور میرے تھانے کی حوالات میں بند ہوگا پھر میں اپنے مخصوص انداز میں جب اس کفن چور سے کڑی پوچھتا چھ کروں گا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔

”آپ کس کفن چور کا ذکر کر رہے ہیں؟“ وہ متذبذب نظر سے مجھ دیکھتے ہوئے بولا۔

”بدرالدین عرف بدری کفن چور۔“ میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ”فرام موضوع صورت مگر!“

”اوہ، اچھا!“ وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رو گیا۔ ”لیکن.....“ میں نے یہ دستور رانا فیاض کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”بدری میری دوسری ترجیح ہے کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ بدری کی اتنی حیثیت اور اوقات نہیں ہو سکتی کہ وہ آپ کی امی جی کی لاش کے ساتھ

ایسا بھیا تک مذاق کرتا۔ اگر بات کو ”کفن چوری“ تک محدود رکھ کر بدری پرفوس کیا جائے تو ایسا کوئی واقعہ ہے جس میں

نہیں آیا۔ آپ کی امی جی کا کفن جوں کا توں موجود ہے۔“

”ہوں.....“ وہ چند لمحات تک گہری سوچتی ہوئی نظر سے مجھ دیکھتا رہا پھر متغیر ہوا۔ ”اور آپ کی پہلی ترجیح کیا ہے؟“

”دیرینہ دشمنی!“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنا شروع کیا۔ ”میرے خیال میں یہ کسی ایسے شخص کی

حرکت ہے جس کی آپ کے خاندان کے ساتھ کوئی پرانی نسل چلی آ رہی ہو۔ بڑے رانا صاحب اپنے گاؤں کے

چودھری ہونے کے علاوہ ایک معروف سیاسی شخصیت بھی ہیں جنہوں نے اپنے مد مقابل سیاسی حریف کو ہمیشہ شکست

دی ہے۔ اس نوعیت کی مسلسل کامیابی میں جہاں آپ کے دس دوست پیدا ہوتے ہیں، وہاں ایک آدھ دشمن کے وجود

سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا.....“

”ملک صاحب.....!“ میری بات کے اختتام پر وہ اضطرابی لہجے میں بولا۔ ”آپ نے تو میری آنکھیں کھول

دی ہیں۔ اس طرف تو ایک لمحے کے لیے بھی میرا دھیان نہیں گیا تھا۔“

میں سوالیہ نظر سے اسے دیکھنے لگا کیونکہ اس کی کوئی بات بھی میرے پلے نہیں پڑی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”آپ کو پتا ہے، میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟“

”نہیں!“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ”آپ بتائیں، کس حوالے سے میں نے آپ کی آنکھیں کھول دی ہیں؟“

”آپ حکم کریں، بس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔“

”سلسلہ تو یہی افسوس ناک واقعہ ہے جو پچھلی رات کسی وقت قبرستان میں پیش آیا ہے۔“ میں نے اس کے

پہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے خیال میں منتر بی بی کی قبر کو کس نے کھولا ہوگا؟“

”ملک صاحب! اگر مجھے اس بندے کے بارے میں پتا ہوتا تو میں اسے گردن سے پکڑ کر سیدھا آپ کے پاس نہ لے آتا۔“ وہ برہمی سے بولا۔

”گردن سے دیوچ کر بلکہ لات جوتے مارتے ہوئے آپ کا بھائی گورکن صدرو کو میرے پاس لایا تھا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن مجھے یہ کوئی اور ہی معاملہ لگتا ہے رانا صاحب.....!“

”کوئی اور ہی معاملہ!“ اس نے ابھین زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔ ”یہ بات میرے علم میں ہے کہ ریاض

گورکن کو مارتے ہوئے تھانے لے گیا تھا۔ اگر یہ کوئی اور معاملہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ صدرو کا اس واقعے میں

کوئی ہاتھ نہیں ہے؟“

”میں فی الحال ایسا ہی سمجھ رہا ہوں۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ سمجیر لہجے میں بولا۔ ”مجھے بھی سمجھا میں ملک صاحب!“

اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ”کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں کہ صدرو کی آپ

کی حویلی اور اس حویلی کے اندر بسنے والے انسانوں سے کوئی خاندانی دشمنی ہے؟“

”نہیں جناب! ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ایک گورکن کا ہم سے کیا مقابلہ۔“

”میں تو انسان اپنے برابر کے بندے سے کرتا ہے۔ کہاں وہ مسکین گورکن اور کہاں ہم موضع ظفر پور کے چودھری.....“

”آپ ایک دانش مند انسان ہیں رانا صاحب اس لیے آپ فوراً میری بات کی تنبیہ پہنچ گئے ہیں۔“ میں نے

ساتھی نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو یہ واقعہ کسی دیرینہ دشمنی کا شاخسانہ لگتا ہے۔“

وہ چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھ دیکھتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ملک صاحب! یہ کسی کفن چور کی کارستانی بھی تو ہو سکتی ہے۔“

”میں نے کفن کی چوری والے معاملے کو نظر انداز نہیں کیا ہوا رانا صاحب۔“ میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے یہاں آنے سے پہلے ایک ٹیم معروف کفن چور کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دی تھی۔ آج شام

کسٹڈی کی بات کی تھی حالانکہ سچی بات تو یہی تھی کہ اس افسوس ناک واقعے کے حوالے سے مجھے گورکن صدرو پر بالکل شک نہیں تھا۔

میں قبرستان سے نکل کر رانا فیاض کے ہمراہ اس کی حویلی میں آ گیا۔ ایک تو رانا فیاض ضد کر کے مجھے اپنے

ساتھ لے آیا تھا، دوسرے حویلی یا تزار میری خواہش بھی تھی۔ میں رانا مظفر سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا جو

رانا ریاض کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق لاہور گیا ہوا تھا۔ باپ کی غیر موجودگی میں اس کے بیٹے فیاض سے بات

ہو سکتی تھی۔ میں نے رانا فیاض کو رانا ریاض کے برعکس خاصا سمجھ دار اور بردبار پایا تھا۔

موضع ظفر پور ایک بھرا پڑا گاؤں تھا۔ میرے مخاطب انداز کے مطابق وہاں پڑھ بڑھ سو کے قریب مکان آباد

تھے یعنی اس گاؤں کی آبادی تقریباً چھ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ رانا مظفر کی حویلی بھی خاصی وسیع و عریض اور عالیشان تھی۔

رانا فیاض نے مجھے ایک تنگی سجائی بیٹھک میں بٹھایا اور میری خاطر تواضع کے اہتمام میں لگ گیا۔ اس کا اصرار تو یہی تھا

کہ میں حویلی میں بھر پور سچ کروں لیکن میرے مسلسل انکار کے بعد اس نے میری خاطر داری کے لیے ڈھیروں

لوازمات بیٹھک کی تنگ سائز میز پر لگوا دیے۔ ماڈرن زبان میں آپ اس اہتمام کو ”ہائی ٹی“ کہہ سکتے ہیں۔

”بڑے رانا صاحب تو لاہور گئے ہوئے ہیں۔“

خورو نوش کے سلسلے کے سچ میں ہمارے درمیان بات چیت کا عمل بھی جاری تھا۔ ”آپ کے چھوٹے بھائی نے بتایا ہے

کہ بڑے رانا صاحب رات تک وہاں آجائیں گے۔ میں ان سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا۔“

”ملک صاحب! چند ماہ کے بعد انکیشن ہونے والے ہیں اور اباجی تو ہر انکیشن میں حصہ لیتے ہیں۔ اللہ کے فضل

و کرم سے آج تک کوئی انکیشن ہر انکیشن سا۔“ رانا فیاض نے بتایا۔ ”اباجی اسی سلسلے میں لاہور گئے ہیں۔ آج کل بعض

لوگوں سے ان کی اہم میٹنگز چل رہی ہیں۔ امید تو یہی ہے کہ وہ رات تک وہاں آجائیں اور ہو سکتا ہے، آج وہ لاہور

ہی میں رک جائیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھ سے بات کر سکتے ہیں۔“

”میں آپ سے بات کرنے کے خیال ہی سے حویلی آیا ہوں۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری تنبیہ کی

سے کہا۔ ”امید ہے، آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے۔“

میرے ذہن میں یہ تھا کہ یہ کسی ایسے شخص کی حرکت ہے جو رانا مظفر اینڈ کمپنی سے کسی قسم کی غار رکھتا تھا۔ اس شخص نے ان لوگوں کو عزت کرنے کے لیے یہ رانا مارا چاہا تھا۔ اس واقعے کو کسی دیرینہ دشمنی کے کھاتے میں ڈالنے کے بعد میں

کھوجی بابا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”بابا فیروزہ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کانشیل وحید تمہارے ساتھ رہے گا۔ تم اپنا

کام شروع کر دو۔ سب سے پہلے قبر کے اندرونی اور بیرونی حصے کلیئر کرنا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا.....؟“

”جتنی طراں سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بے فکر ہو جائیں۔

میں جانتا ہوں، مجھے اپنا کام کس طرح کرنا ہے۔“

”جب تک دن کی روشنی ہے، تم اپنا کام تندہی سے جاری رکھو گے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اس کے بعد وحید کے ساتھ تم تھانے پہنچو گے۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔“

بابا فیروزہ نے اثبات میں گردن ہلانے پر انکشاف کیا۔

”رانا صاحب!“ میں نے رانا ریاض کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”بابا کھوجی جیسے ہی قبر کے قریب وجوار کو

کلیئر کرے، تم صغریٰ بی بی کی لاش کو قبر میں رکھو اگر قبر کو اچھی طرح بند کر دینا۔“

”ٹھیک ہے جناب۔“ وہ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا۔ ”وہ نامراد صدرو کبیں نظر نہیں آ رہا۔ مردے کو

قبر میں اتارنا اور قبر کو بند کرنا تو اسی کا کام ہے نا.....“

”بے شک! یہ گورکن ہی کا کام ہے لیکن اس وقت مجبوراً یہ کام تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو کرنا ہوگا۔“ میں

نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ صدرو کو تم نے آج صبح تھانے میں بند کر دیا ہے۔ وہ میری حویلی

میں ہے۔ جب تک مجرم ہاتھ نہیں لگ جاتا، میں صدرو کو نہیں چھوڑ سکتا۔“

”جی، میں سمجھ گیا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

آخری بات میں نے رانا ریاض پر دباؤ برقرار رکھنے کے لیے کی تھی۔ فطرتاً اور مزاجاً وہ ایک اداکار اور اتھرا

لو جوان تھا۔ اگر اسے یہ یقین رہتا کہ میں اس کی امی جی کی قبر کھودنے والے بندے کو بڑی شدت سے تلاش کر رہا ہوں تو وہ شائد رہتا اور میں یہی چاہتا تھا کہ رانا ریاض اس وقت تک اپنے دماغ کو بھندارے کہ جب تک میں اس معصے کو حل نہیں کر لیتا۔ اسی مقصد کی خاطر میں نے صدرو کی پولیس

”سیاسی حریف!“ وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ”اس بار سیاسی میدان میں ایک ایسی جدیلی دیکھنے میں آئی ہے جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔“

”میں کچھ بھی نہیں سمجھا رانا صاحب!.....“ میں نے ہر تن گوش رہتے ہوئے کہا۔ ”آپ کھل کر بات کریں۔“

”میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔“ وہ میری جانب جھکتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

آئندہ چندہ منٹ میں رانا فیاض نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ اس طرح سے تھا.....

ہر انکیشن میں رانا مظفر کے مد مقابل موضع کوٹ ضامن کا چودھری لطیف چیمہ ہوا کرتا تھا۔ رانا مظفر نے اسے ہمیشہ شکست دے کر انکیشن میں کامیابی حاصل کی تھی۔ کوٹ ضامن نامی یہ گاؤں ظفر پور سے پانچ میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا یعنی میرے تھانے سے چھ میل کی دوری پر۔ اب کی بار لطیف چیمہ نے رانا مظفر کے دونوں کو تقسیم کرنے کے لیے ایک تیسرے امیدوار کو میدان میں اتار دیا تھا اور اس نو امیدوار کا نام تھا، رانا منور فرام صورت نگر یعنی رانا مظفر کا چھوٹا بھائی۔ گاؤں دیہات کے انتخابات میں برادری سسٹم کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ رانا منور چاہے انکیشن میں کامیابی حاصل کرنا یا نہ کرنا لیکن وہ رانا مظفر کے دو فرزند کو ضرور تقسیم کر دیتا جس کا سب سے بڑا فائدہ لطیف چیمہ کو پہنچتا کیونکہ وہ سدا سو پچاس دونوں کی کمی ہی سے ہارا کرتا تھا۔ اگر رانا منور اس حلقے میں اپنی رانا برادری کے کم از کم سو یا اس سے کچھ زیادہ ووٹ بھی حاصل کر لیتا تو رانا مظفر کے مقابلے میں لطیف چیمہ کا پلہ یقیناً بھاری ہو جاتا تھا۔

”رانا جی!“ میں نے فیاض کی بات پوری توجہ سے سننے کے بعد کہا۔ ”کیا آپ کا چاچا رانا منور اتنی ہی موٹی عقل کا مالک ہے کہ لطیف چیمہ کی سازش اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ وہ آپ کو لوگوں کے خلاف لطیف چیمہ کا ساتھ کیوں دے رہا ہے؟“

”میں آپ کو یہ بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ آج کل ہمارا اور چاچا منور کا شدید اختلاف چل رہا ہے۔“ وہ ایک ٹھنڈی سا سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”پچھلے کچھ عرصے سے دونوں خاندانوں نے ایک دوسرے کا حقہ پانی بند کر رکھا ہے اور اس خطرناک رجس کے دو بنیادی اسباب ہیں.....“ لگاتی توقف کر کے اس نے گہری نظر سے

مجھے دیکھا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”کئی سال پہلے چاچا منور نے اپنے سب سے بڑے بیٹے جواد کا رشتہ میری بڑی بہن کنیز فاطمہ کے لیے مانگا تھا لیکن اباجی نے اس رشتے کے لیے انکار کر دیا تھا اور اس انکار کا سبب امی جی اور کنیز فاطمہ تھیں کیونکہ امی جی اپنے بھائی کے بیٹے سے کنیز کی شادی کرنا چاہتی تھیں اور کنیز بھی ماموں کے اس بیٹے کو پسند کرتی تھی۔ اس رشتے سے انکار کو چاچا منور نے کم اور چاچا شادہ نے زیادہ محسوس کیا تھا بلکہ چاچا شادہ نے تو اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا تھا اور کئی سال بعد اس نے بدلہ بھی لے لیا.....“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیسا بدلہ رانا صاحب؟“

”چند ماہ پہلے اباجی نے ریاض کے لیے چاچا کی سب سے چھوٹی بیٹی نرہت بی بی کا رشتہ مانگا تو صورت ٹمر سے چٹا انکار آیا اور اس انکار کے ساتھ چاچا شادہ کا یہ پیغام بھی ظفر پور پہنچا تھا..... میری بیٹی کا رشتہ مانگتے ہوئے صفری کو ذرا سی بھی حیا نہیں آئی۔ صفری وہ دن بھول گئی جب اس نے میرے جواد کے رشتے کو جو تے کی نوک پر مارا تھا۔ لگتا ہے، صفری میں شرم اور غیرت نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تو بہت برا ہوا۔“

”اباجی تو پرانی ناراضیوں کو ختم کر کے خاندان کو جوڑ کر رکھنا چاہتے تھے اسی لیے انہوں نے چاچا سے نہت کا رشتہ مانگا تھا۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولا۔ ”لیکن چاچی کے الفاظ نے ہم سب کے کلیجے چیر کر رکھ دیے تھے۔ اباجی کو چاچی کے رویتے سے اتنا دکھ نہیں پہنچتا تھا جتنا چھوٹے بھائی کی بے اعتنائی اور بے حس کامی ہوا۔ چاچا نے چاچی کی بدتمیزی پر کسی ندامت یا معذرت کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی بیوی کا ساتھ دیا اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم سے ہر طرح کا حلق ختم کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں، اسی بایکٹ کی وجہ سے چاچا نے لطیف چیمہ کی سازش کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”رانا جی!.....“ میں نے فیاض کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”ہوسکتا ہے، آپ کو میری بات پسند نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپ کی چاچی نے جو کچھ بھی کیا اگر اس میں سے بد اخلاقی والا حصہ نکال دیا جائے تو یہ آپ کی امی جی کے عمل کا رد عمل ہے۔ کسی زمانے میں آپ کی امی نے جواد کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔ اب شادہ نے ریاض کے

چار وناچار

رشتے سے انکار کر کے پرانا حساب بے باق کر دیا۔ ہاں، شادہ نے جو بدزبانی کی وہ ہر حال میں قابل مذمت ہے۔“

”ملک صاحب! سب نے بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“ رانا فیاض اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جن گھروں میں نورتوں کے فیصلوں کو اہمیت دی جاتی ہو، وہ گھر ایک دن تباہ ہو جاتے ہیں۔ اباجی نے امی جی کی ضد سے مجبور ہو کر جواد اور کنیز کے رشتے سے انکار کر دیا تھا اور چاچا نے چاچی کے سامنے گھنے ٹپکتے ہوئے ریاض اور نہت کے رشتے کو ٹھکرا دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ چاچا اور اباجی ”عورت راج“ کی وجہ سے آج دو حریفوں بلکہ دو دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ لطیف چیمہ کو زیادہ الزام اس لیے نہیں دیا جاسکتا کہ انکیشن ہو یا کسی بھی قسم کا بیچ اور مقابلہ، اپنے حریف کے کمزور پہلوؤں پر ضرب لگانے کا سب کو حق ہوتا ہے۔ میں تو صرف اتنا ہی کہوں گا کہ آج کل وقت ہم سے روٹھا ہوا ہے۔“

رانا فیاض کے تجزیے کے جواب میں کہنے کے لیے میرے پاس بہت کچھ تھا لیکن قبل اس کے کہ میں اپنی زبان کو زحمت دیتا، کانشیل وحید وہاں پہنچ گیا۔ وحید کو میں بابا فیروزہ کی معاونت کے لیے قبرستان میں چھوڑ آیا تھا۔ حویلی میں اچانک اس کی آمد نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے فوراً اسے اپنے پاس بلا دیا اور تیز لہجے میں استفسار کیا۔

”وحید، خبریت..... تم یہاں؟“

”ملک صاحب! آپ کو اسی وقت میرے ساتھ قبرستان چلنا ہوگا۔“ وہ اضطرابی انداز میں بولا۔

”ایسا کیا ہو گیا وحید۔“ میں نے ابھن زدہ نظر سے اسے گھورا۔ ”تم اس قدر حواس باختہ کیوں ہو رہے ہو۔ کیا تم نے کسی قبر سے کوئی مردہ باہر نکلنے دیکھ لیا ہے؟“

”اس سے بھی زیادہ بھیانک اور تشویش ناک صورت حال ہے ملک صاحب.....“ وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ”بابا فیروزہ نے کھرا نکالنے کے دوران میں ایک ایسی قبر کا سراغ لگایا ہے جسے تازہ تازہ کھول کر بند کیا گیا ہے۔ جب ہم نے اس قبر کی مٹی ہٹا کر اندر جھانکا تو مردہ غائب تھا.....“

کانشیل وحید کے انکشاف نے مجھے ریڈارٹ کر دیا تھا۔

☆☆☆

میں مذکورہ قبر کے کنارے پر کھڑا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ قبر الیاس نامی ایک شخص کی تھی جس کا انتقال چودہ جنوری کو ہوا تھا یعنی صفری بی بی کے انتقال کے ایک دن

بعد۔ الیاس کی موت کا سبب درو قوت تھا۔ وہ تیرہ اور چودہ جنوری کی درمیانی شب اس دایر قاتی سے رخصت ہو گیا تھا۔ اس وقت میری نگاہ کے سامنے الیاس کی قبر کھلی ہوئی تھی لیکن قبر کے اندر اس کی لاش موجود نہیں تھی۔

بابا فیروزہ نے مجھے بتایا۔ ”ملک صاحب! میں نے خاص طور پر دو ہندوں کے کھرے کو پکڑ کر رکھا ہوا ہے۔ یہ دونوں اس گیس میں بہت اہم آدمی ہیں.....“

”تم کتنے دو ہندوں کی بات کر رہے ہو فیروزہ؟“ میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سوال داغ دیا۔

”جناب! میں نے ان کا کھرا نکالا ہے۔“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”میں تو انہیں جانتا ہوں اور نہ ہی مجھے ان کے نام پتا ہیں۔“

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ مجھے بیک وقت کئی زاویوں پر سوچنا پڑ رہا تھا۔ موجودہ صورت حال نے میرے ذہن کو خیالات کا میدان جنگ بنا دیا تھا۔ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

”تم نے ابھی تک جو کھرا نکالا ہے اس کی تفصیل کیا ہے؟“

”ملک صاحب!“ بابا فیروزہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”دو ہندے اس طرف سے پیدل چلتے ہوئے قبرستان میں داخل ہوئے۔ پھر وہ صفری بی بی کی قبر پر پہنچے۔ انہوں نے قبر کو کھولا اور صفری کی لاش کو نکال کر باہر رکھ دیا پھر وہ خاموشی سے چلتے ہوئے الیاس کی قبر کی سمت بڑھے۔ انہوں نے الیاس کی قبر کو کھودا، الیاس کی لاش کو باہر نکالا، قبر کو دوبارہ بند کیا اور لاش کو اٹھا کر قبرستان سے نکل گئے۔“

”ایک منٹ بابا!.....“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روکا اور پوچھا۔ ”قبرستان سے نکل کر وہ دونوں ہندے کہاں چلے گئے؟ اور تم نے یہ اندازہ کس بات سے قائم کیا کہ انہوں نے الیاس کی لاش کو اٹھا رکھا تھا؟“

”اس طرف جناب!“ اس نے دوبارہ اسی سمت اشارہ کیا جدھر سے اس نے مذکورہ ہندوں کی آمد کا ذکر کیا تھا۔ ”اور وہ دونوں الیاس کی لاش کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے گئے اس بات کا اندازہ میں نے پاؤں کے دباؤ سے لگایا ہے۔“

قبرستان میں آمد، صفری کی قبر پر رسائی اور الیاس کی قبر تک سفر کے دوران میں ان کے پاؤں کے کھرے کا جو ساڑ تھا اس میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب وہ الیاس کی قبر سے چلتے ہوئے قبرستان سے باہر نکلے۔ کھرے کا ساڑ بڑھ جانے کا ایک ہی مطلب ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے کچھ وزن بھی اٹھا رکھا تھا جس کی وجہ سے ان کے پاؤں پر اضافی دباؤ

وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”آتے ہوئے نائل کھرا اور واپسی پر وزن اٹھا کر چلنے کا کھرا۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں بندوں نے الیاس کی لاش کو اٹھا کر ایک خاص مقام تک پہنچایا تھا اور۔۔۔“

”اس خاص مقام سے آگے کی کیا کہانی ہے؟“ میں نے فیروزہ کی بات عمل ہونے سے پہلے ہی اضطرابی لہجے میں سوال کیا۔

”وہی تو آپ کو بتا رہا ہوں ملک صاحب!“ وہ شکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ مجھے بات تو پوری کرنے دیں۔۔۔“

”خیک ہے، ہم بولو۔ میں سن رہا ہوں۔“

”جس مقام پر پہنچ کر ان دونوں کا کھرا ختم ہو جاتا ہے، وہاں سے ایک نیا کھرا دیکھنے کو ملتا ہے۔“ وہ انکشاف انگیز انداز میں بتانے لگا۔ ”ایک تیل گاڑی کا کھرا۔۔۔“

”لحائی توقف کر کے وہ گہری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس مرتبہ میں نے اسے نوکنا مناسب نہیں سمجھا اور منتظر نظر سے اسے ٹکٹا رہا۔ اس نے ٹکٹا کر گھٹا صاف کیا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اس کے راستے پر مختلف تانگوں اور گھوڑوں کے قدموں کے نشانات بھی پائے گئے ہیں۔ لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ ان دونوں بندوں کا تیل گاڑی کے ساتھ گہرا تعلق ہے کیونکہ ان کے قدموں کا کھرا میں اس مقام پر ختم ہوتا ہے جہاں سے تیل اور تیل گاڑی کے تاروں کا کھرا شروع ہوتا ہے۔ خیر۔۔۔“

ایک گہری سانس لینے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

”میں نے مذکورہ تیل گاڑی کے کھرے کا تعاقب کیا اور نہر کے کنارے پہنچ گیا۔ نہر کے اس مقام پر ایک ہل بھی بنا ہوا ہے جس کے اوپر سے گزرنے والا راستہ سیدھا صورت گٹر گاؤں کی طرف جاتا ہے لیکن وہ تیل گاڑی صورت گٹر کی سمت نہیں گئی۔“

”پھر۔۔۔؟“ میں پوچھتا ہوا رہ گیا۔

اصل میں کبھی بابا فیروزہ نے اپنے بیان میں اتنا زیادہ سہنس پیدا کر دیا تھا کہ غیر ارادی طور پر میں نے سوال کر ڈالا تھا۔ اس نے بڑی رسانی سے جواب دیا۔

”ملک صاحب! جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ نہر کے متوازی ایک سڑک ہے جس پر اگر مغرب کی سمت سفر کریں تو یہ راستہ سیدھا لاہور کی طرف جاتا ہے اور اگر مسافر کا رخ مشرق کی سمت ہو تو وہ لال پور (موجودہ فیصل آباد) پہنچ جائے گا۔“

فیروزہ جس سڑک کا ذکر بڑے ڈرامائی انداز میں کر رہا تھا، وہ میرے تھانے کے سامنے سے گزرتی تھی تاہم کافی پیچھے وہ نہر سے جدا ہو جاتی تھی۔ موضع ظفر پور میرے تھانے سے ایک میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا۔ لگ بھگ تھانے سے دو فرلانگ پہلے تک نہر اور سڑک ایک دوسرے کے متوازی چلتی تھی۔ میں نے غمیرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ دونوں نامعلوم افراد الیاس کی لاش کو تیل گاڑی پر ڈال کر یا تو لاہور کی طرف گئے ہیں اور یا پھر لائل پور کی جانب۔۔۔!“

”میں اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی بابا فیروزہ!“ میں نے حذب نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس سلسلے میں تمہارا علم کوئی راہنمائی نہیں کر رہا؟“

”کچھ ایسی ہی بات ہے ملک صاحب!“ وہ بے بسی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”جب میں اس مقام پر کھرا نکالنے کا کام کر رہا تھا تو وہ سورج ڈوبنے کا وقت تھا۔ روشنی کافی کم ہو چکی تھی اس لیے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ لوگ الیاس کی لاش کو لے کر لائل پور کی جانب گئے ہیں یا لاہور کی طرف۔ کل صبح میں دوبارہ زیادہ باریک بینی سے اس جگہ کا جائزہ لوں گا۔ مجھے امید ہے کہ دن کی روشنی میں تیل گاڑی کی اگلی منزل کا کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔ ویسے ایک بات کا مجھے یقین ہے کہ وہ تیل گاڑی صورت گٹر کی طرف نہیں گئی۔“

میں فیروزہ کی ہنسنی مجبور یوں کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ کھرا اور کھون کا کام اتنا سہل نہیں تھا جتنا نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ اس فن کے اندر بہت ساری باریکیاں تھیں۔ ویسے بابا فیروزہ نے اب تک جو کارکردگی دکھائی تھی، وہ قابل تعریف اور سلی بیش تھی۔ اس نے جن دو نامعلوم افراد کا کھرا نکالا تھا، ان کا صفائی بی بی والے واقعے سے گہرا تعلق تھا۔ بادی انشکاف میں یہی دکھائی دیتا تھا کہ وہ الیاس کی لاش لے جانے آئے تھے اور غلطی سے صفائی کی قبر کھود ڈالی تھی لیکن میں اس امکان کو ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ صفائی کی لاش کو اس کی قبر سے نکال کر باہر رکھ دینا اور الیاس کی لاش کو قبر سے نکال کر اپنے ساتھ لے جانا ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں تھیں۔ میں ممکن تھا کہ ان دو پر اسرار ”قبر کھود“ بندوں نے پولیس کی فٹیش کی گاڑی کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے یہ ڈراما رچایا ہو۔ میں ہر قیمت پر جلد از جلد ان نامعلوم افراد تک

پہنچنا چاہتا تھا اس لیے میں نے فیروزہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”بابا! میں تمہارے یقین کو چیلنج نہیں کر رہا لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ کل صبح تم نے سب سے پہلے صورت گٹر کی طرف جانے والے کچے راستے کو ایک مرتبہ پھر چیک کرنا ہے۔ تم میرا ٹیکہ سمجھ رہے ہو؟“

”جی ملک صاحب!“ وہ سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میرا بھی یہی پروگرام ہے۔ میں پہلے نہر کے ہل کے دونوں اطراف والے کچے راستے کو اچھی طرح چیک کروں گا۔ اس کے بعد ہی کسی اور سمت میں بڑھوں گا۔“

”ویسے مجھے امید ہے کہ تیل گاڑی اگر صورت گٹر کی طرف نہیں گئی تو پھر وہ لائل پور یا لاہور کی جانب بھی نہیں گئی ہوگی۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کیونکہ لائل پور اور لاہور یہاں سے کئی میل کے فاصلے پر ہیں۔ تیل گاڑی پر اتنا طویل سفر کرنے کے لیے کئی دن لگ جائیں گے۔“

”میں نے لاہور اور لائل پور کا ذکر محض سمت کو واضح کرنے کے لیے کیا تھا۔“ وہ سمجھ انداز میں بولا۔ ”ان دونوں اضلاع کے بیچ میں کئی گاؤں دیہات واقع ہیں۔ وہ لوگ الیاس کی لاش کو لے کر کہیں بھی جاسکتے ہیں۔“

”میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں بابا۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”تم کیا نہیں، ایک دم کا فیروزہ ہو۔“

میری بات کے جواب میں وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ملک صاحب! کچے اور کچے فیروزہ کے کا تو مجھے پتا نہیں لیکن میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں حسینی فیروزہ ہوں۔“

”واہ وا۔۔۔ بہت خوب!“ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”بابا! تم نے بڑی رمزیہ بات کی ہے۔ قسم سے دل خوش ہو گیا۔“

فیروزہ نامی پتھر کی تمام اقسام میں ”حسینی فیروزہ“ اور ”شجری فیروزہ“ کو سب سے اعلیٰ نسل مانا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر تک میرے اور بابا فیروزہ کے درمیان موجودہ صورت حال پر گفتگو ہوتی رہی پھر وہ مجھے سلام کر کے صبح دوبارہ آنے کے وعدے کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ میں تھانے سے اٹھا اور اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح شہر ترقی ہوئی اور دھند والی تھی۔ سورج کا کہیں نام و نشان نظر نہیں آتا تھا۔ میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک

ابم خبر میری منتظر تھی۔ مجھے پتا چلا کہ رات کا شہیل بشارت اور گورنر صدر و صورت گٹر سے واپس آ گئے تھے۔ میں نے بشارت کو اپنے کمرے میں بلایا۔

اس نے میرے پاس آ کر مجھے سلیوٹ کیا اور ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے جھٹکنے والے جوش نے مجھے بتا دیا کہ اس کے پاس کوئی بڑی خوشخبری ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”رات کب واپسی ہوئی؟“

”لگ بھگ دس بجے ملک صاحب۔“ اس نے توانا لہجے میں بتایا۔ ”اس وقت تک آپ اپنے کوارٹر میں جا چکے تھے۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ آپ سو گئے ہوں گے اس لیے میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے بشارت۔ میں نو، ساڑھے نو بجے کے درمیان سو گیا تھا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کل کا پورا دن اتنا زیادہ مصروف گزارا تھا کہ میرا جوجڑ دھک رہا تھا اس لیے میں نے عشا کی نماز سے فارغ ہوتے ہی بستر سنبھال لیا تھا۔ خیر۔۔۔“

”لحائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تم جس کام کے لیے صورت گٹر گئے تھے اس کا کیا ہوا اور وہ صدر وہاں ہے؟“

”صدر کو میں نے آرام کرنے کے لیے حوالدار کرم داد کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ بشارت نے بتایا۔ ”موسم کی خفنی نے گورنر کا باجانبجا کر رکھ دیا تھا اور جہاں تک مشن کی بات ہے تو ملک صاحب۔۔۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں رک کر سٹائش طلب نظر سے مجھے دیکھا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کو یہ سن کر بے حد خوشی ہوگی کہ میں آپ کے مطلوبہ بندے کو ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اسی کی وجہ سے ہمیں اتنی دیر ہوگئی ورنہ ہم تو سورج ڈوبنے سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے۔“

”بدری کفن چور اس وقت کہاں ہے؟“ میں نے سرسراہٹے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”اور اس کی ایسی کون سی وجہ تھی کہ تم لوگوں کو اتنی دیر ہوگئی۔۔۔؟“

”جناب! جس وقت ہم صورت گٹر پہنچے، بدری وہاں موجود نہیں تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں نے اپنے طور پر کوشش کر کے یہ معلوم کر لیا کہ وہ رات کو اپنے گھر آئے گا ضرور۔ مجھ پر ایک ضد سوار ہوگئی کہ کسی بھی قیمت

دوں گا اور تمہارے بغیر کمال کے بدن پر شہد کالیپ کر کے
بھوکے کتوں کو تم پر چھوڑ دوں گا۔ میری بات سمجھ میں آ رہی
ہے یا نہیں؟“

وہ تو ایک لاش کے چکر میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔
میں نے دوسری لاش کا ذکر نکال لیا تو اس کے چہرے پر
ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ وحشت بھری ایک چشم سے بھی
نیچے اور کبھی حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تھانے دار صاحب..... میں نے آپ سے کوئی
جھوٹ نہیں بولا۔“

ادھر بدری کی بات ختم ہوئی، ادھر کرم داد کا ایک
زبانے دار ٹھہر اس کے گال پر پڑا۔ چنانچہ ایک کمراری
آواز فضا میں گونجی پھر ایک اور سنگین آواز نے طمانچہ کی
آواز کو گل لیا۔ یہ آواز حوالدار کرم داد کی تھی۔

”اوائے ایک آنکھ والے منحوس جن! ہم تو جھوٹے
بندے کو اس کے چہرے ہی سے پہچان لیتے ہیں۔ سیدھی
طرح ملک ہو اور انوں سب سچ سچ بتادے ورنہ تمہاری
دوسری جتنی بھی گل کر دوں گا۔“

بدری خوف کی شدت سے تھر تھراکنے لگا۔ ان لمحات
میں وہ ”نہ پائے رفیق، نہ جائے ماندن“ ایسی کیفیت میں
گرفتار دکھائی دیتا تھا۔ گل اس کے کہ وہ حوالدار کی دھمکی کے
جواب میں کچھ کہتا، ایک کانسٹیبل نے اندر آ کر اطلاع دی۔

”ملک صاحب! فیروزہ کھوئی آگیا ہے۔“
میں نے حوالدار کو بدری کے پاس رکھنے کے لیے کہا
اور خود اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ بابا فیروزہ برآمدے
میں موجود تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر تھانے کے صحن
میں آگیا اور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

”بابا! کیا ان دونوں لاش چور بندوں کا کھرا
تمہارے ذہن میں محفوظ ہے؟“

ایک لمحہ آنکھیں بند رکھنے کے بعد اس نے جواب
دیا۔ ”جی ملک صاحب! پتلی طراں محفوظ ہے۔“
”مطلب ان کے پاؤں کے نشان تم کہیں اور بھی
دیکھو تو فوراً پہچان لو گے نا؟“ میں نے کریدنے والے
انداز میں سوال کیا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں ملک صاحب!“ وہ
دزدیدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ میرا پیشہ ہے اور
میں اپنے فن کا ماہر ہوں پھر بھلا میں کیسے نہیں پہچانوں گا۔
میں نے تو ایسے ایسے چپٹا چال باز ڈاکوؤں کا کھرا بھی نکالا
ہے جنہوں نے گھوڑوں کے سون پر چڑھ کر کی تھیلیاں

لہو یا نہ انداز میں بولا۔ ”اس میں میرا کم اور لوگوں کا زیادہ
قصور ہے۔“

”اوائے وہ کس طرح؟“ میں نے گھور کر اسے
دیکھا۔ ”مردوں کے کفن تم چر آؤ اور قصور دوسرے لوگوں کا۔
بڑی نرالی منطق لے کر آئے ہو تم.....!“

”سرکار!“ وہ اپنے تئیں وضاحت کرتے ہوئے
بولا۔ ”بس، ایک دو بار میں نے غلطی سے کفن کیا چوری کر لیا
لوگوں نے میرا نام ہی ”کفن چور“ رکھ دیا۔ ایک زمانہ
ہوا، میں اس کام سے توبہ کر چکا ہوں اور..... مغربی کی قبر
سے تو میرا کچھ لینا دینا ہی نہیں۔ میں تو کافی عرصے سے ادھر
آیا بھی نہیں.....“

”میں نے تم سے مغربی یا اس کی قبر کے بارے میں
کچھ پوچھا؟“ میں نے ایک چشم سیاہ رو بدری کی طرف
دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں جی، آپ نے تو نہیں پوچھا۔“ وہ نفی میں
گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آپ کے سپاہی نے تو
رات ہی سے مغربی کی قبر کے بارے میں پوچھ پوچھ کر میرا
بیبا عذاب کر رکھا ہے۔“

”تم نے صرف عذاب کا نام سنا ہے۔“ کرم داد نے
اس کی گدی پر ایک زوردار دوپٹہ رسید کرتے ہوئے خوں
خوار انداز میں کہا۔ ”تمہیں بالکل بھی اندازہ نہیں کہ عذاب
کس ذہنی اور جسمانی کیفیت کا نام ہے۔ ملک صاحب سے
فارغ ہو کر تم میرے پاس ہی آؤ گے۔ میں تمہیں بتاؤں گا
کہ ذات کس چیز کا نام ہے۔“

”تھانے دار صاحب! میرا قصور کیا ہے؟“ وہ اپنی
آواز میں سکینے بھر کر مجھ سے مستنصر ہوا۔

”تمہارا قصور یہ ہے کہ تم جھوٹ بول کر قانون کی
آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کر رہے ہو۔“ میں نے
اس کے کانوں کے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”جس
کانسٹیبل کا تم نے ذکر کیا وہ آدمی حقیقت سے واقف ہے اس
لیے اس نے تم سے صرف مغربی کی قبر کے بارے میں پوچھا
تھا۔ میں تو مغربی کے ساتھ ساتھ الیاس کی کشیدہ لاش کے
حوالے سے بھی تم سے پوچھ چکے کرنے والا ہوں۔ اگرچہ بولو

گے تو میں تمہیں رعایت دینے کے بارے میں سوچوں گا اور
اگر جھوٹ بولو گے تو.....“ میں نے دانستہ جملہ ادھر اچھوڑ کر
خطرناک انداز میں اس کے روشن قمقمے کو گھورا پھر اپنی بات
مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”تو میں تمہاری کھال کھنچوا کر اس میں بھوسا بھروا
دوں گا اور تمہارے بغیر کمال کے بدن پر شہد کالیپ کر کے
بھوکے کتوں کو تم پر چھوڑ دوں گا۔ میری بات سمجھ میں آ رہی
ہے یا نہیں؟“

وہ تو ایک لاش کے چکر میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔
میں نے دوسری لاش کا ذکر نکال لیا تو اس کے چہرے پر
ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ وحشت بھری ایک چشم سے بھی
نیچے اور کبھی حوالدار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

کرختگی اور خوں خواری بڑے بڑے مجرموں کا پتہ پائی
کر دیتی تھی۔ کرم داد، بدری کے عقب میں ایک قدم کی
دوری پر تن کر کھڑا تھا۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ وہ ایک
سینڈ سے بھی کم کے نوٹس پر ہر نوعیت کی ہنگامی کارروائی کے
لیے تیار تھا۔

بدری کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ
گہری سانولی رنگت کا مالک ایک مضبوط اور توانا شخص تھا۔ اس
کا بدن کسی گینڈے کے مانند ٹٹھا ہوا تھا اور اس کے چہرے کا
ایک تقرر گل تھا۔ ساری خشکی اللہ کی بنائی ہوئی ہیں تاہم اس
امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ بدری خاصا کریہہ صورت
تھا۔ اس کے ہاتھوں میں آہنی زور نظر آ رہا تھا۔

میں نے بدری کی ”آنکھوں“ میں آنکھیں ڈال کر
قدرے سخت لہجے میں سوال کیا۔ ”سرکاری مہمان خانے
میں تمہاری رات کیسی گزری؟“

”ابھی بتاتا ہوں تھانے دار صاحب.....“ یہ کہتے
ہوئے اس نے کمرے پر بیٹھنے کی کوشش کی۔
اگلے ہی لمحے حوالدار کرم داد کے دیکے نے اس کی
کوشش کو نام بنادیا۔ ”اوائے کسی نواب صاحب کی نا جائز
اولاد.....“ کرم داد نے اسے کار سے ہٹھ کر سیدھا کھڑا

کرتے ہوئے رعب دار آواز میں کہا۔ ”یہ تمہاری بے بے کا
ڈرانگ روم نہیں ہے۔ الف کی طرح سیدھا کھڑا ہو جا۔
ورنہ ایسا ڈنڈا گھماؤں گا کہ کسی کو بتاتے ہوئے شرم سے پھینا
پھینا ہو جاؤ گے۔“

”غلطی ہو گئی سرکار!“ وہ سہمی ہوئی نظر سے حوالدار کو
دیکھتے ہوئے بولا۔

کرم داد نے چڑھائی جاری رکھتے ہوئے دھمکی آمیز
انداز میں کہا۔ ”یہ غلطی پہلی اور آخری ثابت ہونا چاہیے ورنہ
مار مار کر باندروں بنا دوں گا۔ پھر تمہاری باقی کی ساری زندگی
چڑیا گھر کے کسی بنجرے میں چھلانگیں لگاتے گزرے گی۔“

کرم داد کی دھمکی کا گر ثابت ہوئی اور بدری خوف
زدہ نظر سے مجھے کھنکھنے لگا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ
جماتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

”ماں باپ نے تمہارا کتنا اچھا نام رکھا تھا..... بدر
الدین۔ کبھی ایسے اعمال پر بھی غور کیا ہے؟ کفن چوری کے
دھندے نے تمہیں معاشرے میں کتنا ذلیل و رسوا کر کے
رکھ دیا ہے اور اب سب تمہیں ”بدری کفن چور“ کے نام سے
جاننے ہیں۔“

”مائی باپ.....!“ وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے

پر میں نے خالی ہاتھ آپ کا سامنا نہیں کرنا چاہیے میں اور
صدر اس کے مکان کے نزدیک ہی ایک جگہ پر ڈیر اڈال کر
بیٹھ گئے۔ میری معلومات کے مطابق، بدری آٹھ بجے کے
قریب لوٹا۔ صدر اس کے قد کاٹھ اور چلنے سے اچھی طرح
واقف تھا۔ اس نے دوسری سے دیکھ کر فتویٰ صادر کر دیا کہ وہ
سولہ آنے بدری کفن چور ہی ہے۔ بدری کوئی پنجابی گانا گاتے
ہوئے آ رہا تھا اور اس کے انداز سے بے پروائی جھلکتی تھی
لیکن جیسے ہی وہ ہمارے قریب سے گزرا، میں نے اچانک
اس کے سامنے آ کر اس کی ساری بے پروائی اڑن چھو کر
دی..... اس وقت وہ حوالدار کے اندر بند ہے۔“

”مغربی کی قبر کے حوالے سے بدری سے تمہاری کوئی
بات ہوئی؟“ کانسٹیبل کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔
”ملک صاحب! بات تو ہوئی لیکن وہ بڑی شدومد
کے ساتھ انکار ہی ہے۔“ بشارت نے بنجیدہ لہجے میں بتایا۔

”اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ ایسے کسی واقعے کے بارے میں کچھ
نہیں جانتا۔ وہ تو بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے کہ پچھلے
ایک ماہ سے اس نے ظفر پور میں قدم بھی نہیں رکھا۔“

”تم اسے لے کر میرے پاس آؤ۔“ میں نے
غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اس کے دعوؤں اور
فتوؤں کو اپنے انداز میں چیک کرتا ہوں۔ اگر وہ قبرستان
والے واقعے میں کسی بھی زاویے سے ملوث ہے تو میں مار مار
کر اس کے بدن کے ایک ایک سوراخ سے اتنا دھواں

نکالوں گا کہ وہ زمانہ قدیم کے اسٹیم انجن کی شکل اختیار
کر لے گا۔“
”ہے گیاتے ہنے آجی جی.....!“ کانسٹیبل یکتا اٹھ
کر کھڑا ہو گیا۔

”ایک منٹ.....“ وہ جانے کے لیے مڑا تو میں نے
آواز دے کر اسے روک لیا۔ ”بشارت!“ میں نے اس کی
آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غلوں بھرے انداز میں کہا۔
”بدری کو میرے پاس پہنچا کر تم چھٹی کر لیتا۔ کل کے دن اور
پھر گزشتہ رات تم نے بڑی سخت ڈیوٹی کی ہے۔ اس وقت
تمہارا جسم بھی آرام کا تقاضا کر رہا ہوگا۔ جب اچھی طرح نیند

پوری ہو جائے اور بدن کی ساری تھکن اتر جائے تو دوبارہ
ڈیوٹی پر آ جانا۔“
وہ میرا ٹکڑا ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

پانچ منٹ کے بعد بدری میرے در و در کھڑا تھا۔ میں
نے اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے احتیاطاً حوالدار کرم داد
کو بھی اپنے پاس بلا لیا تھا۔ کرم داد کے چہرے سے کتنی

”سمجھ گیا ملک صاحب۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ”ایک گھنٹا تو بہت ہے۔ اگر دس منٹ کے اندر ہی بدری ند بول پڑا تو میرا نام بھی کرم داؤ نہیں۔“

”تم نے اس کے ساتھ جو بھی کرتا ہے وہ کرو۔“ میں

پرچا
نہیں ملتا

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

☆☆☆

تھوڑی ہی دیر کے بعد کرم داد میرے پاس پہنچ گیا اور
 نہایت ہی ادب و احترام کے ساتھ بولا۔ ”حکم ملک صاحب!“
 ”ہمیں کچھ ملا ہے۔“ میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔
 ”تم نے ایک گھنٹے کے اندر نقیشت کی کسوٹی پر غرس کر کھرے
 اور کھونے کی کپچان کرنا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا.....؟“
 ”آہ“ نے فکر ہو جا میں حکم صاحب!“ وہ بڑے

میں اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔
بابا فیروزہ اینڈ مینی کوکھڑ پورا دانہ کرنے کے بعد میری
پوری اور موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔ مجھے پورا
غصوں ہو رہا تھا کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے
اس کیس کا اونٹ لازماً کسی کرڈٹ بیٹھ جائے گا۔ اچانک

”میں بھی اس معاملے کو جلد از جلد نمٹانا چاہتا ہوں اس لیے بدری کو تم وحید کی نگرانی میں اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بدری کے ہاتھوں میں پتھری اسی طرح لگی رہے گی۔ جیسے ہی تمہیں اطمینان ہو جائے کہ ان دو نامعلوم افراد میں سے ایک کا کھر

جواب

ذکر یہ چل پڑا کہ رات کے وقت بچے کو دودھ دودھ دینا پڑتا ہے تو دودھ کون دے بیوی یا شوہر؟
ایک خاتون نے اپنی دادی اماں سے پوچھا۔ "دادی اماں! آپ بتائیں کہ آپ کے وقت میں کیا انتظام تھا؟"
دادی اماں نے کہا۔ "بھئی میرے میاں تو دودھ دے ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ ہمارے وقت میں بوسل کارواج شروع نہیں ہوا تھا۔"
محمد عین اجمہر، کی نوازش تحصیل گریٹ سے

"ملک صاحب! یہ بات آپ کو بھی معلوم ہوگی کہ بدری کا کوئی باقاعدہ روزگار نہیں ہے۔" نزاکت نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانا شروع کیا۔ "وہ گزر بسر کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف کام کرتا رہتا ہے جن میں اکثر کام اٹلے ہی ہوتے ہیں۔ میں نے آج دن بھر بعض ایسے لوگوں سے ملاقات کی ہے جن کا بدری کے ساتھ میل جول رہتا ہے اور ان سب نے بدری کے حوالے سے مجھے ایک خاص بات بتائی ہے۔"

"کون سی خاص بات نزاکت علی؟" میں سیدھا چکر بیٹھ گیا۔
وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بدری کی جیب عموماً خالی ہی رہتی ہے لیکن ان دنوں وہ اپنے یار دوستوں پر خوب پیسے خرچ کر رہا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا۔"

"بدری! لگتا ہے، تم نے کوئی لمبا ہاتھ مار لیا ہے ورنہ تمہاری نظر تو ہمیشہ ہماری جیب پر ہوتی تھی۔"
"ایسی کوئی بات نہیں یار۔" بدری نے بے پروائی سے کہا۔ "بس، مجھے عارضی طور پر ایک ایسی نوکری مل گئی ہے جس میں پیسے کی ریل تیل ہے۔"

"یاد تو ایسی نوکری پر ہمیں بھی لگوانا۔"
"ٹھیک ہے، میں بات کروں گا۔" بدری نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔
"تم کس سے بات کرو گے؟"

"رانا منور سے!"
"تو کیا تم رانا منور کی حوصلی میں ملازم ہو گئے ہو؟" اس بندے نے بے یقینی سے بدری کی طرف دیکھا۔ "تم تو ایک

بعد ہی آپ کے پاس آؤں گا۔"
"کیا یہ کام آج کی تاریخ میں ہو جائے گا؟"
"جی ملک صاحب۔" وہ بڑے اعتماد سے سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "میں بہت جلد آپ کو رزلٹ دوں گا۔"
جب میں نے بدری کو کرم داد کے حوالے کیا تھا تو اس وقت کرم داد نے جوش بھرے انداز میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ اگر دس منٹ میں بدری نہ بول پڑا تو اس کا نام کرم داد نہیں۔ میں چاہتا تھا جو کرم داد کو اس کا دعویٰ یاد دلا سکا تھا لیکن میں نے اسے شرمندہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بدری کے ذیل ڈول اور چٹائی جیسے کو کچھ کر میں سمجھ گیا تھا کہ موٹی کھال والے اس گیندے کی زبان کھلوانا آسان ثابت نہیں ہوگا اور میرا اندازہ بالکل درست نکلا تھا۔

سہ پہر میں بابا فیروزہ اور کاشمیل وحید اپنا کام ختم کر کے واپس آ گئے۔ کھوجی بابا کی رپورٹ میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے بڑے وثوق کے ساتھ مجھے بتایا کہ تیل گاڑی نے کسی بھی قیمت پر موصیغ صورت گارنٹ نہیں کیا تھا۔ بابا فیروزہ ہنوز یہ بتانے سے بھی قاصر تھا کہ اس مقام سے آگے تیل گاڑی گئی کہاں۔ یہاں پہنچ کر ہر سراغ گونگا بہرا ہو جاتا تھا۔ بہر حال، فیروزہ کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم نہیں تھا کہ اس نے بدری کو خشک کے دائرے کے اندر قید کر دیا تھا۔ باقی کی معلومات میں اس کی زبان سے اٹھوا لیتا۔

میں نے فیروزہ کو جاننے کی اجازت دی تو وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "ملک صاحب! میں نے اپنا کام مکمل کر دیا ہے۔ اب آپ مجھے میرا انعام دے دیں۔"
"فیروزہ! تم نے یقیناً اپنا کام نپا دیا ہے لیکن میرا کام ابھی پورا نہیں ہوا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے رسائیٹ بھرے لہجے میں کہا۔ "انعام کے لیے تمہیں ایک دن تک انتظار کرنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے جناب۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں کل کسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

شام سے تھوڑی دیر پہلے نزاکت علی میرے پاس آیا۔ میں نے اسے بدری کے حوالے سے سن سن لینے کا کام سونپا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں مجھے عجیب سی چمک نظر آئی تو میں نے سوال کیا۔

"نزاکت! کیا رپورٹ لائے ہو؟"
"رپورٹ کافی دلچسپ ہے جناب۔" وہ جو شیے انداز میں بولا۔

"اس دلچسپ رپورٹ کی تفصیلات کیا ہیں؟"

تھا کہ میں ان تھانے داروں میں سے نہیں ہوں جو چودھریوں، خانوں، وڈیروں، راتوں اور آبی ٹائپ کے طاقتور جاگیرداروں سے مرعوب ہو جاتے ہیں اور نظائر حکم پولیس کے ملازم رہتے ہوئے وہ اپنے ان پرائیویٹ آقاؤں کی چاکری میں لگ جاتے ہیں۔
"بالکل!" میں نے اس کے حسب منشا سر کو اٹھاتی جنبش دی اور کہا۔ "میں آپ کی ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔ گاؤں پر راج کرنے کے لیے ایک ایک بندے کو راج کرنا پڑتا ہے۔"
"کیا بدری کفن چور نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"آج کی وقت اس سیاہ رویہ چشم بدری کو یہ نیک کام کرنا ہی ہوگا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "انشاء اللہ! کل صبح تک یہ کیس روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گا۔ آپ لوگوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے فرض سے کوتاہی نہیں برتوں گا۔"
"بہت بہت شکریہ ملک صاحب!" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لیے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اب مجھے اجازت دیں۔ میں کل کی وقت دوبارہ چکر لگاؤں گا۔"

میں نے خوشی خوشی اسے جانے کی اجازت دے دی۔ رانا ریاض نے مجھ سے جتنی بات کی، میں نے اسے اتنا ہی جواب دیا۔ نہ اس نے زیادہ کرید کی اور نہ میں نے اسے اپنی اب تک کی تفتیش کی تفصیل سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ ریاض کے جانے کے بعد حوالدار میرے پاس آ گیا۔ کرم داد نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ دس منٹ میں بدری کا منہ کھولالے گا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے اپنے مقدمے میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔

"ملک صاحب! مجھے تھوڑا تاخیر اور چاہیے۔" میری سوالیہ نظر کے جواب میں حوالدار نے کہا۔ "یہ بندہ میری توقع سے زیادہ کھوجل اور سخت جان ہے۔ اس کی زبان کھلوانے کے لیے تفتیش کے پیش گراں پڑیں گے۔"

"اگر بدری کھوجل اور سخت جان ہے تو کرم داد! تم نے بھی ہاتھوں میں کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔" میں نے سکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہیں جتنا وقت چاہیے لے لو، جو بھی تفتیشی چٹکنڈا آزماتا چاہتے ہو، تمہیں میری طرف سے اجازت ہے اور کچھ۔"

"شکریہ ملک صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اور کچھ نہیں۔ میں اب اس کی زبان کا جندرا کھولنے کے

نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "بس، مجھے وہ ایسی حالت میں ملنا چاہیے کہ اپنے ہوش و حواس میں ہو اور اقبالی بیان لکھوانے کے قابل بھی۔"

"اوکے سرا!" اس نے مجھے کھٹاک دار سیلیوٹ مارا اور پرجوش انداز میں بولا۔ "ملک صاحب! میں آپ کی امید پر پورا اتروں گا جناب۔"

تھوڑی دیر کے بعد رانا ریاض مجھ سے ملنے کے لیے آ گیا۔ اس کے ساتھ تین چار حاشیہ بردار بھی تھے۔ میں نے بچوں کو چھوٹے کو باہر روک کر ریاض کو اندر بلا لیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔

میں نے رسمی ملکہ ملکہ کے بعد پوچھا۔ "کیا وڈے رانا صاحب لاہور سے واپس آ گئے ہیں؟"

"نہیں جناب!" وہ فنی میں منڈی ہلاتے ہوئے بولا۔ "رات کو تو وہ نہیں آئے۔ امید ہے، آج کسی وقت ابائی... ظفر پور پہنچ جائیں گے۔" پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔ "ہمارے کیس کا کیا نتائج؟ کیا صدر نے کچھ بتایا ہے؟"

"صدر کو تو میں آج کسی وقت چھوڑ دوں گا۔" میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ "مجھے وہ غریب بے تصور لگتا ہے۔ ایک کام کا بندہ میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ حوالدار اس کی زبان کا جندرا کھول رہا ہے۔"

"نہیں... آپ بدری... کفن چور کی بات تو نہیں کر رہے۔؟" اس نے بکھری ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے اسے صورت گمر سے گرفتار کیا ہے۔ آج صبح وہ آپ کے بندوں کے ساتھ ظفر پور کے قبرستان میں بھی دیکھا گیا ہے۔"

"واہ بھئی رانا جی۔" میں نے اسے خوش کرنے کی غرض سے کہا۔ "تمہاری سی آئی ڈی تو پولیس ڈیپارٹمنٹ سے بھی زیادہ فعال ہے۔"

"بس جی، کیا کریں۔" وہ جوڑا ہوتے ہوئے بولا۔ "گاؤں چلانے کے لیے ہر معاملے کی خبر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ آپ تو سیانے بیانے ہیں، میری بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔"

وہ گاؤں کو چلانے کی بات اس طرح کر رہا تھا جیسے وہ گاؤں نہ ہوا، کوئی بیوی ششیں ہوئی جسے وہ کسی آپریٹر کے انداز میں چلا رہا تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ کل کے مقابلے میں آج رانا ریاض کھل اور ٹھنڈے مزاج سے بات کر رہا تھا اور میں سمجھتا ہوں، اس کے دو بنیادی اسباب تھے۔ اول، رانا فیاض نے اسے سمجھا یا ہوگا۔ دوم، میرے کھڑے اسٹائل نے اسے باور کرا دیا

خیال میرا خوشبو کی طرح

☆ ہم نے سمندروں میں پھل کی طرح تیرنا اور فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا سیکھا مگر آج تک ہمیں زمین پر انسانوں کی طرح رہنا نہیں آیا۔

☆ ضمیر کی عدالت میں ضرور جائے کیونکہ وہاں غلط فیصلے نہیں ہوتے اور نہ ہی دیکھوں کی قیاس بھری پڑے گی۔

☆ جب ہم اللہ سے مانگتے ہیں تو بے حساب مانگتے ہیں لیکن جب عبادت کا وقت آئے تو نوافل بھی گن کر ادا کرتے ہیں۔

☆ جزیں سلامت ہوں تو نڈمند درختوں پر بھی موسم بدلنے ہی پھول آجاتے ہیں۔

☆ ایک خوب صورت دل ہزار خوب صورت چہروں سے بہتر ہوتا ہے لہذا بہتر لوگ منتخب کریں، جن کے پاس خوب صورت دل ہیں نہ کہ خوب صورت چہرے۔

☆ اگر آپ اپنی زبان سے وعدہ لے لیں کہ وہ صرف ایک معقول بات کرے گی تو آپ دیکھیں گے کہ رفتہ رفتہ آپ خاموش ہوتے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

ٹی وی چینلز

ایلیس کے چند چیلے جب اس کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھا سگار پی رہا ہے۔ چیلوں نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، آج کل آپ نے شیطانی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔“ کہیں آپ کی صحت تو نہیں جواب دے گئی؟“

یہ سن کر ایلیس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”اس بارے میں تشویش کرنے یا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آج کل میں نے اپنا سارا کام ٹی وی چینلز کو سونپ دیا ہے۔“

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، محل ہزارہ

قبرستان تک پہنچے تھے اور پھر اسی تیل گاڑی پر الیاس کی لاش کو ڈال کر نہرو والے ہل کے قریب پہنچے تھے۔ یہاں تک تو فیروزہ نے بھی ان کا کھرا نکال لیا تھا۔ اس کے بعد کی کہانی کچھ اسی طرح تھی۔ انہوں نے الیاس کی لاش کو اٹھا کر نہرو کے ہل کے نیچے ایک خفیہ مقام پر چھپا دیا تھا۔ ان دنوں نہرو کے اندر پانی بہت کم تھا۔ پانی کی ایک پتلی سی لکیر نہرو کے قلب میں ست روی سے رواں دواں تھی لہذا ہل کے نیچے یہ کارروائی کرنے میں انہیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تیل گاڑی کے تیل کو کھول کر انہوں نے نہرو کے خشک حصے میں آزاد چھوڑ دیا تھا۔ نہرو کے اس کنارے سے اکثر گائے، بھینسیں اور دیگر مویشی پانی پینے اور غسل کرنے کی غرض سے نہرو میں اترتے ہی رہتے تھے لہذا اس حصے میں مختلف جانوروں کے قدموں کے لاتعداد نشانات ایک دوسرے میں مدغم تھے۔ فیروزہ کا اسی سبب ادھر دھیان نہیں گیا تھا۔ وہ تو قبرستان سے نہرو کے ہل تک تیل گاڑی کے ٹائروں کا کھرا پکڑ کر آیا تھا اور یہی سڑک پر پہنچ کر ٹائروں کا کھرا غائب ہو گیا تھا۔ تیل کے بغیر گاڑی کو ان دونوں نے دھکیل کر سڑک کے کنارے واقع ایک گڑھے میں پھینک کر اسے آگ لگا دی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنے ساتھ مٹی کے تیل سے بھری ہوئی ایک بوتل بھی لائے تھے۔ چوٹی گاڑی جل کر راکھ ہو گئی۔ مذکورہ تیل گاڑی انہوں نے اس واقعے سے ایک دن پہلے چرائی تھی۔ ”مال سرودھ، دل بے رحم“ کے مصداق انہیں گاڑی کے جلنے کا غم تھا اور نہ تیل کے کہیں بھی نکل جانے کا۔۔۔۔۔

کرم داد کی بیان کردہ تفصیل کے کئی گوشے نقشہ تھے لہذا جب بدری کو میرے پاس پہنچایا گیا تو میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”اس وقت ہم دونوں کے علاوہ یہاں اور کوئی موجود نہیں اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کمرے کی باتیں باہر نہیں جائیں گی لہذا تم نے صرف اور صرف سچ بولنا ہے۔ حوالدار کو تم نے جو کہانی سنائی ہے اس میں بے شمار الجھنیں اور گھماؤ پھراؤ ہے۔ سمجھ لو کہ میں تمہیں جان بچانے کا آخری موقع فراہم کر رہا ہوں۔ جھوٹ بول کر تم اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرو گے۔“

”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ جو بھی پوچھیں گے اس کا بالکل ٹھیک جواب دوں گا۔“

”یہ خاور ثانی بندہ کون ہے جس کے ساتھ مل کر تم نے

حرارت کو رومان پرور اور فرحت بخش تمازت کہہ سکتے ہیں۔ حوالدار کرم داد کو بدری کے معاملے میں گزشتہ روز میں نے فری ہینڈ دے دیا تھا۔ آج میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ کرم داد میرے پاس آگیا۔ اس کا چہرہ ہشاش بشاش اور آنکھوں میں رخ کی چمک تھی۔ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”لگتا ہے تم نے بدری کی زبان کا قفل تو ڈالا ہے۔“

”جی ملک صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔“ وہ مسرت بھرے لہجے میں بولا۔ ”میں نے نقیشت کی روایتی اور آزمودہ کار تار ایک جب بدری پر آزمائیں تو اس کی ساری ہٹ دھرمی اور سخت جانی دھواں بن کر اڑ گئی۔ اب وہ تیر کی طرح سیدھا ہو چکا ہے اور ہم سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہے۔“

”ٹھیک ہے، لے آؤ اسے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں بھی تو دیکھوں، تم نے اس چٹلی کو کتنا سیدھا کیا ہے۔ ویسے اس نے تمہیں کیا بتایا ہے؟“

”کافی کچھ بتایا ہے اور بہت کچھ چھپا رہا ہے۔“ وہ ذوقی انداز میں بولا۔

”مطلب یہ کہ اس کی زبان کا تالا پوری طرح تم سے کھل نہیں سکا؟“ میں نے سوالیہ نظریں سے حوالدار کی طرف دیکھا۔

”ایسی بات نہیں ہے ملک صاحب۔“ وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”تالا کٹدی سب کھل چکا ہے۔ اس نے مجھ سے التجا کی ہے کہ چند اہم باتیں وہ صرف آپ سے کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کی جان کو خطرہ ہے۔“

کرم داد کے سامنے بدری نے جو کچھ اگلا تھا، اس کا خلاصہ کچھ اسی طرح سے تھا۔ وہ اور اس کا ساتھی خاور ظفر پور کے قبرستان سے الیاس کی لاش لے آئے تھے۔ الیاس سے ان کی کوئی دشمنی تھی اور نہ ہی کوئی تعلق واسطہ۔ انہیں کسی خاص مقصد کے لیے بس ایک تازہ دفن شدہ لاش کی ضرورت تھی اور انہیں پتا چلا تھا کہ دو روز پہلے ظفر پور کے قبرستان میں دو میتوں کو دفن کیا گیا تھا۔ ظفر پور کے قبرستان میں داخل ہونے کے بعد وہ بوکھلا گئے اور غلطی سے صغریٰ کی قبر کو الیاس کی قبر سمجھ کر کھول لیا لیکن جب کفن کے اندر بالوں والی ایک عورت کی لاش نظر آئی تو وہ اسے وہیں چھوڑ کر الیاس کی قبر تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے کیونکہ انہیں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک ادھیڑ عمر مرد کی لاش کی ضرورت تھی اور الیاس کا مُردہ ان کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ وہ نہرو والی سڑک سے تیل گاڑی پر سوار ہو کر

آزاد پہنچی ہو۔ اس قسم کی ملازمت تمہارے بس کا کام نہیں۔“

”میں نے کہا تھا، یہ عارضی نوکری ہے۔۔۔۔۔“

”لیکن یہ بھی تو بتاؤ کہ اس نوکری کی نوعیت کیا ہے؟“

”چند ماہ کے بعد انکیشن ہونے والے ہیں۔“ بدری نے اس بندے کو تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں رانا صاحب کی انتہائی مہم کا نگران بن گیا ہوں۔ وہ پہلی مرتبہ انکیشن میں حصہ لے رہے ہیں اس لیے دل کھول کر پیسہ خرچ کر رہے ہیں اسی لیے اپنے بھی پیش لگے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔“

نزاکت علی اپنی تحقیقاتی رپورٹ دے کر رخصت ہو گیا تو میں اس نئی صورت حال پر غور کرنے لگا۔ رانا فیاض کی زبانی سیاست کی نئی بساط کی مجھے خبر ہو چکی تھی۔ اس مرتبہ رانا منور پہلی بار انکیشن میں حصہ لے رہا تھا اور وہ بھی اپنے بڑے بھائی رانا مظفر کے خلاف۔ دراصل وہ رانا مظفر کے ایک ویرینہ حریف لطیف چیمہ کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا تھا اور لطیف چیمہ کے مقابلے میں وہ رانا مظفر کو ہرانے کے لیے انتخابات میں شریک ہو کر ووٹرز کو تقسیم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ پرانی رنجشوں اور عداوتوں کے نتیجے میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ دشمنی کی اس فضا میں یہ سوچا جاسکتا تھا کہ بدری نے رانا منور کے ایما پر صغریٰ کی لاش کے ساتھ وہ بھی ایک مذاق کیا تھا۔ رانا منور اپنی بھائی کے لیے دل میں کوئی ایچھے چنڈ بات نہیں رکھتا تھا لیکن دو سوالات ایسے تھے جو کسی بھی صورت مجھے ہنسنے نہیں ہو پا رہے تھے۔

سوال نمبر ایک، صغریٰ کی قبر کو کھول کر بدری نے اس کی لاش کے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ تو مجھ میں آ رہا تھا لیکن الیاس کے ساتھ بدری کی یا رانا منور کی کیا دشمنی تھی؟ اس بے چارے کی لاش کو کہاں اور کس مقصد کے لیے غائب کیا گیا تھا؟ سوال نمبر دو، اگر بدری واقعی رانا منور کی سیاسی مہم کو چلا رہا تھا تو رانا منور اپنے سیاسی ورکر کی گرفتاری پر منہ میں جھنجھکیاں ڈالے کیوں بیٹھا تھا؟ بدری پچھلے میں، ہائیں گھٹنے سے پولیس کی تحویل میں تھا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ رانا منور کو اس کی گرفتاری کی خبر ہی نہ ہو پھر رانا کی اس پراسرار خاموشی کا کیا مطلب تھا؟

ان دونوں سوالات کے جوابات بدری ہی دے سکتا تھا۔

☆☆☆

اٹھارہ جنوری کی صبح خاصی خوشگوار تھی۔ اس روز مطلع صاف تھا۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا تاہم اس کی دھوپ میں وہ تمازت نہیں تھی جو موسم گرما کا خاصہ ہوتی ہے۔ آپ اس

اکثر اوقات کم عمری کی معصوم دوستی بھی بڑے رنگ دکھاتی ہے۔ وہ بھی اپنی چھوٹی سی دوست کی گم شدگی پر بے تحاشا افسردہ تھا اور اسی اداسی نے اس کے دل میں ایک جستجو پیدا کی، جس کی روشنی میں وہ اس گم شدگی کی اصل تہ میں پہنچ گیا۔

دانی میں استہجائی دانا کی سے کام لینے والے ایک بچے کی ذہانت

شاہ زین رضوان

گم شدہ



اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سفید سایہ لہرایا اور اس نے دیکھا کہ صوفی اس کے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ اکثر اسکول میں ملا کرتے تھے لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کب اس سے ملنے آئے گی۔

ان کی پہلی ملاقات سات ماہ قبل ہوئی تھی جب اس کی

میلیس جنگل میں گیلی زمین پر بیٹھا جلتی ہوئی موم بتی کو دیکھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے موم بتی کا شعلہ بھی بھی بھڑکنے لگتا۔ اس نے احتیاطاً اسے ایک سوڈے کی پرانی بوتل میں جھنسا دیا تھا۔ وہ نو سالہ لڑکا ذہنی دوپہر میں بڑی بے چینی سے کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک

چشم فتنہ پرور بدری کو گھور رہا تھا۔ وہ میری توقع سے کہیں زیادہ ہوشیار اور چالاک ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے ناپسندیدہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ تم نے پولیس کو اتنا بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ تم لوگوں کا جو بھی پروگرام تھا اس پر تم عمل نہیں کر سکتے۔ تم دونوں سے جو بھی سنگین غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کے حوالے سے میں تمہارے لیے مہیا کوش نکالنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے بتاؤ کہ اس مہلک منصوبے کا ماسٹر مائنڈ کون ہے؟“

”رانا مظفر.....!“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

”اس نے ہم دونوں کو پانچ پانچ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ایک ہزار ایدہ دس اور چار ہزار کام مکمل ہونے پر.....“

”تمہارا دماغ تو خشک ہے بدری.....؟“ میں شیشا کر رہ گیا۔

”میں بچ کہہ رہا ہوں تمہارے دار صاحب اور یہ بیان میں عدالت میں کھڑے ہو کر بھی دے سکتا ہوں۔“ وہ چٹائی لہجے میں بولا۔

”رانا مظفر نے ہم دونوں کو پانچ پانچ ہزار میں خرید لیا تھا اور ہمارے اس منصوبے کی کسی کو خبر نہیں۔ اس کام کو مکمل کرنے کے بعد خاور کسی اور ضلع میں جا کر نئی زندگی شروع کر دیتا۔ سب یہی سمجھتے کہ رانا منور کے ساتھ لطیف چیمہ کا ڈرائیور خاور بھی مل مرا۔“

میں نے خون سفید ہو جانے کے بارے میں پڑھا اور سنا تھا اور بعض اوقات قدرت اس کی عملی مثالیں بھی دکھا دیتی ہے۔ یہ بھی ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔

اسی دوپہر میں نے رانا مظفر کو اس کی حویلی سے گرفتار کر لیا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میں نے اس پر پکا ہاتھ ڈالا ہے تو وہ گردن جھکا کر بولا۔

”ملک صاحب! میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے چارو ناچار یہ سب کرنا پڑا۔ میں لطیف چیمہ کے ہاتھوں اپنی شکست کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔“

”پھر تو تمہیں لطیف چیمہ کی زندگی کا چراغ گل کرنا چاہیے تھا۔“ میں نے پیچھے انداز میں کہا۔

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”ہمارے ہوئے جواری پر ہاتھ اٹھانے کے بجائے آستین کے سانپ کا سر کلپنا زیادہ ضروری ہوتا ہے۔“

میں نے بھی رانا مظفر کو چارو ناچار زندگی بھر کے لیے جیل بھجوا دیا۔

(تحریر: حُسام بٹ)

ظفر پور کے قبرستان کو ادھیر ڈالا ہے؟“

”خاور میرا جگر یار ہے جناب۔“ اس نے بتایا۔

”اور یہ لطیف چیمہ کا ڈرائیور ہے۔“

”وی لطیف چیمہ جو رانا مظفر کے مقابلے میں انکیشن لڑ رہا ہے؟“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے سوال کیا۔ ”تو یہ ساری کارروائی تم لوگوں نے لطیف چیمہ کے ایما پر کی ہے..... رانا مظفر کو ذلیل و رسوا کرنے کے لیے؟“

”نہیں جناب!“ وہ نفی میں گردن جھکتے ہوئے بولا۔

”چیمہ صاحب کو تو اس واقعے کی خبر بھی نہیں۔“

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”پھر تو یقیناً اس کام کا حکم رانا منور نے دیا ہوگا؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

میری آنکھوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں بدری سے کہا۔ ”پھر مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم دونوں کا منصوبہ کیا تھا۔ تم نے کس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایسا اس کی لاش کو قبر سے نکال کر نہر کے پل کے نیچے چھپا رکھا ہے۔ آخر تم لوگ کرنا کیا چاہتے تھے؟“

”یہ منور صاحب کے قتل کا منصوبہ تھا۔“ وہ سنسنی خیز لہجے میں بتانے لگا۔

”رانا منور آج یعنی اٹھارہ جنوری کو ایک سیاسی جلسہ کرنے والے تھے۔ لطیف چیمہ نے انہیں جلسہ گاہ تک پہنچانے کے لیے ڈرائیور سمیت اپنی گاڑی بھیجی تھی۔ اس گاڑی کو نہر کے پل کے قریب سے گزرتا تھا۔ پروگرام کے مطابق.....“

لحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

”پل پر پہنچ کر خاور نے گاڑی کو کسی فنی خرابی کا بہانہ کر کے روک لیا تھا۔ اسی وقت میں نہر کے پل کے نیچے سے نکل آتا اور ہم دونوں مل کر رانا منور کو کھٹکانے لگے۔ پھر ایسا کی لاش کو ڈرائیونگ سیٹ پر ٹھونس کر گاڑی کو بندر آتش کر دیا جاتا۔ سوختہ گاڑی کے اندر سے بعد ازاں پولیس کو دو لاشوں کے کونے ملتے۔ ایک ڈرائیونگ سیٹ پر اور دوسرا آہنی نشست پر۔ اس صورت حال میں پولیس اسی نتیجے پر پہنچتی کہ کسی فنی خرابی کے باعث گاڑی کے انجن میں آگ لگ گئی ہوگی اور چشم زدن میں اس آگ نے گاڑی کے پینٹرل ٹینک تک پہنچ کر گاڑی کو ایک دھماکے سے اڑا دیا.....“

میں حیرت اور غصے کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ یک

ماں کے سنے بوائے فریڈ نے نشکی حالت میں اس کا چھپا کیا تو وہ ڈر کے مارے قریبی جنگل میں جا کر اسی جگہ چھپ گیا جہاں وہ اس وقت بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گھنٹوں میں سر دیے رو رہا تھا۔ اس لیے اس سات سال لڑکی کو نہ دیکھ سکا جو اس کے پیچھے چلتی ہوئی وہاں آگئی تھی۔ اسے لڑکی کی موجودگی کا احساس تب ہوا جب اس نے اس کے ہاتھ کو چھوا۔ اس نے چونک کر اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا لیکن جب اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑا تو بلیس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے تاوقتیکہ اس کے آنسو خشک نہ ہو گئے۔

صوفی اس کے برابر میں اپنے گھنٹوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوئی تھی۔ بلیس نے دیکھا کہ اس کے سنہری بال کبھی ہو رہے تھے اور پکڑوں پر دھبے لگے ہوئے تھے۔ اسے کھانسی بھی ہو رہی تھی۔

بلیس نے پوچھا۔ ”تمہیں اپنی جیکٹ دوں؟“

صوفی نے نفی میں سر ہلایا اور کمزور آواز میں بولی۔

”یہ موم بتی کہاں سے ملی؟“

”فادر گرگوری نے مجھے چرچ میں دی تھی۔“ بلیس نے جھوٹ بولا۔

”کیوں؟“

”شاید وہ میری مدد کرنا چاہ رہا تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے جیکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک دوسری موم بتی نکال کر اسے دی۔ یہ موم بتیاں اس نے گر جا کے اس کے کمرے سے چرائی تھیں جہاں تبرک چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ ”یہ تم رکھ لو۔“

یہ دوسرا موقع تھا جب اس نے صوفی کو کوئی تحفہ دیا۔ اس سے پہلے وہ اسے پلاسٹک کا تاج دے چکا تھا جو اس نے اپنی ایک گلاس فیلو سے چرایا تھا۔

صوفی نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ موم بتی پکڑ لی اور اسے یوں دیکھنے لگی جیسے وہ ایسی چیزوں سے ناواقف ہو۔ اس نے پوچھا۔ ”تم نے چرچ میں ان موم بتیوں سے کیا کام لیا؟“

”ہم نے آج گھانٹیک ہونے کی دعا کی۔“

”کیوں؟“

بلیس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ آج سینٹ بلیس کا دن ہے اور وہ موم بتی کے ذریعے لوگوں کے گلے کا علاج کرتے تھے۔“

”تمہارا نام بھی تو بلیس ہے۔“

”ہاں۔“ بلیس نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں

دکھاتا ہوں۔“

اس نے پوئل سے اپنی موم بتی نکالی اور صوفی سے اس کی موم بتی لے کر دونوں کو x کی شکل میں اوپر نیچے رکھا اور انہیں سروں سے پکڑ کر اس کے گلے کی دونوں جانب رکھ کر بولا۔

”اب دعا مانگو۔“

اس نے کوشش کی کہ پادری نے جو دعا مانگی تھی، وہ اسے یاد آجائے۔ ”ہم سینٹ بلیس سے دعا مانگتے ہیں کہ صوفی کا گلا اورو۔۔۔ اور۔۔۔ اس نے قریب ہو کر دیکھا کہ صوفی کی گردن کے گرد جاسنی رنگ کے زخم تقریباً اس کی قمیص کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ اسے ہر بیماری اور معیبت سے محفوظ رکھ۔ اس کی حفاظت فرما۔“

اس نے موم بتیاں نیچے کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے پوری دعا ٹھیک طرح یاد نہیں لیکن یہ اس سے بہت قریب ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے صوفی کی موم بتی اسے واپس کر دی۔

”شکریہ۔“ صوفی نے سر کوٹھکی۔

”اب تمہارا گلا خراب نہیں ہوگا۔“

اس کی خواہش تھی کہ وہ صوفی کو اپنے گھر مدعو کرنا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں بھی اس پر راضی نہیں ہوگی حالانکہ ان دونوں اس کا کوئی دوست ان کے ساتھ نہیں رہ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صوفی اپنے گھر واپس جائے کیونکہ وہاں کا ماحول اس کے لیے ٹھیک نہیں تھا۔ اس کے والدین کے بارے میں یہ افواہ گرم تھی کہ وہ اپنے گھر میں نشا آور دوامیہ (میٹھا ڈون) تیار کرتے ہیں۔ بلیس کی ماں نے اسے سختی سے دہاں جانے کے لیے منع کیا تھا کیونکہ وہ دو خطرناک اور معزز صحت تھی۔

اس نے صوفی کی جلد پر پڑے نشان دیکھ کر کہا۔ ”یہ کیسے آئے؟“

صوفی نے اپنا چہرہ نیچے کر لیا اور جواب میں کچھ نہیں بولی۔ چند لمحوں بعد بلیس نے چاروں طرف دیکھ کر محسوس کیا کہ اندر پوری طرح ٹھیک چکا ہے۔ اس نے کہا۔ ”اب ہمیں گھر جانا چاہیے۔“

صوفی نے اثبات میں سر ہلادیا اور بلیس اس کا ہاتھ پکڑ کر جنگل سے باہر آگیا۔ سڑک پر آنے کے بعد اس نے صوفی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل دی۔ بلیس اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو وہ بھی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگلے روز وہ اسکول نہیں آئی۔ بلیس نے کچھ خیال نہیں

کیا لیکن جب وہ مزید دو روز غیر حاضر رہی تو اسے فکر ہونے لگی اور وہ اس کا پتا لگانے چل دیا۔ اس کی کمر پر اسکول بیک لٹکا ہوا تھا اور وہ صوفی کے گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ بیرونی محسن کے چاروں طرف کافی اونچی زنجیر کی بازگئی ہوئی تھی اور ایک کھڑکی کا شیشہ غائب تھا۔ اس کی جگہ پلائی وڈ کے تختے نے لے لی تھی۔ بلیس نے بڑی مشکل سے گیٹ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

اچانک ہی ایک بڑے سرو والا کتا بھونکتا اور غراتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔ بلیس اسے دیکھتے ہی واپس ہولیا۔ کتے کی زنجیر کئی لمبی تھی تاہم اب وہ اس کی تنگی سے دور ہو چکا تھا۔ کتے نے مایوسی کے عالم میں ایک دردناک چیخ نکالی اور وہیں بیٹھ کر گرائے لگا۔

پیچھے ہٹتے ہوئے بلیس نے دیکھا کہ مکان کا بیرونی جالی والا دروازہ کھلا اور ایک دروازہ شخص قمیص کے بغیر باہر آیا۔ ”تم کون ہو؟“ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ ”اور یہاں کیا کر رہے ہو؟“

اس کے پورے جسم پر رنگے برنگے ٹیو بنے ہوئے تھے۔ بلیس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں سے دیکھنا شروع کرے۔

”بہتر ہے کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر میں نے کتے کی زنجیر کھول دی تو تم دس فٹ کا فاصلہ بھی طے نہیں کر سکو گے۔“

بلیس نے ماتھے پر سے بال ہٹائے اور بولا۔ ”میں صوفی سے ملنے آیا ہوں۔ وہ اسکول نہیں آ رہی۔ ٹیچر نے اس کا ہوم ورک بھیجا ہے۔“ اس نے آخری جملہ جھوٹ بولا تاکہ اس کے آنے کا جواز بن جائے۔

ایک چھوٹے قد کی سنہرے بالوں والی عورت اس آدمی کے برابر میں آکر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ ”یہ لڑکا کون ہے؟“

”میرا نام بلیس ہے۔ صوفی میرے ساتھ پڑھتی ہے۔“

”وہ بتا رہے۔“ اس عورت نے جواب دیا۔

”کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟“

”نہیں۔“ مرد بولا۔ ”وہ ہوم ورک نہیں کر سکتی۔ اس کی ماں نے ابھی بتایا تو ہے کہ وہ بیمار ہے۔“

بلیس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ”مجھے ہوم ورک دے کر اس کے دستخط لینے ہیں۔“

”لعنت ہو تم پر۔“ اس آدمی نے زمین پر تھوکتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے کہ میرا صبر جواب دے جائے، تم اپنی منہوس شکل لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہیں کسی نے

یہاں نہیں بھیجا۔ تم وہی ہونا جس سے وہ چوری چوری ملنے جاتی ہے۔“

اس نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں اس جنگل میں کیا کرتے ہو؟ تم مجھے ہو کہ مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن میری نظر ہر طرف رہتی ہے۔ تم نے اسے ہاتھ تو لگا ہواگا۔ اس کے علاوہ اور کیا کرتے رہے ہو؟“

اس سے پہلے کہ وہ مزید آگے بڑھتا، بلیس نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہاں سے دوڑ لگا دی۔ کچھ دور جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ شخص اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا۔ البتہ اس کا زوردار قہقہہ سنائی دیا۔

بیتے کے دن وہ اسکول کے دفتر گیا۔ ایڈمنسٹریٹر مسز روز نے اسے گھورا۔ ”کیا مسز جیمبر لین نے تمہیں دوبارہ بھیجا ہے؟“ اس کا اشارہ اسکول کی پرنسپل کی طرف تھا۔ بلیس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”پھر کس نے بھیجا ہے؟“

”کسی نے نہیں۔“

”پھر یہاں کیوں آئے ہو؟ اگر بیمار ہو تو تمہیں اسکول فز کے پاس جانا چاہیے۔“

”میں نہیں البتہ صوفی بیمار ہے۔“ بلیس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ وہ اسکول کب آئے گی۔“

”اوہ۔ اب بھی۔“ مسز روز نے کہا۔ ”لیکن میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ ہمیں کسی طالب علم کی بیماری کے بارے میں بتانے کی اجازت نہیں ہے۔ چاہے ہمیں پہلے سے معلوم کیوں نہ ہو۔ کاش مجھے۔۔۔۔۔“

”اس کا نام صوفی ہے۔“

”میں اس کا پورا نام جانتا چاہوں گی۔“

”کالڈویل۔۔۔۔۔“ سیکریٹری نے اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ”یہ صوفی کالڈویل کی بات کر رہا ہے۔ اس کی ماں نے دو دن پہلے اسے اسکول سے نکال لیا ہے اور وہ اپنے حقیقی باپ کے پاس رہنے چلی گئی ہے۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔“ مسز روز نے بلیس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کم از کم تمہیں یہ تو معلوم ہو گیا کہ اب وہ بیمار نہیں ہے۔“

”وہ کہیں نہیں گئی ہوگی۔“ بلیس نے منہ ہی منہ میں کہا۔

”میں سمجھی نہیں۔“ مسز روز بولی۔

”وہ مجھے بتاتے بغیر نہیں جاسکتی۔“ بلیس نے کہا۔

”اس نے مجھے خدا حافظ نہیں کہا۔“

”معاف کرنا لڑکے۔ مجھے بہت کام کرنا ہے۔“ مزر روز بولی۔ ”ممکن ہے کہ یہ سب اچانک ہوا ہو اور اسے خدا حافظ کہنے کا موقع نہ ملا ہو۔“

”بٹیس ہوسکتا۔“ اس نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”بٹیس.....!“ مزر روز بولی۔ ”تم مزر جیبر لین کے پاس جاؤ اور اسے اپنا مسئلہ بتاؤ۔ دو بارہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔“

اس کے بعد بٹیس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور اسکول کی شارٹ سے باہر آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ پرنسپل کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا بلکہ الٹا اس کی بے عزتی ہو جائے گی۔ اس لیے اس نے فی الوقت اس معاملے کو ملتوی کر دیا۔ اسے کچھ وقت درکار تھا لیکن وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اپنی سائیکل اٹھالی اور وہاں سے چل دیا۔

وہ اپنی سڑک سے گزر کر اس جگہ پہنچا جہاں اس نے آخری بار صوفی کو دیکھا تھا۔ وہ یہ اطمینان کرنے کے لیے رک گیا کہ وہاں کوئی پولیس کار یا کوئی اور شخص تو موجود نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھا اور اس جگہ سے گھومتا ہوا جہاں سڑک کے کنارے پکڑے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے، صوفی کے گھر کے نزدیک فٹ پاتھ پر پہنچ گیا۔ اس کی نظر ایک سائیکل پر پڑی جو گھر کے سامنے رکھے ہوئے ڈبوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ اسے دیکھنے کے لیے رک گیا۔ وہ ایک کھنٹی چھوٹی گلابی رنگ کی سائیکل تھی جس کے ہینڈل میں ایک کھنٹی بھی تھی۔ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔ وہ صوفی کی سائیکل تھی۔ پھر کتے نے اسے دیکھ لیا۔ جیسے ہی اس نے بھونکنا شروع کیا، بٹیس مڑا اور تیزی سے سائیکل چلائے ہوئے اتنی دور نکل گیا کہ کتے کے بھونکنے کی آواز اس تک نہ پہنچ سکے۔

اپنی پناہ گاہ میں پہنچ کر اس نے سانس پر قابو پایا اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا اس پر یقین کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صوفی اپنی سائیکل چھوڑ کر چلی جائے گی جبکہ اس نے حال ہی میں سائیکل چلانا سیکھی تھی۔ اگر انہوں نے واقعی صوفی کو اس کے باپ کے پاس بھیج دیا تھا تو انہوں نے اس کی سائیکل کو کوڑے کے ڈھیر میں پھینکنے کے بجائے اس کے ساتھ کیوں نہیں بھیجا؟ اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ضروری تھا کہ وہ صوفی کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش کرے۔

اس نے جمعے کے روز اسکول انتظامیہ سے جو

نا مناسب رویہ اختیار کیا تھا، اس کی سزا کے طور پر اسے ایک ہفتے کے لیے اسکول آنے سے روک دیا گیا۔ اس طرح اسے اپنے منصوبے کی تیاری کا موقع مل گیا۔ وہ اپنی ماں کی آنکھ بچا کر سر مار کرٹ جاتا اور وہاں سے گوشت کے پیکٹ چرا کر لے آتا۔ اس نے وہ سارے پیکٹ ایک تھیلے میں جمع کر کے اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے باہر رکھ دیے تھے۔

جب وہ صوفی کے گھر پہنچا تو اس کے انتظار میں تھا۔ پہلی رات اس نے گوشت کا پیکٹ اس طرح پھینک کر کتا اس تک یہ آسانی پہنچ سکے اور خود تیزی سے سائیکل چلاتا ہوا اندھیرے میں گم ہو گیا۔ دوسری رات جب کتے نے اسے جیکٹ سے گوشت کا پیکٹ نکالتے دیکھا تو بھونکنے کا ارادہ ملتوی کر دیا پھر وہ اس پر یوں بچھٹ پڑا جیسے اس نے چوٹیں کھینے سے کچھ نہ کھایا ہو۔ تیسری رات وہ اس راستے پر نظریں جمائے اس کا انتظار کر رہا تھا جہاں سے بٹیس آیا کرتا تھا۔ اس نے اپنے اگلے پنجے پہلے ہی سے باڑ پر رکھ لیے تھے۔ گوکہ بٹیس کو سائیکل سے اترتا دیکھ کر اس کے حلق سے ہلکی سی غراہٹ برآمد ہوئی لیکن وہ بھونکا نہیں۔ بٹیس نے گوشت کا ٹکڑا اس کی جانب بڑھایا۔ کتے کے خوفناک دانتوں اور اس کی آنکھوں کے درمیان چند انچ کا فاصلہ تھا۔ چوتھی رات بٹیس نے گوشت کا ٹکڑا دینے سے پہلے اس کے سر کو چھونے کا خطرہ مول لیا اور حیرت انگیز طور پر کتے نے اس کی اجازت دے دی۔ جب وہ اپنا کھانا ختم کر چکا تو اس نے دیکھا کہ بٹیس اب بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے سر جھکا لیا اور آگے پیچھے دم ہلانے لگا۔

بٹیس نے اپنا ہاتھ باڑ پر رکھا اور انتظار کرنے لگا۔ کتے نے ناگوں کے بل پر اپنے آپ کو اوپر اٹھایا اور اپنے محسن کی آنکھوں کو گھنٹے لگا پھر اس نے بٹیس کی ہتھیلی کو زبان سے چاٹنا شروع کر دیا۔

بٹیس نے مسکراتے ہوئے سر گھومی کی۔ ”گڈ بوائے ٹوٹی۔“ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کتے کو یہ نام کیوں دیا۔ شاید اس کے ذہن کے کسی کونے میں یہ نام پہلے سے موجود تھا۔ اس نے ایک بار پھر کہا۔ ”تم اچھے ہو ٹوٹی۔“ اور جب بٹیس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ تیزی سے دم ہلانے لگا۔

گھر کے اندر اونچی آواز میں میوزک بج رہا تھا۔ بٹیس نے کسی مرد کو تہقید لگاتے ہوئے سنا پھر وہ آواز کھاسی میں تبدیل ہو گئی۔ پورے گھر میں روشنی تھی جو کونے کے آخری سرے پر تھا اور بالکل اس کے بیڈروم جیسا لگ رہا تھا۔ اسے

یقین تھا کہ یہی صوفی کا کمرہ ہے۔ اس نے ٹوٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کل آؤں گا۔“

جب وہ اگلی رات وہاں پہنچا تو اس نے ٹوٹی کو اگلے بچوں سے زمین کھودتے اور مٹی کو ادھر ادھر کرتے دیکھا۔ وہ اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں تک اس کی زنجیر جاسکتی تھی۔ بٹیس نے باڑ کے قریب پہنچ کر ہلکے سے مٹی کی آواز نکالی۔ کتے نے سر اٹھایا اور اپنا کام چھوڑ کر باڑ کی طرف لپکا۔ بٹیس نے اسے اپنے ہاتھوں سے گوشت کھانا شروع کیا اور اس دوران وہ اس کے سر پر ہاتھ بھی پھیرتا رہا۔ جب سارا گوشت ختم ہو گیا تو اس نے ایک بار پھر اسے چھگی دی اور سرگوشی میں کہا۔ ”گڈ بوائے ٹوٹی۔“ پھر وہ باڑ سے کود کر اندر آ گیا۔ اس نے جیکٹ اتار کر زنجیر پر ڈالی اور صوفی کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ کتا اس کے ساتھ ساتھ گیا جہاں تک اس کی زنجیر جاسکتی تھی۔ پھر وہ اپنی مخصوص جگہ پر دوبارہ دیکھا اور ڈھکنا ڈبے پر دوبارہ رکھ دیا۔

بٹیس نے جینز کی جیب سے اسکرڈر اٹھایا اور صوفی کے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر اس نے دیکھا کہ کھڑکی کے عین نیچے سینٹ کا ایک بلاک رکھا ہوا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ صوفی اس کے ذریعے کمرے میں آتی جاتی ہوگی۔ اس بلاک نے اس کا کام آسان کر دیا تھا۔ اس نے بلاک پر کھڑے ہو کر اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں سوائے سنگرامیز اور بیڈ کے کچھ نظر نہیں آیا۔ جب اس نے پردے کی ڈوری کھینچی تو وہ اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اب اسکرڈر اٹھایا کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ لہذا اس نے اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے تیز موسیقی کے ساتھ ساتھ ایک مرد اور عورت کی نشے میں ڈوبی ہوئی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے کسی کیسیٹیں اور گیسولین کی بوتلی بھی محسوس کی۔

اس نے اپنا منہ اور ناک ڈھانپنے کے لیے قمیص اوپر کھینچی لی پھر وہ کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی پھر سرگوشی میں کہا۔ ”صوفی! کیا تم یہاں ہو؟“

اسی لمحے خطرہ مول لیتے ہوئے اس نے لائٹ روشن کر دی جو اس نے اپنی ماں کی پیمن سے لگائی تھی اور اس کی روشنی میں کمرہ کا جائزہ لینے لگا۔ بستر، چھوٹی سی سنگرامیز، ٹوٹا ہوا آئینہ اور اس کے سامنے رکھی کرسی، سب کچھ اس کے سامنے تھا۔ فرش پر ایک بالوں کا برش پڑا ہوا تھا جس کے دندانوں میں سنہری بال پھنسے ہوئے تھے۔ کھلی ہوئی الماری

میں اس نے صوفی کے کئی عمدہ جوڑے دیکھے جو بے ترتیبی سے لٹکے ہوئے تھے اور اتنی ہی تعداد میں اس کے کپڑے ایک ڈھیر کی شکل میں گرد آلود فرش پر پڑے ہوئے تھے۔

بٹیس جانتا تھا کہ وہ اپنے کپڑے اور بالوں کا برش چھوڑ کر نہیں جاسکتی تھی لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس کے باپ نے اسے نئی چیزیں خرید کر دینے کا وعدہ کیا ہو لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا چیز چھوڑ کر نہیں گئی ہوگی۔ اس کے کمرے میں کچھ فرنیچر ایسا تھا جہاں وہ اپنی چیزیں چھپا سکتی تھی۔ وہاں کی تلاش لینے کے بعد وہ بیڈ کے نیچے جھک گیا۔ وہاں اسے گتے کا بنا ہوا جوتوں کا ڈبا نظر آیا۔ اس نے نارنج منہ میں دبا کر اس کا ڈھکنا ہٹایا اور اس میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے آنکھیں سکر

دوبارہ دیکھا اور ڈھکنا ڈبے پر دوبارہ رکھ دیا۔ کمرے کا چکر لگاتے ہوئے اس کی نظر سنگرامیز پر رکھی ایک ٹوٹی ہوئی رنگین پتسل پر پڑی۔ اس نے اسے اٹھایا۔ وہ بال کے دروازے تک گیا اور اپنے کان اس طرف لگا دیے لیکن موسیقی اور مرد و عورت کی بے ربط باتوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ اس نے دروازہ کھول کر برآمدے میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سفید دیوار پر جلی حرف میں لکھ دیا۔ ”صوفی کہاں ہے؟“

اپنے کام سے مطمئن ہونے کے بعد وہ واپس کمرے میں گیا۔ جوتوں کا ڈبا اٹھایا اور کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اسے کمرے سے باہر آتا دیکھ کر ٹوٹی نے چھوٹی سی چھلانگ لگائی۔ اس کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی اور دم آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ بٹیس اسے نظر انداز کر کے باڑ پر سے کود گیا اور سائیکل پر سوار ہو کر رات کی تاریکی میں اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ جوتے کا ڈبا اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔

جنگل میں اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ کر اس نے سائیکل سے چھلانگ لگائی اور گیلی زین پر بیٹھ کر ایک مرتبہ پھر ڈبا کھولا۔ پتسل نارنج کی روشنی پلاسٹک کے تاج پر لگی جس میں مصنوعی موتی جڑے ہوئے تھے۔ اس کے برابر ہی ایک سفید موم بتی رکھی ہوئی تھی۔

بٹیس نے اپنا سر کھنٹوں پر رکھا اور زار و قطار رونے لگا۔

☆☆☆

آوازوں کا شور سن کر اس کی آنکھ کھلی گئی۔ آوازیں بہت قریب سے آرہی تھیں۔ ایک مرد اور عورت غضب ناک انداز میں اپنی جہاز اس ناکل رہے تھے۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ صوفی کے کمرے میں سو گیا تھا لیکن پھر ایک تیسری آواز

بھی شامل ہوگئی جس کا لہجہ مدافعت تھا۔ وہ اس کی ماں کی آواز تھی۔ تب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنے ہی بستر پر ہے اور وہ لوگ اس کے گھر میں آکر شر شرابا کر رہے تھے۔

وہ اپنے بستر سے اٹھا اور لیوگ روم کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے دیکھ کر قحطی طور پر وہ لوگ خاموش ہو گئے۔ وہ مرد اور عورت ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

”بھئی ہے وہ۔“ مرد نے اس کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک دن ہمارے گھر کے گرد چکر لگا رہا تھا لیکن میں نے اسے بھگا دیا لیکن گزشتہ شب یہ ہمارے مکان میں داخل ہو گیا اور ہماری دیوار پر ایک عبارت لکھ کر گیا۔ یہ انتہائی بدگیز لڑکا ہے۔“

”تم میرے بیٹے کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال نہیں کر سکتے۔“ ٹیلیس کی ماں نے جوابی وار کیا۔ ”میں اپنے گھر میں ایسی باتیں برداشت نہیں کر سکتی۔“ پھر وہ ٹیلیس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”یہ جو کہہ رہے ہیں، کیا یہ درست ہے؟ کیا تم گزشتہ شب ان کے گھر گئے تھے؟“

ٹیلیس نے ان لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں صوفی کو تلاش کر رہا ہوں۔“

”اب وہ اپنے باپ کے ساتھ رہ رہی ہے۔“ صوفی کی ماں نے کہا۔

”یہ فضول بات ہے۔“

”ٹیلیس! اس کی ماں نے ڈانٹا۔ ”تم کس طرح بات کر رہے ہو؟“

”وہ وہیں ہے۔“ صوفی کی ماں نے اصرار کیا۔

”اب وہ وہاں نہیں آئے گی۔“

”کم از کم تمہیں اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے۔“ مرد نے کہا۔ ”میں پولیس کو فون کرنا نہیں چاہتا البتہ تمہیں اس دفعہ وارننگ دے رہا ہوں۔“

”جاؤ پولیس کو فون کرو۔“ ٹیلیس نے اسے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح تمہاری پریشانی بڑھ جائے گی۔“

”کنیا کی اولاد۔“ وہ آدمی دانت پیستے ہوئے بولا۔

”مجھے چاہیے تھا کہ اسی وقت تمہاری ہڈی پکلی ایک کر دیتا۔“

”بہت ہو گیا۔“ ٹیلیس کی ماں چلائی۔ ”تم دونوں اسی وقت میرے گھر سے چلے جاؤ۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میرے گھر میں آکر مجھے اور میرے بیٹے کو دھمکیاں دو گے؟“ پھر وہ عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ”اور

تمہیں کس نے میرے گھر میں سگریٹ پینے کی اجازت دی۔ میں پولیس کو فون کرتی ہوں۔ اب باقی باتیں ان کے سامنے ہوں گی۔“

صوفی کی ماں نے دروازے کی طرف پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ البتہ مرد ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے باری باری ٹیلیس اور اس کی ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں مجھ سے دشمنی مول نہیں لینی چاہیے۔“

”میں تمہیں دشمن ہی سمجھتا ہوں۔“ ٹیلیس نے کہا۔

”تم جانتے ہو یا میں پولیس کو بلاؤں۔“ ٹیلیس کی ماں نے فون پر انگلیاں مارتے ہوئے کہا۔

وہ شخص دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے ٹیلیس سے بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے اور تم بھی یہ بات جانتے ہو۔“

ان کے جانے کے بعد ٹیلیس کی طرف مڑا اور اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ ماں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”ٹیلیس! تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ وہ لوگ گزشتہ شب شاید تمہیں مار ڈالتے۔ کیا تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی؟“

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اس کے کندھے پر کپڑے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ ”تم ہی میرے لیے سب کچھ ہو ٹیلیس۔ پلیز ایسی امتحانہ حرکیں نہ کرو۔ بولو..... آئندہ ایسا نہیں کرو گے؟“

ٹیلیس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ہمیشہ کی طرح جھوٹ بولا۔ ”ٹھیک ہے ماما..... میں کروں گا، میں وعدہ کرتا ہوں۔“

☆☆☆

”تمہارا خیال ہے کہ صوفی کی ماں اور اس کے دوست نے صوفی کے ساتھ کچھ برا کیا ہے؟“

اسکول ریسورس آفیسر مسٹر آرنلڈ نے ٹیلیس سے پوچھا۔ اس وقت وہ اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ٹیلیس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟“

”اس کے پڑے اب بھی نہیں ہیں۔“ ٹیلیس نے یہ نہیں بتایا کہ اسے یہ بات کیسے معلوم ہوئی۔ مسٹر آرنلڈ نے لہجہ بھر کے لیے اسے غور سے دیکھا لیکن اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔

”ممکن ہے کہ وہ ان کپڑوں کو ساتھ لے جانا نہ چاہتی ہو۔ شاید اس کا باپ اسے نئے کپڑے خرید کر دے۔ کیا تم

نے یہ بات نہیں سوچی؟“

”وہ اس کے علاوہ اور بھی چیزیں چھوڑ گئی ہے۔“

”مثلاً؟“

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”کچھ چیزیں جو میں نے اسے دی تھیں۔“

”کیا صوفی تمہاری دوست تھی؟“ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ٹیلیس اس سلسلے میں مسز روز کے پاس بھی گیا تھا۔ ٹیلیس کو اپنا چہرہ گرم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کے پاس وہ الفاظ نہیں تھے جن کے ذریعے وہ صوفی کے بارے میں اپنے محسوسات بیان کر سکتا۔ لہذا کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”یعنی تم نہیں سمجھتے کہ اسے یہ چیزیں یہاں چھوڑنی چاہیے تھیں؟“ ٹیلیس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”اس کے علاوہ تم نے کوئی بات نوٹ کی؟“

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دباتے ہوئے کچھ سوچا پھر کہنے لگا۔ ”وہ وہاں نشیات بناتے ہیں۔“

آرنلڈ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”ہر کوئی یہ جانتا ہے۔“

آرنلڈ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کیا کروں گا۔ میں صوفی کے باپ کو فون کر کے کہوں گا کہ وہ میری صوفی سے بات کرائے۔ اگر وہ وہاں ہے تو تمہیں اطمینان ہو جائے گا اور تم جان جاؤ گے کہ وہ خیریت سے ہے اور اگر نہیں تو دیکھیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ ٹیلیس اس تجویز سے متفق ہوتے ہوئے بولا۔ ”لیکن وہ وہاں نہیں ہوگی۔“

”اس دوران میں تم صوفی کے گھر سے دور رہنا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“ ٹیلیس نے ایک بار پھر رضامندی ظاہر کر دی۔

☆☆☆

اس رات جب وہ صوفی کے گھر آیا تو اس نے محسوس کیا کہ کیسیل کی بواب نہیں آ رہی تھی۔ موسیقی کی آواز بھی بالکل تھی اور سب سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ ٹونی باڑ پر اس کا انتظار نہیں کر رہا تھا۔ اسے یہ سوچ کر پریشانی ہو رہی تھی کہ ان لوگوں نے ٹونی سے ناراض ہو کر اس لیے تو جان نہیں چھڑائی کہ اس نے ٹیلیس کو گھر کے اندر آنے دیا۔

وہ باڑ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا غبی محن تک آیا اور خطرہ مول لیتے ہوئے پشیل نارنج روشن کر کے لان کا جائزہ

لینے لگا۔ ٹونی اپنی جگہ پر نہیں تھا پھر وہ اسے صوفی کی کھڑکی کے نیچے نظر آ گیا۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں بے چین تھیں اور گزردہ جسم لرز رہا تھا۔ اس کی زنجیر چھوٹی ہو کر اتنی رہ گئی تھی کہ وہ محض چند فٹ تک حرکت کر سکے۔

ٹیلیس نے نارنج بند کی اور اس کے قریب جا کر سرگوشی میں بولا۔ ”ٹونی! میں آ گیا ہوں۔ ٹکری کوئی بات نہیں۔ میں تمہارا ڈرنے لے کر آیا ہوں۔“

ٹونی نے پھر بھی کوئی حرکت نہیں کی۔ ٹیلیس نے دیکھا کہ اس کی ایک ٹانگ زمین سے چند انچ اوپر اٹھی ہوئی ہے اور اس کے سر پر دو تازہ زخم بھی نظر آرہے تھے۔

ٹیلیس نے اپنی جیکٹ اتاری اور اسے باڑ پر پھینکنے والا ہی تھا کہ اچانک ہی اپنی جگہ پر جم رہا ہوا۔ صوفی کی کھڑکی کے تاریک شیشے کے پیچھے کچھ لٹل و حرکت نظر آئی۔ ٹیلیس نے سوچا کہ یہ ایک جال ہے۔ وہ کوشش کر رہے تھے کہ ٹیلیس محن یا مکان میں آجائے۔ کئی قدم پیچھے ہٹتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ خوف سے زیادہ اس پر غصہ غالب آ رہا ہے۔

اس دوزخی جوڑے نے نہ صرف اس کی اکھوتی دوست کو غائب کر دیا تھا بلکہ ٹونی کو بھی بری طرح زخمی کیا اور اب اسے چارے کی طرح استعمال کر رہے تھے۔ اس نے گوشت کا کٹورا باڑ پر سے ٹونی کی طرف پھینکا اور واپسی کی راہ لی۔

☆☆☆

”اس نمبر پر صوفی کے باپ سے رابطہ نہ ہو سکا۔“

آرنلڈ نے وضاحت کرتے ہوئے ٹیلیس کو بتایا۔ ”لہذا میں خود صوفی کی ماں سے بات کرنے گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے پاس مسٹر کالڈویل کا یہی نمبر ہے۔“

وہ دونوں کھیل کے میدان کے کنارے پر کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے لڑکے کھیل کے دوران انہیں وقفے وقفے سے کن انہیں سے دیکھ رہے تھے۔

”میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔“ پھر اسے ایک خیال آیا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم گھر کے اندر گئے تھے؟“

”ہاں۔“ آرنلڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس نے مجھے اندر بلایا تھا۔“

”پھر تم نے گھر کی تلاش کی؟“

”نہیں۔ ہم نے لیوگ روم میں ہی چند منٹ بات کی۔ میرے پاس مکان کی تلاشی لینے کی کوئی وجہ نہیں تھی اور یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ ویسے بھی سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا۔ میں نے وہاں کچھ غلط نہیں دیکھا۔“

”کوئی ناگوار پوچھوس نہیں ہوئی؟“
”نہیں بلکہ سب فریضہ کی مہک آ رہی تھی۔“

بلیس نے سوچا کہ اس سے بہت بڑی حماقت سرزد ہو گئی جو اس نے دیوار پر وہ تحریر لکھی۔ اس طرح وہ لوگ محتاط ہو گئے اور انہیں منصوبہ بندی کے لیے وقت مل گیا۔

”میں نے فورون دن اور انٹرنیٹ کے ذریعے بھی مسٹر کالڈویل کا کوئی انمبر معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ابھی تک کچھ نہیں ملا۔“

آرنلڈ نے بلیس کے چہرے پر ہاپوی اور ناامیدی دیکھی تو اسے تسلی دینے کے لیے بولا۔ ”بلیس! اگر میرے بس میں ہوتا تو اس سے بھی زیادہ کچھ کرتا لیکن میں قانون کو بھی دیکھتا ہوں۔ یہ کوئی فی وی یا ظلم کا سین نہیں ہے۔ کسی کے گھر کی تلاشی لینے کے لیے میرے پاس وارنٹ ہونا چاہیے۔ ہم کسی کے گھر کی تلاشی صرف اس لیے نہیں لے سکتے کہ ان کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھی نہیں ہے یا برورسی۔ ان کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔“

”پھر ہمیں کیا چاہیے؟“
”ہمیں جرم کا ثبوت چاہیے ہوتا ہے یا کم از کم کوئی شے والی بات۔ بعض اوقات ہمیں یہ معتبر ذرائع سے مل جاتی ہیں بشرطیکہ وہ کوئی پچھندہ ہو۔“ آرنلڈ نے بلیس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”عام طور پر عدالت نابالغ بچوں کی اطلاع پر مجبور نہیں کرتی۔“

بلیس نے کندھے اچکائے اور کہا۔ ”اس کے علاوہ اور کیا طریقہ ہو سکتے ہیں؟“

اب آرنلڈ کی کندھے اچکانے کی باری تھی۔ ”میرا خیال ہے کہ ہنگامی حالات میں یہ ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک پولیس آفیسر کسی گھر سے چلانے کی آواز سنتا ہے تو اسے سرچ وارنٹ کی ضرورت نہیں۔ وہ سیدھا مکان کے اندر جا سکتا ہے کیونکہ اس کے پاس یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہوتی ہے کہ شاید کسی کی زندگی خطرے میں ہو۔“

”اوہ۔۔۔۔۔۔“
”لیکن یہاں ہم اس طریقے پر عمل نہیں کر سکتے۔“
”وقت ختم ہونے کی گھنٹی بجی تو بلیس نے بھی ہوتی آواز میں کہا۔ ”اب مجھے چلنا چاہیے۔“

☆☆☆

بلیس نے رات کو سونے سے پہلے چار بجے کا الارم لگا دیا تھا۔ الارم بجتے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شرطیہ کہہ سکتا تھا کہ اس وقت صوفی کی ماں اور اس کا دوست گہری نیند سو

رہے ہوں گے۔ وہ چلاٹنگ مار کر بستر سے اٹھا۔ اس نے پہلے سے ہی سیاہ جینز اور سیاہ ڈھالی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے ربر کے جوتے پہنے اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا کھڑکی تک گیا اور آہستہ سے باہر نکلا۔

اس نے اپنی سائیکل گھر کے عقب میں کھڑی کی اور پیدل ہی چل دیا۔ اس کے پاس دو چیزیں تھیں جن کا انتظام اس نے پہلے ہی کر لیا تھا۔ توقع کے مطابق صوفی کا مکان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کوئی لائٹ روشن تھی اور نہ ہی کوئی آواز آ رہی تھی۔ تاہم وہ اپنے اطمینان کے لیے کچھ دیر مرکز پر موجود گاڑیوں کی آڑ میں کھڑا ہو کر دیکھتا رہا۔ مطمئن ہونے کے بعد اس نے دونوں چیزیں اٹھائیں اور باڑ کے ساتھ چلتا ہوا عجبی محن تک آ گیا۔ وہاں رک کر اس نے ایک بار پھر مکان کا جائزہ لیا۔

نوٹی اب بھی صوفی کی کھڑکی کے نیچے موجود تھا۔ بلیس نے اس سے کوئی بات یا سرگوشی کرنے کے بجائے صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ جواب میں نوٹی نے بھی اسے پچھان کر دم ملا دی۔ بلیس نے اپنی جیکٹ اتار کر باڑ پر لٹکائی اور دونوں چیزیں ایک ایک کر کے باڑ کی دوسری طرف رکھ دیں پھر وہ بھی باڑ چلاٹنگ کر اندر آ گیا پھر اس نے پہلی چیز اٹھائی جو ایک پتھر کی تختی تھی اور اسے سیدھا کر کے نرم زمین میں گاڑ دیا پھر دوسری چیز اٹھا کر گھر کی طرف چل دیا۔

عجبی دیوار پر پہنچ کر مٹی کے تیل کا کنٹر کھولا اور دیوار کی بنیادوں میں ڈالنا شروع کر دیا۔ یہ پلاننگ کا کنٹر اس نے بڑوبی کے شڈ سے چرایا تھا اور اس میں صرف دو لیٹن کی محتاش تھی لہذا بلیس کو کفایت شعاری سے کام لینا پڑا۔ اس کام میں اسے پانچ منٹ لگے اور وہ واپس اس جگہ آ گیا جہاں نوٹی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے تاریک کھڑکی کے نیچے دیکھا اور خود بھی وہیں بیٹھ گیا۔

چند لمحوں تک نوٹی کا سر ہلانے کے بعد بلیس نے مکان کی بنیادوں سے لے کر اس جگہ تک تیل چھڑک دیا جہاں پہلے بھی نوٹی اپنے بچوں سے زمین کھودتا تھا۔ اس نے تیل کا آخری قطرہ تک استعمال کر کے ممکنہ حد تک پوری جگہ کو بھگو دیا پھر وہ نوٹی کے پاس آیا اور اس کا پتا پکڑ کر بولا۔

”نوٹی۔ تم اچھے بچے ہو۔“

جیسے ہی نوٹی کو آزادی ملی، اس نے محن میں ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھوک کر خوشی کا اظہار کرتا، بلیس نے دوڑ کر گیت کھول دیا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ماچس نکالی۔ مین اسی وقت چکن کی لائٹ

روشن ہوئی۔ اس کا دروازہ اس جگہ سے چند فٹ کے فاصلے پر تھا جہاں وہ اکثر دو بیٹھا ہوا تھا۔ نوٹی دور جا چکا تھا اور اس کے بھونکنے کی آواز اب نہیں آ رہی تھی۔

اس نے ماچس کی تیلی جلا کر اس جگہ ڈال دی جہاں مٹی کا تیل چھڑک گیا تھا۔ اس نے فوراً ہی آگ پکڑی اور ایک نیلا شعلہ دو مختلف اطراف میں دوڑنے لگا۔ آگے چل کر اس نے ایک اور سمت بھی پکڑی۔ بلیس گیت کی طرف بڑھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

جب وہ کتے کے ہمراہ سڑک پر پہنچا تو اس نے تیسرے شعلے کا دھماکا سنا جو اپنے گول پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ نارنجی رنگ کے شعلوں نے فٹ ہاتھ اور وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جیسے سورج اچانک ہی نکل آیا ہو پھر ایک مرد کے چلانے کی آواز آئی۔

”آگ۔۔۔۔۔۔ آگ۔۔۔۔۔۔ ہمارے گھر میں آگ لگ گئی۔“

بلیس نوٹی کو لے کر گھر کی جانب دوڑ پڑا۔

☆☆☆

کچھ دیر بعد وہ آنکھیں ملتا ہوا بیڈروم سے باہر آیا اور

ماں سے پوچھنے لگا۔
”یہ کیا شور ہے؟ سائرن کی آواز کیوں آ رہی ہے؟“

”آگ لگ گئی ہے۔“ ماں نے لیوگ روم کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ”صوفی کے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔“

بلیس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
”واقعی۔۔۔۔۔۔؟ کیا میں دیکھنے جا سکتا ہوں؟“

”نہیں۔ تمہیں نہیں جانا چاہیے۔“
بلیس کو کھلی ہوئی کھڑکی سے شعلے نظر آ رہے تھے۔ اس کا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

”یہ شاید ان فشیات کی وجہ سے لگی ہے جو وہ اپنے گھر میں بناتے تھے۔“

ماں نے مڑ کر اسے دیکھا جیسے وہ کچھ مختلف سوچ رہی تھی۔ ”بلیس۔۔۔۔۔۔“ اس نے بولنا شروع کیا پھر رک گئی۔

”کیا میں بعد میں جا سکتا ہوں؟“ اس نے پوچھا۔
”جب آگ بجھانے والی گاڑیاں چلی جائیں تو تم اپنی سائیکل پر اسکول جا سکتے ہو۔“ ماں نے کہا پھر بولی۔

”کیا تم نے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنی؟ لگتا ہے کہ وہ ہمارے گھر کے قریب سے ہی آ رہی ہے۔“

واپس جاتے ہوئے وہ بولا۔ ”نہیں! میں نے کچھ

نہیں سنا۔“ ابھی اسے سوچنا تھا کہ وہ اپنے محن میں کتے کی موجودگی کی کیا وضاحت پیش کرے گا۔

وہ دن کی روشنی میں آہستہ آہستہ سائیکل چلاتا ہوا صوفی کے مکان تک پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اب بھی اپنی جگہ پر موجود تھا۔ گوکہ اس کی بنیادیں جھک گئی تھیں لیکن چھت کے ایک کونے نے ہی آگ پکڑی تھی۔ اب وہاں صرف ایک آگ بجھانے والی گاڑی باقی رہ گئی تھی اور اس کا عملہ پانی کا ہلکا چھڑکاؤ کرنے کے بعد فسی مذاق میں مصروف تھا۔

عجبی محن میں لگنے والی آگ نے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی تھی۔ بلیس نے دیکھا کہ وہاں کئی بارودی پولیس والوں کے علاوہ تین ساؤہ لباس والے بھی موجود تھے جن پر انہیں شبہ تھا کہ وہ بھی پولیس والے ہیں۔ وہ سب جلی ہوئی زمین پر اس دھبے اور نشانی کو دیکھ رہے تھے جو بلیس نے وہاں چھوڑی تھی۔ ان میں سے ایک اس نشان کو بالکل قریب سے دیکھنے لگا۔ بلیس نے اسے پہچان لیا۔ وہ آرنلڈ تھا۔

اسی وقت اس نے کسی کی گھنٹی ہوئی اور رونے کی آوازیں سنیں۔ جیسے کوئی بدعادے رہا ہو۔ وہ آوازوں کی جانب پلٹا تو اس نے دیکھا کہ نیٹو والا شخص ایک پیٹرول کار کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے بالکل پیچھے ایک دوسری پولیس کار میں صوفی کی ماں بیٹھی ہوئی رو رہی تھی اور ناگوار طریقے سے چلا رہی تھی۔ بلیس نے صرف یہ دیکھا کہ ان دونوں کے ہاتھ پشت سے بندھے ہوئے تھے۔ جب پہلی مرتبہ بلیس کی ان دونوں سے ملاقات ہوئی تھی تو اس نے اپنی درمیانی انگلی اور اٹھا کر انہیں سلپٹ کیا تھا۔ اس مرتبہ اس میں ایک طنزیہ مسکراہٹ بھی شامل ہو گئی۔

اس نے اپنی نظریں وہاں سے ہٹائیں تو دیکھا کہ آرنلڈ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنا بازو نیچے کیا اور سائیکل پر سوار ہو کر تیز پیڈل مارتا ہوا اسکول کی جانب روانہ ہو گیا۔

آرنلڈ نے بچ کے بعد اسے اپنے کمرے میں بلایا لیکن اس بار بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔ بلیس اس کی میز پر رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

”تم اپنے نام کے بچے کس طرح کرتے ہو؟“
آرنلڈ نے پوچھا۔

بلیس اس بے شک سوال پر حیران تو ہوا لیکن اس نے بچے بتا دیے۔

”اوہ۔۔۔۔۔۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ”بلیز“ ہوگا۔ اس کا

یہ کھڑکی باہر لان میں کھلتی تھی اور کھڑکی کی سیدھ میں ہی سانسے بیرونی پتھر کا چھوٹا کمرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کا محور و مرکز یہی پتھر تھا۔ کیونکہ آج رات کو کسی بھی وقت اس پتھر میں کسی چور کی آمد متوقع تھی اور وہ اس چور کا منظر واضح نظر آتا رہے۔

پاگل ممتا

فہمی سرورس

جیسے کوئی قطرہ قطرہ اپنی دولت جمع کرتا ہے اور پھر اس کی حفاظت کے لیے بے چین رہتا ہے، ممتا کی بھی کچھ ایسی ہی کہانی ہے۔ وہ بھی اپنے بچوں کی محبت میں پاگل تھی مگر صد افسوس کہ اس کی ممتا کی دیوانگی پر اس کے اپنے ہی خون نے پاگل پن کی مہر ثبت کر دی۔... ایسے میں دل نہ ٹوٹے تو کیا ہو۔

اولاد کے ناز اٹھانے والی ایک ماں کا پاگل پن



سے نیچے کی جانب اشارہ کیا تھا۔ آرنلڈ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ”اس کا خیال تھا کہ اس سے پولیس والوں کو کچھ مدد ملے گی کیونکہ میں صوفی کے باپ تک نہیں پہنچ سکا اور نہ ہی اس کا اتنا پتا معلوم ہوا۔ اس لیے میں نے ایک تربیت یافتہ کتا منگوانے کے لیے کہا جو زمین میں دفن یا چھپائی گئی لاشوں کا پتا لگاتا ہے۔“

”پھر کیا ہوا؟“

”اس نے لاش دریافت کر لی۔“

”کیا وہ صوفی کی لاش تھی؟“

”ہاں۔“ آرنلڈ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں یقین ہے کہ وہ صوفی ہی ہے۔“

”اوہ میرے خدا۔“ پلیس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا

چہرہ چھپالیا۔

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صوفی کی ماں اور اس کا آٹھاب باقی ساری زندگی جیلی میں گزاریں گے۔“

”لیکن انہوں نے صوفی کو قتل کیوں کیا؟“

”وہ اب بڑی ہوری بھی اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ

یہ دونوں خشیات کے کاروبار میں ملوث ہیں پھر اس نے تم

سے بھی ملنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں ڈر ہوا کہ وہ کہیں تمہیں

اس بارے میں کچھ نہ بتا دے۔ اس کے بعد ان کے لیے

اس کاروبار کو جاری رکھنا مشکل ہو جاتا۔ پہلے انہوں نے

کوشش کی کہ اس کا حقیقی باپ اسے آکر لے جائے لیکن

جب اس نے کوئی دیکھی ظاہر نہیں کی تو انہوں نے صوفی کو

راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر تم صوفی کی تلاش

میں وہاں نہ جاتے تو کبھی اس کی کشدگی کا معاملہ نہ ہوتا۔“

پلیس کی آنکھ سے ایک قطرہ پکا اور وہ اپنا گال پونچھتے

ہوئے بولا۔ ”مجھے خوشی ہے کہ میں اس کے کسی کام آکا۔“

اس رات صوفی کی تدفین کے بعد پلیس، ٹونی کے

ہمراہ دوبارہ قبرستان آیا۔ صوفی کی قبر پر نیا کتبہ لگا دیا گیا

جس پر اس کا نام، تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج تھی۔

اس نے جو تے کا ڈبا کھول کر دونوں موم بتیاں نکالیں۔

انہیں الگ الگ سوڈے کی خالی بوتلوں میں رکھا پھر انہیں

روشن کر کے قبر کے سر ہانے دونوں طرف رکھ دیا پھر پلاسٹک

کا تاج نکال کر کتبے پر لٹکا دیا۔ جو چیزیں صوفی چھوڑی تھی،

وہ اس نے اس تک پہنچا دیں پھر احتراماً صوفی کی قبر کے

سر ہانے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ دوست کو خراج عقیدت پیش

کرنے کا یہی طریقہ اس کی سمجھ میں آیا۔

مطلب تو تم سمجھتے ہو نا..... آگ کا بھڑکنا، جیسی آگ آج صبح صوفی کے گھر میں لگی؟“

پلیس نے کوئی جواب نہیں دیا صرف اپنا منچلا ہونٹ

دبا تا رہا۔

”آگ لگانا ایک ایسا جرم ہے جس کا یقین آسانی

سے کیا جاسکتا ہے۔ جہاں کہیں بھی آگ لگے یا لگائی جائے تو

اسے پھیلانے کے لیے مٹی کے تیل کی ضرورت ہوتی ہے اور

تلاش یا شناخت کرنا بہت آسان ہے۔“

پلیس نے اس طرح سر ہلایا جیسے اسے کوئی سبق

پڑھایا جا رہا ہو۔ آرنلڈ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے

کہا۔ ”بہر حال یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ آگ کس

نے لگائی ہے کیونکہ جن شہوتوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ

آگ میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جیسے انگلیوں کے نشانات

اور تیل کا کنسٹر وغیرہ۔ ایک اور مسئلہ شہادتوں کا نہ ملنا ہے یا

کم از کم گواہ قابل اعتبار ہوں جیسے صوفی کی ماں اور اس کا

دوست۔“

اس بار پلیس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آرنلڈ نے اپنی

نظریں اس پر جمادیں۔ ”انہوں نے میرے آنے سے پہلے

یقیناً اپنی چھوٹی سی خشیات کی لیبارٹری ختم کر دی ہوگی۔ شاید

انہیں یہ پریشانی ہو کہ کوئی ان کے پیچھے لگ گیا ہے۔ میں

یقین سے کہیں کہہ سکتا کہ وہ کون ہوگا۔ انہوں نے انتہائی

ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس گندے سامان سے

جان چھڑانے کے بجائے الماری میں رکھ دیا۔ آگ بجھانے

والا عملہ جب مکان کی تلاش لے رہا تھا تو انہیں وہاں سے یہ

چیزیں ملیں۔ انہوں نے پہلے ہی انہیں دیکھ کر پولیس کو فون

کر دیا تھا۔ اگر آگ اندر پہنچ جاتی تو شاید پوری عمارت ایک

دھماکے سے زمیں بوس ہو جاتی اور اس کے اثرات پورے

علاقے پر ہوتے۔“

پلیس نے نظریں چرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ

ہو سکا۔ آرنلڈ نے کہا۔ ”خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔ ورنہ

بہت تباہی ہوتی۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے؟“

”ہاں۔ بالکل میرا بھی یہی خیال ہے۔“ پلیس نے

تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔“ آرنلڈ

نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”جس کسی نے بھی آگ لگائی، وہ عقبی صحن کے چلے

ہوئے جسے میں قبر کے کتبے کی طرح ایک نشانی چھوڑ گیا جس

پر سفید چاک سے لکھا ہوا تھا۔“ صوفی یہاں ہے۔“ اور تیر

کڑی نگرانی کر رہی تھی۔

کشمالہ پیٹھے پیٹھے اوجھلے لگی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ لیٹ کر آنکھیں بند کرے اور پاس سوئے ہوئے شوہر کی طرح میٹھی نیند میں کھو جائے۔

مگر نہیں..... آج رات تو اس چور کو روکنے کے ذیل کرنا تھا۔ وہ متوقع چور کوئی باہر سے آنے والا شخص نہیں، بلکہ گھر کا ہی ایک فرد تھا۔ وہ مشکوک شخص، اس کے شوہر کی ماں، یعنی اس کی ساس کلثوم تھی۔

اس کی ملازمہ نسرین اسے کئی مرتبہ انعام کر چکی تھی کہ اس کی ساس گھر میں چھوٹی موٹی وارداتیں کرتی رہتی ہے مگر اسے اس کی باتوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ یقین تو اسے تب آیا جب ایک دن بڑھیا نے اپنے گاؤں سے ملنے کے لیے آئی ہوئی اپنی بھانجی کو، فریج سے پورے ایک کلو منٹن کا پیکٹ اٹھا کر اس کے ہمراہ کر دیا۔ اس دن بھی وہ گھر میں موجود نہ تھی اور یہ اطلاع نسرین نے ہی بہم پہنچائی تھی اور اس نے بڑے سخت لہجے میں اپنی ساس سے گوشت کے اس پیکٹ کی چوری کے حوالے سے باز پرس کی تھی۔

وہ بہو کی جارحانہ جرح کے سامنے زیادہ دیر تک ٹک نہ سکی۔ اقبال جرم کرنے میں ہی نجات دکھائی دی اور ساتھ ہی وضاحت بھی کی کہ بہو، میری بھانجی کا بچہ تیار ہے، چھت سے گر کر ٹانگ کی ہڈی توڑا بیٹھا ہے۔ سو چا چار دن چار حصے کر کے بچہ کو کھلائے گی تو تھوڑی جان آجائے گی۔

”مگر اماں! آپ میری اجازت کے بغیر کیسے گوشت کا پیکٹ اس کے حوالے کر سکتی ہیں؟“ کشمالہ نے نفرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”مگر بہو! یہ..... میرے بیٹے کا بھی تو گھر ہے نا؟“

کلثوم کے لہجے میں دنیا بھر کی لاچار سمانگی۔

”ہرگز نہیں! یہ میرا گھر ہے، آپ کے بیٹے کا نہیں ہے اور میری مرضی کے بنا اس گھر میں کوئی پتا بھی نہیں ہل سکتا۔“

اس نے اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

”مجھے معاف کر دو بہو! آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں دہراؤں گی۔“ اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی تھی اور پھر باقی کا سارا وقت اپنے کمرے میں جا کر اس بے توقیری اور بے عزتی پر روٹی رہی تھی۔

اسی رات جب کشمالہ نے تیمور کے سامنے اس کی ماں کا شرمناک کارنامہ رکھا تو وہ جیسے سے اٹھ گیا۔ حالانکہ اس نے کشمالہ کے سامنے بھی اونچی آواز میں بولنے کی جرأت نہیں کی تھی مگر ماں جیسی عظیم ہستی پر اتنا سنگین الزام برداشت

نہ کر پایا اور بلا خوف و خطر میدان میں کود پڑا۔

کشمالہ کو تیمور سے اس قدر مزاحمت کی توقع نہ تھی۔ اس نے شوہر کی سرکشی کے جرم کو بھی کلثوم کے کھاتے میں ڈال دیا۔

☆☆☆

اب تو واقعی اسے اس بڑھیا سے چڑھنے لگی تھی، جو اچانک پتا نہیں کہاں سے آکر اس کے سر پر مسلط ہو گئی تھی۔

اب تو وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ نسرین نے اطلاع دی تھی کہ آج رات بڑھیا پھر سے واردات کرنے کی کوشش کرے گی اور اب وہ پوری مستعدی سے، کھڑکی کا پردہ ہٹائے باہر لان میں موجود، تاریک کچن پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔

وہ انتظار کرتے کرتے اب اوپنے لگی تھی۔ یہ سوچ کر نگرانی کا پروگرام ملتوی کرنے ہی لگی تھی کہ لگتا ہے آج بڑھیا کا ارادہ بدل گیا ہے۔ اچانک اس نے ایک سائے کو کچن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ چونک گئی اور غور سے اس سائے کو دیکھنے لگی۔ باوجود گلیے اندھیرے کے وہ اپنی ساس کے بیوے کو بے آسانی پہچان چکی تھی۔

اس نے پاس سوئے ہوئے شوہر پر نظر ڈالی جو گہری اور آسودہ نیند کے مزے لوٹ رہا تھا۔ ابھی جب اس کی ماں کو رینگے ہاتھوں پکڑ کر، اس کے سامنے پیش کروں گی تو بیچارے کا سکون و اطمینان ایک دم سے اڑن چھو ہو جائے گا۔ یہ سوچتے ہی اس کے لب مسکرانے لگے۔ اس نے شوہر کو گھنٹوں ڈالا۔

”کیا ہوا..... کون سی قیامت آگئی؟“ وہ نیند میں بوجھل آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا۔

”تم فوراً اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔“ وہ پھرتی سے بیڈ سے نیچے اترتی اور تیمور کو بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگی۔

”آخر ہوا کیا ہے، کچھ پتا بھی تو ملے؟“ وہ بھی اب ناگہم لڑکائے، سلیر پاؤں میں گھسیڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کشمالہ نے پھر سے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی۔ اب کچن کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہاں روشنی تھی۔

”ہمارے جانے تک کہیں وہ رفو چکر ہی نہ ہو جائے۔“ وہ زہر بربزدانی اور تیمور کو کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

کلثوم دبے پاؤں کچن میں داخل ہوئی۔ اندر آنے سے پہلے اس نے ہر طرح کی تسلی کر لی تھی۔ وہ کسی کے سامنے مجرم ثابت نہیں ہونا چاہتی تھی اور اپنے بیٹے کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ اگر تیمور کو پتا چل جاتا کہ اس کی ماں چوریاں

کرتی ہے، وہ بھی اس کے گھر میں تو بھلا کیا عزت رہ جاتی اس کے سامنے۔

وہ سوچتی جا رہی تھی اور اپنا کام کرتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ اس نے اپنا کام پورا کیا۔ مطلوبہ مال حاصل کر کے، واپس جانے کے لیے رخ پھیرا تو دروازے کے کچھ بہو اور بیٹے کو کھڑا دیکھا۔

بہو کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ قفس کر رہی تھی۔ فتح بابی کے احساس سے اس کا چہرہ تنک رہا تھا۔ جبکہ بیٹے کا چہرہ احساس ندامت سے دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔

کلثوم کے جسم سے جیسے اچانک جان نکل گئی۔ چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں اٹھائی ہوئی چادروں کی پلیٹ پیچھے ماربل کے فرش پر گر کے پھٹنا چور ہو گئی۔ منٹن پلاؤ زمین پر بکھر گیا۔

”میں نے کیا کہا تھا تم سے..... تمہاری ماں چور ہے۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تم نے۔ ساری رات جاگتی ہوں تب نہیں جا کر پکڑا ہے، رینگے ہاتھوں۔“ اس کے لہجے سے حقارت اور استہزایہ ایک وقت چھلک رہے تھے۔

تیمور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا جبکہ وہ بیٹے کی ایسی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے گڑگڑائی۔

”مجھے معاف کر دو۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بیٹے اور بہو کے سامنے جوڑ دیے۔ ”آئندہ کبھی چوری نہیں کروں گی۔“

☆☆☆

بیچاری کلثوم، سدا کی جھلی اور عاقبت نا اندیش۔ اگر بیانی ہوئی تو اپنی بھری جوانی ان بلاشت بھر کے دو بچوں پر قربان کر دیتی؟ دوسری شادی کر کے گھر کو بسالیتی۔ بچے خود ہی دل کھل کے پل جاتے مگر نہیں جھلی تھی نا۔ اس نے سوچا کہ میرے بچے در بدر ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ جب غلام محمد کی میت کھیتوں سے گھر لائی گئی تو بیچاری مارے سکتے کے کھل کے رو دھکی نہ سکی۔ اندر اندر ہی سسکتی رہی اور دونوں بیٹوں کو سینے سے پیچھے سسکیاں لیتی رہی۔

گھر سے یہ کہہ کر نکلا تھا کہ کھیتوں کو پانی لگا کر ابھی آتا ہوں تم میرا ناشتا تیار کرو مگر ناگوں پر چل کر آنے کے بجائے، جار پائی پر لیٹ کر چار آدمیوں کے کندھے پر سوار ہو کر آیا۔ لوگوں کی زبانی پتا چلا کہ کھیتوں کو پانی لگاتے ہوئے کسی زہر لیے سانپ نے ٹانگ پر کاٹ لیا تھا۔

چار آدمی پھر سے اندر آئے اور غلام محمد کو کندھوں پر اٹھا کر چلتے ہوئے۔ کچھ دن تک کلثوم نے، غلام محمد کی ناگہانی موت کا سوگ منایا پھر اپنے دونوں بیٹوں کو کھینچے ہوئے، ہمت... کی۔ زمین پنے پر دے دی اور خود گھر کے کچن میں بندھی ہوئی چار پانچ بیٹھنوں کا دودھ پیچ کر گزر راکھ کر کے لگی۔

اب تو اس کا ایک ہی خواب تھا کہ ان ننھے پودوں کو پال پوس کر تیار درخت بنانا ہے۔

بڑا تیمور پڑھائی میں بہت لائق فائق تھا جبکہ تیمور کو تعلیم سے کچھ خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ اسکول سے گھر آکر ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ بیٹھنوں کو چار ڈال اور اپنے ننھے سنے ہاتھوں سے ان کا دودھ بھی دیتا۔

تیمور نے میزک کر کے مزید تعلیم کے لیے شہر کا رخ کیا۔ گاؤں کے ماسٹر صاحب نے کالج میں داخلے سے لے کر ہاسٹل میں ایڈمشن تک، ہر طرح سے اس کی مدد کی جبکہ کلثوم نے اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے اپنی ایک بھوری بھینس بیچ دی۔

تیمور پوری دہائی سے تعلیم حاصل کرنے لگا جبکہ تیمور نے آٹھ جماعتیں پاس کر کے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا اور ماں کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس نے پٹے پر دی ہوئی اپنی اراضی بھی واپس اپنے ہاتھ میں کر لی اور کھیتی باڑی کر کے زمین سے سونا اگانے لگا۔

تیمور ابھی بیس سال کا ہوا تو کلثوم کے دل میں بیٹے کے لیے پر سہرا سجانے کا ارمان جاگ اٹھا۔ تیمور اس وقت اپنے تعلیمی مدارج کے آخری مراحل طے کر رہا تھا۔ کلثوم بیس سالہ تیمور کے لیے اپنی انیس سال کی بھانجی ثمنہ کو بیاہ کر لے آئی۔

جب تیمور ایم بی اے کر کے ایک اچھی انٹرنیشنل فرم میں اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہوا تو، تیمور دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ اب کلثوم بھی پیار رہنے لگی تھی۔ وہ تیمور کے سر پر بھی سہرا سجانا چاہتی تھی مگر وہ مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

اور پھر ایک دن، اس نے گاؤں میں آکر ماں کو یہ اطلاع دی.... کہ وہ شہر میں کسی لڑکی کو پسند کرتا ہے اور شادی بھی اسی کے ساتھ کرے گا۔ نیز یہ کہ لڑکی کروڑ پتی باپ کی اکلوتی اولاد اور وارث ہے۔

کلثوم کا دل ٹوٹ گیا۔ پھر یہ کہہ کر دل کو سمجھایا کہ اچھا کیا بیٹے نے اپنی پسند اور معیار کی لڑکی ڈھونڈ لی۔ ورنہ یہاں گاؤں میں اس کے مطلب کی لڑکی کہاں ملنا تھی بھلا۔

کلثوم، اس کا بیٹا تیمور اور بہو شادی والے دن ایسے شادی ہال میں گئے، جیسے دوسرے مہمان شامل ہوئے تھے۔

☆☆☆

اب کی بارکلوٹوم نے پھر سے اپنے جھلی ہونے کا ثبوت

”ہاں اماں! اسی نے کہا تھا کہ اب کی بار اماں کو ساتھ

”بھو! شاید تم لوگوں نے پہچانا نہیں۔ یہ تمہاری داد ہے۔“

اکتوبر 2018ء

سے بدل لیا۔

اب ہر کوئی اسے "ایمی" کے نام سے مخاطب کرنے لگا۔ پکارنے کی حد تک اس نے، اس نام سے راؤ فرا حاصل کر لی تھی۔

"ایمی! یہ کس لمحے میں اپنی دادی سے بات کر رہی ہو؟" تیمور ہاڑا تو ابھی شعلہ بارگاہوں سے دونوں ماں بیٹے کو گھورتی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے پیچھے شانی بھی لپکا۔

"سوری اماں! کوئی بات دل پر نہ لگنا۔ بچ پوچھیں تو کشمالہ نے بچوں کی تربیت میں بڑی غفلت برتی ہے۔" تیمور شرمندہ شرمندہ سامان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا تھا۔

"ارے نہیں بیٹا! تم کیوں نام ہو رہے ہو۔ بچے ہیں، نادان ہیں ابھی۔ بڑے ہوں گے تب دیکھنا، میری کیسی قدر کریں گے۔" وہ مسکرائی۔

"چلیں اماں! اندر چلیں۔" اس نے ماں کا بازو پکڑا اور اندرونی دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگا۔

کلیٹوم، تیمور کے ہمراہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو پہلی نظر لاؤنج میں رکھے آرام دہ صوفے پر دھنسی ہوئی بہو پر پڑی۔ وہ ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ چڑھائے، سلفون کان سے لگے کسی سے بات کر رہی تھی۔ کلیٹوم اور تیمور اس کے سامنے والے صوفے پر ٹک گئے۔ اس نے اپنی ہوتی نظر ساس اور شوہر پر ڈالی۔ مگر اپنی بات ادھوری چھوڑ کر، ساس کی خیریت دریافت کرنا ضروری نہ سمجھا۔

وہ سامنے بیٹھی فون پر باتوں کی مجلس چھوڑتی رہی۔ کلیٹوم کو اس کی دیگر باتوں کی تو کچھ سمجھ نہ آئی مگر ایک لفظ جو بہو و دران گفتگو بہ کثرت استعمال کر رہی تھی اس کی سمجھ کلیٹوم کو بخوبی آ رہی تھی اور اس لفظ کی سنگینی اور رنگینی سے بھی بخوبی واقف تھی۔

کشمالہ نے جب پہلی بار "یار" کہا تو کلیٹوم نے چونک کر پہلے اسے اور پھر تیمور کی جانب دیکھا مگر جب بیٹے کو، اخبار کے مطالعے میں مشغول پایا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ یقیناً تیمور نے اپنی بیوی کے منہ سے کسی غیر مرد کے لیے لفظ "یار" نہیں سنا، بس پھر کیا تھا۔ کلیٹوم نے پوری توجہ بہو کی طرف مبذول کر دی اور یہ لفظ بار بار منہ سے کہہ کر دہرائی۔

جب بہو نے اپنی گفتگو سمجھنے ہوئے الوداعی کلمات ادا کرتے ہوئے "سی یو اینڈ ٹیک کیئر رانی" کہا تو کلیٹوم کی جان میں جان آئی کہ وہ لفظ "یار" کسی نامزد کے لیے نہیں بلکہ اپنی کسی بیٹی کے لیے استعمال کر رہی تھی۔

"میں بھی کہوں، تیمور جتنا مرضی شہری بابوں میں جائے، اتنا

بے غیرت کبھی نہیں ہو سکتا۔" وہ اپنی کج فہمی پر دل ہی دل میں مسکراتے لگی۔ کشمالہ کال منقطع کر کے اب استقبالیہ نظروں سے تیمور کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جیسے آنکھوں سے، کلیٹوم کی آمد کا مقصد پوچھ رہی ہو۔ تیمور بھی اس کی نظروں کی زبان خوب سمجھتا تھا۔ گلا کھٹکا کر بتانے لگا۔

"اماں کی طبیعت آج کل کچھ نامسا ز رہتی ہے۔ اس لیے ساتھ لے آیا۔ کچھ دن ہمارے ہاں ہی رہیں گی۔ ڈاکٹر صدیقی سے ان کا چیک اپ کروائیں گے۔" اس کا وضاحت بھرا جواب بھی کشمالہ کو مطمئن کرنے میں ناکام رہا۔

"کیسی ہو بہو؟" کلیٹوم نے شہدائیں لہجے سے بہو کے منہ کی کڑواہٹ کم کرنے کی کوشش کی۔

"اچھی ہوں۔ آپ کب سے بیمار ہیں؟" اس نے الٹا سوال داغ دیا۔ "تیمور نے آپ کا علاج معالجہ کیوں نہیں کروایا۔ تیمور کے حصے کی زمین بھی سنبھالے بیٹھے مگر ایک ماں نہیں سنبھال سکتی اس سے۔" بہو کی فکرت زنی سے گھبرا کر وہ تیمور کو مدد طلب لگا ہوں سے دیکھنے لگی۔

"تیمور اماں کا ہر طرح سے خیال رکھتا ہے۔ بس میں اپنے اطمینان کے لیے اماں کو شہر لایا ہوں۔ اچھے ڈاکٹر سے اماں کا علاج کرواؤں گا۔" اب کی بار تیمور کا لہجہ قدرے سختی لیے ہوئے تھا۔

کشمالہ نے مزید بحث نہ کی اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

رات کو کھانے کے بعد وہ پھر سے انہوں کے درمیان اجنبی بنی بیٹھی تھی۔ سب لاؤنج میں بیٹھے کوئی فی وی ڈراما دیکھ رہے تھے۔

.... کلیٹوم نے فرمائش کی: "جہاں اللہ کا گھر نظر آتا ہے، اس جھیل پر لگا دیا جائے۔"

"دادی! پلیز شور نہ کریں۔ یہ میرا فیورٹ ڈراما ہے۔" ایمی نے احتجاج کیا تو پھر کلیٹوم کو دوبارہ منہ کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔

ڈراما ختم ہونے کے بعد ایک نیا ڈراما شروع ہو گیا اور اس ڈرامے کا نام تھا: کلیٹوم کو کہاں سلا دیا جائے؟" یہ سوال اپنی تمام تر سمجھ بھرتی کے ساتھ، سب کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

اتنے بڑے گھر کے اتنے دھیر سارے کمرے ہونے کے باوجود، یہ مسئلہ خاصی پیچیدگی اختیار کر گیا۔ اوپر کی منزل پر چار بیڈ رومز تھے مگر کلیٹوم گفتگوں کے درد کی وجہ سے بیڑھیاں چڑھنے اترنے سے قاصر تھی۔

اب تیمور نے ایمی کی طرف ملتجیانہ نظروں سے گزارش

کی مگر وہ فوراً اس کی نظروں کا مفہوم جان کر بول اٹھی۔

"نوپا! آپ تو جانتے ہیں۔ میرے انگریز چل رہے ہیں آج کل۔ رات گئے تک پڑھتی رہتی ہوں اور ویسے بھی مجھے اپنی پرائیویسی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے سوری۔"

بیٹی کی مدلل تقریر سن کر کشمالہ کے چہرے پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ تیر گئی۔

"مجھے یقین ہے مجھ سے کوئی اس طرح کی بے سگئی فرمائش نہیں کرے گا اور دوسری بات میں لڑکا ہوں اور دادی ایک لڑکی، اس لیے یہ جواز... بالکل نہیں بنتا۔ ہے نادادی؟"

اس نے ایک آنکھ کھینچ کر دادی سے پوچھا تو دادی اس کی بات کی تیک پیچھے بنائی، اس کے ساتھ دل کرشنے لگی۔

"بد معاش کہیں کا، اپنی دادی کو آنکھ مار رہا ہے۔"

"اب تو صرف ایک ہی صورت بچتی ہے۔" کشمالہ بولی تو تیمور اس کی طرف امید افزانہ نظر سے دیکھنے لگا۔

"اماں! سرین کے سروٹ کوارٹر میں سو جایا کریں۔ ویسے بھی وہ بیڈ پر سونے کی عادی نہیں ہیں، وہاں سرین چار پائی بچھا دے گی، اپنی چار پائی کے ساتھ۔ خوب انہی نیند آئے گی۔"

کشمالہ کی بات سن کر کلیٹوم خوش ہو گئی جبکہ تیمور مارے صدمے کے لنگ رہ گیا۔

"تم ہوش میں تو ہو کشمالہ..... میری ماں سروٹ کوارٹر

میں سو کر گئی؟"

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے یار! اس کے اس طرح سب کے سامنے بار کھینے پر کلیٹوم نہ صرف تجالٹ محسوس کر رہی تھی بلکہ اس نتیجے پر بھی پہنچ گئی کہ لفظ "یار" بہو کا حکیم کلام ہے۔

"دیکھو ڈیز! گاؤں میں اماں جس قسم کے گھر میں رہتی ہیں، ہمارا سروٹ کوارٹر اس سے ہزار درجے بہتر ہے اور پھر سرین پاس ہو گی ان کی دیکھ بھال کے لیے۔ بیمار بندے کو رات کو اکیلا نہیں سوتا چاہیے۔"

"بہو ٹھیک کہتی ہے تیمور..... سرین کے ساتھ میرا اچھا وقت گزار کرے گا۔"

اور یوں یہ سمجھ مسئلہ کشمالہ کی فہم و فراست سے چکیوں میں حل ہو گیا۔ وہ الگ بات کہ سرین کو بھی کلیٹوم کا یوں اپنی تنہائی میں خلل ہوتا اچھا نہ لگا مگر وہ دوسروں کی طرح، اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کھلم کھلا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ کبھی تو گھر کی ملازمت۔

اسے کلیٹوم سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی

اور حل سوچنا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن ہی تیمور اسے ساتھ لے کر ڈاکٹر صدیقی کے کلینک جا پہنچا۔ ڈاکٹر نے کچھ ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیے جن کی رپورٹس نے بتا دی کہ کلیٹوم شوگر اور ہپا ٹائیس جیسے موڈی امراض کے شبہ میں جکڑی جا چکی ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ ہدایات اور کچھ ادویات کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

گھر آ کر تیمور نے کشمالہ اور سرین دونوں کو تاکید کی کہ اماں کو چاول کم سے کم دینے ہیں اور وہ بھی تازہ حالت میں۔ باقی چاول ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

جبکہ چاول کلیٹوم کی کمزوری تھے۔ اس کی شروع سے یہ عادت رہی تھی کہ جب بھی گھر میں چاول پکائی، رات کو کھاتی اور دن کو ناشتا بھی چاولوں پر دی ڈال کر کرتی۔ اب چاولوں پر بربادی لگی تو جیسے زندگی ایک دم سے بد مزہ اور بھکی بھکی لگنے لگی۔

رات کو ڈاکٹرنگ نمبل پر، کلیٹوم نے چاولوں کی ڈش کی طرف ہاتھ لگایا تو تیمور نے روک دیا۔

"اماں! آپ کو ڈاکٹر نے چاول کھانے سے منع کیا ہے۔" اس نے بڑھا ہوا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ بے دلی سے روٹی کے چند ٹوٹے زہر مار کے اور اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔ تیمور کے دل پر گھونسا سا لگا۔

☆☆☆

نیم غنڈو کی عالم تھا جب اس کی چار پائی پر آ کر کوئی دھیرے سے بیٹھ گیا اور نرم ہاتھوں سے اس کی ٹانگیں دبائے لگا۔ کلیٹوم نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو تیمور کو اپنی ٹانگیں دباتے پایا۔

"رہنے دے پتر! کیوں تکلیف کرتا ہے؟ میں اچھی

کھلی تو ہوں۔" اسے بیٹے پر بے طرح پیارا آیا۔

"اماں! میں بہت برا ہوں۔ تمہاری خدمت نہیں کر سکتا۔ تمہیں سروٹ کوارٹر میں ٹھہرنے سے نہیں روک سکتا۔" وہ سسکتے لگا۔

"ارے رو کیوں رہے ہو پتر؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ وہیں ماں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا اور وہ ماما بھرا اس الکیوں میں سو کر اس کے بالوں میں پھیرنے لگی۔ یہ تو شکر ہوا کہ سرین ابھی سونے کے لیے نہیں آئی تھی۔ ورنہ ماں بیٹے کا یہ جذباتی منظر خوب چٹارے لے کر کشمالہ کے گوش گزار رہتی۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب نسرین کی اچانک کسی کھٹکے سے آنکھ کھل گئی۔ اس نے آنکھ کی درز سے، ساتھ والی چار پانی پر نظر ڈالی تو حیران رہ گئی۔
بڑی بی بی یعنی کلثوم اپنی چار پانی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی جالوں کھا رہی تھی۔ مگیا اندھیرا ہونے کے باوجود نسرین نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ وہ مٹر پلاؤ پر دہی کا رانکا ڈالے، بڑی رغبت سے کھا رہی ہے۔

کلثوم نے ناولہ منہ میں ڈال کر ایک احتیاطی نگاہ نسرین پر ڈالی تو نسرین نے فوراً آنکھیں میچ لیں۔
چاولوں کی پلیٹ ختم کر کے کلثوم دبے پاؤں اٹھی اور خالی برتن اٹھائے کمرے سے باہر نکل گئی۔ نسرین سمجھ گئی کہ خالی برتن واپس کچن میں رکھنے گئی ہے۔ اس کے لب مسکرانے لگے۔ کشمالہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے اچھا خاصا 'دچسپ' مواد ہاتھ آگیا تھا۔

اگلے دن جیسے ہی کلثوم نے دو پہر کا کھانا کھا کر کوارٹر کا رخ کیا، نسرین بڑے رازدارانہ انداز میں، کشمالہ کورات والی صورت حال سے آگاہ کرنے لگی۔ کشمالہ بھی حیران رہ گئی۔
”بڑھیا کو لگتا ہے اپنی جان سے کوئی پیا نہیں۔ جس چیز کو کھانے سے ڈاکٹر نے سختی سے منع کیا ہے، وہ رات کو سب سے چھپ چھپ کر کھانا کہاں کی عقلندی ہے بھلا؟“
”بات صرف چھپ چھپ کر کھانے کی نہیں ہے پیغم صاحبہ! بات چوری کر کے کھانے کی ہے۔ وہ آپ کے گھر میں چوری کر کے کھانا کھاتی ہے اور چوری تو چوری ہی ہوتی ہے۔ چاہے کھانے کی ہی کیوں نہ ہو۔“
نسرین کے آخری فقرے نے کشمالہ کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

دو تین دن بعد گاؤں سے کلثوم کی بھانجی اپنے میاں اور دس سالہ بچے سمیت کلثوم سے ملنے چلی آئی۔ اس کا بیٹا چھت سے کر کر اپنی پینڈلی کی ہڈی تڑوا بیٹھا تھا۔ اسی کو ہڈی جوڑ کے اسپیشلسٹ کو دکھانے کے لیے دونوں میاں بھوی شہر چلے آئے تھے۔ شہر آئے تو سو چال خالہ کلثوم کی خیر خبر بھی لیتے چلیں۔
مہمانوں کی آمد پر پہلے تو وہ بری طرح بولھائی مگر اگلے ہی لمحے جب یہ بات ذہن میں آئی کہ آج بھو اپنی سہیلیوں کے ساتھ کہیں پنکج منانے گئی ہے اور شام سے پہلے اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں تو اس نے پرتپاک انداز میں ان کا استقبال کیا۔ انہیں لاؤنج کے نرم صوفوں پر بٹھا کر، بڑی بارعب آواز میں نسرین کو پکارا۔ بھانجی نے خالہ کے یہ ضاٹ

بات دیکھ کر دانتوں میں انگلی داب لی۔

”خالہ! تم واقعی بڑی خوش قسمت ہو۔ اتنے امیر بیٹے کی ماں ہونا کوئی مذاق..... بات تمھاری ہے۔“ وہ گھر کی شان و شوکت اور آرائشی اشیا کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں مرعوب دیکھ کر کلثوم چھوٹی نہ سارہی تھی۔

”ہاں! آج کتنی ہوٹھیلہ! میں واقعی بہت ہی خوش نصیب ہوں۔ ابھی تو میری بھو گھر میں نہیں ہے..... وہ ہوتی تو تم دیکھتیں کہ وہ کیسے تم لوگوں کی خدمت کرتی۔ سچ کہہ رہی ہوں، مہمانوں کو دیکھ کر جوش چڑھ جاتا ہے۔“

نسرین اس کی بارعب آواز سن کر بھی پورے پندرہ منٹ بعد، چہرے پر بے زاری جھانے سامنے آئی۔
”نسرین! تم اتنی دیر سے کیوں آئی ہو؟ جاؤ جلدی سے مہمانوں کے لیے جوس لے کر آؤ۔“ کلثوم نے مالگن بننے کی پوری پینٹیک کی۔

وہ منہ پھلائے گئی اور ٹرے میں تین گلاس جینکو جوس لے کر آگئی۔ ٹرے میز پر رکھ کر پلٹنے لگی تو کلثوم نے نیا آرڈر جاری کیا۔

”نسرین! تم ایسا کرو، فرنیچ سے ایک پیکٹ مٹن کا نکال کر مٹن پلاؤ بناؤ جلدی سے۔ مہمان کھانا کھا کر جائیں گے۔“

”نہیں جی! میں کشمالہ بی بی کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں بنا سکتی۔“ اس نے اکھڑے لہجے میں جواب دیا تو کلثوم کو مہمانوں کے سامنے بڑی سکی محسوس ہوئی۔

اس نے اپنی آواز میں پہلے سے بھی زیادہ رعب اور دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”نسرین! امت بھولو کہ میں بھی اس گھر کی مالگن ہوں بلکہ بڑی مالگن ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ٹھیکلہ کی طرف کن اکھیوں سے دیکھا۔ جہاں اس وقت کلثوم کی شخصیت سے مرعوبیت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا مگر مرعوبیت کا یہ کچل اگلے ہی لمحے زمیں بوس ہو گیا جب نسرین نے دونوں کچے میں کلثوم کا کوئی بھی حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

نسرین پاؤں تختے ہوئے چلی گئی تو کلثوم نے خفت منانے کی خاطر بیان بدل دیا۔

”یہ کم بخت تو بالکل ہی باؤلی ہے۔ آنے دو ہو کو ذرا، دیکھنا کیسے چوٹی سے پکڑ کر گھر سے باہر پھکوائی ہوں اسے۔ ٹھیکلہ میری ہنسی تم ایسا کرو، خود ہی پلاؤ پکالو۔ میں تمہیں گوشت اور دوسری چیزیں دیتی ہوں اور ویسے ہی تم اس کلوہی سے تو اچھا ہی بناؤ گی۔“

”رہنے دو خالہ! بھابی آگئیں گی تو اعتراض کریں گی اور ایسے بھی بھوک بالکل نہیں ہے۔“

”کس کی جرأت ہے اعتراض کرنے کی۔ یہ میرے بیٹے کا گھر ہے اور میری بھو بھی بہت اچھی ہے۔“ کلثوم کے بے حد صراحت کرنے پر، ٹھیکلہ مٹن پلاؤ پکانے پر راضی ہو گئی۔

ٹھیکلہ نے پلاؤ پکایا اور کلثوم نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ ٹھیکلہ کے شوہر اور بچے نے بھی مزے سے کھایا۔

وقت رخصت، کلثوم نے فرنیچ سے ایک پیکٹ مٹن کا مزید نکالا اور ٹھیکلہ کو شاپر میں یہ کہہ کر دے دیا کہ بچے کو چار پانچ دن ٹھوڑا ٹھوڑا کر کے کھانا، طاقت ملے گی تو ہڈی جلدی جڑ جائے گی۔

☆☆☆

اس سے اگلے دن وہ کسی مجرم کی طرح سر جھکاے کشمالہ کے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کی من مانیوں اور ہٹ دھرمی کی ساری رپورٹ نسرین نے رات کو ہی کشمالہ کے سامنے پیش کر دی تھی اور وہ بھی پوری رنگ آمیزی کے ساتھ۔

”میں پوچھتی ہوں آپ کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ آپ مالکانہ حقوق استعمال کرتے ہوئے اپنے مہمانوں کی تواضع کرتی رہیں۔ مت بھولیں کہ یہ گھر میرا ہے اس کی ہر شے میری ملکیت ہے۔“

”مگر بھو! وہ مہمان تھے۔ مہمانوں کی تواضع کرنا تو سنت ہوئی ہے۔“ وہ کنبہ سے میں کھڑے کسی طزم کی طرح اپنی صفائیاں پیش کر رہی تھی۔

”میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے تو اتنا پتا ہے کہ آپ نے میری اجازت کے بغیر میرے گھر کی چیزیں استعمال کیں اور گوشت کا پیکٹ اپنی اس بھانجی کے ہمراہ بھی کر دیا کہ لو بھئی اگر یہاں من نہیں بھرا تو گھر جا کر پھر سے پکا کر کھا لیتا۔ حد ہوتی ہے ڈھٹائی کی بھی۔“ وہ نان اسٹاپ بولے چلی جا رہی تھی۔

چونکہ تیور اور بچے گھر سے جا چکے تھے اس لیے اسے اس وقت روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ کلثوم مکمل طور پر کشمالہ اور نسرین کے نرم و نرم پر تھی۔ بھو کی چلی کی سن کر کیلیا چھلنی ہو رہا تھا۔

”معاف کر دو بھو! آئندہ ایسی غلطی نہیں کروں گی اور یہ بات بھی ذہن میں رکھوں گی کہ یہ گھر اور اس میں موجود ہر چیز کی مالک صرف تم ہو۔“ اس کی آواز رندہ گئی۔ وہ اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلی گئی۔

دو چار دن گزرے تو جلی کلثوم نے سر جھک کر سب

بہترین تحریریں، لا جواب رد وادار
اہلی داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ

شمارہ اکتوبر 2018ء

کی جھلکیاں

مرگ برگ

اس شاعر نے مثل کا زندگی نامہ جس کی شاعری
لہور لاتی تھی مگر اسے ہی لہو میں نہلا دیا گیا

شوق پرواز

تاریخ سے تالبدہ ہوئی جہاز کو مغرب کا کارنامہ
کھینچتے ہیں لیکن ہوا میں اڑنے کا مظاہرہ کئی
صدی قبل معروف مسلم سائنسدان نے کیا تھا

آگ کا دریا

تاریخ کے صفحات میں مدفون ایک
جنگجو کے کشت و خون کا تذکرہ

آل راؤنڈر

اس پاکستانی سپر اسٹار کی داستان
جسے کوئی چانس دینے پر تیار نہ تھا

اس کے علاوہ

بھی بہت سی نئی داستانیں، سچے قصے
اور دلچسپ سچ بیانیات

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر نیا شمارہ مختص کرالیں

کچھ نظر انداز کر دیا۔ بلکہ بیٹے کی محبت نے سب بھلانے پر مجبور کر دیا۔ کیا ہوا بہو تھوڑی سخت مزاج ہے تو، بیٹا تو جان چھڑکا ہے ہاتھ پر۔ اسے مطمئن ہونے کے لیے اتنا خیال ہی کافی تھا۔

ایک دن باہر لان میں بیٹھی تھی کہ ایسی کو سپارہ پڑھانے والی استانی اندر سے باہر نکلتی دکھائی دی۔ کلثوم کو لان میں بیٹھے دیکھا تو وہ بھی سیدھی ادھر ہی آگئی۔ سلام دعا کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

”آمنہ خیر سے کون سے پارے پڑ لگ گئی ہے؟“ کلثوم نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔
”دسویں پارے پر پہنچ گئی ہیں۔“ اس نے نیچے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”ماشاء اللہ! ہم تو اپنے بچوں کو سات آٹھ برس کی عمر ہونے تک قرآن پڑھا دیا کرتے تھے اور یہ خیر سے تیرہ سال کی ہو گئی اور ابھی تک دسویں پارے پر آگئی ہوئی ہے۔“
”آمنہ بھی کب کی قرآن مکمل کر چکی ہوئی۔ اگر پوری توجہ اور دھیان سے پڑھتی تو۔۔۔۔۔“

”کیا مطلب؟“ کلثوم کی تیوری پر بل پڑ گئے۔
”مطلب آپ کے سامنے ہے جی۔ جب دل چاہتا ہے دو لفظ پڑھ لیتی ہے اور جب موڈ نہیں ہوتا تو ٹر خا دیتی ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ کلثوم کے منہ سے تاسف بھری آواز نکلی۔
”ہم تو اپنے استادوں کو ماں باپ کے برابر درجہ دیا کرتے تھے۔ مگر آج کل کی نئی نسل۔۔۔۔۔“

دونوں تھوڑی دیر تک بیٹھی تاسف بھرے مکالموں سے جی سوختہ کرتی رہیں اور پھر وہ استانی اپنی عبا سے چہرہ ڈھانپ کر باہر نکل گئی جبکہ کلثوم کے ذہن میں تجا نے کیا سایا کہ سیدھی آمنہ کے کمرے کا رخ کیا۔

اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا تو وہ بیڈ پر لیٹی، کسی سے سل فون، پر بات کر رہی تھی۔ کلثوم کو دیکھتے ہی اس نے مدغم آواز میں کسی سے فون بند کرنے کی اجازت چاہی اور یہ کہہ کر کال ڈراپ کر دی۔ ”اگے تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔“

”جی فرمائیے۔“ اس نے سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی اپنی دادی کو مخاطب کیا۔

”بس دل چاہ رہا تھا، تمہارے پاس بیٹھے کو، تم سے باتیں کرنے کو۔ کیا میں بنا کام کے تمہارے کمرے میں نہیں آسکتی آمنہ؟“

”نکتی بار کہا ہے مجھے اس نام سے مت پکارا کریں۔ میں ایسی ہوں۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

کلثوم کا دل دکھ سے بھر گیا۔ ”میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔“ کلثوم نام کی بحث پر الجھنے کے بجائے اصل مدعے پر آگئی۔

”جی کیسے۔“ ایسی اس کی طرف استغما یہ انداز میں دیکھنے لگی۔

”بیٹا! تمہاری استانی صاحبہ تمہیں پڑھانے کے لیے اتنی دور سے آتی ہیں اور تم پڑھنے سے انکار کر دیتی ہو۔ ان کا جی برا ہو جاتا ہے۔“

”دور سے پڑھانے آتی ہیں تو کوئی احسان نہیں کرتیں مجھ پر۔ باقاعدہ تنخواہ دی جاتی ہے انہیں اس کام کی۔“ اس نے رعوت زدہ انداز میں جواب دیا تو کلثوم تاسف بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”استاد کا بڑا درجہ ہوتا ہے۔ صرف چند سکول کے عوض ہم اپنے استاد کا احسان نہیں اتار سکتے بیٹا۔“ کلثوم نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”دادی! آپ سے ایک بات کہوں، امید کرتی ہوں آپ برا نہیں منائیں گی؟“

”کہو میری جان! تمہاری کسی بات کا میں برا مناؤں گی یہ سوچ بھی کیسے لیا تم نے۔“ کلثوم نے واری صدقے جاتے ہوئے جواب دیا۔

”کسی کے کمرے میں جانے سے پہلے دروازے پر ہلکے سے ناک کر کے اندر آنے کی پر مشین لے لیا کریں۔ یوں اچانک کسی کے کمرے میں، بنا اجازت کے کھس آنا بہت بری بات ہے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کی نیش بٹل کو غور سے دیکھنے لگی۔

کلثوم کچھ دیر تک تو ہونق چہرہ لیے اس کی بات کی۔ تب اترنے کی کوشش کرتی رہی۔ ایسی کی بات ابھی طرح سمجھنے کے باوجود وہ سمجھتا نہیں جانتی تھی۔ ”کسی کے کمرے میں؟“ اس نے پوچھتی ہی اس کے الفاظ دہرائے۔ ”ٹھیک ہے بیٹا! آئندہ خیال رکھوں گی۔ یہ کہہ کر کلثوم اس کے کمرے سے نکل آئی۔ کیونکہ کسی کے سامنے آنکھوں کو چمکانا سے سخت نا پسند تھا۔ وہ ہمیشہ سے تنہائی میں رونے کی قائل تھی۔

☆☆☆

اسی رات، کشمالہ اور تیمور میں خوب ٹوکنا ہوئی اور دو کلثوم کی ذات ٹھہری۔ بیٹا جتنا بھی بے حس اور بے غیرت

ہو جائے ماں کو چور کہنے والے سے الجھنے لگتا ہے۔ کشمالہ بھی اس کے سامنے اس کی ماں کو چور کہہ رہی تھی اور وہ تاؤ کھا رہا تھا۔ بھلا اتنا گھٹیا الزام کیسے برداشت کر سکتا تھا۔ نتائج کی پروا کیے بنا ہی کشمالہ کو برا بھلا کہنے لگا۔

کشمالہ نے چاول چوری کرنے سے لے کر گوشت چوری کرنے تک کی تمام رام کہانی سنائی مگر وہ کسی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے کشمالہ کے ہر الزام کی سختی سے تردید کی بلکہ کشمالہ کے شرمناک رویے کی سخت مذمت بھی کی۔

کشمالہ کو تیمور سے اس قدر جارحانہ مدافعت کی امید نہ تھی۔ اس کو اتنا سچ یاد کیا تو خاموش ہوئی مگر دماغ مسلسل غور و فکر میں مصروف تھا۔

اگلے دن نسرین کو تاکید کی کہ بڑھیا کی حرکات پر کڑی نظر رکھی جائے۔ جیسے ہی اچھی واردات کا ارتکاب کرنا چاہے، اسے رازداری سے انکار کر دیا جائے۔ وہ شوہر کی سرکشی کی بیز اس کی ماں کو اس کی نظروں میں ڈھیل کر کے دینا چاہتی تھی۔ بس مناسب موقع کی تاک میں تھی اور پھر وہ موقع بھی جلد ہی ہاتھ آگیا۔

آج پھر گھر میں شام کے کھانے میں مٹن پلاؤ پکا تھا۔ نسرین اور کشمالہ ایک دوسرے کو مٹنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ کھانے کے بعد نسرین نے ٹیبل سے برتن اٹھاتے ہوئے، کشمالہ کو آنکھوں سے اشارہ کیا اور پھر کشمالہ نے پوری رات جاگ کر، کھڑکی سے پردہ ہٹا کر کچن کی گھرائی کی اور جب کلثوم کو کچن میں داخل ہوتے دیکھا تو اسے لگا جیسے اس کے جانے کی سخت وصول ہوئی ہے۔

سرشاری کے عالم میں شوہر کو جھنجھوڑ کر چنگایا اور اسے ساتھ لیے کچن کا رخ کیا، جہاں کلثوم اپنی لالرائی میں مصروف تھی۔ اس کے دیم وکمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ آج یوں اچانک، مین مونی پر چھاپا پڑ جائے گا۔ وہ چاولوں کی پلیٹ بھر کر واپس بیٹنی تو سامنے بہو اور بیٹے کو کھڑا پایا۔ بری طرح بوکھلائی۔ پلیٹ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔

بہو کے چہرے پر تعجب کی آمیز مسکراہٹ دیکھی اور بیٹے کو یوں شرمندہ اور دل گرفتہ سا دیکھا تو دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگی۔

”مجھے معاف کر دو بیٹا! آئندہ کبھی چوری نہیں کروں گی۔“ وہ بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رونے لگی۔

تیمور جو پتھر کا بت بنا کھڑا تھا، ماں کے اس طرح رونے اور ہاتھ جوڑنے پر رت۔۔۔ اٹھا آگرم بڑے۔۔۔

بڑے ہوئے ہاتھ الگ کیے اور ان چوری کرنے والے ہاتھوں کو چومنے لگا۔

اب کلثوم بیٹے کے سینے سے لگی سسک رہی تھی اور کشمالہ زخم خوردہ ناخنوں سے گل کھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

”اماں!“ تیمور نے آنسوؤں سے بھیجی آواز میں پکارا۔
”ہوں۔۔۔۔۔“ کلثوم کے حلق سے اتنی آواز بھی یہ شخص نکل سکی۔

”اپنی چیزیں وغیرہ اکٹھی کر لیں۔ میں آپ کو گاؤں چھوڑ آؤں۔ یہ جگہ آپ کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔“ کلثوم آنکھیں پونچھتے ہوئے، تائید میں سر ہلانے لگی۔

☆☆☆

رات کا تجا نے کون سا پہر تھا، جب اچانک کشمالہ کو سوتے میں کھانسی کا دورہ اٹھا۔ وہ کھانسنے کھانسنے بے حال ہو گئی۔ سینے کو مسلتے ہوئے بے اختیار حلق سے ”پانی“ کی صدا بلند ہوئی مگر آواز اتنی خفیف تھی کہ پاس سوئی ہوئی ملازمہ کے کانوں تک بھی نہ پہنچ سکی۔ اب کشمالہ بے چینی سے اٹھ کے بیٹھ گئی اور اپنے بیڈ کی پائنتی سائڈ پر زمین پر سوئی ہوئی ملازمہ کو آواز دی۔

”نسرین!“ پھر خود ہی زیر لب بڑبڑائی۔ ”نکتی ماگل ہوں میں۔۔۔۔۔ نسرین کی شادی کو دس سال ہو گئے مگر ابھی تک اسے نکاحی رہتی ہوں۔“

”تائیا۔۔۔۔۔“ اس نے اب کی بار وجود کی پوری قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے، تھوڑی اونچی آواز سے پکارا۔

زمین پر سوئی ہوئی سولہ سترہ سالہ تائیا کشمالہ کے آواز دینے پر تھوڑا کسمساں اور پھر بے سہہ ہو گئی۔ نوخیز جوانی مدبھرے سبوں کے جھولے پر جھولتے رہنا چاہتی تھی۔

کشمالہ نے جا رہا پانچ آوازیں دے کر اسے خوابوں کی دنیا سے باہر تو کھینچ لیا مگر خود اس کی سانس اب دھونکی کی طرح چلنے لگی تھی۔

تائیا بادل ناخواستہ انھی اور اپنی لال انکارہ آنکھوں سے اس کو گھورنے لگی۔ اس کے چہرے پر چھائی ناگواری کشمالہ کو صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مگر کیا کرتی۔ اس کی نیند خراب کرنا اس کی مجبوری تھی۔

”تائیا! الجھنے پانی پلاؤ۔“ کشمالہ نے کانپتی آواز میں التجائی اور ایک ہاتھ گردن پر پھیرنے لگی۔

تائیا انھی، کمرے کے ایک کونے میں رکھے ہوئے چھوٹے فرنیچ کو کھولا۔ پانی کی بوتل باہر نکالی۔ ایک گلاس میں

میں گلاس خالی گرمی اور پھر خالی گلاس اس کی طرف بڑھایا۔
”سوری تانیہ! آج پھر میری وجہ سے تمہاری نیند خراب ہوئی۔“ کشمالہ نے اس کا خراب موڈ بحال کرنے کی کوشش کی۔

”یہ کون سی نئی بات ہے۔ روزانہ کا معمول ہے جی۔“ اس نے بے رخی سے جواب دیا اور گلاس پکڑ کر واپس چل دی۔
گلاس فرنیچ کے اوپر رکھ کر وہ پھر سے زمین پر نہ بچھے اپنے میز پر لیٹ گئی۔

”ایک بات کی تمہیں نہیں آتی بیگم صاحبہ! آپ کو ہمیشہ یہ سمجھانی کا دورہ آدھی رات کے بعد ہی کیوں پڑتا ہے؟ یا میری چوسکون نیند آپ سے ہضم نہیں ہوتی؟“ تانیہ کا طنزیہ لہجہ، کشمالہ کے دل پر برجمی کی طرح لگا۔

”سوری تانیہ.....! میں سوری۔“ یہ کہتے کہتے اس کی آواز رندہ گئی اور خود بھی نڈھال سی لیٹ گئی۔

”کل ہی چھوٹی بیگم صاحبہ سے بات کرتی ہوں۔ مجھے یہ نوکری نہیں دارا کھاتی؟ کیا فائدہ ایسی کمائی کا کہ پندرہ رات کو سکون سے سو بھی نہ سکے۔“ تانیہ پر لب بڑبڑا رہی تھی۔

چند لمحوں بعد اس کی بڑبڑاہٹ بند ہوئی جس سے کشمالہ نے اندازہ لگایا کہ وہ سو چکی ہے۔ اب وہ چت لیٹی جھٹ کو گھور رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر نچے کو گھس رہے تھے۔
آہ! وقت کتنی جلدی گزر گیا۔ پندرہ سال ایسے گزر گئے جیسے کل کی بات ہو۔

پندرہ سال پہلے اس کی ساس ”کلثوم“ بھی اسی سروٹ کو اثر میں اپنے شب و روز گزارا کرتی تھی جس میں آج وہ مردوں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ جس راج سنگھان پر بیٹھ کر حکومت کیا کرتی تھی، کبھی وہ ہنگامان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ یہ اقتدار عارضی ہے۔ یہ حکومت اور تخت و تاج اپنے ہاتھوں سے کسی دوسرے کو سونپنا پڑے گا۔

ان پندرہ سالوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔
کلثوم اپنی بیاریوں اور اپنوں کے ناروا سلوک کو سینے سے لگائے دنیا چھوڑ گئی۔ اس کے مرنے کا تیور کو بہت غم ہوا۔ وہ خود کو ماں کا مجرم سمجھتا تھا۔ احتشام اور آمنہ کی کچے بعد دیگرے شادیاں کر کے وہ تارک الدنیا ہو گیا۔ سارا سارا دن مسجد میں بیٹھ کر عبادت میں مشغول رہتا۔

ایک دفعہ رمضان کے مہینے میں مسجد میں نماز پڑھنے گیا۔ مسجد میں گیا تو سر اٹھانے کا اللہ نے حکم نہ دیا۔ مسجد میں روزے کی حالت میں روح نفس عصری سے پرداز کر گئی۔

اس کی میت گھر لائی گئی تو کشمالہ کو صحیح معنوں میں احساس ہوا کہ عرش سے گر کر فرش تک کیسے پہنچا جاتا ہے۔
باپ کے مرتے ہی بچوں کے رویوں میں واضح بدلاؤ پیدا ہوتا چلا گیا اور پھر کشمالہ پر قانع کے ایک نے، اس کی اولاد کی نظر میں اس کا ناکارہ وجود ایک بوجھ بنادیا۔

اسے آج بھی وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب احتشام نے اس کے مظلوم وجود کے پاس کھڑے ہو کر کہا تھا۔

”ماما! میں نے اور عروج نے کل یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کا کمرہ اب سید کا (اس کی بیٹی) کو دے دیا جائے۔ آپ تو جانتی ہیں سید کا اور حنظلہ کے بیچ ہر روز جھگڑا ہوتا ہے، روم کو لے کر۔ دونوں اپنے الگ کمرے کی فرمائش کرتے ہیں اور ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ ان کی ڈیمانڈ کو پورا کرنا ہی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اب زمانہ ایسا نہیں رہا کہ سگے بہن بھائی کو بھی ایک کمرے میں سلا یا جائے۔“ وہ خاموش ہو کر تانیہ طلب نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔

”مگر..... بیٹا..... میں اس حالت میں اوپری منزل پر کیسے چڑھ سکتی ہوں؟“ اس نے قانع زدہ زبان کو بڑی مشکل سے حرکت دی۔

”ڈونٹ وری ماما! اب میں اتنا بھی خود غرض نہیں کہ بیمار ماں کو سیر حیاں اترنے اور چڑھنے کی مشقت میں جمونک دوں۔“ وہ مسکرایا اور پاس بیٹھ کر پھر گویا ہوا۔ ”سروٹ کو اثر کو آپ کے بیڑوم میں تبدیل کر دوں گا۔ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے جانے میں بھی بہت آسانی رہے گی۔ باہر سے ہی گاڑی میں بیٹھ کر جایا کریں گی۔“ اس نے شاباشی لینے والے انداز میں کشمالہ کی طرف دیکھا تو وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائے گی۔

”سچ کہتے ہو بیٹا! جو بول کا درخت میں نے لگا دیا تھا، اس کا پھل کھانے کا وقت آ گیا ہے۔“
اس کے طنزیہ جملے کو پتا نہیں دو کیا سمجھا۔ فوراً وضاحت دینے لگا۔

”ماما! آپ کے ساتھ میں وہ سلوک نہیں کروں گا، جو آپ نے دادی کے ساتھ کیا تھا۔ میں اس کو اثر میں آپ کی ضرورت کی ہر شے مہیا کروں گا۔ وہ صرف نام کا کو اثر ہو گا مگر اس کے اندر نی وی، فرنیچ، اسے سی سب کچھ ہو گا۔ ڈونٹ وری ماما۔“ اس نے ماں کے پاس بیٹھ کر اس کا ہاتھ چھسپایا تو کشمالہ نے اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

اور اب وہ ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود، کئی کئی روز تک اپنے پیاروں کی غفلیں دیکھنے کے لیے ترسا کرتی۔



فنڈلے اپنے بزنس پارٹنر بورگ کو کبھی قتل نہ کرتا، اگر اس نے فنڈلے کو جیل بھیجے گی دھمکی نڈی ہوتی۔

بورگ کھانے کی میز پر استعمال ہونے والے چاندی کے اعلیٰ قسم کے ظروف اور ٹکڑی بڑے فخر کے ساتھ اپنے ملک ڈنمارک سے درآمد کیا کرتا تھا اور اسے اس بات پر بے حد فخر تھا۔ البتہ اس کے علم میں یہ بات آگئی تھی کہ اس کا پارٹنر فنڈلے ان برتنوں میں پتیل کے سستے ظروف شامل کر کے فروخت کر دیتا ہے اور سارا منافع خود ہڑپ کر جاتا ہے۔

اس نے کئی بار فنڈلے کو متنبہ بھی کیا تھا کہ وہ اپنی اس حرکت سے باز آجائے لیکن فنڈلے نے اس کی سرزنش پر کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔

اس وقت فنڈلے کے ذہن کے کسی گوشے میں تشدد کرنے کا کوئی گمان تک نہیں تھا، جب بورگ نے رات ایک

بجے آئے ان کے دفتر میں طلب کیا تھا۔ بورگ کام کے اوقات کے سلسلے میں ہمیشہ سے متون مزاج ثابت ہوا تھا۔ اس لیے رات ایک بجے بورگ کے طلب کیے جانے پر کوئی تشویش یا پریشانی لاحق نہیں ہوئی تھی۔

اس وقت پوری عمارت میں صرف وہ دونوں ہی موجود تھے۔

فنڈلے لفٹ سے نکل کر خراماں خراماں چلتا ہوا دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا بریف کیس اس کے ہاتھ میں تھا۔ ”ایسی کیا بات ہے جو تم نے اس وقت مجھے یہاں بلوایا ہے؟ کیا صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے؟“ اس نے بورگ سے کہا۔

”نہیں!“ بورگ دباؤ۔
بورگ نے اسے بتایا تھا کہ اس کے ملک ڈنمارک میں اخلاقی آزادی اس حد تک ہے کہ ہر کوئی بے لباس گھوم

بریف کیس

سلیم انور

زبان و بیان میں فرق اور لفظی معنی کے بدل جانے سے کبھی کبھی زندگی ایک عجیب موز پر آجاتی ہے... جیسے کہ اس کی تمام ہوشیاری دھری کی دھری رہ گئی... مرنے مرنے بھی مقتول اپنے قاتل کا ہاتھ چھوڑ گیا۔

لاج میں اندر سے ایک دوست کی لرزہ خیز واردات کا قصہ



پھر سکتا ہے، غیر شادی شدہ نوجوان اپنے والدین کی رضامندی سے عشق و محبت کر سکتے ہیں لیکن جب بات کاروبار کی آتی ہے تو وہ نہایت کٹربن جاتے ہیں۔

”تم دھوکے باز ہو۔“ وہ فنڈلے سے چیخ کر بولا۔ ”میں تمہیں گرفتار کرادوں گا۔ میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے۔“ یہ صورت حال فنڈلے کے لیے برداشت سے باہر تھی۔

”تم مجھے جیل نہیں بھیج دو گے۔“ فنڈلے آپے سے باہر ہوتے ہوئے چیخا اور اشتعال کے عالم میں اپنے سامنے میز پر پڑا ہوا لفافہ چاک کرنے والا اسٹیل کا تیز دھار باریک نوک والا چاقو اٹھا یا اور بورگ کے سینے میں گھونپ دیا۔ اس خطرناک قسمے میں بورگ کو اس حرکت سے روکنے کے لیے اسے یہی واحد راستہ بھائی دیا تھا۔

بورگ ایک دردناک کراہ کے ساتھ فرش پر پڑے ہوئے قالین پر لڑکھڑاتے ہوئے گر پڑا۔ خون آلود چاقو بدستور فنڈلے کی گرفت میں تھا۔

اتنے میں نیچے سڑک پر رات کے سناٹے میں کسی کار کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ فنڈلے چاقو بدستور ہاتھ میں تھامے کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ اس نے جھانک کر نیچے کی طرف دیکھا۔

دو آدمی ایک پولیس ہیڈرول کار سے نیچے اتر رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بورگ نے پولیس کو طلب کرنے کے بارے میں اسے جھوٹی دھونس نہیں دی تھی۔

ان دو آدمیوں میں سے ایک عمارت کے دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا جبکہ دوسرا شخص دوڑتا ہوا عمارت میں داخل ہو گیا۔

فنڈلے کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اس پر پہچانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ راہ فرار اختیار کرنے کے بارے میں سوچنے لگا مگر لفٹ کے ذریعے نیچے نہیں جاسکتا تھا۔ اتنی رات گئے صرف ایک لفٹ ہی چل رہی تھی اور پولیس مین اسی لفٹ سے اوپر آ رہا تھا۔ وہ آگ سے بچاؤ والے راستے کی سیڑھیوں سے دوڑتے ہوئے نو منزل نیچے بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو نیچے موجود پولیس مین کی ہانپوں میں پھنچ جاتا۔

اب صرف ایک ہی صورت باقی تھی۔ وہ یہی ظاہر کرے گا کہ وہ بھی ابھی ابھی یہاں پہنچا ہے اور اس جرم کو دریافت کیا ہے۔

اس کے لیے اسے آؤٹ لک سے نجات حاصل کرنا ہوگی

فرار ہوا ہے۔

اسے چاقو کو چھپانے کے لیے کوئی جگہ بھانکی نہیں دی۔ وہ اسے نہیں بھی چھپاتا تو جلد یا بدیر اسے تلاش کر لیا جاتا۔ نہ ہی وہ اس چاقو کو کھڑکی سے باہر نیچے سڑک پر اچھال سکتا تھا۔ پوری عمارت ایئر کنڈیشننگی اور تمام کھڑکیاں سیل شدہ تھیں۔

لیکن چاقو کو تو غائب کرنا تھا۔

اس کی پریشان نگاہیں بے تابی سے دفتر کا جائزہ لینے لگیں۔ بورگ کی میز پر ایک جانب کاروباری لفافوں کا ایک ڈھیر موجود تھا جس پر فرم کے نام ”بورگ اینڈ فنڈلے“ کے ساتھ جوابی پتا بھی چھپا ہوا تھا۔ ان جوابی لفافوں پر ڈاک کا گٹھ چپکانے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

فنڈلے، بورگ کی لاش پر جھک گیا اور اس کے خون آلود کوٹ کے دامن سے چاقو کے پھل پر لگے خون کو صاف کرنے کے بعد اس نے ایک چھپا ہوا جوابی لفافہ اٹھا یا اور باریک پھل دار لفافہ چاک کرنے والا اسٹیل کا چاقو اس لفافے میں ڈال دیا۔ لفافہ چاقو کے سینے سائے کے مطابق تھا۔ اس نے لفافے کے فلیپ پر زبان پھیرتے ہوئے اس کے گوند گویا کیا اور لفافہ بند کر دیا۔

پھر وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر باہر کار پڑے درمیں آ گیا۔ لفٹ کے اوپر آنے کی آواز نہ دیکھ آتی جارہی تھی۔ فنڈلے نے بند لفافہ ڈاک نیچے تک لے جانے والی پھسلواؤ ڈھلوان میں ڈال دیا پھر پلٹ گیا۔

تب اس کی نگاہ بے ساختہ بورگ پر پڑی جو ابھی مرا نہیں تھا۔

وہ فرش پر کھسکا ہوا دروازے کی دہلیز پر آ گیا تھا۔ اس کا آدھا دھڑا برابر ادھاری میں تھا اور اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں فنڈلے پر جمی ہوئی تھیں۔

اتنے میں لفٹ کا دروازہ کھلا اور پولیس مین نے راہداری میں قدم رکھتے ہوئے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ فنڈلے کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ پر جوش لہجے میں بولا۔ ”میں فنڈلے ہوں۔ میں ابھی ابھی یہاں پہنچا ہوں۔ میرا پائزر ڈی ہے۔“

پولیس مین فرش پر پڑے بورگ کی جانب لپکا اور اس کے خون آلود لباس کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ چاقو زنی کا واقعہ لگتا ہے۔ چاقو کہاں ہے؟“

بورگ نے اپنی کپکپاتی آنکھ اٹھا کر فنڈلے کی جانب

اس کے حلق سے کھڑکھڑاتی آواز نکلی۔ ”بریف کیس!“

فنڈلے کمرے سے باہر نکلتے وقت اپنا بریف کیس ساتھ اٹھا لیا تھا تاکہ یہ ظاہر ہو سکے کہ وہ خود بھی ابھی یہاں پہنچا ہے۔ وہ حیران نظروں سے بورگ کو دیکھنے لگا۔ یہ کیا بڑا بڑا رہا ہے؟ اس معاملے سے اس کے بریف کیس کا تو کوئی تعلق نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ مرتے ہوئے بورگ کا دماغ بالکل بھی کام نہیں کر رہا ہے۔

پھر بورگ کے حلق سے خون کی قفل کی سی آوازیں آنے لگیں اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

”یہ مجھے دے دو۔“ پولیس مین نے فنڈلے سے کہا۔ فنڈلے نے مسکینے کے ساتھ اپنا بریف کیس پولیس مین کی جانب بڑھا دیا۔

”اندر چلو۔“ پولیس مین نے دفتر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اندر جانے کے بعد فنڈلے.... دفتر میں بیٹھ گیا اور پولیس مین فون کرنے میں مصروف ہو گیا۔

منٹوں میں مزید پولیس کی نفری بھی آ گئی۔ ان کے ساتھ ایک ایبویٹس بھی تھی۔ ایبویٹس کے ڈاکٹر نے بورگ کا معائنہ کرنے کے بعد اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ اتنے میں پولیس انسپٹر میک لین بھی آ گیا اور اس نے تحقیقات کا چارج سنبھال لیا۔

پولیس کی تحویل میں موجود فنڈلے کے بریف کیس کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد.... اس میں سے کوئی کارآمد شے برآمد نہیں ہوئی۔ چند اہم کاروباری کاغذات کے سوا بریف کیس میں اور کچھ نہیں تھا۔ پھر پولیس نے پورا دفتر کھنگال لیا لیکن آؤٹ لک تلاش کرنے میں ناکام رہی۔

”لگتا ہے کہ قاتل اس آؤٹ لک کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“ انسپٹر میک لین نے سر ہلاتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔ ”اب تم جاسکتے ہو ستر فنڈلے!“

☆☆☆

فنڈلے نے سوچا کہ ڈاک کو لے جانے اور پھر اس لفافے کے ڈاک سے واپسی میں جو بیس گھنٹے کا وقت لگ سکتا ہے۔ اس لیے کہ ڈاک کا نظام قطعی غیر یقینی ہے۔

البتہ ایک بار جب لفافہ چاک کرنے والا چاقو ڈاک کے ذریعے واپس اس کے پاس پہنچ جائے گا تو پھر وہ اطمینان کے ساتھ اسے اپنی مرضی سے ٹھکانے لگا دے گا۔

اگلے روز وہ اپنے دفتر چلا گیا۔ اب سلور ویز کا پورا

کاروبار سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ دفتر کے دروازے کا تالا کھولنے سے پہلے اس نے ڈاک کا تھیلہ جو اس کے دروازے پر رکھا ہوا تھا، اٹھا لیا اور تالا کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے ڈاک کا تھیلہ اپنی میز پر الٹ دیا۔ وہ اپنی ڈاک چھانٹنے لگا۔

تب اس کی نظروں میں وہ جوابی لفافہ آ گیا جس میں اس نے لفافہ چاک کرنے والا چاقو چھپایا تھا۔ اس نے وہ لفافہ اٹھا لیا۔ لفافے میں موجود چاقو کے خاکے کو محسوس کرتے ہوئے اسے قہقہے اطمینان ہونے لگا۔ پھر اس نے لفافے کا فلیپ کھولا چاہا۔

اتنے میں اس کے دفتر کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور پولیس انسپٹر میک لین اندر داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ کرخت چہرے اور کسرتی جسم والا ایک پولیس افسر بھی تھا جو فنڈلے کو کینڈے توڑ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”یہ میں لے رہا ہوں۔“ انسپٹر میک لین نے فنڈلے کے ہاتھ سے لفافہ جھٹکے ہوئے کہا۔

اس دوران لفافے کا فلیپ کھل چکا تھا اور لفافہ چاک کرنے والے چاقو کا پھل نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔ ”تمہیں قتل کے الزام میں گرفتار کیا جا رہا ہے، فنڈلے۔“ انسپٹر میک لین نے کہا۔ ”اور میں تمہیں متنبہ کر رہا ہوں کہ.....“

فنڈلے کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن..... لیکن تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”بورگ نے ہمیں بتا دیا تھا کہ تم نے چاقو کے ساتھ کیا، کیا ہے البتہ مجھے احساس نہیں ہو سکا تھا کہ مرتے دم اس نے اپنی آخری سانسوں کے وقت کیا الفاظ ادا کیے تھے۔“

”اس نے تو صرف بریف کیس کہا تھا، صرف بریف کیس!“ فنڈلے نے بورگ کے آخری الفاظ دہرائے۔

”ہاں۔ اس نے یہ الفاظ اپنی مادری زبان میں ادا کیے تھے۔ گزشتہ شب جب میں اپنے ایک ڈیش دوست سے ڈیش زبان کا درس لے رہا تھا تو جب میری سمجھ میں آیا کہ تم نے آؤٹ لک ڈاک نیچے پہنچانے والی ڈھلان سے کھسکا دیا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ فنڈلے نے حیرت سے پوچھا۔ ”بورگ نے حقیقت میں بریف کیس نہیں کہا تھا۔ اس نے اپنی مادری زبان میں ”brevkasse“ کہا تھا اور ڈنمارک کی زبان میں یہ لفظ ”لیٹر بکس“ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔“

کاروبار کے ہاتھ میں تھا۔ وہ خوش دلی کے ساتھ اس

محفل شہر و سخن

✽ محمد ہمایوں تولی..... اسلام آباد
جن کے پروں میں قوت پرواز ہی نہیں
تقید کر رہے ہیں وہ مری اڑان پر
✽ عبدالجبار روی الصاری..... پورے والا
یہ ساغر، شمشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں، لبو رلاوتے ہیں
✽ نازش خان..... پشاور
اگر میں آؤں گا صدیوں کی عمر لاؤں گا
کہ تیرے پاس مجھے مختصر نہیں رہنا



✽ آذین رضوان..... کورنگی، کراچی
آسمانوں کی کشش کبھی رہتی ہے مگر
خاک سے پاؤں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے
تم نے چاہا بھی تو کس حال میں چاہا ہے ہمیں
جب ہمیں وقت بدلتے ہوئے ڈر لگتا ہے

✽ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس
کبھی بن سنور کے جو آگے تو بہار حسن دکھا گئے
میرے دل کو داغ لگا گئے یہ نیا شگوفہ کھلا گئے
✽ محمد شفیق حسین..... سندھی ہوٹل، نیو کراچی
میرے محبوب نے وعدہ کیا ہے پانچویں دن کا
کسی سے سن لیا ہوگا یہ دنیا چار دن کی ہے

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
ایسا کوئی نہیں جو کہے میں ہوں خود خراب
ہر شخص کہہ رہا ہے زمانہ خراب ہے
✽ کرن عمران..... گلشن اقبال، کراچی
اک ایسی بزم سچائی گئی ہے غلوت میں
سمٹ گیا ہے زمانہ خود اپنی وسعت میں
وہ کارواں جو تری رہ گزر سے لوٹ آئے
اٹے ہوئے ہیں ابھی تک غبار وحشت میں



✽ تہمید یوسف..... اسلام آباد
رات کی بات کا مذکور ہی کیا
چھوڑے رات گئی بات گئی

✽ محمد آریز ملک..... کراچی
جرم الفت پہ ہمیں لوگ سزا دیتے ہیں
کیسے ناداں ہیں شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

✽ غفرین احمد..... ملتان
تیرے بغیر اگر زندگی کی خواہش ہو
خدا کرے مجھے وہ زندگی نہ رہے آئے

✽ نوشین جاوید..... گلشن معمار
اس کی زد پر وہ بھی خود بھی تو آسکتے ہیں
یہ کہاں جانتے ہیں آگ لگانے والے
کون تعبیر کی سوچے کہ سبھی قتل ہوئے
موسم خواب کی تفصیل بتانے والے

✽ محمد یعقوب..... رحیم یار خان
میرے دیران درپچوں میں بھی خوشبو جاگے
وہ میرے گھر کے دروہام سجانے آئے

✽ شہزاد خان..... کوئٹہ
تیرے ہی بھلے کو چاہتا ہوں
میں تجھ کو کبھی نہ یاد آؤں

✽ وردہ ملک..... کراچی
اب اس سے بڑھ کے محبت کا قہقہہ کیا ہوگا
سب انجی ہیں یہاں رسم درواہ ہوتے ہوئے
مجھے اچالے کا لالچ دیا گیا اور پھر
میں دیکھتا رہا دن کو سیاہ ہوتے ہوئے

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
ہر جانب بارود بچھا ہے قدموں میں
اور خلقت دیوانی بڑھتی جاتی ہے
خاموشی سے ظلم ہے جاتے ہیں لوگ
نکتی تن آسانی بڑھتی جاتی ہے

✽ عامر شہزاد..... نیکانہ صاحب
بظاہر تو محبت تھی حقیقت میں مجبور رہا
اسے شہرت ملی ہم سے وہ لوگوں میں مفروز رہا

✽ انعم کمال..... حیدر آباد
جن خوابوں کی تعبیر پہ اصرار ہے تم کو
ان خوابوں کی تعبیر بتانے کی نہیں ہے
اس بھیڑ میں سائے سے پھرتا ہوا سایہ
کہتا ہے یہاں ساتھ بھانے کی نہیں ہے

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال
خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے
نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

✽ مہتاب احمد..... حیدر آباد
جس کی طلب میں اس قدر آگے نکل گئے
دنیا ارے یہ دنیا تو برباد ہووے گی

✽ عالیہ بھٹی..... سرگودھا
بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لکھ لگا
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

✽ غلام محمد..... پڑمیدین
تب چاک گریباں کا مزہ ہے دل ٹالاں
جب اک نفس ابھرا ہوا ہر تار میں آوے

✽ ظہیر احمد..... سکھر
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو
کاش کے تم مرے لیے ہوتے
میری قسمت میں غم مگر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

✽ امتیاز احمد..... منڈی بہاؤ الدین
چپک رہا ہے بدن پر لبو سے پیرا ہن
ہماری جب کو اب حاجت رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جتو کیا ہے

✽ اسلم علی..... نواب شاہ
تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے
اگر پہلو تھی کیجیے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

✽ نواز رشید..... میرپور خاص
نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
اتحاد اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی

✽ عاصم خان..... کراچی
ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

✽ زوہیب احمد ملک..... کراچی
کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

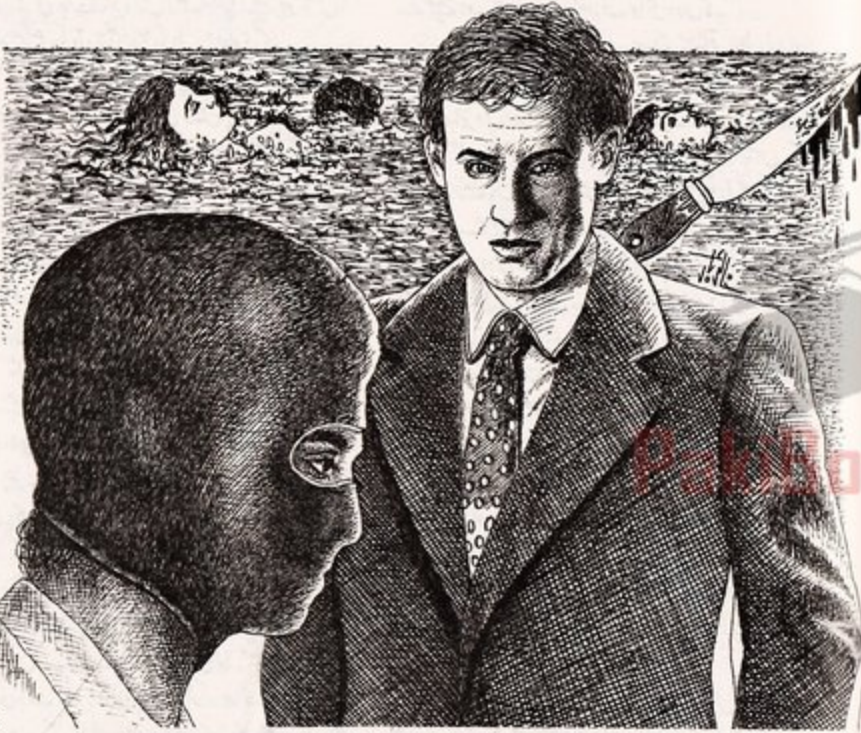
✽ زریان سلطان..... اردو بازار، کراچی
ہمارے بھر کے قصے سیمو گے تو لکھو گے
ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک
تمہارے حسن کے بلوے نے رنگوں میں ڈھالیں گے
ہمیں کچھ ہوش تو آئے تمہیں تصویر کرنے تک

✽ محمد عظیم..... جھنگ
میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبہ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بے

چشم دید

محمد طاہر عمیر

جرائم کی دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک طاقت ور اپنے گھمنڈ میں بڑے سے بڑا جرم کرتا چلا جاتا ہے مگر... بدقسمتی سے ایک چھوٹی سی چالاکی پر پکڑا جاتا ہے کیونکہ... قدرت اسے مزید مواقع دینے سے انکاری ہو جاتی ہے۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی صورت حال کا شکار تھا اور معاملات کی نوعیت پر حیران بھی۔



مشری دنیا میں جرائم کے ارتکاب میں ہر دم مجبور کرنے والا ایک مکار مجرم

”میرنا! تمہارے مشروم اور دودھ کی بوتل میں فرق میں رکھ رہا ہوں۔“ اس نے بے آواز بلند کہا اور دونوں چیزیں فرق میں رکھ دیں۔ شاپنگ بیگ میں سے دو کھربا کس نکال کر وہ لاؤنج کی طرف آیا۔

”روزی اور میڈی کے کھربا کس بھی لے آیا ہوں۔“

انہو... میرنا! کیا تم نے وی کی آواز کم کر دی؟“ وہ یہ کہتے

میکس گھر کا صدر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خاکی رنگ کا شاپنگ بیگ تھا۔ بائیں جانب سے لاؤنج میں سے ٹی وی چلنے کی بلند آواز آرہی تھی جہاں بیس بال کا میچ لگا ہوا تھا۔ وہ سیدھا دائیں جانب سے پچن کی طرف آیا اور شاپنگ بیگ کو ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر اس میں سے سامان نکالنے لگا۔

میسونہ عزیز... لاہور

ہم اہل خواب کی مجبوریاں سمجھتے ہیں سو ہم نے کچھ نہیں سوچا ترے خیال کے بعد

نازش ریحان... لیہ

رکا ہوا تھا ہمارا سانس میرے سینے میں اسے گلے نہ لگاتا تو گھٹ کے مرجاتا

اولیس خان... بہاولنگر

عشق وہ حیرت و دانائی کا موسم ہے جہاں کام آتی ہی نہیں دانش دنیا مرے دل

احسن آفریدی... میانوالی

سانس لینے سے بھی بھرتا نہیں سینے کا خلا جانے کیساتھ ہے جو بے ڈل ہوئی ہے مجھ میں

فیاض احمد... اداکارہ

اک نئی آگ بھر میں ایسی بھڑک اٹھی کہ پھر سارے ہی رنگ اتر گئے رنگ وصال کے سوا

عاصم علی... ٹنڈوالہیار

کبھی خوشی سے ہار کسی نے مانی ہے؟ آخر دنیا کیوں ہم کو تسلیم کرے

شرییل خان... لاہور

ہر اختیار پر بے اختیار قابض ہیں ہر اقتدار پر قبضہ ہے غاصبانہ وی

رضا احمد... فیصل آباد

جانے کس لہر میں تھا کوزہ گر خاک ہوئی رہی ادھر سے ادھر

شاہانہ فیض... چنیوٹ

عشق گر ایسا عشق ہے آنکھوں سے بہنے دو لہو زیت گر ایسی زیت ہے اپنا تو کام ہو چکا

اسما خان... خانیوال

عمر بھر حادثے ہی کرتے رہے استقبال وقت ایسا تھا کہ سینے سے لگائے گئے ہم

نمیر... دیپاڑی

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

پرویز علی خان... آزاد کشمیر

سنہلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے کہ دامن خیال یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

نمرہ علی... کراچی

خواہشوں کے سچ میں اور سازشوں کے درمیاں لکھ رہا ہے آسمان بھی اک عجیب داستان

نہنبل خواجہ... ناظم آباد، کراچی

اک عمر گزاری رستوں میں، ماحول وہی ہے کل جو تھا نہ جانے کیسی گردش میں وہ گلیاں اور چوہارے تھے

سنبل... کراچی

جب بھی انسانوں کو پرکھا، مجھ کو یہ احساس ہوا تن میں ان کا زہر بھرا ہے، ناکن میں کیا رکھا ہے

نورین علی... واہ کینٹ

وہ خوش جمال کتنا، رہتا تھا بدگیاں سا باتوں میں کچھ جلن سی، آنکھوں میں کچھ دھواں سا

وزیر احمد... جامشورو

اک بکھرے خواب کی صورت ہے وہ دور سنہرے بچپن کا اب یاد ہیں قصے بھوتوں کے، پریوں کی کہانی بھول گئی

ثاقب کمال... کراچی

کوئی نہ اپنا ساتھی ہو تو سنگت کس سے ہم جوڑیں چاروں سمت ہو ویرانی تو راہ کو اپنی کیا موڑیں

ممتاز علی... حسن ابدال

اب کے جو مسافت ہمیں درپیش ہے اس میں کچھ بھی تو سراپوں کے حوالے نہیں کرنا

ارم کا شرف... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سائے سے سایہ گزرتا ہوا محسوس ہوا اک عجب خواب کی حیرت میں ملے ہیں تجھ سے

محفل شعر و سخن

کوین
برائے
شمارہ
نومبر
2018

نام: _____
پتا: _____

کچھ نہیں۔ اور یہ بات تو عدالت میں بھی ثابت ہو چکی ہے لہذا اس موضوع کو نہ پھینچا جائے تو بہتر ہے۔“

”اسیٹ میں انڈر ولڈ کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے متعلق آپ نے کیا لائحہ عمل تیار کیا ہے؟“

”میں چھوٹی پمپلیوں کے بجائے بڑی پمپلیوں کو پکڑوں گا اور میں نے جولا ٹیگل بنایا ہے اس پر عمل کر کے میں چند ماہ میں اسیٹ کو کراٹم فری زون بنا کر دکھاؤں گا۔“ اس کے جواب پر ہال کمراتیوں سے گونج اٹھا۔ اس نے وقفے سے ایک قانکہ اٹھا کر پھر سے ایک گھونٹ پانی پیا۔

”کیا بڑی پمپلی سے آپ کا مطلب ڈان کارلوس سے ہے؟“

”ولیم کارلوس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہے ہی نہیں۔ کیا آپ میں سے کسی نے اسے دیکھا ہے؟ یا کسی کے پاس اس کی کوئی تصویر ہے؟ ڈان ولیم کارلوس ایک نقاب ہے اور اس نقاب کے پیچھے جو کوئی بھی ہے، وہ قانون کی نظر میں ایک مجرم کے سوا کچھ نہیں۔“ ان کے جواب پر بھی نے اثبات میں سر ہلا دیا جیسے وہ اس سے متفق ہوں اور اس کے ساتھ ہی پریس کانفرنس ختم ہو گئی۔

☆☆☆

موسلا دھار بارش میں وہ جھپٹتے ہوئے میکس کے گھر میں داخل ہوئے۔ جون نے اندر داخل ہوتے ہی اپنا ہیٹ اور رین کوٹ اتار کر اسٹینڈ پر ڈال دیا۔ وہاں اس کے ڈیپارٹمنٹ کے کئی ماہرین موجود تھے۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اسے گرم کافی کا کپ پکڑاتے ہوئے کہا۔

”ایک لاش فی وی لاؤنج میں ہے جبکہ تین لاشیں باہر سوئنگ پول میں ہیں۔“

”بڑا خوبصورت گھر ہے۔“ اینڈریو نے تبصرہ کیا۔ وہ لاؤنج میں داخل ہو چکے تھے۔ سرخ قالین پر میکس کی قابلِ عبرت لاش پڑی تھی۔ اس کے پیٹ میں بھرا چاقو سے وار کیے گئے تھے۔ پیٹ کی آستیں باہر نکل آئی تھیں۔ اینڈریو نے فوراً ناک پر رومال رکھ لیا جبکہ جون جھک کر لاش کو دیکھنے لگا۔ میکس کے چہرے پر خوف اور تکلیف کے تاثرات نمودار ہو چکے تھے۔ اس کی ادھمکی آنکھوں میں اب کوئی تاثر نہیں تھا۔

”کچھ ملا؟“ اس نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا۔

”کچھ انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ لاشوں کے قریب سے کچھ نہیں ملا۔ اسے چاقو سے مارا گیا ہے اور چاقو اسی سوئنگ پول میں سے ملا ہے جہاں اس کی بیوی اور بچوں کی لاشیں پائی گئیں۔“

حالت بہتر ہے۔ لوٹ مار کا کس نہیں لگتا، کسی نے ذاتی دشمنی نکالی ہے۔“

”یاد رہے قتل کرنے والے ہر بار ایک معما سا کیوں بنا دیتے ہیں؟“ اینڈریو منہ بنا کر بولا۔

”تا کہ تم جیسے لوگ مفت کی تنخواہ پر گزارہ نہ کریں۔“

جون نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اٹھ کر شیشے کی دیوار کی طرف آگیا جس کے پار لان اور سوئنگ پول کا منظر تھا۔ بارش اب بھی جاری تھی۔ پول میں ایک عورت اور تین بچوں کی لاشیں تیر رہی تھیں۔ اس کے سامنے ان لاشوں کو باہر لگانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

”کیوں مسٹر جینکس! تم کیا کہتے ہو اس قتل کے بارے میں؟“ جون نے اینڈریو سے پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ قاتل کئی لوگوں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ میکس گھر پر نہیں تھا اس نے میکس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی اور بچوں کو مارا اور پھر بیٹھ کر میکس کا انتظار کیا اور اس دوران اس نے مشروب سے اپنا دل بھی بہلا یا جیسے ہی میکس اندر داخل ہوا اس نے میکس کو چاقو سے ہلاک کر دیا۔ قاتل کی دشمنی صرف میکس سے تھی اس کی فیملی سے نہیں۔“ اینڈریو نے اس بار تجدد کی کہتا تو جون اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

”یہ تمہارا اندازہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔ مجھے ابھی ابھی قاتل کا فون آیا تھا۔“ اینڈریو نے کہا تو جون کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

”اوہ جون! میں مذاق کر رہا تھا۔ دیکھو مذاق کر لینا چاہیے ایک چھوٹی سی بیسی سے ہماری کتنی مشکلیں آسان ہوتی ہیں۔“ اینڈریو اسے شصے میں آتا دیکھ کر بولا۔

”مجھے اس طرح کا مذاق پسند نہیں۔ خاص طور پر ایک ایسے گھر میں جہاں چار انسانوں کا قتل ہوا ہو۔“ جون نے ناگواری سے کہتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

”دیکھو یہاں کا منظر وہی کہہ رہا ہے جو میں نے بتایا۔ عورت اور بچوں کی لاشیں پھول چکی ہیں اور یہ بتاتی ہیں انہیں قتل کیے ہوئے زیادہ دیر ہو چکی ہے اور میکس کو بعد میں مارا گیا ہے۔ وہاں ایک شاپنگ بیگ بھی پڑا ہے جس میں کچھ سامان ہے۔ میکس اسے لے کر باہر گیا ہوگا جب قاتل اندر داخل ہوئے۔ یہاں کئی افراد کی موجودگی تو جہیں بھی محسوس ہو رہی ہے اور اس جھوٹے کے پاس موجود تپانی پر رکھے مشروب اور پمپلی ہوئی برف سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قاتل نے میکس کا انتظار کرنے کے دوران دو پیگ لیے۔ رہی بات دشمنی کی تو یہ بتانا آتا ہے۔“

دے کر مارا ہے۔“ اینڈریو نے اس بار سنجیدہ لہجے میں کہا۔

”بہت اچھے۔ تم نے ٹھیک وہی اندازہ لگایا ہے جو یہاں موجود کبھی افراد لگا چکے ہیں۔“ اس نے شیشے کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔

”اور تم..... تمہارا کیا خیال ہے جون کیا یہ غلط ہے؟“

اینڈریو نے حیرانی سے پوچھا۔

”سنو مسٹر جینکس! تم اور ان سب نے جو اندازے لگائے ہیں وہ اپنی جگہ پر درست ہیں لیکن سراغ رسانی سامنے کی صورت حال کا اندازہ لگانے کا کام نہیں بلکہ سامنے کی صورت حال سے آگے کا اندازہ لگانے کا کام ہے۔“ جون نے کہا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ یہ اندازہ لگایا جائے کہ قاتل اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔ وہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی گاڑی میں کاؤنٹی سے باہر جا رہا ہوگا یا پھر ٹوائلٹ میں بیٹھ کر اخبار پڑھ رہا ہوگا یا پھر..... یا پھر وہ اپنے اگلے قتل کی منصوبہ بندی کر رہا ہوگا۔ کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو اس طرح کے اندازے لگانے سے کیا ہوگا؟ ذرا مجھے بتا سکتے ہو۔“ اینڈریو استہزائیہ انداز میں بولا۔

جون خاموشی سے شیشے کے پار دیکھتا رہا۔

”اچھا تم بتاؤ۔ تم نے کیا اندازہ لگایا ہے؟“ اینڈریو نے پوچھا۔

”یہ قتل ڈان ولیم کارلوس نے کیے ہیں اور خود اپنے ہاتھوں سے۔“ جون نے اینڈریو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ اینڈریو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”تمام لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو اور یہاں موجود ہر اس چیز کو قبضے میں لے لو جس پر انگلیوں کے نشانات ہو سکتے ہیں۔“ جون نے اینڈریو کوٹ پہنتے ہوئے کہا اور اپنا ہیٹ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

مسٹر مائیکل آج کل اپنی ایکشن کمین میں مصروف تھے اسی سلسلے میں وہ آج عام لوگوں کی طرح ایک بس اسٹاپ پر کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ بھی ایکشن میں کامیابی اور عوام کی توجہ حاصل کرنے کا ایک نسخہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ عوامی ہوا جائے۔ دس منٹ بعد بس آ کر رکی تو وہ بس میں سوار ہو گئے۔ ایک سیٹ پر بیٹھے ہی انہوں نے سر پر رکھا سفید ہیٹ اتار کر لوگوں نے انہیں پہچان لیا اور بے اختیار خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

”نی دی بر برسوں آپ نے جو تفریح کی میں اس سے

لفظ لفظ موتی

☆ کچھ باتوں کا جواب صرف خاموشی ہوتی ہے اور خاموشی بہت خوب صورت جواب ہے۔

☆ کچھ لوگ قسمت کی طرح ہوتے ہیں جو دعا سے ملتے ہیں اور کچھ لوگ دعا کی طرح ہوتے ہیں جو قسمت بدل دیتے ہیں۔

☆ جب غلطی ثابت ہو جائے تو عقل مند اپنے آپ کو درست کر لیتا ہے اور جاہل ضد پر اڑ جاتا ہے۔

☆ کسی رشتے کو کتنی بھی محبت سے باندھا جائے لیکن عزت اور لحاظ چلا جائے تو محبت بھی چلی جاتی ہے۔

☆ شکست کھانا بڑی بات نہیں شکست کھا کر ہمت ہار جانا بڑی بات ہے۔

☆☆☆

بہت اتفاق کرتا ہوں۔ ہمیں دوسروں کے گھروں میں دخل دینے کے بجائے اپنا گھر پہلے صاف کرنا ہوگا۔“ ایک مسافر بولا۔

”میرے خیال میں وقت آگیا ہے کہ پہلے خود کو سدھار لیا جائے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

”اسیٹ کے متعلق جوئے قوانین بتائے گئے ہیں کیا ان کے ذریعے عوام کی حق تلفی نہیں کی گئی؟“ ایک اور شخص نے پوچھا۔

”میرا ذاتی طور پر خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ ہمیں اگر خود کو بہتر بنانا ہے تو کچھ حدود متعین کرنا ہی ہوں لیکن یہ صرف میرا ذاتی خیال ہے اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ قانون عوام کی حق تلفی کر رہے ہیں تو میں اس معاملے میں آپ کے ساتھ کھڑا ہوں گا۔“ مائیکل نے ڈیوٹیک جواب دیتے ہوئے کہا جس پر ساری بس نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔

”ہمیں ایسا ہی گورنر چاہیے۔“ ایک جانب سے آواز آئی۔

”بالکل۔ مسٹر مائیکل ہمارے پسندیدہ فرد ہیں۔ یہ ہماری بات سمجھتے ہیں۔“ ایک بوڑھی خاتون بھی تو مائیکل مسکرا دیا۔

”آپ سب لوگوں کا شکر ہے۔ آج رات نو بجے“ میرا پروگرام“ ضرور دیکھیں گے۔ میرا انٹرویو ہے۔“ وہ یہ کہتے ہوئے

اپنے اسٹاپ پر اتر گئے۔ بس والوں نے انہیں ہاتھ ہلا کر رخصت کیا۔ وہ اسٹاپ سے پیدل ایک جانب بڑھتے چلے گئے۔ کچھ دور ایک گلی میں ان کا شو فران کی مرسیڈز لے انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

”میں یہ کیس نہیں لے سکتا۔“ جون نے کہا۔
”یہ فیصلہ تم نے نہیں مجھے کرنا ہے۔“ سینئر آفیسر ایڈم نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کیس کو تمہیں ہی سنبھالنا ہوگا۔ یہاں کوئی اور سینئر بندہ نہیں ہے۔“

”میں تمہارے فیصلوں کی پابندی سے آزاد ہو چکا ہوں۔ آج شام پانچ بجے میری ڈیوٹی ختم ہوتے ہی میں ریٹائرڈ ہو جاؤں گا۔ اور تم اس مسٹر جنس پر ہمر و سائیکل نہیں کر لیتے۔ یہ بہت اچھا سراغ رساں ثابت ہوگا۔ خاص طور پر تمہارے لیے یہ بہت فرما بئراوری دکھا سکتا ہے۔“ جون نے ایک طرف کھڑے اینڈریو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”دراصل اسی نے مجھے یہ مشورہ دیا ہے۔“ ایڈم نے کہا۔
”اوہ۔ تم کب دوسروں کے مشورے ماننے لگے ایڈم۔“ یہ اچھا سراغ رساں ہے، میری بات کا یقین کرو۔“ جون جانے کے لیے پلٹا۔

”کیا تم مجھے یقین دلا سکتے ہو کہ یہ لڑکا ڈان ولیم کارلوس کو گرفتار کر سکتا ہے؟“ ایڈم نے اونچی آواز میں کہا تو جون رک گیا ایڈم اس کے قریب آیا۔

”کارلوس کو پکڑنے کا یہ تمہارے پاس آخری چانس ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم اس میں کامیاب ہو سکتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارے علاوہ یہاں اور کون یہ کام کر سکتا ہے؟“

جون باہر نکل کر اپنے کمبین میں آگیا اور کمپیوٹر کی میز پر ہاتھ دکا کر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے دو تصویریں تھیں جن کے درمیان ایک سوالیہ نشان والا کاغذ چسپاں تھا۔
”دیکھیے۔ یہ میری خواہش تھی کہ یہ کیس آپ حل کریں اور میں آپ کو اسٹ کر دوں۔ لیکن اگر آپ نہیں چاہتے تو میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔“ اینڈریو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔
”لیکن کیا ایک سینئر ہونے کے ناتے آپ اپنے جونیئر کی مدد نہیں کر سکتے۔ یہ میرا پہلا کیس ہے اور ہے بھی ڈان ولیم کارلوس کے بارے میں..... جسے آج تک نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی تصویر ہمارے پاس ہے۔ یہ کیس میرا کیریئر بنا بھی سکتا ہے اور مٹا بھی سکتا ہے۔“

”اگھوں کے نشانات لے؟“
”نہیں۔ قاتل نے یقیناً ڈستانے پہن رکھے تھے۔“
”میں پوسٹ مارٹم رپورٹس دیکھنا چاہتا ہوں۔“ جون نے کہا۔

اینڈریو ایک جھگٹے سے آگے بڑھا اور دراز کھول کر ایک فائل نکال کر اسے حمادی۔ جون نے جیب سے عینک نکال کر لگائی اور رپورٹس دیکھنے لگا۔

”ہوں..... میکس کو تین بار چاقو مارا گیا اور باقی تینوں کی موت پیٹ میں پانی بھر جانے کی وجہ سے ہوئی اور انہیں میکس سے آدھا گھٹنا پہلے قتل کیا گیا۔ کسی کے جسم پر اگھوں کے نشانات نہیں ملے۔“

”یہ کچھ اور کاغذ بھی ملے ہیں میکس کے گھر سے۔“ اینڈریو نے فوراً ہی ایک اور فائل اسے حمادی۔ جون کچھ دیر ان کاغذوں کو بھی دیکھنے لگا۔
”میکس نے اپنی آنکھوں کی انشورنس کروائی تھی۔“ جون نے آنکھیں کھینچتے ہوئے کہا۔

”جی ہاں لیکن چونکہ اس حادثے میں اس کی آنکھیں محفوظ رہی تھیں اس لیے یہ انشورنس کینسل ہو گئی۔ میری انشورنس کمپنی سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک حادثے میں میکس کی بائیں آنکھ کا کارہ ہو گئی تھی۔ آپریشن کے ذریعے اسے نئی آنکھ لگا دی گئی تھی اس لیے اس نے اپنی آنکھوں کی انشورنس کروائی۔“

”یہاں لکھا ہے کہ اس نے اپنی دونوں آنکھوں کی علیحدہ علیحدہ انشورنس کروائی؟“ اس نے عینک کے اوپر سے اینڈریو کو دیکھا۔

”جیسے علم نہیں۔ کیا آپ کچھ کہہ سکتے ہیں؟“
”کیا میکس کو کوئی وصیت نامہ ملا ہے؟“ جون نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”گھر سے تو بس یہی کچھ ملا ہے۔ آج اس کے بینک لاکر کا سامان ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔ شاید اس میں ہو۔“ جون نے فائل بند کرتے ہوئے عینک اتار کر جیب میں رکھ لی۔

”ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟ آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ میکس کے قتل میں ڈان ولیم کارلوس ملوث ہے۔“ اینڈریو نے پوچھا۔

جون نے خاموشی سے اپنی بیوی اور بچے کی تصویریں اتار کر اسے سامان میں منتقل کیا اور پھر اینڈریو کی طرف

مڑا۔ کچھ پردہ اینڈریو کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر اس نے اچانک اپنی قمیص جھٹک کر اوپر اٹھائی۔
اینڈریو نے دیکھا اس کے پیٹ پر زخم کے دو نشان تھے۔ شاید خنجر یا چاقو کے۔
اینڈریو دم بخود رہ گیا۔

☆☆☆

قبرستان میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ بظاہر اس سنان جگہ پر دو نفوس موجود تھے۔ انہوں نے سیاہ لباس پہن رکھے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں کدالیں تھیں اور وہ ایک قبر کی کھدائی کر رہے تھے۔ اسس سنائے میں کدالوں کے چلنے کی ہلکی ہلکی دھمک سنائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں ایک گہرا گڑھا کھود چکے تھے۔ اچانک ایک کدال سخت شے سے ٹکرائی تو انہوں نے کھدائی روک دی۔ گڑھے کے اندر ہتھری ایک سل نظر آ رہی تھی۔ کدالوں کو رکھ کر انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس سل کو ایک طرف ہٹا دیا۔ اندر ایک لکڑی کا تابوت نظر آ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکن کھولنے ہی ایک ناقابل برداشت بو اطراف میں پھیل گئی۔

”تم باہر دھیان رکھو۔ میں کام شروع کرنے لگا ہوں۔“ ایک بندے نے لاش پر جھنجھتے ہوئے کہا تو دوسرا بندہ باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اندر والا بندہ باہر نکل آیا۔

”ہو گیا؟“ پہلے والے نے پوچھا۔
”ہاں۔ اب نکلو یہاں سے۔“ دوسرے نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”قبر کو بھرتا نہیں ہے؟“ پہلے والا بولا۔
”چھوڑو اسے۔ نکلو یہاں سے۔“ دوسرا تیز تیز چلتے ہوئے بولا تو پہلے والا کندھے اچکا کر اس کے پیچھے ہولیا۔

☆☆☆

”ڈان ولیم کارلوس کی شخصیت ہمیشہ سے بڑی پراسرار رہی۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح مخفی رکھا کہ کوئی اس تک پہنچنا تو درکنار اسے پہچان بھی نہیں سکتا تھا۔ دوسری جانب اس کا سیٹ اپ اتنا طاقتور تھا کہ اس نے پوری اسٹیٹ میں جہاں جہاں اس کے مخالف تھے، سب کو ختم کر دیا اور اس طرح ختم کیا کہ اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔ کارلوس کون لے، کہاں رہتا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ کسی کے پاس اس کی کوئی تصویر نہیں ہے۔ میں ایک عرصے سے کارلوس کے پیچھے تھا لیکن مجھے بھی کامیابی نہیں ملی۔ پھر ایک دن مجھے ایک ایسا آدمی ملا جس نے کارلوس سے غداری کی بھی یقین اس سے پہلے کہ میں اس آدمی سے کچھ حاصل کر سکتا، وہ کل کر دیا گیا۔ بالکل اسی

طرح جس طرح میکس اپنی فیملی سمیت قتل ہوا ہے۔“ جون اور اینڈریو اس وقت ایک اوپن ایر ریسٹورنٹ میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔

”بات صرف یہیں تک نہیں رہی۔ ایک رات جب میں گھر لوٹا تو وہاں ڈان ولیم کارلوس اپنے ساتھیوں سمیت خود موجود تھا۔ میرے بیڈروم کی چھت سے میری بیوی اور پانچ سالہ بیٹے کی لاشیں لٹک رہی تھیں۔ ڈان کارلوس ایک نقاب میں تھا اس لیے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے ذاتی دشمنوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے خوش محسوس کرتا ہے اس لیے اس نے اس نندار کو اپنے ہاتھوں سے مارا اور میری فیملی بھی اسی لیے ماری گئی ہے کہ میں اس کا پیچھا چھوڑ دوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے پیٹ میں اس طرح چاقو مارے کہ میں صرف زخمی ہوا۔ جانے کیوں اس نے مجھے جان سے نہیں مارا۔ پچھلے کافی عرصے سے ڈان اچانک غائب ہو گیا۔ اس کے بارے میں ہر طرح کی خبریں اور جرائم کے تذکرے سنائی دینے بند ہو گئے۔ ایسا لگا جیسے وہ یہاں سے کہیں چلا گیا ہے لیکن میکس کے گھر میں موجود مظہر دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ یہ کام ڈان ولیم کارلوس کا ہے۔ وہ واپس آ گیا ہے۔ لیکن میری بات پر یقین کون کرتا ہے؟ یہاں سب مانتے ہیں کہ ولیم کارلوس صرف ایک نقاب ہے۔ وہ اصل میں ہے ہی نہیں انڈر ورلڈ کے ایک پورے گروپ کا نام ہی ڈان ولیم کارلوس ہے لیکن..... میں جانتا ہوں ولیم کارلوس ایک آدمی ہے۔ ایک انڈر ورلڈ اور ان ایک بے رحم قاتل اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کی گرفتاری میرے ہاتھوں ہوگی۔“ جون نے اسے تفصیل بتائی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم ولیم کارلوس سے مل چکے ہو۔ وہ بے شک نقاب میں تھا لیکن اس کا قد و قامت تو تم نے دیکھا ہی ہوگا۔“ اینڈریو ہنسی سے بولا۔

”ہاں۔ وہ ایک بیماری جسم کا مالک ہے۔ اس کے شانے چوڑے تھے آواز بھاری اور کرخت۔“ جون نے کہا اور پھر چونک کر سامنے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”ہوشیار ہو جاؤ۔ وہ مسٹر مائیکل ہیں۔ گورڈز کا الیکشن لڑنے والے ہیں۔ ہماری طرف ہی آرہے ہیں۔“

اینڈریو نے پلٹ کر دیکھا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائے مائیکل اس ریسٹوران میں لوگوں سے مصافحہ کر رہا تھا۔

”انہیں میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے۔ یہ تو بہت بڑے بزنس مین ہیں۔“ اینڈریو نے کہا۔
”ہاں اور اس وقت اپنی الیکشن کمپین میں مصروف

ہیں۔ میں ان سے ہاتھ ملاتا پسند نہیں کرتا لیکن مجبوری ہے۔“
جون آہستہ سے کہتے ہوئے اٹھا اور اپنی جانب آتے ہوئے
ہانیکل سے مصافحہ کرنے لگا۔
”اوہ جون! بالآخر تم ریٹائرڈ ہو ہی گئے۔ یہ میرے
لیے تکلف دہ بات ہے۔ کیونکہ اگر میں گورنر بننا اور تم ڈیوٹی پر
ہوئے تو میں تمہیں چیف بنادیتا۔“
”شاید اسی لیے میں ریٹائرڈ ہو گیا ہوں۔“ جون کی
بات سن کر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اسی لمحے اینڈریو نے موبائل
پر ایک کال ریسیو کی اور جون کے کان میں سرگوشی کی۔
”میکس کے بارے میں بری خبر ہے۔“
جون نے ہانیکل سے اجازت لی اور اینڈریو کے ساتھ
ریستوران سے باہر نکل آیا۔
”کیا خبر ہے؟“ گاڑی کی جانب چلتے ہوئے جون

نے پوچھا۔
”کل رات کسی نے میکس کی قبر کھودی اور لاش کی
دونوں آنکھیں نکال لیں۔“ اینڈریو نے کہا تو جون چونک گیا۔
”کیا مطلب؟“ جون نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔
”اوہ میرے خدا! تم نے میکس کا وصیت نامہ نہیں پڑھا
ہوگا۔ وہ بھی کل رات ہی ملا تھا۔ جانتے ہو اس میں کیا لکھا
تھا؟“ اینڈریو نے کہا۔

”کیا لکھا تھا؟“ جون نے پوچھا۔
”میکس نے اپنی آنکھیں مرنے کے بعد عطیہ
کرنے کی وصیت کی تھی۔“ اینڈریو کی بات سن کر جون جھج
جھ اچھل پڑا۔

”کمال ہے۔ میکس نے ایسا کیوں کیا؟“
”یہ تو میکس ہی بتا سکتا ہے لیکن وہ تو.....“ اینڈریو
بذاق کرتے کرتے رک گیا۔

”یہ آنکھوں کا کیا چکر نکل پڑا۔ ہمیں اس کی قبر کھود کر
آنکھیں نکالنے والے کو ڈھونڈنا ہوگا۔ تم ایسا کرو کہ پولیس
اسٹیشن جا کر معلوم کرو کہ پولیس نے اب تک آنکھیں چوری
کرنے والوں کو گرفتار کیا ہے یا نہیں۔ میں جب تک اس
ڈاکٹر سے مل لوں جس نے میکس کی آنکھوں کا آپریشن کیا
تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں کوئی نہ کوئی کلیو ضرور ملے گا۔“
اینڈریو سر ہلا کر ایک طرف چلا گیا جب کہ جون پولیس اسٹیشن
کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

استھ ایک لمبے قد کا مالک شخص تھا۔ چوڑے جڑے
اور شاندار ایک اترتے بال۔ ایک کان میں سنہری بالی

تھی۔ انگلیوں میں مختلف پتھروں کی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔
اس وقت اس نے ریسیور کان سے لگا رکھا تھا۔
”نہیں ہاس اس کا کوئی پتا نہیں لگا۔ ہائی وے کے
ایک پب سے فون کیا تھا اس نے۔ پوچھ کا سکیورٹی کیمرہ بھی
خراب تھا۔“
”دیکھو استھ! میں اب سارے کام چھوڑ کر اس دو گئے
کے بلیک میلر سے نمٹنے سے تو رہا۔ جو بن پڑتا ہے وہ
کرو۔ مجھے جلد از جلد اس معاملے سے باہر نکالو۔“
”ٹھیک ہے ہاس۔ آپ بالکل بے فکر رہیے۔ میں
سنجیدہ لیتا ہوں۔“ استھ نے کہا اور ریسیور گرڈل پر رکھتے
ہی اس نے کسی کو آواز دی۔ فوراً ہی ایک سیاہ فام مہنگا شخص
اندر داخل ہوا۔ اس نے کانوں میں ہیرے کے ٹاپس پہن
رکھے تھے۔

”جی! فوری طور پر دس ملین ڈالرز کا بندوبست کرو۔“
جی سر ہلا کر باہر چلا گیا تو استھ مشروب کے گھونٹ لینے لگا۔ وہ
سوچ رہا تھا کہ یہ بلیک میلر کون ہو سکتا ہے؟ آج صبح ہی کوئی
اس کے لیٹر باکس میں ایک لفافہ رکھ گیا تھا جسے کھولنے پر اس
کے اندر سے ایسی تصویر نکلی کہ وہ بری طرح چونک گیا۔ ایسی وہ
اس تصویر کا جائزہ ہی لے رہا تھا جب اس کے فون پر تیلنجی۔
یہ تصویر بھیجے والے آدمی کی کال تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ تصویر
شخص ایک ٹریڈر ہے۔ اس کے پاس پوری فلم ہے۔ استھ نے
پوچھا کہ وہ اس کے بدلے میں کیا چاہتا ہے تو اس شخص نے کہا
کہ استھ شام تک دس ملین ڈالرز کی پیش کا بندوبست کرے۔ اس
نے شام چار بجے کا وقت دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جی پیسوں
سے بھرا بیگ اٹھا لیا۔ اب اسے چار بجنے کا انتظار تھا۔ عام
حالات میں شاید وہ اس بلیک میلر کو اتنی اہمیت نہ دیتا لیکن آج
کل حالات کچھ اور طرح کے تھے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی
ہو سکتا تھا۔ ٹھیک چار بجے سامنے تپائی پر رکھا فون بج اٹھا۔
استھ نے ریسیور اٹھا لیا۔

”سنو۔ رقم کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اب بتاؤ کہاں مل
رہے ہو؟“

”میں نے یہ کب کہا تھا کہ ہمیں ملے گی۔ صرف پیسے
لے کر وہ چیز تمہارے حوالے کرنے کی بات ہوئی تھی۔“
”تو بتاؤ کہ پیسے کہاں بھجواؤں؟“ استھ نے دانت
پیستے ہوئے پوچھا۔

”گرین ہل پارک کا چارٹرڈ ٹرانٹ خرابی کی بنا پر بند
ہے اس کے عقی روشندان کا ٹھیکہ ٹوٹا ہوا ہے اس روشندان
کے اندر تم کا بیگ پیچیک دو۔ رقم لےتی ہی میں تمہیں فون کر

کے بتاؤں گا کہ تمہاری چیز کہاں ہے۔“
”تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟ اگر رقم لے کر تم نے اس کا
پتانہ بتایا تو؟ ویسے بھی اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تمہارے
پاس اس کی کوئی اور کاپی نہیں ہوگی۔“
”میں تم لوگوں کی اصلیت جان گیا ہوں اس لیے تم
سے ٹکراؤ نہیں چاہتا۔ میں تمہارے حوالے اصلی کاپی ہی کروں
گا اور دوسری بات یہ کہ تمہارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔
اب جلدی کرو اور آٹھ بجے سے پہلے رقم مطلوبہ جگہ پر پہنچ جانی
چاہیے۔ گنڈ بائے۔“ اس شخص نے فون کاٹ دیا۔

☆☆☆

اینڈریو اور جون آپریشن روم میں ایک مشین کے
سامنے بیٹھے تھے دونوں کے کانوں پر ہیڈ فون چڑھے ہوئے
تھے۔ ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔
”تمہیں رقم مل گئی ہے۔ اب بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟“
”تم نے میرے ساتھ کوئی گز بزنس کی لہذا میں بھی
نہیں کروں گا۔ تمہارے گھر کے سامنے والے خالی گھر کے
لیٹر باکس میں ایک لفافہ تمہارا منتظر ہے۔ اور سنو، مجھے امید
ہے کہ تم میری تلاش میں وقت ضائع نہیں کرو گے۔ جو ہو گیا
اسے بھول جاؤ۔“ بلیک میلر کی آواز سنائی دی اور اس کے
بعد کال منقطع ہو گئی۔

”لوکیشن بتاؤ۔“ جون نے آپریٹر سے کہا۔
”کال کرنے والا بلیک میلر پبلک فون پوچھ نمبر
56 سے بات کر رہا تھا۔ یہ شہر کا شمالی علاقہ ہے۔ ہماری ایک
ٹیم اس علاقے میں موجود ہے۔“

”فورا اسے گرفتار کرواؤ۔ اور دوسری لوکیشن؟“ جون
جلدی سے بولا تو آپریٹر نے اسے شہر کے جنوبی مضافات
میں۔ بنے ایک جنگل کا پتا بتا دیا۔ جون اور اینڈریو ایک ساتھ
ہی اٹھے۔

”میں تیار ہے؟“ جون نے اینڈریو سے پوچھا۔
”بالکل۔“
”تو چلو۔“ جون باہر کی طرف لپکا۔ اینڈریو اس کے
ساتھ ہی تھا۔ اگلے آدھ گھنٹے بعد جون اور اینڈریو دس مسیح
افراد کے ساتھ جنگل میں گھر کر استھ اور جی کو اس کے تین اور
ساتھیوں سمیت گرفتار کر چکے تھے۔

استھ کی تلاشی تو اسی کی جیب سے ایک لفافہ برآمد ہوا
جس کے اندر ایک یو ایس بی تھی۔
جون نے ایک طرف موجود کمپیوٹر آن کیا۔
”آخر اس میں ہے کیا؟“ اینڈریو بولا۔

”ڈان ولیم کا کارلوس کا اصلی چہرہ۔“ جون نے سنسناتی
ہوئی آواز میں کہا۔
”ٹھیک۔ کیا مطلب..... یہ کیسے؟“
”ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے یہ تو دیکھ لیں کہ ڈان اصل
میں ہے کون۔“ اس نے یو ایس بی لگا کر اس میں موجود
ویڈیو آن کر دی۔ اگلے ہی لمبے وہاں موجود سبھی افراد حیرت
زدہ رہ گئے۔
اینڈریو بے اختیار چلا اٹھا۔
”مسٹر ہانیکل۔“

☆☆☆

مسٹر ہانیکل گرفتار ہو چکے تھے کیونکہ یہ ثابت ہو چکا تھا
کہ مسٹر ہانیکل ہی اصل میں ڈان ولیم کا کارلوس ہیں۔ ویڈیو میں
میکس کے قتل کی ویڈیو بھی اس میں ایسے فقرے بھی تھے جن
سے ثابت ہوتا تھا کہ قتل کرنے والا ہی ڈان ولیم کا کارلوس ہے۔
”جون! میں بہت حد تک تو سمجھ گیا ہوں لیکن تمہیں
ویڈیو دیکھنے سے پہلے ہی کیسے معلوم ہوا کہ اس میں ڈان ولیم
کا کارلوس کی ویڈیو ہے؟“

”میں شروع سے جانتا ہوں کہ یہ سب کیا اور کیسے ہوا۔“
جون نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک توقف کے بعد بولا۔

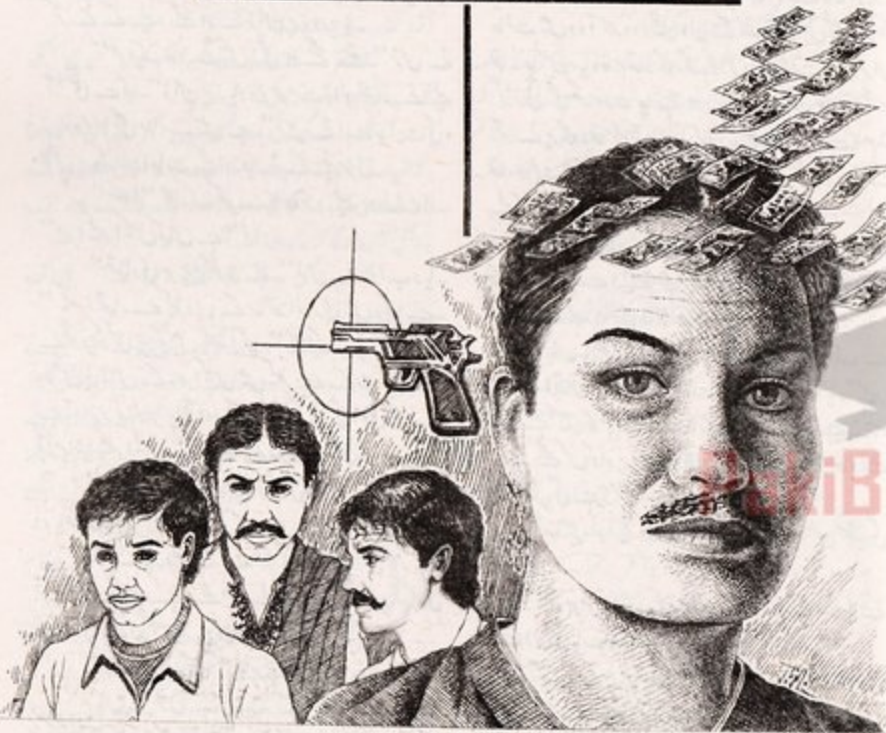
”ڈان ولیم کا کارلوس نے اپنی شخصیت کو بہت پر اسرار بنا
رکھا تھا۔ ایک جانب یہ اپنے لوگوں میں ڈان ولیم کا کارلوس تھا تو
دوسری جانب یہ بہت بڑا بزنس مین مسٹر ہانیکل بھی
تھا۔ دراصل یہ سارا بزنس اس نے اپنے کالے دھن کو سفید
بنانے کے لیے کھڑا کیا ہوا تھا۔ ڈان کے روپ میں یہ انڈر
ورلڈ کا بادشاہ تھا تو بزنس مین کے روپ میں یہ ایک کامیاب
اور مشہور شخصیت تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک پلان بنایا
جس کے مطابق یہ بطور مسٹر ہانیکل اپنی مشہور شخصیت کو سیاسی
طور پر آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے گورنر کا الیکشن لڑنے کا
فیصلہ کر لیا۔ ڈرا سوچو اگر یہ شخص گورنر بن جاتا تو ساری اسٹیٹ
میں اس کا راج ہوگا۔ جرائم سے لے کر بزنس تک سب میں
اسی کا حکم چلتا لیکن گورنر بننے سے پہلے اس نے ان لوگوں کو ختم
کرنے کا فیصلہ کیا جو اس کی بطور ڈان ولیم کا کارلوس کی شخصیت
سے آگاہ تھے۔ اس نے اپنے بے حد فوجی لوگوں کو قتل کروانا
شروع کر دیا۔ سو اے تین چار لوگوں کے، باقی سب مارے
گئے۔ یہ تین چار لوگ بطور ڈان اس کی شکل سے آشنا نہیں
تھے۔ ان کا رابطہ صرف ڈان سے فون پر تھا۔ جب وہ تمام
لوگ مارے گئے بطور ڈان اس کی شکل سے آگاہ تھے تو
اسے معلوم ہوا کہ کافی عرصہ قتل اس کا ایک اسٹنٹ میکس جو

احسان مند

ناریس نور

ایک اچھا انسان اگر اچھائی کا بدلہ اچھائی سے دے تو اتنا احساس نہیں ہوتا مگر جب برا انسان اچھائی کرے تو ہر ایک چونک جاتا ہے۔ وہ جو اس کی جان کا دشمن تھا ایک چھوٹے سے احسان نے اسے اس کا محسن بنا دیا۔

ایک قاتل کے فیروز کا بوجھ جسے وہ اتارنے کے لیے بہن تھا



جیسے وہ شائنگ کے لیے نکلا ہو، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ ایک شخص کو قتل کرنے کے لیے گھر سے نکلا تھا چونکہ وہ پیشہ ور قاتل تھا، اس لیے اس کی چال ڈھال حرکات و سکنات میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ اس وقت وہ ایک غیر معروف سڑک کے کنارے چل رہا تھا۔ اچانک قریب کھڑی ہوئی ایک کار میں خوفناک دھماکا ہوا۔ کلارک زمین سے کئی فٹ اوپر اچھا، شیشے اور لوہے کے ٹکڑے اڑ کر اس

آج صبح سے مطلع صاف نہیں تھا۔ آسمان پر نیلے بادل تھے۔ تیز ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے فضا میں سختی سی آگئی تھی۔ کلارک قلب نہایت اطمینان سے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا۔ اس کے دائیں کندھے پر کیمرا لٹک رہا تھا جو سیاہ رنگ کے کیس میں محفوظ تھا۔ وہ تقریباً چالیس سال کا طویل قامت اور مضبوط بدن والا مرد تھا۔ اس کے چہرے پر کوئی سفاکی، درندگی یا کھچاؤ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا

پہلے پولیس والے بلیک میلر تک اس آدمی کے ذریعے پہنچ گئے تھے جس کے ساتھ مل کر اس نے قبر کھودی تھی۔ پولیس کے ذریعے ہمیں اطلاع ملی تو ہم نے بلیک میلر کی نگرانی شروع کروادی جس کی وجہ سے بلیک میلر اور اس کے دو ساتھیوں کا ٹیلیفونک رابطہ ہماری نظروں میں آ گیا۔ بلیک میلر بھی گرفتار ہو گیا اور اس کے دو ساتھی بھی۔ باقی ویڈیو کے ذریعے مسٹر ہائیکل عرف ڈان ولیم بھی پکڑے گئے۔ یہ بھی ساری کہانی۔ جون نے کہانی مکمل کی تو اینڈریو ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

”ایک بات تو ہے ہاں۔ سینئر سینئر ہی ہوتا ہے۔ اس کیس میں سب اندازوں کا کھیل تھا اور کمال کی بات ہے کہ تمہارے سارے اندازے درست ثابت ہوئے۔ تم نے بالکل سچ کہا تھا کہ ایک سراغ رساں کا کام سامنے دیکھنا نہیں بلکہ سامنے سے ذرا آگے دیکھنا ہے۔“

”جانتے ہوا اینڈریو، اپنے چالیس سالہ دور میں، میں نے ڈان ولیم کارلوں کو پکڑنے کے لیے ایسی ایسی منصوبہ بندیاں کی تھیں کہ جن سے اس کا پچھتاوا ممکن تھا لیکن وہ بچتا رہا۔ وہ قانون اور مجھ سے تو بچتا رہا لیکن قدرت کی لاشی بے آواز ہوئی ہے۔ اس سارے کیس میں ہمارا آدھا کام قدرت نے کیا ہے کیونکہ جب قدرت ڈان ولیم جیسے لوگوں کی رسی کھینچ لیتی ہے تو ایک چھوٹا سا بہانہ بھی کافی ہوتا ہے۔ ڈان ولیم کارلوں کی رسی کھینچ لی گئی تھی اس لیے وہ ایسے قتل کے الزام میں گرفتار ہوا جس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ڈان ولیم ایسے موقع پر گرفتار ہوا جب وہ گورنر کا انکیشن لڑنے جا رہا تھا۔ اس طرح پوری دنیا میں اس کی تذلیل ہو کر رہ گئی۔ اور یہ بات انڈر ورلڈ ڈانز سے لے کر سیاست دانوں تک کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کر دے گی۔“ جون نے کہا۔

”اب کیس تو ختم ہو گیا جون۔ آگے تمہارا کیا ارادہ ہے؟ میرا مطلب کیا اب تم کوئی کاروبار کرو گے؟ ویسے شک کا کام بہت اچھا ہے۔ میرے اکل پے کام کرتے ہیں اور بڑے کامیاب ہیں۔ بس تم کو ہر وقت سمندر کی ٹھنکین فضا میں رہنا ہوگا۔“

”کاروبار میرے بس کی بات نہیں۔ میں فورس کا آدمی ہوں، صرف ریٹائرڈ ہوا ہوں۔ اپنا کام نہیں چھوڑ سکتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں اب پابندیوں سے آزاد ہو چکا ہوں لیکن ہوں تو سراغ رساں۔ ویسے بھی ابھی تم اس سفر میں کچے ہو۔ تمہیں بہت کچھ سکھانا باقی ہے۔ تو کیا مسٹر ہائیکل تم تیار ہو؟“ جون نے مسکراتے ہوئے کہا تو اینڈریو نے بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

ایک لڑکی سے شادی کرنے کے بعد اس سے غداری کر کے روپوش ہو گیا تھا، وہ واپس اسی اسٹیٹ میں آ گیا ہے تو اس نے اسے بھی مارنے کی ٹھانی۔ میکس اپنی بیوی کے اصرار پر واپس آیا تھا۔ دراصل میکس کا چہرہ ایک کارڈائیکسٹ میں منہ بھرہ ڈھکی ہو گیا تھا۔ اس کی ایک آنکھ صاف ہو گئی اور چہرہ بری طرح جھلک گیا تھا۔ سرجری کے بعد اس کا چہرہ کافی بدل چکا تھا اور ایک آنکھ بھی مصنوعی لگا گئی۔ اسے امید تھی کہ کوئی اسے پہچان نہیں پائے گا لیکن ڈان کے آدمیوں نے اسے پہچان لیا۔ اس لیے وہ بچا رہا اپنی بیوی بچوں سمیت مارا گیا لیکن ایک چیز تھی جس کی طرف کسی کا دھیان نہیں جا سکا۔ میکس نے نہ صرف اپنی دونوں آنکھوں کی اشورنس کروا رکھی تھی بلکہ اپنی وصیت میں بھی اسے عطیہ کرنے کی خواہش کر رکھی تھی اور یہ سب کچھ... بوجھ نہیں تھا۔ میکس کی مصنوعی آنکھ صرف آنکھ نہیں بلکہ ایک جدید کیمرا تھا۔ کچھ عرصہ قبل جاپانی سائنسدانوں نے ایسی مصنوعی آنکھ بنائی تھی جس سے نہ صرف دیکھنا سیکھ سکتے تھے بلکہ اس سے ویڈیو بھی بنی جاتی تھی تاکہ خوبصورت اور یادگار مناظر محفوظ کیے جا سکیں۔ میکس نے اسی لیے اپنی آنکھوں کی اشورنس اور انہیں عطیہ کرنے کی خواہش کی تھی کہ کل کو اگر اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہو تو اس کی ویڈیو کے بارے میں لوگوں کو معلوم ہو جائے جیسے کہ ہمیں معلوم ہو گیا۔ مجھے اس مصنوعی الیکٹرونک آنکھ کے بارے میں اس ڈاکٹر نے بتایا تھا جس نے میکس کا آپریشن کیا تھا۔ اسی لیے میں سمجھ گیا کہ میکس کی اس الیکٹرونک آنکھ میں یقیناً اس کے قتل کی ویڈیو بھی ہوگی اور اس سے پہلے میں یہ اندازہ تو لگا ہی چکا تھا کہ میکس کا قتل ڈان ولیم نے اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ اب آتے ہیں آنکھ چور کی جانب جو دراصل بلیک میلر بھی تھا۔ یہ وہی آدمی تھا جس نے میکس نے یہ الیکٹرونک آنکھ خریدی تھی۔ اس نے اخبار میں میکس کے قتل کی خبر پڑھی تو اس کے دل میں یہی خیال آیا کہ قتل کی ویڈیو اس آنکھ کے کیمرے میں محفوظ ہوگی۔ لہذا اس نے ایک آدمی کے ساتھ مل کر میکس کی قبر کھود کر یہ آنکھ حاصل کر لی۔ جب اس نے ویڈیو دیکھی تو اس پر انکشاف ہوا کہ معاملہ اس کی توقع کے خلاف زیادہ خطرناک ہے۔ اس نے ڈان کے خاص آدمی اس کے خلاف زیادہ خطرناک اس کے پاس ایک ایسی ویڈیو ہے جو ڈان کو بھانسی تک لے جاسکتی ہے۔ بدلے میں اس نے دس ملین ڈالرز مانگے۔ اس کے علاوہ کوئی یوٹی اہمیت کا صحیح طور پر نہیں تھا۔ وہ اسے ایک عام سائیکل میٹنگ اسٹن بگھتے رہے۔ انہوں نے بلیک میلر کی بات مان کر اسے پیسے دے کر ویڈیو حاصل کی لیکن اس سے

کے جسم سے نکلے۔ دوبارہ مرکز پر گرنے سے پہلے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک صاف ستھرے کمرے کے بستر پر پڑے ہوئے پایا۔ کمرے میں دواؤں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بستر کے قریب ایک لڑکی کھڑی تھی جس کی انگلیاں کلاڑی کی نبض پر تھیں۔ کلاڑی کو لڑکی کا چہرہ دھندلا نظر آ رہا تھا۔ ”مم..... میں کہاں ہوں؟“ اس نے پوچھا۔

”اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ وہ نرس تھی اور اسپتال کے سفید یونیفارم میں تھی۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ کلاڑی نے پوچھا اور کچھ یاد کرنے کے لیے دیکھتے ہوئے ذہن پر زور دیا۔

”تم ایک حادثے میں زخمی ہو گئے تھے۔“ نرس نے آہستگی سے کہا۔ ”ذہن پر زیادہ بوجھ مت ڈالو، تمہارے لیے زیادہ بولنا بھی مناسب نہیں ہے۔“ نرس نے اسے ہدایت کی، فائل پر کچھ اندراجات کیے اور جانے کے لیے مڑی۔

”سنو!“ کلاڑی کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

”میرا کیرا کس کہاں ہے؟“

”تمہاری ہر چیز محفوظ ہے۔“ نرس نے جواب دیا۔ ”کیرا تمہارے کپڑوں کے ساتھ الماری میں رکھا ہے۔ بے فکر ہو کسی چیز کو نہیں چھیڑا گیا۔“ کلاڑی نے اطمینان کی سانس لی، اس کے کیرا کس میں کیرے کے علاوہ چھوٹا سا بے آواز ریوالتور، قاتو اور ایک لمبی اسٹیل کی سوئی تھی۔ یہ تمام اشیاء کیرا کس کے خفیہ خانے میں رکھی تھیں۔

”میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟“ کلاڑی نے دریافت کیا۔

”ایک کار دھماکے سے اڑ گئی تھی۔ تم اس کار کے قریب سے گزر رہے تھے اسی لیے زخمی ہو گئے۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں زیادہ جوش نہیں آئیں۔“

”کار کے اندر کوئی شخص موجود تھا؟“

”ہاں۔“ نرس نے بتایا۔ ”بم انجین سوچے سے شعلہ تھا۔ جیسے ہی مشین اسکاٹ نے کار اسٹارٹ کرنے کے لیے انجین میں چابی گھمائی، کار کے ساتھ ساتھ ان کے بھی پرچھے اڑ گئے۔“

”مشین اسکاٹ؟“ کلاڑی نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

”وہ ایک مشہور بزنس مین تھے۔ امریکا میں ان کی کاروباری ساکھ مضبوط تھی۔“

”اوہ..... افسوس ہوا۔“ کلاڑی نے دھیرے سے کہا اور اپنی دائیں آنکھ پر آہستگی سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

”میری اس آنکھ میں سخت جھپٹن ہو رہی ہے۔“

”آنکھ کھلو۔“ میں دیکھتی ہوں۔“ نرس نے نرمی سے اس کی آنکھ کے پونے کو اٹھا کر دیکھا، چند لمحوں تک وہ غور سے دیکھتی رہی پھر قدرے فکر مند سی ہوئی۔

”شاید شیشے کا کوئی ریزہ آنکھ میں چلا گیا ہے۔ میں آنکھوں کے ڈاکٹر کو اطلاع کرتی ہوں۔ جب تک اس آنکھ کو بند رکھو اور اسے ملنا بالکل نہیں، ورنہ آنکھ زخمی ہو جائے گی۔“

اتنا کہہ کر نرس تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کلاڑی آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ اسے جانسن سے مقررہ مدت میں توسیع کے لیے کہا پڑے گا۔ موجودہ حالت میں وہ آئندہ دو تین دن کے اندر کام مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ جانسن سیاہ فام تھا۔ کلاڑی کو اس کی رفاقت بڑی گراں گزرتی تھی مگر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جانسن کو برداشت کرنے پر مجبور تھا کیونکہ اس کے ذریعے سے ہی اسے کام ملتا تھا، دولت ملتی تھی اور زندگی کی آسائشیں حاصل کرنے کے لیے کلاڑی کو ہر وقت دولت کی ضرورت رہتی تھی۔

دو روز قبل کلاڑی جانسن سے ایک ریسٹوران میں ملا تھا۔ جانسن اسے دیکھتے ہی مسکرایا۔ ”ہیلو..... مسٹر کلاڑی!

کافی عرصے بعد ہماری ملاقات ہو رہی ہے۔“

”ہاں بالکل! کافی عرصہ ہو چکا ہے۔“ کلاڑی نے اس سے اتفاق کیا اور جلدی سے اصل بات پر آیا۔ ”میرا خیال ہے ہمیں کام کے بارے میں بات کرنی چاہیے۔ بتاؤ اس بار مجھے کس کواد پر بھیجتا ہوگا اور پارٹی نے کتنے معاوضے کی پیشکش کی ہے؟“

”خاصی فراخ دلانہ پیشکش ہے۔“ جانسن سنجیدگی سے بولا۔

”تم ہر مرتبہ یہی کہتے ہو۔“ کلاڑی نے منہ بناتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

”میں نے ہر مرتبہ تمہیں کام کی مناسبت سے معقول معاوضہ دیا ہے۔“ جانسن نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ذریعے سے تمہیں کام ملتا ہے۔ پارٹیوں سے معاملات میں طے کرتا ہوں۔ پارٹی کو تو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی ناپسندیدہ شخصیت کو عدم سے سرپر روانہ کرنے والا کون ہے اور اسی طرح تم بھی ان کے متعلق نہیں جانتے۔ اس طرح پارٹی مطمئن رہتی ہے کہ اسے بعد میں بھی بلیک میل نہیں کیا جائے گا اور تمہارے لیے بھی کوئی رسک نہیں ہے۔ تمہیں پیٹھے بٹھائے کام مل جاتا ہے۔ اس تمام سلسلے میں اگر میں کچھ کمیشن رکھتا ہوں تو یہ میرا حق بنتا ہے۔“

”درست کہہ رہے ہو کمیشن رکھنے کا تم حق رکھتے ہو۔“ کلاڑی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ ”لیکن، تمہیں یہ حق ہرگز حاصل نہیں ہے کہ تم میرے معاوضے کی نصف رقم کمیشن کے نام پر رکھ لو۔“

”کیا مطلب ہے تمہاری بات کا؟“ جانسن غرایا۔

”مس لنڈا کے معاوضے میں تم نے مجھے جو معاوضہ دیا تھا وہ اصل رقم سے نصف تھا جو تم نے پارٹی سے وصول کیا تھا۔“ کلاڑی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اچھا.....“ جانسن نے بھویریں سیکھتے ہوئے اسے گھورا۔ ”اس کا مطلب ہے تم بعد میں چھان بین کرتے ہو۔“

”مجھے اتفاقاً معلوم ہو گیا تھا۔“

”کیسے..... معلوم ہو گیا کلاڑی؟“ جانسن کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ”یہ ریاکت میں فروخت ہونے والی اشیاء کے نرخ نہیں ہیں کہ تمہیں اتفاقاً معلوم ہو جائیں۔ یقیناً تم کام مکمل کرنے کے بعد تقیث کرتے ہو اور یہ بڑی خطرناک بات ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے، اس بات کو بھول جاؤ۔“ کلاڑی نے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نرمی سے پوچھا۔ ”موجودہ بزنس کی بات کرو۔ پارٹی نے کتنی رقم کی پیشکش کی ہے؟“

”میں ہزار ڈالرز“ جانسن نے رکھائی سے جواب دیا۔

”بہت خوب۔“ کلاڑی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

”معاوضہ ملے سمجھو، اب اس کا نام اور پتا بتاؤ جسے ٹھکانے لگانا ہے۔“

جانسن کے چہرے پر اب بھی برہمی کے تاثرات تھے مگر اس نے خاموشی سے کاغذ کا ایک پرزہ کلاڑی کی جانب بڑھا دیا جس پر نام اور پتا تحریر تھا۔ ”اسٹیون جانسنز 112 تھرو ڈائیون۔“ کلاڑی نے نام اور پتا ذہن نشین کرنے کے بعد کاغذ کا پرزہ پھاڑ دیا۔ ”مطمئن رہو کام ہو جائے گا۔ ویسے وقت کی کوئی پابندی تو نہیں ہے نا؟“

”وقت کی پابندی ہے۔“ جانسن بولا۔ ”ہمارا موکل جلدی کام کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس نے تین دن کی حد مقرر کی ہے۔“

”ٹھیک ہے، تین دن کافی ہیں۔“ کلاڑی نے ہائی بھر لی۔

جانسن نے جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ کلاڑی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آدمی رقم ہے، باقی حسب معمول کام کی تکمیل کے بعد ملے گی۔“

کلاڑی نے لفافہ جیب میں ڈالا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ خیالات کا سلسلہ آنکھ میں ہونے والی تکلیف کی شدت سے ٹوٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد نرس واپس آئی اور اس

کے بیڈ کو دھکیلتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہ معائنے کا کمرہ تھا۔ دس منٹ کے بعد ایک خوش مزاج اور دہلا پتلا ڈاکٹر اس کی آنکھ کا معائنہ کرنے آیا۔ ڈاکٹر کی عمر پچاس برس کے قریب لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور ممانت بانی جاتی تھی جو اس کے کام میں مہارت ظاہر کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے کلاڑی کی آنکھ کا معائنہ کیا۔ ”تمہاری آنکھ میں شیشے کے دو ذرے نظر آ رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”ایک ذرہ پتلی میں ہے اور یہی تمہیں زیادہ تکلیف پہنچا رہا ہے کیونکہ پتلی آنکھ کا نازک ترین حصہ ہے۔ دوسرا ذرہ کنارے پر ہے۔“

”ڈاکٹر۔“ کلاڑی نے گھبرا کر کہا۔ ”میری آنکھ خراب نہیں ہو جائے گی؟“

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”میں کچھ دیر کے اندر دونوں ذرے نکال دوں گا اور ایک ٹپٹے کے بعد تمہیں یاد بھی نہیں ہوگا کہ کچھ ہوا تھا۔“

”آپ ابھی یہ ذرے نکال دیں گے؟“ کلاڑی نے پوچھا۔

”ہاں صرف آدھے گھنٹے کے اندر۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا پھر وہ نرس سے مخاطب ہوا۔ ”اسے آپریشن تھیٹر لے چلو۔“ اور پھر ڈاکٹر نے آدھا گھنٹہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی آنکھ سے دونوں ذرات نکال دیے۔ ایک ذرہ کچھ گہرا چلا گیا تھا، اس کے لیے ڈاکٹر کو ایک چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑا۔ اس جگہ پر اس نے چند ناکے لگا دیے۔

”اب تمہیں درد تو محسوس نہیں ہو رہا؟“ ڈاکٹر نے کام ختم کرنے کے بعد پوچھا۔

”بالکل نہیں۔“ کلاڑی کے لہجے میں شکر گزاری تھی۔ ”قدرت نے آپ کے ہاتھوں کو سچائی بخشی ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔

”میں نے کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا ہے۔ کوئی بھی آنکھوں کا سرجن یہ کام اسی طرح کر سکتا ہے۔“

کلاڑی نے قدرے فکر سے پوچھا۔ ”میری آنکھ..... بالکل ٹھیک ہو جائے گی نا..... پہلے کی طرح۔“

”ارے..... پہلے سے بھی زیادہ بہتر ہو جائے گی۔“

ڈاکٹر بولا۔ ”تم بالکل ٹھیک رہو، میں نے آنکھ کو اچھی طرح صاف کر دیا ہے۔ اب اس میں کوئی خرابی نہیں ہوگی۔ تمہیں پانچ روز کے بعد صرف ایک مرتبہ میرے پاس آنا پڑے گا۔“

تاکہ میں تمہاری آنکھ سے ٹانگے نکال سکوں۔“

”مجھے اسی اسپتال میں آنا ہوگا؟“

”نہیں، میں یہاں کام نہیں کرتا۔ تمہیں میرے کلینک پر آنا ہوگا۔ یہاں مجھے تھوڑی دیر پہلے میرے کلینک سے ہنگامی طور پر بلوایا گیا ہے۔“

”صرف میرے لیے؟“ کلارک حیران رہ گیا۔

”ہاں میرا خیال ہے کہ یہاں کوئی اور آنکھوں کا کیس نہیں ہے۔“

”اوہ..... اس کا مطلب ہے آپ کو خاصی فیس بھی دینا پڑے گی؟“

”نہیں۔“ ڈاکٹر نے ہلکا ہتھکڑ لگا لیا۔ ”میں اسپتال میں جن مریضوں کا علاج کرتا ہوں ان سے کوئی فیس نہیں لیتا۔“

”اس کی وجہ؟“ کلارک نے تجسس سے پوچھا۔

”اپنے پیسے سے بھرپور فائدہ حاصل کرنا۔“ ڈاکٹر نے مسکرا کر دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ کلارک کے چہرے پر الجھن نظر آنے لگی۔ ”فیس نہ لے کر کس طرح کا فائدہ؟ مجھے..... کچھ سمجھ نہیں آیا۔“

ڈاکٹر نے شفقت سے کلارک کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور نرم انداز میں بولا۔

”میں اپنے پیسے سے صرف مادی فائدہ حاصل نہیں کرتا روحانی سکون بھی پاتا ہوں۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں، جسے مسیحا بھی کہا جاتا ہے۔ قدرت نے مجھے مسیحائی کی قدرت، علم اور ہنر عطا کیا ہے تو اس سے صرف مجھے ہی نہیں انسانیت کو بھی فائدہ پہنچانا چاہیے اور جہاں تک فیس کا معاملہ ہے تو میں یہ فیصلہ خود کرتا ہوں کہ کس مریض سے فیس لینی چاہیے اور کس سے نہیں۔ البتہ اس اسپتال کے لیے میں نے اپنی خدمات مکمل طور پر رضا کارانہ طور پر وقف کر دی ہیں۔ یہاں جب بھی میری ضرورت ہوتی ہے، مجھے بلوایا جاتا ہے۔“

کلارک ایسی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔ وہ حیرت سے سوچنے لگا کہ اس کے اذگرداریے فرشتہ صفت لوگ بھی رہتے ہیں جو مادی فائدے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ کلارک جیسے جلاصفت قاتل کا دل بھی اس ڈاکٹر کے تعلیم اور احترام سے بھر گیا۔

”آپ کا کلینک کہاں ہے؟“ کلارک نے پوچھا۔

”مجھے کہاں آنا ہوگا؟“

”میرے کلینک کا پتا ہے۔ 112 تھرڈ ایویو۔ تم یہ آسانی وہاں پہنچ سکتے ہو۔“

پہننے ہی کلارک پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ وہی پتا تھا جو اس نے دو روز پہلے ذہن میں محفوظ کیا تھا۔ ”اگر اسے حادثہ پیش نہ آتا تو.....“ یہ خیال آتے ہی کلارک کے ذہن میں ایک اور خیال ابھرا۔ ”ڈاکٹر کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟“

”اسٹیون۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ڈاکٹر اسٹیون جانکز۔“

کلارک اپنی جگہ سے ہنر کر رہ گیا۔ ڈاکٹر کا نام سن کر کلارک کے لیے اپنے تاثرات جیسا نامشکل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کی موجودہ..... کیفیت دیکھی تو پوچھا..... ”کیا ہوا تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو نہیں آنکھ میں خارش یا جلن تو نہیں ہو رہی؟“

”نہیں..... نہیں۔“ کلارک نے جواب دیتے ہوئے مسکرائے کی کوشش کی جس میں وہ ناکام رہا۔

”پانچویں روز میرے کلینک آنا مت بھولنا۔“ ڈاکٹر نے بدستور دہمکی اور ہر شفقت مسکراہٹ سے کہا۔

”میں آ جاؤں گا۔“ کلارک نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے اس کی آنکھ میں چند قطرے ڈالے پھر روٹی رکھ کر پیٹی بانڈی اور رخصت ہو گیا۔ خوش قسمتی سے کلارک کو حادثے میں زیادہ زخم نہیں آئے تھے۔ اگلے دن اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا وہ اسپتال سے ذہن پر بھاری بوجھ لے کر نکلا تھا۔ جس شخص کو قتل کرنے کی ہامی دے کر چکا تھا وہ شخص اب اس کا حسن بن گیا تھا اور نہ صرف حسن بلکہ وہ ایک نہایت شریف انسان اور ہمدرد انسان بھی تھا۔ نہ جانے اس کی مسیحائی نے کتنے لوگوں کو پینائی کی روشنی بخشی تھی۔ کلارک کے لیے ایسے نفس اور رحم دل انسان کو قتل کرنا انتہائی مشکل کام تھا۔ اس نے اپنے پیسے میں بھی جذبات کو داخل نہیں ہونے دیا لیکن اب..... اسے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف مسئلہ اصول اور ساکھ کا تھا۔

کلارک معاہدہ کرنے کے بعد بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ وہ بھی ناکام ہوا تھا نہ اس نے بھی کوئی معاہدہ منسوخ کیا تھا اور پیشگی رقم وصول..... کرنے کے بعد اسے واپس کرنا کلارک کے اصول کے سخت خلاف تھا۔ اس الجھن سے نجات کا کوئی راستہ فی الحال اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شام کو کلارک نے اسی ریسٹوران میں جانسن سے ملاقات کی۔ جانسن اسے دیکھتے ہی چونک پڑا۔ ”تمہاری آنکھ پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ تمہیں یہ چوت کیسے آئی؟“ جانسن نے پوچھا۔ ”نہیں تم اپنے کام میں ناکام تو نہیں ہو گئے؟“

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ کلارک

نے بتایا۔ ”میں ایک حادثے میں زخمی ہو گیا ہوں، کوئی خاص چوٹ تو نہیں آئی۔ بس آنکھ میں شیشے کے ذرات چلے گئے تھے۔“

”کیا تم ایک آنکھ سے محروم ہو گئے ہو؟“ جانسن نے..... تشویش سے پوچھا۔

”نہیں..... ایک مہربان ڈاکٹر کی بروقت مدد سے میری آنکھ بچ گئی ہے۔ چار روز بعد پٹی ہل جائے گی اور ٹانگے نکال دیے جائیں گے۔“ بات کرتے وقت کلارک کی نگاہوں میں ڈاکٹر اسٹیون جانکز کا ہر شفقت چہرہ گھومتے لگا۔

قدرے تو قف کے بعد کلارک نے پوچھا۔ ”جانسن تم نے میرے شکار کا کیا نام بتایا تھا؟“

”اس کا مطلب ہے کہ حادثے نے تمہارے حافظے پر بھی اثر ڈالا ہے۔“ جانسن نے مذاق اڑایا۔

”میرا حافظہ بالکل ٹھیک ہے۔“ کلارک نے زچ ہو کر کہا۔ ”ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ میں اچانک دھماکے کی آواز سن کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ دماغ پر یا جسم پر کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔ میں..... میں بس احتیاطاً نام پوچھ رہا ہوں۔“

جانسن نے اسے غور سے دیکھا پھر کہا۔

”اس کا نام اسٹیون جانکز ہے۔“

”کیا تم اس شخص کا نام بتا سکتے ہو جو اسے قتل کرانے کے لیے اتنا معقول معاوضہ دے رہا ہے؟“

”کلارک! آج تم یہ کیسی بھکی بھکی باتیں کر رہے ہو؟“ جانسن برہم ہوا۔ ”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اسے موٹوں کا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔ میرے کام کرنے کے کچھ اصول ہیں، پتا نہیں تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“

”ناراض مت ہو جانسن، میں تو ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔ خیر! میں نے تمہیں اس لیے بلایا تھا کہ میں موجودہ حالت میں مقررہ مدت کے اندر کام مکمل نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک ہفتے کی مدت چاہیے۔“

”میں اپنے موکل سے بات کر کے صبح تمہیں مطلع کروں گا۔ مجھے امید ہے وہ مطلوبہ مہلت دینے سے انکار نہیں کرے گا۔“ جانسن نے اٹھتے ہوئے خشک لہجے میں کہا اور تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے چار روز کلارک سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ایک طرف اصول ساکھ اور دس ہزار ڈالرز کی رقم بھی تو دوسری طرف ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ اسے کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ کلارک نے خود کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ میں.....

☆☆☆

اگلے چار روز کلارک سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ایک طرف اصول ساکھ اور دس ہزار ڈالرز کی رقم بھی تو دوسری طرف ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ اسے کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ کلارک نے خود کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ میں.....

☆☆☆

اگلے چار روز کلارک سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ ایک طرف اصول ساکھ اور دس ہزار ڈالرز کی رقم بھی تو دوسری طرف ایک ایسا شخص تھا جس کے ساتھ اسے کچھ لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ کلارک نے خود کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ میں.....

☆☆☆

نرخامہ برائے اشتہارات

جملہ اشتہارات ایک ہفتی سے مفت شائع کیے جاتے ہیں۔ البتہ کاغذ، روشنی وغیرہ کے سلسلے میں فی اشتہار مبلغ پانچ سو روپے کی حقیر رقم طوعاً و کرہاً قبول کی جاتی ہے۔ مفلوک الحال پارٹیوں سے آسان قسطوں میں بھی وصولی کی جاتی ہے۔ البتہ قسط ٹونے کی صورت میں ادا شدہ رقم بھی واجب الادا ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

خاطر جمع رکھیں

کہتے ہیں کہ غیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ یقیناً آ جاتی ہے لیکن سولی چڑھنے کے بعد اسے ابدی غیند بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابدی غیند اور ابدی شہرت میں کوئی خاص فرق نہیں ہے کیونکہ ابدی شہرت بھی کسی قلم کار کے لیے ابدی غیند ہی کا بہانہ بنتی ہے۔

(ظفر اقبال کی کتاب دل واپس سے اقتباس)

☆☆☆

سزا

نوجوان ادیب (ایڈیٹر سے)۔ ”میں آپ کے پرے میں شائع کرانے کے لیے ایک کہانی لایا ہوں۔“

ایڈیٹر۔ ”کہانی پڑھ کر سنائیے۔“

نوجوان ادیب نے کہانی پڑھ کر سنائی پھر بولا۔

”مجھے اس کے بدلے کیا ملے گا؟“

ایڈیٹر۔ (جل کر) ”میں مجسٹریٹ ہوتا تو تمہیں دو ماہ قید کی سزا سناتا کیونکہ تم نے اپنا ادب میرا وقت برباد کیا ہے۔“

☆☆☆

سول وجواب

انٹرویو لینے والے نے ایک سفارشی لڑکے سے نوکری کے لیے یہ سوال کیا۔ ”بتاؤ، بلی کی جینوں کون تھے؟“

بلی کی جینوں کو دوسرے لڑکے سے (جس کی سفارش نہیں تھی) اس طرح کیا۔

”بلی کی جینوں کے گھر کا ٹیلی فون نمبر بتاؤ.....؟“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

خواتین وہ جذباتی ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر کا تو کام ہی علاج کرنا ہے۔ مجھے اس کا اتنا احسان مند نہیں ہونا چاہیے، میرے لیے ہمیشہ کی طرح معاہدہ اہم ہونا چاہیے۔ واقعی... ڈاکٹر کا کام ہی علاج کرنا ہوتا ہے۔ ہر ڈاکٹر یا سرجن اپنے پیشے کے آغاز میں حلف اٹھاتا ہے کہ جہاں اور جس طرح بھی ممکن ہو گا وہ انسانی زندگی کو بچانے کی پوری کوشش کرے گا۔ ڈاکٹر اسٹیون نے بھی یہی کام کیا ہے۔ کلاؤک نے پرسکون ہو کر خود کو مختلف دلیلوں سے مطمئن کیا اور حادثے کے پانچویں روز ڈاکٹر اسٹیون کے کلینک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے خوش اخلاقی سے اس کا استقبال کیا۔ نرم انداز میں خیریت پوچھی پھر اسے اندرونی روم میں لے جا کر ایک لمبی میز پر لٹا دیا اور پٹی کھول کر نائے نکالنے لگا۔ کلاؤک اس کے چہرے کو گھور رہا تھا۔ ڈاکٹر اسٹیون کی آنکھوں میں حسب معمول شفقت ہمدردی، متانت اور خود اعتمادی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنا کام دس منٹ میں ختم کیا اور نائکوں والی جگہ پر کوئی نوٹن ملا۔ ”اب تمہاری آنکھ پہلے جیسی بلکہ پہلے سے بھی اچھی ہو گئی ہے“ ڈاکٹر نے کہا اور اسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”بہت شکریہ ڈاکٹر۔“ کلاؤک اٹھ گیا اور جیب سے پانچ سو ڈالر نکال کر ڈاکٹر کی جانب بڑھائے۔ ”یہ آپ کی فیس۔“

”ارے نہیں۔“ ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کام کی کوئی فیس نہیں ہے۔ یہ بات میرے اصول کے خلاف ہے اور میں نے بھی اپنا اصول نہیں توڑا۔“

”لیکن ڈاکٹر! میں آپ کا احسان نہیں لیتا چاہتا۔“

”کیسا احسان؟“ ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔ ”میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا، صرف اپنے اصولوں کی پابندی کی ہے۔“

”لیکن... آپ۔“ کلاؤک کچھ کہنا چاہ ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹی۔

”میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا۔ اپنے پیشے کے لحاظ سے مجھے انسانیت کے لیے کام کرنا ہے، تم اسے احسان مت سمجھو۔“

”شک ہے ڈاکٹر۔“ کلاؤک نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ نے احسان نہیں کیا، تو میں بھی کوئی بوجھ محسوس نہیں کرتا۔“

کلاؤک کلینک سے باہر نکلا اور آس پاس دیکھ کر اپنی آنکھ کی صلاحیت کا اندازہ کرنے لگا۔ وہ مان گیا کہ ڈاکٹر نے شیک کہا تھا، اس کی نظر پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ کلاؤک کا

ارادہ ایک بار پھر ڈاکٹر انوں ڈول ہونے لگا۔

☆☆☆

کلاؤک ایک پیشہ ور قاتل تھا۔ وہ اس کام میں... نوآموز نہیں تھا کہ کام کرتے ہوئے گھبراہٹ کا شکار ہو کر پہلی بار یہ ہو رہا تھا کہ وہ معاہدے کی ششگئی رقم لے کر اپنا کام انجام دینے سے ہٹ چکا رہا تھا۔ کافی سوچ بچار اور چھان بین کے بعد آخر کار اس نے اپنا کام مکمل کر ہی لیا۔ اگلی صبح اس نے جاسن کو فون کیا اور اسی مخصوص ریسٹوران میں ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

”کیا خبر لائے ہو کلاؤک؟“ جاسن نے اس کے سامنے بیٹھے ہوئے سوال کیا۔

”کام ہو گیا ہے۔“ کلاؤک سکون سے بولا۔

”خوب! مجھے معلوم تھا کہ تم ناکام نہیں ہو گے، کب مکمل کیا کام؟“ جاسن نے پوچھا۔

”گزشتہ رات۔“ کلاؤک نے مختصر جواب دیا۔

”اس کے ثبوت اپنے ساتھ لائے ہو؟“ جاسن نے وضاحت چاہی۔

”کیوں نہیں۔“ کلاؤک نے اپنے کمرے سے اتاری ہوئی دو تصویریں جاسن کی طرف بڑھادیں۔ تصویر میں ایک شخص اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے جاسن نے پوچھا۔ ”تم نے اسے کسی گیراج میں قتل کیا ہے؟“

”ہاں یہ اپنی گاڑی نکال رہا تھا، میں اسی وقت مجھے اپنا کام دکھانے کا موقع مل گیا۔ اچانک حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔“

”کیا؟... حرکت قلب بند ہونے کے باعث... مطلب کیا تم نے قتل نہیں کیا؟“ جاسن کے چہرے پر حیرت کا تاثر نمودار ہوا۔

”میں نے ہی اسے قتل کیا ہے۔“ کلاؤک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن اس کی موت کا سبب حرکت قلب بند ہونا ہی بتایا جائے گا اور اصل میں... اس کی موت دماغ کی رگیں پھٹ جانے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔“

”یہ تم جیسی باتیں کر رہے ہو؟“ جاسن اٹھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”حکمت قلب... دماغ کی رگیں... مکمل کر بناؤ، آخر تم نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا؟“

کلاؤک نے جاسن کے قریب جھکتے ہوئے ڈرامائی انداز میں سرگوشی کی۔ ”میں نے اس کی آنکھ کے کونے میں چھ انچ لمبی... پتلی سوئی داخل کر دی تھی۔ یہ کام میں نے

نہایت صفائی سے کیا۔ سوئی اس کی آنکھ کے اندرونی کونے میں داخل ہو کر دماغ میں پہنچ گئی تھی۔ جب میں نے سوئی نکالی تو آنکھ پر زخم کا کوئی نشان نہیں تھا۔ مجھے یقین ہے، ڈاکٹر اس کی موت کا سبب نہیں جان سکیں گے۔“

”کیا بات ہے کلاؤک۔ تم نے مجھے واقعی متاثر کر ڈالا ہے، سچ میں یہ طریقہ بہت صاف ستھرا ہے۔“ جاسن اٹھتے ہوئے بولا۔ ”تصویریں میں اپنے موکل کو دکھانے کے لیے لے جا رہا ہوں، کل بقیہ رقم تمہیں اسی جگہ مل جائے گی۔ اسی دوران میرا موکل تمہارے کام کی تصدیق بھی کرے گا۔“

کلاؤک نے اثبات میں سر ہلایا۔ جاسن نے تصویریں جیب میں ڈالیں اور ریسٹوران سے رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے روز آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کسی وقت بھی بارش شروع ہو سکتی تھی۔ کلاؤک شیک وقت پر ریسٹوران پہنچ گیا۔ خلاف معمول جاسن پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس کے چہرے پر سخت غصیلے تاثرات تھے۔

کلاؤک اس کے سامنے کرسی صاف کر بیٹھا گیا۔ ”میں کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔“ جاسن کی آواز غصے سے لرز رہی تھی، مگر اس نے اپنی آواز بلند نہیں ہونے دی۔

”میں تو مقررہ وقت پر پہنچا ہوں، کیا مجھے یہاں آنے میں تاخیر ہو گئی ہے؟“ کلاؤک نے حیرت سے پوچھا۔

”نہیں۔“ جاسن غراہا۔ ”تم طے شدہ وقت پر پہنچے ہو، لیکن اس مرتبہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔“

”کیسی غلطی؟“ کلاؤک نے تعجب سے جاسن کی جانب دیکھا۔

”تم نے غلط شخص کو قتل کر دیا ہے۔“

”کیا؟...“ کلاؤک نے کہا۔

”ہاں تم سے غلطی ہو گئی ہے کلاؤک۔“ جاسن دانت پیس کر بولا۔ ”میں تو پہلے ہی اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ حادثے نے تمہارے حواس پر بہت برا اثر ڈالا ہے۔“

”میرا خیال ہے تم مذاق کر رہے ہو۔“ کلاؤک غصے سے بولا۔ ”میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔ میں اس میدان میں نوآموز نہیں ہوں مسٹر جاسن! لہذا فضول باتوں سے گریز کر ڈلو! میری بقیہ رقم۔“

”میں رقم نہیں لایا۔“ جاسن نے رکھائی سے جواب دیا۔

”کیون کیا وہ ثبوت کافی نہیں ہے؟“

”ثبوت۔“ جاسن نے استہزاءیہ لہجے میں کہا۔ ”اس سے

صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ تم نے ایک شخص کو قتل کیا ہے اور بس۔“

”میں بے ہودہ مذاق پسند نہیں کرتا مسٹر جاسن!“

کلاؤک نے غصیلی آواز میں کہا۔ ”میں نے تم سے قتل کیا ہے اور جس کی تصویر تمہیں دی ہے وہ ڈاکٹر اسٹیون جانلری ہے اور یہ بات سو فیصد درست ہے۔“

”یقیناً تم نے ڈاکٹر جانلری ہی کو قتل کیا ہے مگر یہ وہ نہیں تھا جس کا ہم نے معاہدہ کیا تھا۔“ جاسن پھر سے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تم نے ڈاکٹر ویسٹرن جانلری کو قتل کر دیا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو ایڈریس مجھے دیا ہے وہاں دو ڈاکٹر جانلری رہتے تھے؟“ کلاؤک نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

”ہاں ایک ڈاکٹر اسٹیون جانلری کا بھتیجا تھا۔ دونوں آنکھوں کے ڈاکٹر تھے اور ساتھ کام کرتے تھے۔ اب کچھ

میں آیا کچھ کہ تم سے تنہی بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ تم نے کچھ کو قتل کرنے کے بجائے مجھے قتل کر دیا ہے۔ تم نے جس شخص کو قتل کیا ہے وہی تو ہمارا موکل تھا۔ اس نے اپنے بچاؤ ڈاکٹر اسٹیون جانلری کو قتل کرانے کے لیے ہمیں رقم دی تھی۔“

کلاؤک نے معنی خیز انداز میں سر کو جنبش دی جو بات جاسن بتا رہا تھا وہ اسے پہلے ہی معلوم تھی۔ اس نے پوری تحقیق کے بعد ہی نو جوان ڈاکٹر ویسٹرن جانلری کو قتل کیا تھا۔

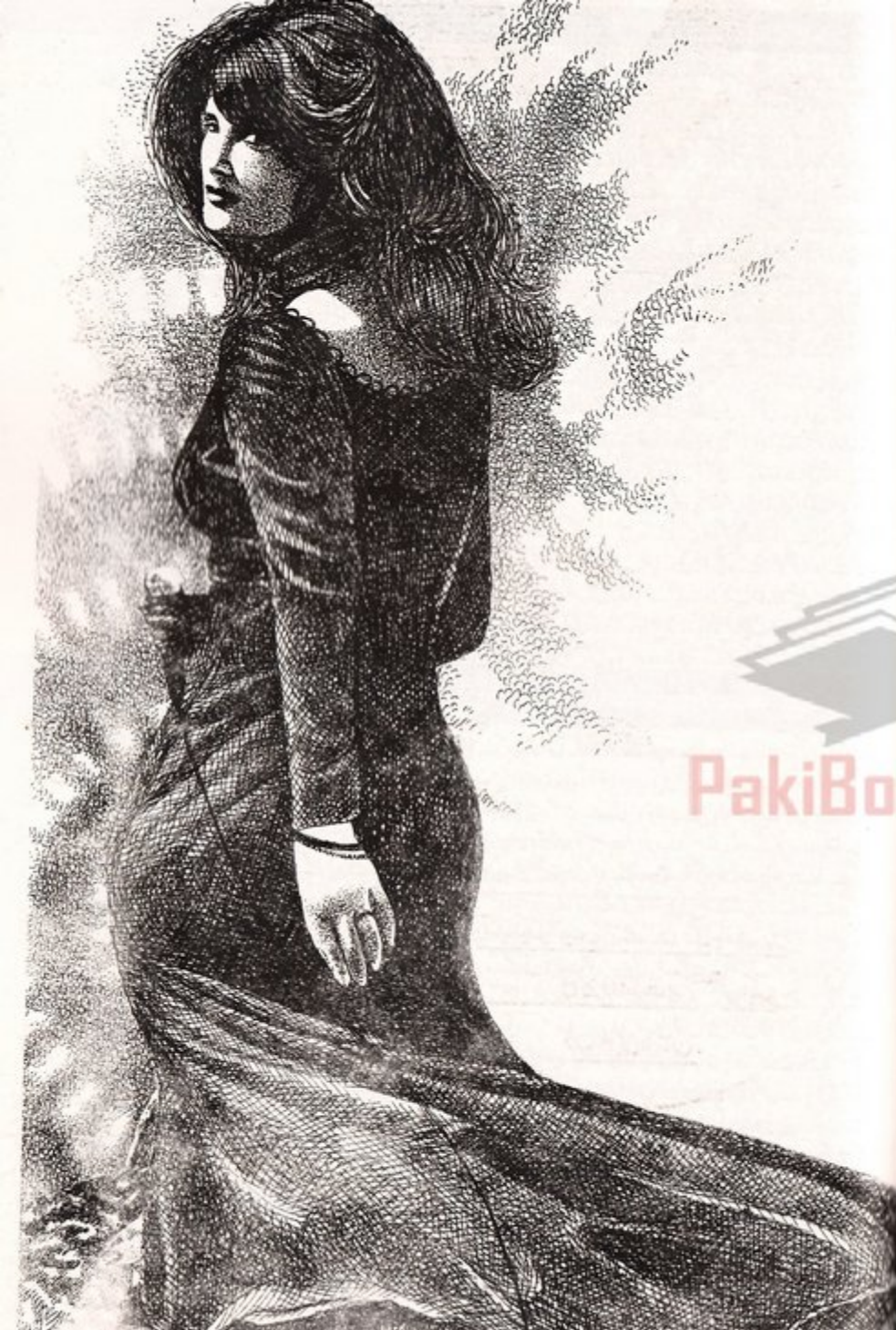
خاصی چھان بین کے بعد کلاؤک کو یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ ڈاکٹر ویسٹرن جانلری اپنے چچا ڈاکٹر اسٹیون جانلری کو قتل کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی جائداد اور کلینک پر قبضہ کر سکے۔ اب ظاہر ہے کہ جاسن بقیہ نصف رقم نہیں مل سکتی۔

جاسن اٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیونکہ جس سے رقم ملنے کی امید تھی تم غلطی سے اسے ہی قتل کر بیٹھے ہو۔“

”اوہ... میرے خدایا۔ مجھ سے اتنی بڑی حماقت کیسے سرزد ہو گئی۔“ کلاؤک نے سر ہٹا لیا۔

”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ حادثے نے تمہارے اعصاب متاثر کیے ہیں۔ تمہیں اب بھی آرام اور علاج کی ضرورت ہے۔ اب اگلا معاہدہ میں تب لاؤں گا، جب تمہاری طبیعت میں بہتری واقع ہو جائے گی۔“ اوکے

ہائے۔“ جاسن نے تاسف سے کہا اور رخصت ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی کلاؤک کے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ زندگی میں پہلی بار اسے کسی کو قتل کر کے اطمینان کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اپنے محسن ڈاکٹر اسٹیون جانلری کی جان بچائی تھی اور یہ موقع اسے ناموں کی ممانعت سے مل گیا تھا۔



قت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور

قسط نمبر: 19

وقت

حسام بہ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا۔ ایک ایسے پر عزم بازی گر کی بازی گری

سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

دلربا طویل داستان

سے بھی... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی... ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی... دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لہجے کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو ہر سونے پادریے گا۔

اکتوبر 2018ء

188

سپینس ڈائجسٹ

اس کا نام اسماعیل رکھا گیا جسے "علی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے سنیہا لاخود کو علی سلطان کی جگہ شامت میں پایا۔ علی سلطان نکلیا (امریکا) کا ایک معتبر کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو وصل چیز تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی اپنی بیوی رنا سیکھالین سے علیحدگی ہو چکی تھی۔ وقت رخصت رنا اپنی اکوٹی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ کر کچھ کے لیے ایک کل وقتی ملازمہ مقرر ہوئی تھی اور جیسے جوں کی توہمت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد یا بیارہ تاؤ کرتا تھا جو اسے اٹکل کہتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں پیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی پل بڑھ کر جواں ہوئے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی اٹکل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر بردبار شخص نے نہایت ہی خوب صورتی سے اسے دل دیا۔ یہ علی علی کے جس کو ہوا دینی تھی لہذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچ کے جالے میں الجھ کر رہا جاتا تھا مگر اس اضطرابی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے ٹیکساس کے علاقے "سٹیکلٹن میں واقع "سرکل رائے" نامی ایک اسٹور پر جرتی ملازمت بھی لے لی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکالوجی میں پیچڑ ڈگری حاصل کر لی تو تئہ بنے پگسے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ ایک روز دو مسکین لڑکے لکھتی کی نیت سے "سرکل رائے" میں گھس آئے۔ تمام کیش لینے کے بعد وہ ڈکیت علی کے ساتھ موجود سٹریٹ میں نظارہ کوٹ کر گئے۔ پولیس نے شک کی بنا پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ بعد ازاں ان دونوں مسکین ڈکیت کوئی گس (یری زونا) سے گرفتار کر لیا گیا۔ علی کا کالج ایک جیکسن (ٹیکساس) میں تھا جبکہ علی سلطان کی رہائش بے بی (ٹیکساس) میں تھی۔ علی ایک ہوٹل میں رہتا تھا اور ایک جیکسن کے اکثر ریسٹورنٹس میں اس کا آنا جانا لگ رہتا تھا۔ "وئی لاؤنج" نامی ایک ریسٹورنٹ میں ہسپانوی دو شیرو مشاوردے نے علی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس نے علی کے درپل پر دستک دی تو اس کی زندگی میں بہادر تار آئی۔ ایک رات وئی لاؤنج میں جب لیونارڈو نامی ایک مسکین غصے اور اس کے خوار یوں نے مشاوردے سے تیزی کی کوشش کی تو علی کچھ مچ مچ کر بڑا۔ اس مارا ماری کو ایک امیر وکیر اشتیاش لایڈی ڈیڈیٹا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا زور ٹینک کا ڈر علی کو کھما کر رخصت ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد کو یالو نارڈو نے علی کی دشمنی کا قاعدہ آغا ہو گیا تھا۔ لیونارڈو نے اپنی ہزیت کا بدلہ لینے کے لیے مشاوردے کو مار گٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ وئی لاؤنج والے نے ناخوشوار واقعے کی بنا پر علی نے مشاوردے کی ریسٹورنٹ والی جاب چھڑوا کر اسے اٹکل سلطان کی خدمت کے لیے گھر میں رکھا تھا۔ ایک روز جب مشاوردے اشتیاش مشاوردے سے گروسی خریدے گئی تو لیونارڈو نے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے مشاوردے کی تلاش میں بہت نہاری اور مشاوردے کو گھونٹا تار یا بار ایک رات لیونارڈو کا ایک قریبی ساتھی پیلو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ علی نے قفس کے عالم میں مار مار کر پیلو کو ادھ موار کیا۔ آئندہ روز پیلو کے قتل کی خبر ایک جیکسن اور اس کے قرب وجوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ ایک جیکسن میں مزید قیام خطر کا ثابت ہو سکتا تھا لہذا علی نے اٹکل سلطان کو صورت حال سے آگاہ کیا اور ایک جیکسن سے یوشن بھیج کیا۔ اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیڈیٹا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیڈیٹا نے علی کی کھانسنے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے تک باہر کی دنیا سے کٹ کر اس کے ساتھ بیٹھنے میں رہے تو وہ اسے تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ راضی ہونے پر ان بہتر گھنٹوں میں ہر مل علی پر چیتوں کا ایک نیارو ہوتا رہا۔ ڈیڈیٹا بہت اونچی کھنچ کی مالک ایک پراسرار لایڈی تھی۔ اس نے اپنا زور سوخ استعمال کر کے علی کو پیلو سرورس سے اس طرح نکال لیا جیسے کھن سے بال۔ ملاوہ ازیں ڈیڈیٹا نے ٹھوس ثبوت کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونارڈو مشاوردے کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ مشاوردے کو عصمت فروشی کے چہنم میں جھونکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیڈیٹا نے علی کو یوشن دلا یا کہ اگر وہ بہتر گھنٹے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ مشاوردے کو صحیح سلامت واپس لے آئے گی۔ مشاوردے حصول کی خاطر علی ڈیڈیٹا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پر یوشن ہالوادے اس بیٹھنے میں ڈیڈیٹا کی سنگت میں گزرنے والے وہ ظلم ہوش رہا بہتر گھنٹے بڑے سنگین، دشمن، درد مان پرورد اور ناقابل یقین تھے۔ ڈیڈیٹا کی شخصیت کسی معنے سے کم نہ تھی۔ اس پر مستزاد ڈیڈیٹا نے اپنے ہی امی دو پراسرار شخصیات ڈلی آنرک بارون لاؤرڈیا اور ایمیل پام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔ علی پر یہ اعتراف ہوا کہ وہ تمام افراد عیوہوں کی ایک بیکٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی "اسکل اینڈ یوز" سے تعلق رکھتے تھے جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آزاد تھے۔ لوگ خود کو زمینی خدا سمجھتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی ماں مسلمان اور باپ عیسائی تھا۔ انہیں شک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیڈیٹا کی تمنا تھی کہ علی کی شرانکھ پر صاد کرتے ہوئے "اسکل اینڈ یوز" کی رکنیت حاصل کرنے پر آمادگی ظاہر کر دے لیکن علی نے ڈیڈیٹا کی خواہش کو ٹھکرا دیا اور ڈیڈیٹا سے بے بسی اپنے اٹکل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک نئی کثرت اس کی راہ کو بدھ رہی تھی۔ اٹکل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے در پیر اور سربراہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیو یارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گارجین کی حیثیت سے انہیں برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں میٹم ایک نیک خاتون براشت کر رہی تھیں مگر پچھلے چند ماہ سے آجاک کراچی سے یہ رقم آنا بند ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کی معصیت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ

فیصلہ کیا گیا کہ علی کو فی الفور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامر بیگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی نے کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکا تھا۔ علی نے تیاری کی اور یوشن سے کراچی آ گیا۔ علی کی دوستی عظیم نامی نوجوان سے ہو گئی۔ عظیم نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے علی کی والدہ کا پتہ لگایا اور انہیں گھر لے آیا۔ علی کی ملاقات اپنی ماں سے ہو گئی۔ علی کو اپنی ماں کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا اور وہ دشمنوں سے انتقام لینے کے بارے میں سوچنے لگا۔ علی ماں کے ہنگلے پر رہنے لگا۔ وہیں اسے اطلاع کی کہ اگلے علی سلطان کا دل کے دورے کے سبب انتقال ہو گیا ہے۔ علی نے ماں کو امر کیا تاکہ علی کے جانے کے لیے وٹ ویزا کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی۔ کچھ نامعلوم افراد نے حملہ کر کے علی کی والدہ کو قتل کر دیا۔ علی نے تہیہ کر لیا کہ وہ ماں کے قاتلوں کو کیفر کر دے تاکہ وہ اپنی ماں کے قاتلوں کی تمام حقیقت چنا کو بھی بتا دی۔ وہ علی کی اچھی دوست اور مرزا بن گئی تھی۔ علی کو اس کی رہائش گاہ کے چارہا یک خط ملا جس میں اس کی ماں کے قتل کا حوالہ دیا گیا تھا۔ علی نے نادر شاہ کو چیک کرنے کا ارادہ کیا۔ علی نے عظیم کے ساتھ مل کر منموہ بنایا کہ نادر شاہ کو افواہ کر کے اس سے بچ آگوا یا جائے۔ عظیم نے کچھ لوگوں کو پیسے دے کر نادر شاہ کو افواہ کرایا۔ تاہم اس میں سے ایک شخص نے عظیم کو کال کر کے بتایا کہ ان کے آدھوں کو پولیس نے گھیر لیا ہے۔ نادر شاہ اور افواہ کشندگان پولیس کی تحویل میں پہنچ گئے تھے۔ علی نے فوری طور پر ہنگلہ چھوڑ دیا اور جتا کے ہمراہ اس کے قلیب پر آ گیا۔ علی نے ہنگلے پر جیش کو چھوڑا تھا اور.... نظر رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ علی کو دو جرمن سفیرز کی مدد سے تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس کے در پر وہ ڈھلیٹیاں کا ہی تھا تھا۔ وہ بھی کبھی طرح علی کو قابو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے پولیس کو چھپنے لگا دیا تھا جو بڑی شدہ سے علی کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ علی نے نادر شاہ کو سبق سکھانے کے لیے اسے قابو کیا اور بدترین تشدد کر کے اسے جتا کی زندگی گزارنے کے لیے چھوڑ دیا اور اپنی ماں کے ہنگلے کو بڑا فرش کر دیا۔ علی کو ایک عورت کی مدد سے ٹریس کر لیا گیا اور نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا گیا۔ وہاں ایک شخص ملا جس نے علی کو بتایا کہ وہ وہاں آئی لینڈ پر ہے جہاں اسے چالیس دن گزارنے ہیں۔ وہیں اسے ایک لڑکی کا پیش بھی جس سے دوستی ہوئے پر اس نے بتایا کہ وہ اسکل اینڈ یونے کے لیے کام کرتی ہے اور اسے جان بوجھ کر وہاں بھیجا گیا ہے۔ علی کا یہاں کے ساتھ آئی لینڈ کی سیر کے لیے نکلا کہ اچانک اس کا برف میں دھنس گیا، علی کا یہاں کی مدد کے لیے آگے بڑھا تو وہ بھی برف میں دھنس گیا۔ اسے لگا کہ اس کا آخری وقت آ گیا ہے۔ وہ برف کے نیچے جتے پانی میں گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ علی کو بوش آیا تو اس نے خود کو کچھ لوگوں کے ترے میں پایا۔ اچانک اس کا نمودار ہوئی اور اس نے فائز کیا تو وہ لوگ بھاگ گئے۔ ہٹ میں بیڑہ رونا ہی شخص آیا جسے علی نے پہچان لیا کہ وہ چیچر خان ہے۔ علی نے اسے فائز تک موت دی اور اپنے انتقام کی آگ بجھائی کہ یا اپنے علی کو نادر شاہ دیا کہ وہ بھی اپنے دشمن کو اسی طرح اذیت دے کر مارنا چاہتی ہے۔ علی کے اس استہوار پر اس کا دشمن کون ہے وہ بلکہ بلک کر رونے لگی۔

کایا کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہوا اور آنکھوں کی پیرا کی ہوئی تھی۔ اس نئی کی طغیانی دیکھنے سے تعلق نہ۔ اس کا بدن ایک خوف ناک طوفان کی زد پر تھا۔ ہوس ہوتا تھا جیسے اس کے وجود میں کوئی آتش نشاط نے قرار ہو۔

علم ہوں۔ میرا علم اور تجربہ مجھے بتا رہا تھا کہ کیا اپنے دل پر کوئی بھاری بوجھ لیے گھوم رہی ہے۔ اگر اسے رونے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے تو اس کے من کا غبار دھل جائے گا۔ میرے اس فیصلے کے خاصے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔

کایا کی سسکیاں روتے روتے ہچکیوں میں بدلیں پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ہنسنے لگی۔ میں نے لوہا گرم دیکھا تو کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ میری کاتبہوں کے حصار میں قید ہو کر رہ گئی۔ میں نے اس کے بوب کٹ بالوں میں اپنی انگلیاں ڈالیں اور دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں کی مدد سے اس کی گمڈی پر ہلکا ہلکا مساج کرنے لگا۔ وہ اپنا چہرہ میرے سینے پر ملتے ہوئے تھوڑی دیر تک ہنسنے لگی پھر اس کے وجود میں ہر پارازلے کو توڑا سا آگیا۔ میں نے چند لمحات تک اسے اپنے سینے سے لگائے رکھا پھر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

”کایا! تمہیں اچانک کیا ہو گیا تھا؟“
 ”آئی ایم سوری علی!“ وہ تسنہیل کر بیٹھتے ہوئے

اس کیفیت سے پہلے کا یا نے بڑے حسرت بھرے انداز میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ”کاش! میرے اندر کا درد نہ بھی جاگ اٹھے تاکہ میں بھی اپنے دشمن کو ایک یادگار اور بھیا تک موت مار سکوں.....“

میں نے متعدد بار اس سے سوال کیا تھا کہ مجھے اپنے دشمن کا نام بتاؤ لیکن اس نے جواب نہیں دیا تھا اور مسلسل روتی چلی جا رہی تھی۔ جب انسان کو مٹی کے رونے کا سبب معلوم نہ ہو اور اس رونے والے کو چھوڑ دینی نہ سکنا ہو تو پھر دل و دماغ کی عجیب سی حالت ہو جاتی ہے۔ ان لمحات میں، میں بھی، کچھ اکر نوعیت کے حالات سے دو جا رہا تھا۔

میں نے کایا کو روکنے دیا۔ میں قلم نفسیات کا طالب

سے متعلق کسی لہریں خارج ہو رہی تھیں۔ مجھے اس کے دیکھنے سے بے چینی محسوس ہونے لگی تو میں نے پوچھ لیا۔
”ایسے کیا دیکھ رہی ہو.....؟“
”کچھ نہیں۔“ وہ صاف ٹال گئی۔

میں نے بھی زیادہ کرید مناسب نہ سمجھی۔ ناشتا ختم ہو چکا تھا اور وہ بھی ایک دم فریض لگ رہی تھی۔ میں اسے اصل موضوع کی طرف لے آیا۔
”کایا! تم مجھے سوسائٹی کی کسی اہم مینٹگ کے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”میں تمہیں اپنے بھائی رائن کی موت کے بارے میں بتا رہی تھی۔“ وہ ایک بوچھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”اس خاص مینٹگ میں تمام شرکا کو ایسی ریڈ وائن سرو کی جاتی ہے جس کے اندر انسانی خون کی آمیزش ہوتی ہے اور یہ راز اس وقت کسی بھی جونیئر ممبر کے علم میں نہیں ہوتا۔ اس ”برادر ہڈ“ سے تعلق رکھنے والے افراد جب ترقی کرتے ہوئے ایک خاص ڈگری تک پہنچ جاتے ہیں تب انہیں ایسے مکروہ رازوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ خیر، میں تمہیں رائن کے ساتھ پیش آنے والے افسوس ناک واقعے کا احوال سنا رہی تھی۔“

وہ تھوڑی دیر کو سانس ہموار کرنے کے لیے تھی تو میں اس کی فراہم کردہ معلومات پر غور کرنے لگا اور اس ”غور“ کے نتیجے میں مجھے اپنا جی ملتاتا سا محسوس ہوا۔ اب اس سوسائٹی کے شیطان ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ ان لحاظ میں، میں نے تہیہ کر لیا کہ مرثا، مرچاؤں گا مگر کبھی اس برادر ہڈ کا حصہ نہیں ہوں گا۔

”جب یہ اہم مینٹگ برخاست ہوتی ہے تو تمام ممبرز کو وہاں سے رخصت ہونا پڑتا ہے۔“ کایا نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔ ”صرف ان افراد کو روک لیا جاتا ہے جن کی وفاداری پر شک کا دائرہ لگ چکا ہو۔ تین سال پہلے رائن کو کبھی روک لیا گیا تھا۔ رائن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ سوسائٹی کے سینئر زمیر نے بھائی کو بڑی ہسیانک جان لیوا سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔“ لمبے بھر کو خاموش ہو کر اس نے ایک خوف ناک جھرجھری لی۔

میں نے اسے روکنا یا ٹوکنا موزوں نہ جانا۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے اندر پھنساتے ہوئے مجھے مزید بتانے لگی۔

”اس واقعے کے بارے میں مجھے چند ماہ پہلے ہی پتا چلا ہے۔ اگر رائن کی موت کے وقت میں اس سے آگاہ ہو چکی ہوتی تو یا تو میں خود کو ختم کر دیتی یا پھر آسکر کو لین اب میں حتیٰ فیصلہ کر چکی ہوں کہ مجھے تمہاری دوستی میں ایک شاندار زندگی گزارنا ہے اور..... آسکر کو.....“

مجھے محسوس ہوا کہ جذبات کی شدت ایک مرتبہ بھر اس کے اعصاب پر بری طرح اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے ایک سگریٹ سلگا کر فوراً اس کی طرف بڑھایا پھر پڑ غلوس انداز میں کہا۔

”میں جانتا ہوں کایا، تمہارے اندر انتقام کا الاؤ روشن ہے اور اس کیفیت کو مجھ سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ میں خود بھی اس آگ میں برسوں جلا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں قدم بہ قدم تمہارے ساتھ ہوں۔ آسکر یہاں آنے والا ہے۔ اسے تمہارے من پسند انجام تک پہنچانے کے لیے میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔ مجھے بتاؤ، آسکر نے رائن کے ساتھ کیا کیا تھا؟“

وہ شراب نوشی کی عادی تھی۔ میری قربت کی چاہت نے اس کی یہ عادت چھڑا دی تھی۔ ان جذباتی لحاظ میں اسے کسی سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ اس نے میرے ہاتھ سے سگریٹ لے کر دو تین گہرے کش لیے پھر میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

”سوسائٹی والے معاشرے کے ذہن ترین اور کسی فن میں یدِ طولیٰ رکھنے والے افراد کو منتخب کرتے ہیں اور اگر کسی کی وفاداری مشکوک ہو جاتی ہے تو اسے عبرت ناک موت بھی ملتی ہے اور اگر وہ معتبوب بندہ ان کی دسترس میں ہوتا ہے تو اسے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے اس کی تمام ذہانت اور ہنر کو ایک مکروہ ٹیکنیک کے ذریعے اس کے اندر سے نکال لیا جاتا ہے۔ کیا تم نے کبھی ناریل پانی پیا ہے؟“

اس نے ایک غیر متعلق اور عجیب و غریب سوال پر اپنی بات کو ختم کیا تو میں نے کہا۔ ”ہاں، کئی بار پیا ہے۔“
”ناریل پینے والا ناریل کے اندر سوراخ کر کے اس کے اندر ایک اسٹرا ڈالنا ہے پھر اپنے کسٹریکٹر کی طرف بڑھا دیتا ہے۔“ وہ تجسیم انداز میں بولی۔ ”سوسائٹی کے سینئر ذہنی اسی ٹیکنیک کے ذریعے بد نصیب ممبر کی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو نکال لیتے ہیں۔“

”کیا کہنا چاہ رہی ہو.....؟“ میں نے حیرت اور الجھن کے طے جلتے تاثرات کے ساتھ کایا کی طرف دیکھا۔

”معتوب انسان کو ایک خاص قسم کا انجیکشن دیا جاتا ہے۔“ وہ اپنی ہی دھن میں بولی چلی گئی۔ ”اس انجیکشن کے اثر سے بندہ اشل ہو کر رہ جاتا ہے یعنی اس کے جسم پر فالج گرتا ہے اور وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دینے کے قابل نہیں رہتا البتہ اس کا دماغ بیدار رہتا ہے۔ یہ مصنوعی فالج اس کے دماغ کو متاثر نہیں کرتا۔ اس کے بعد ڈرل مشین کی مدد سے اس کے پس منطوق شخص کی کھوپڑی میں سوراخ کیا جاتا ہے اور اس سوراخ کے اندر جوس والا اسٹرا ڈال کر اس کا بھیجا سڑک لیا جاتا ہے۔ رائن کو بھی یہی سزا دی گئی تھی اور وہ بھی آسکر کے ہاتھوں۔ اب تم خود اندازہ لگا لو کہ جو شخص میرے بھائی کا بھیجا لگے بیٹھا ہو، میرے دل میں اس کے لیے کس درجے کی نفرت ہوگی.....؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر توقف کیا پھر سانس لیے بغیر کش پر کش لگا کر سارا سگریٹ پھونک ڈالا۔ ان لحاظ میں مجھے اس دکھائی پر برا ترس آیا۔ میں نے سنگین لہجے میں کہا۔
”کایا! تمہارے سوال کا جواب الفاظ میں نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے لیے مجھے عملی مظاہرہ کر کے دکھانا ہوگا۔“

وہ میرے الفاظ کی سفاکی کو محسوس کرتے ہوئے بے بسی سے بولی۔ ”میں بھی کتنی بد بخت ہوں کہ اکثر میری ڈیوٹی ایک ایسے شخص کے ساتھ لگا دی جاتی ہے جسے دیکھ کر میرا جگر پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ میں آسکر کی ناپاک سنگت کو کس دل سے برداشت کرتی ہوں یہ صرف میں جانتی ہوں یا پھر جیہودا جانتا ہے۔“

اب میں اسے مزید سگریٹ نوشی کی اجازت نہیں دے سکتا تھا لہذا اسے جذباتی سہارا دینے کے لیے میں میدانِ عمل میں اتر آیا۔ اگلے ہی لمحے وہ میری آغوش میں گئی۔ میں کافی دیر تک اسے پیار کرتا رہا۔ اس دوران میں ہمارے بچ بچ بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

”میں نے سن رکھا ہے کہ افریقا کے خطرناک جنگلات میں بعض ایسے قبائل بھی آباد ہیں جو اپنے ہتھے چڑھنے والے انسان کا بھیجا نکال کر اسے فرما کر کرتے ہیں اور پھر بڑے مزے سے کھا جاتے ہیں۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”یہ لوگ سانپ کی پوجا کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ کی ایک انگلی میں سانپ کی شبیہ والی انگوٹھی بھی ہوتی ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ یہ لوگ سانپ کی نسل سے ہیں مگر مجھے تو یہ عقیدہ انتہائی فضول اور دواہیات لگتا ہے۔“
”تمہیں ان کے عقیدے پر یقین ہو یا نہ ہو لیکن میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ آسکر سانپ کی نہیں

بلکہ شیطان کی اولاد ہے۔ میں اس شیطان کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“

”صرف چار دن کے لیے اپنے جذبات پر قابو رکھو۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”میں جولائی کی صبح آسکر یہاں پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہیں لینے آ رہا ہے مگر اس کے ساتھ ہی موت کا فرشتہ بھی اس ہٹ تک پہنچے گا پھر تم میری مدد سے اپنے من کی آگ کو ٹھنڈا کر دو گی۔ آسکر کو اتنی اذیت ناک موت آنے کی کتنی چنگیز خان کی ہسیانک موت کے منظر کو بھی بھول جاؤ گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اب تم سیکرٹ سوسائٹی کے قتل پر نہیں ہو بلکہ میری دوستی کے رحم پر سوار ہو۔ مالک نے تمہاری جتنی بھی سانس لکھ رکھی ہیں وہ تم میری دوستی میں بڑی آن، بان اور شان سے جوگی۔“
وہ میری بغل میں گھسی ہوئی تھی۔ میرا ایک بازو اس کے چہرے کے قریب سے گزرتا تھا۔ وہ میری کلائی میں دانت کڑاتے ہوئے غور لہجے میں مستغرق ہوئی۔
”علی! مجھے چھوڑ کر تو نہیں چلے جاؤ گے؟“
”ڈراؤ تو نہیں.....!“ میں نے ذومنی انداز میں کہا۔

”میں نے کیا ڈرایا ہے؟“
”تم نے جس طرح میری کلائی میں اپنے دانت گاڑ رکھے ہیں اس سے تو یہی لگتا ہے کہ تمہارا تعلق بھی کسی آدم خور قبیلے ہی سے ہے۔“ میں نے معنوی تنبیہ کی سے کہا۔

”ادھ سوری!“ وہ جلدی سے اپنے منہ کو میری کلائی پر سے ہٹاتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔ ”میں تو تمہیں پیار کر رہی تھی۔“

میں نے اس کے چہرے کو اوپر اٹھاتے ہوئے مستی بھرے لہجے میں کہا۔ ”پیارا ایسے تھوڑی کرتے ہیں۔“
”پھر کیسے کرتے ہیں؟“ اس نے مصویت بھرے انداز میں پوچھا۔

”ایسے.....“ میں نے اس کے گلاب ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔

☆☆☆

وہ پورا دن ہم نے سو کر گزارا۔ رات بھی اپنی مخصوص رفتار سے گزر گئی۔ ہمارے بچ استوار ہونے والا دوستی کا رشتہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ گہرے سے گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس بندھن کی گہرائی ہماری قربت کو بڑھا دے رہی تھی۔ کایا نے تو گویا میری کا یا پلٹ کر رکھ دی تھی۔



دلچسپ کہانیوں اور تین سلسلوں سے مرعہ ستمبر 2018 کا دل خوش کن شمارہ

پاکیزہ

ماہنامہ

شیریں حیدر، رفعت سراج، حیا بخاری کی دلکش سلسلے وار کہانیاں

دردانہ نوشین خان کے زیرک خیالات کا مظہر

ایک یادگار مٹا کر مٹی ناول صفحہ کی نئی قسط

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا پُر بصیرت مضمون

عید الاضحیٰ کی مناسبت سے نزہت حبیب ضیا کا مکمل ناول دل کی بساط پر

شمع ہدایت کے سلسلے میں اختر شجاعت کی تحریر

سخاوت نامور اسکالر و علمائے دین کی مستند کتابوں سے لی گئی تحقیق کا نچوڑ

پاکیزہ کے محمان میں ملاقات کیجیے

ماضی و حال کے نامور اداکار فہمید احمد خان و

بیگم فہمید احمد

اسما قادری، ناہید فاطمہ حسنین، نفیسہ سعید کے مشاق قلم کے کرشمے

(اس کی عیال)

پڑھیے ہماری سینئر اور جونیئر راسٹر کی پُر لطف و دلچسپ تحریریں جن میں ڈاکٹر زاہدہ پروین،

سلمیٰ غزل، نظیر فاطمہ، منعم ملک و دیگر شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوق کی نذر

ظہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”تم ان کے ذیل ڈول اور صورتِ شعل کی معصومیت تو دیکھ رہے ہو لیکن ان کی چوچ کی خطرناکی تمہاری نظر سے پوشیدہ ہے۔ یہ بد معاش اپنے شکار کرنے کے لیے ایک دم ظالم اور سفاک بن جاتے ہیں جیسا کہ چنگیز خان کے معاملے میں تم بن گئے تھے۔ یہ اپنی چوچ کی مدد سے قابو آئے ہوئے شکار کو ادھیڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ سیگل، اسکو اور بعض سلی تو ان کو دیکھ کر ہی گھبرا جاتے ہیں اور گوشت ان کی پسندیدہ خوراک ہے۔“

”اگر یہ چینگون اتنے ہی باصلاحیت ہیں تو میں ان کے ٹیلنٹ کو ضرور آزمائوں گا۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اور بہت جلد..... انشا اللہ!“

”اگر تم نے چینگون کا تماشا دیکھ لیا ہو تو واپس ہٹ میں چلتے ہیں۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”اتنا تو چلے گا۔ ضرور کیوں نہیں۔“ میں نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر ہم دونوں چہل قدمی کرتے ہوئے ہٹ میں آ گئے۔

انسان کا جسم کسی گھڑی کے مانند ہے۔ جس طرح کسی گھڑی میں وقت سیٹ کیا جاتا ہے بالکل ویسے ہی انسان کا بدن بھی اپنے ماحول میں سیٹ ہو جاتا ہے۔ میرے جسم نے بھی ان دنوں میں انٹارکٹیکا کی سردی کو کافی حد تک برداشت کرنا سیکھ لیا تھا۔ پہلے روز مجھے یہاں جس قدر سردی محسوس ہوئی تھی، اب ویسی کیفیت نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ میں اس کا عادی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

اتھائیس جولائی کی صبح میں نے کایا سے کہا۔ ”آج ناشتے میں کچھ میٹھا ضرور بنانا۔ آج کا دن میرے لیے بہت اچھا ہے۔“

”خیریت!“ اس نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔ ”آج میرا تو تھوڑے نہیں ہے۔ کیا تمہارا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”آج ایک بہت ہی خاص الحاح تھاوار ہے۔“

وہ پوچھے بناندرہ کی۔ ”کیسا تھاوار؟“

”جس طرح تم لوگ ایسٹرو چھوٹی عید اور کرسمس کو بڑی عید کے طور پر مناتے ہو ایسے ہی ہمارے ہاں میں چھوٹی اور بڑی عید ہوتی ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”چھوٹی عید یعنی عید الفطر کو ہم میٹھی عید اور بڑی عید یعنی عید الاضحیٰ کو ہم تمکین عید یا عید قرباں کہتے ہیں۔ آج عید الفطر ہے۔“

ستائیس جولائی کی صبح ہمارے ماحول میں تھوڑی تہدیلی دیکھنے کو ملی۔ ہم سوکر اٹھے تو ہٹ کے قرب و جوار میں بے شمار آوازیں سنائی دیں۔ میں نے سوالیہ نظر سے کایا کی طرف دیکھا۔ وہ میری آنکھوں میں موجود سوال کو پڑھ کر اس کے جواب میں بولی۔

”چینگون ہیں۔“

”چینگون!.....“ میں نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا۔ ”لیکن میں نے اتنے دنوں میں اس ہٹ کے آس پاس تو ایک چینگون بھی نہیں دیکھا۔“

”میں اس کی وجہ سمجھ سکتی ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”آؤ، باہر چل کر دیکھتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، چلو۔“ میں نے کایا کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے وہ وجوہ بتا دو جس کا ابھی تم نے ذکر کیا ہے؟“

”دو روز پہلے اس خطے میں گڑگڑاہٹ اور دھماکوں کی جوا آوازیں سنیں تھیں انہوں نے ماحول کے درجہ حرارت کو کافی حد تک بڑھا دیا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

”جس کے سبب کئی ایک مقامات سے برف کی اچھی خاصی مقدار پھیل گئی تھی۔ یہ کوئی زیر برف انہی تجربہ تھا یا فضا میں اچانک شامل ہو جانے والی تانکاری، اس سے بحث نہیں لیکن میں سمجھتی ہوں، تہدیلی کے اسی عمل میں یہاں آس پاس کی برقی زمین میں کسی جگہ کوئی ایسی دراڑ پڑ گئی ہے کہ اس کے نیچے کا پانی کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ چینگون عموماً ان برقی مقامات پر قیام کرنا پسند کرتے ہیں جہاں سے انہیں یہ آسانی پانی کے اندر چھلانگ لگانے کا موقع مل سکے۔ ان کی خوراک کا زیادہ تر حصہ مختلف آبی جانور ہیں۔“

ہم نے ہٹ سے باہر نکل کر قرب و جوار میں نگاہ دوڑائی تو کایا کی بات بالکل درست ثابت ہوئی۔ سوگز کی دوری پر مجھے نصف درجن چینگون کھیل کود میں مصروف دکھائی دیے۔ میں نے چینگون کو پانی کے اندر پرواز کرتے ہوئے اپنی باطنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اب میں اپنی ظاہری آنکھوں سے انہیں برف پر تیرتے ہوئے بھی دیکھ رہا تھا۔ انتہائی چھوٹی ناگوں اور انتہائی موٹے پیٹ کے ساتھ چینگون کے جسم کی ہر حرکت دلچسپی کی حامل تھی، خاص طور پر ان کا پانی کے اندر غوطہ کھانا تو مسرور نگاہوں کا مظہر تھا۔

”دیکھو تو، کتنے معصوم جانور ہیں۔“ میں نے کایا سے کہا۔

ممکن نہیں تھا۔ آٹھ، نو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے محو پرواز کوئی یونٹنگ یکا ایک یونٹ نہیں لے سکتا تھا۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ کسی بھی سبب ایسا ہو گیا تھا تو پھر اگلے ہی لمحے طیارے کو کریش ہو جانا چاہیے تھا۔ اس رفتار پر کسی طیارے کا اون ایئر ڈگری پر گھوم جانا، ایک لمحے میں اسے اکھنٹ نکلوں میں تقسیم کر دیتا ہے لیکن فلائٹ MH370 کسی پراسرار غیر مرئی قوت کے زیر اثر واپسی کی سمت میں گامزن تھی اور اس کے اندر موجود دو سو انتالیس انسان بھی محفوظ تھے۔

اصولی طور پر اس واپسی کے نتیجے میں طیارے کو کوالا لپور کے ان پورٹ پر لینڈ کر لینا چاہیے تھا لیکن اب تک ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں، یہ یونٹنگ 777 کس انجانی منزل کی سمت رواں دواں تھا۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد خطرناک کیٹا بلیک ونڈز (Katabatic winds) میں پھنسنے کے بعد طیارے کی رفتار میں نمایاں کمی واقع ہو گئی تھی۔ مسافروں نے ایک بار پھر چیخا چلانا شروع کر دیا تھا۔

کسی کی آہ و بکا اور دافریا کا طیارے کے ”موڈ“ پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ انتہائی جنوب میں پرواز کرتے ہوئے بہت تیزی سے نیچے آیا۔ یہ منظر اور صورت حال بہت ہی ہولناک اور روئے تھکے کر دینے والی تھی۔ یونٹنگ 777 کی پرواز MH370 ایک زوردار دھماکے کے ساتھ برف کے ایک عظیم الجثہ پہاڑ سے ٹکرائی پھر وہ طیارہ سر کے بل برف کے اندر اس طرح اترتا چلا گیا جیسے مچھن کے اندر چھری اترتی ہے۔۔۔۔۔ میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔

میں اس وقت ہٹ کے اندر بیڈروم میں تھا۔ کیا سکڑی سٹی اپنا منہ میری پسلیوں میں گھسائے دھجے سروں میں خراٹے لے رہی تھی۔ جس طرح میں رفتہ رفتہ راس آئی لینڈ کے شدید موسم کا عادی ہوتا جا رہا تھا بالکل ویسے ہی دھیرے دھیرے میری سماعت نے بھی کیا کیا خراتوں کے ساتھ کپڑا مڑا کر لیا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا، آتیس جولائی کی صبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ میں بستر چھوڑ کر بچن میں آ گیا۔

ان لمحات میں میرا ذہن مسلسل فلائٹ MH370 کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا۔ میں کافی تیار کرتے ہوئے اپنے خواب کے تجزیے میں مصروف ہو گیا۔ میں علم نفسیات کا طالب علم ہوں اس لیے انسانی فطرت، اس کی نفسیات اور خوابوں کا بھی مجھے وسیع علم حاصل ہے۔ انسان کو حالت نیند

بھی تلاش کر لیتا ہے۔

اس رات میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ میں کوالا لپور سے بیٹنگ جانے کے لیے ملائیشین انٹرنلزنز کے یونٹنگ طیارے 777 پر سوار ہوتا ہوں۔ ملائیشین انٹرنلزنز کی اس فلائٹ MH370 پر میرے علاوہ دو سو چھیپیس مسافر اور بھی سوار ہیں یعنی MH370 پر مسافروں کی کل تعداد دو سو انتالیس ہے۔ جہاز کے عملے کے بارہ افراد کو بھی اگر شامل کر لیا جائے تو یونٹنگ 777 پر انسانوں کی تعداد دو سو انتالیس ہو جاتی ہے۔ طیارہ اپنے مقررہ وقت پر فضا میں بلند ہو کر ناک کی سیدھ میں کوالا لپور سے بیٹنگ کی سمت بڑھنے لگتا ہے۔ کچھ ہی دیر کے بعد طیارے کا کنٹرول ٹاور سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ پائلٹ بھی بے اختیار ہو جاتا ہے۔ پائلٹ سمیت طیارے کے پورے عملے کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، MH370 کسی پراسرار نہیں قوت کے زیر اثر نا معلوم منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ ان نازک لمحات میں، میرے ذہن میں پٹ پٹ کے گانے ”گیٹ اٹ اسٹارٹ“ کی یہ لائنز روشن ہو جاتی ہیں۔ ”نوبلی، نو فریزر بٹ فار ناؤ اس آف نو ملائیشیا۔ نو پاسپورٹس، تھری ٹینڈر نو کنٹرولز ون ڈے۔۔۔۔۔“

پٹ پٹ نے دو سال پہلے اس گانے کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ ایک دن دو افراد آسٹریا اور اٹلی سے چرائے گئے دو پاسپورٹس کو استعمال کر کے ملائیشین انٹرنلزنز کے طیارے پر سوار ہوں گے۔ ان کے لیے یہ ایک پسندیدہ عمل ہوگا جو دو ملکوں ملائیشیا اور ویتنام کے تین معروف شہروں کے بیچ کھلیا جائے گا جس کے نتیجے میں فلائٹ MH370 بھی، کہیں بھی لینڈ نہیں کر سکے گی۔

گانے کے بول اور موجودہ صورت حال نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔ میری طرح دوسرے مسافر بھی خوف زدہ اور ہراساں تھے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کافی دیر تک اسی غیر یقینی کیفیت میں گرفتار رہنے کے بعد طیارے کو ایک زوردار جھکا لگا اور یوں محسوس ہوا، وہ ایک سو اتنی ڈگری پر گھوم گیا ہے۔ یہ جھکا اتنا خوف ناک اور دل دہلا دینے والا تھا کہ مسافروں کی چیخیں نکل نکلیں۔

ون ایئر ڈگری پر طیارے کے گھومنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ واپسی کے سفر کے رخ پر آ گیا تھا۔ پھر اس کی رفتار میں حیرت انگیز اضافہ بھی ہو گیا۔ نتیجی اعتبار سے ایسا ہونا

قریب ہو۔

”میں ہمیشہ اسی طرح تمہارے قریب رہوں گی۔“ وہ محبت پاش نگاہ سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔“

”میں نے سوچا تھا، یہ عید اپنی ماں کے ساتھ امریکا میں مناؤں گا۔“ میں نے بھول آواز میں کہا۔ ”لیکن مالک کو کچھ اور ہی منظور تھا۔۔۔۔۔“

”ہمیں ہر حال میں مالک کے فیصلوں کو قبول کرنا چاہیے۔“ وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”اسی میں ہماری بھلائی چھپی ہوتی ہے۔“

”بے شک!“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔

”تم فریش ہو جاؤ۔“ وہ اپنا ہاتھ بھرے لہجے میں بولی۔ ”میں عید کی صبح کے ناشے کا اہتمام کرتی ہوں۔ پھر ہم دونوں مل کر پورا دن یہ عید کا دن سلیمبرینٹ کریں گے۔“

سچ تو یہ ہے کہ اس دن ماں مجھے بے طرح یاد آ رہی تھیں۔ میں برسوں ان کی جدائی میں تڑپا تھا لیکن ہمارا ملن بہت مختصر اور نا پائیدار ثابت ہوا تھا۔ اس سیرانی نے میری

نفسی کو اور بڑھا دیا تھا خاص طور پر ان کی جدائی کا منظر میرے لیے جگر پاش اور دلدوز تھا۔ انہوں نے میرے ہاتھوں میں جان دی تھی اور میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ وقت بعض اوقات انسان کو اتنا بے بس اور

لاچار کر دیتا ہے کہ وہ اپنی ناک پر بیٹھی ہوئی کوبھی اڑانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اسی چیز کا نام تقدیر ہے جس کے سامنے انسان کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

وقت کے ہاتھوں میں انسان ایک کھلونے کا مانند ہے۔ اس نے غم کے پہلو میں رات کو بٹھا رکھا ہے اور خوشی کے تعاقب میں غم کو لگا رکھا ہے۔ پاگل سورج، چاند کی دھونڈ میں نظر آتا ہے اور سوریا، شام کو کھٹا پھرتا ہے۔

کا یا پورا دن میری دلجوئی اور دلداری میں لگی رہی۔ اس کی ایک ایک اداسے خلوص اور اپنائیت جھلکتی تھی۔ وہ اپنی محبت میں اس طرح ٹوٹ کر مجھ پر برسی کہ میں نہال ہو کر رہ گیا۔

عورت اور مرد کی چاہت میں سب سے نمایاں فرق یہی ہے کہ عورت کسی ایک مرد کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنا کر مطمئن ہو جاتی ہے جبکہ مرد کو ہر عورت اپنی اپنی لگتی ہے اور محوئی کی کوشش کر کے وہ اس عورت کے اندر جتنی محبت کو

”اوہ۔۔۔۔۔ گریٹ!“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”تو آج تمہاری صفی عید ہے۔“

”ہاں!“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”ہم اس وقت دنیا کے جس خطے پر قیام پذیر ہیں اس کا مقامی وقت جی ایم پی سے بارہ گھنٹے آگے ہے یعنی اس وقت انگلینڈ میں

ستاہیں جولائی کی شام ہے اور پاکستان میں ابھی اٹھائیس جولائی کا آغاز ہوا ہے یعنی وہاں ابھی رات کے ڈیڑھ، دو بجے کا وقت ہوگا مگر اس آئی لینڈ پر عید الفطر کی صبح ہو چکی ہے۔“

”ٹھیک ہے علی! میں اس ہٹ میں تمہارے لیے کوئی لذیذ کیک تو تیار نہیں کر سکتی لیکن ایک سویٹ ڈش ضرور بنا دوں گی۔ اپنی ماؤ۔۔۔۔۔ پتی عید ڈے!“

کایا نے مجھے دس کیا تو بہت اچھا لگا۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”غیر مبارک اینڈ تھینک یو سوچ۔“

وہ چند لمحات تک پُرسوج انداز میں مجھے دیکھتی رہی پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”علی! عید چھوٹی ہو یا بڑی یا کوئی بھی خوشی کا تہوار ہوا سے منانے کا مزہ تو انہوں کے سچ ہی آتا ہے نا۔۔۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

کایا کے اس سادہ سے سوال نے میرے دھیان کو پینا اور شارو کی طرف پھیر دیا تھا لیکن میں نے حاضر دماغی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”کایا! میں تمہارے خیال سے اتفاق کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میں اس وقت کسی اپنے کے ساتھ ہی ہوں۔ کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا؟“

وہ میرے جوابی سوال سے گڑبڑا گئی، جلدی سے بولی۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے قریبی رشتے داروں کے حوالے سے بات کی تھی۔“

”میرے والدین اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ میں انکو تا ہوں۔ میرا نہ تو کوئی بھائی ہے اور نہ ہی بہن۔۔۔۔۔“

میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”والدین کے بعد میں جسے اپنا سمجھتا تھا وہ اگلے علی سلطان تھے جنہوں نے انیس سال تک میری پرورش اور تعلیم و تربیت کی۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، یہ اگلے سلطان کی پُر خلوص محنت کا ثمر ہے لیکن انہوں نے چند روز پہلے وہ بھی مجھے داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ باقی

جہاں تک دوست احباب کا معاملہ ہے تو میرا ایک سچا دوست عظیم کپور کرانچی، پاکستان میں ہے۔ پتا کو سو ساٹھ والوں نے سیلبرن، آسٹریلیا میں رکھا ہوا ہے، شارو کو بویا،

جڑی، میرا لہذا اس وقت میری واحد دوست تم ہو جو میرے

انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں ان کے تحائف سے متاثر ہونے والا نہیں ہوں۔ یہ چاہیں جتنی بھی کوشش کر لیں، میں ان کے قابو میں نہیں آنے والا۔"

"جیہووا تمہیں ثابت قدم رکھے۔" وہ بھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "دیئے اگر تم ان کے قابو میں آگئے یعنی تم نے اپنی رضامندی سے سوسائٹی جو ان کے قابو میں کر لیا تو یہ سب سے پہلے تمہیں یروشلم لے جائیں گے۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور یہ اپنے پراسرار علوم کے ذریعے تمہاری برین واشنگ کر دیں گے پھر تم انہی کے رنگ میں ڈھل جاؤ گے اور جب تک تم ان کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو جاتے، یہ تمہارے ساتھ زور زبردستی نہیں کریں گے اور اسی طرح چوہ بلی کا میل جاری رکھیں گے۔"

"اس بات کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔" میں نے پُرسوج انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں پریسٹن ہالو والے ہنگے پر ڈیٹلیفیکا کی معیت میں جتنا بھی وقت گزار چکا ہوں اس نے مجھے بہت کچھ سکھا اور سکھا دیا ہے۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا، ابھی تک ہمارے درمیان نام ایڈجیری والا روئین ہی چل رہا ہے۔"

"علی! تمہارا روئین بڑا خطرناک ہوتا ہے۔!"

وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تو یہ بات تم جا کر ڈیٹلیفیکا کو بتاؤ۔" میں نے بھی ذمہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اس روئین کی شروعات اسی نے کی تھی۔"

"میری اتنی حیثیت نہیں ہے کہ میں میڈم ڈیٹلیفیکا سے کچھ کہنے کی جرات کا مظاہرہ کر سکوں۔" وہ ایک غصہ ناک سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "میں تو ابھی ابتدائی مراحل میں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ کبھی! وہ جلدی سے صحیح کرتے ہوئے بولی۔ "اور میڈم کی ڈگری تو بہت اونچی ہے۔"

"میں نے سنا ہے، اس سوسائٹی کے ممبران میں تینتیس ڈگری کو سب سے ہائی سمجھا جاتا ہے۔" میں نے اپنی معلومات سے کا یا کو آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے اور ڈیٹلیفیکا کے پاس کون سی ڈگری ہے؟"

"میڈم ڈیٹلیفیکا کے بارے میں تو میں کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکتی۔" وہ بے بسی سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"ہاں، یہ درست ہے کہ تینتیس ڈگری کو بہت ہی اہم سمجھا جاتا ہے۔ تھرٹی تھری ڈگری کا مطلب ہے، شرف یافتہ۔ اس درجے کی ڈگری عموماً سربراہان مملکت کے

بہت جونیئر ہوں۔ ممکن ہے، میں ابھی اس درجے پر نہ ہوں جو ایسی خفیہ میٹنگ کے لیے ناگزیر ہے۔ اگر تم یوریت محسوس نہیں کر رہے تو میں تمہیں خودی تفصیل بتاتی ہوں۔"

"ضرور!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ہمدن گوش ہوں۔ تم بولی جاؤ۔"

"ابتدائی ٹریٹنگ میل اور فی میل کی ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔" وہ شروع ہو گئی۔ "یہ سوسائٹی ایک قدیم ترین سوسائٹی ہے۔ ابتدا میں اس کا نام 'برادر ہڈ آف ڈیٹھ' تھا پھر یہ صرف 'برادر ہڈ' رہ گئی۔ اس کا ممبر بننے کے لیے ضروری ہے کہ کسی ممبر نے آپ کی سفارش کی ہو۔ بعض اوقات تو ایک سے زیادہ ممبرز کی سفارشات کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور۔۔۔۔۔"

"ایک منٹ!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو اس سوسائٹی کا ممبر نہیں بننا چاہتا اور نہ ہی کسی ممبر نے میری سفارش کی ہے پھر یہ لوگ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں؟"

"اس موضوع کے حوالے سے دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔" وہ بڑی رसान سے جواب دیتے ہوئے بولی۔ "ایک وہ جو اپنی خواہش سے سوسائٹی جو ان کرنا چاہتے ہوں۔ ایسے افراد کے لیے بنیادی شرائط میں چند چیزیں شامل ہیں مثلاً ممبر شپ کا خواہش مند شخص بیدار مغز اور زندگی کے۔۔۔ کسی شے کا ماہر ہونا چاہیے۔ اس کی عمر کم از کم اٹھارہ سال ہونا چاہیے اور وہ دنیا کے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو یعنی وہ ایک خدا کو ماننے والا ہو۔ ان خصوصیات کے ساتھ اگر اس کے پاس سوسائٹی کے کسی ممبر کی سفارش بھی ہو تو اسے ممبر شپ مل جاتی ہے اور دوسری قسم کے لوگ تمہارے جیسے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ لٹائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

"ایسے افراد، سوسائٹی جن کو ممبر بنانے کی خواہش مند ہوتی ہے۔ جن کے اندر سوسائٹی کو کوئی انوکھی اور منفرد خفیہ صلاحیت نظر آ جاتی ہے۔ وہ اس کا دل جیتنے اور اسے اپنا بنانے کے لیے جن کرتے رہتے ہیں جیسا کہ انہوں نے تمہیں چیکیز خان کا حنفہ دیا تاکہ تم اپنے اندر روشن انتقام کی آگ کو غصہ کر سکو۔ تم اگر اپنے طور پر ساری زندگی بھی کوشش کرتے رہتے تو اپنے اس دشمن جبرون تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔"

"یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے تائیدی

افسانوی یا پروپیگنڈا لگی تھیں پھر ان لوگوں سے میرا ڈائریکٹ واسطہ پڑ گیا تھا۔ تب مجھے پتا چلا تھا کہ اس سوسائٹی کے ممبرز کتنے با اختیار ہیں اور اب کا یا کی زبانی تو تحیر آمیز اور ناقابل یقین باتیں پتا چل رہی تھیں۔ میں نے صدیقی دل سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی بھی قیمت پر ان کے برابر ہڈ کا حصہ نہیں بنوں گا۔

شام ہوئی تو میں نے کا یا سے پوچھا۔ "کہاں تم ہو؟"

"میں تو یہیں پر ہوں، تمہارے پاس!"

"وہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔" میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔ "لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ تمہارا دماغ کہیں اور ہے۔۔۔۔۔"

"بس، میں عجیب سی بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔" وہ الجھن زدہ انداز میں بولی۔ "ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔"

"ہاں، وہ تو ہے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "بس، ایک رات کی بات ہے۔ جو بھی ہوتا ہے، پھر ہو ہی جائے گا اور۔۔۔۔۔ اس ہونے سے تمہارا من ہلکا اور تن شانت ہو جائے گا۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ ضرور!" وہ بوجھل آواز میں بولی۔ "واقعی، میں اپنے اعصاب پر بہت دباؤ محسوس کر رہی ہوں۔"

"ایک بات سچ سچ بتاؤ گی؟"

"تم سے جھوٹ کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو۔"

"تم نے وہ خاص الخاص میٹنگ کتنی مرتبہ اینٹیل کی ہے جس میں ریڈوائن کے اندر انسانی خون کو ملا کر سرو کیا جاتا ہے؟"

"ایک بار بھی نہیں۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ "اس کا کوئی خاص سبب۔۔۔۔۔ کیا تم ابھی اس مقام پر نہیں پہنچی ہو جس کے بعد اس میٹنگ میں مدعو کیا جاتا ہے؟"

"پہلی بات تو یہ کہ سوسائٹی والے فیملیئر ممبرز کو اسپورٹس، میڈیکل اور شو بز کے مختلف شعبوں میں مصروف رکھتے ہیں خصوصاً میوزک انڈسٹری میں اور۔۔۔۔۔ اس میٹنگ میں عموماً مرد ہی شرکت کرتے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "اور دوسری بات یہ کہ میں سوسائٹی میں ابھی

میں دکھائی دینے والے اکثر خواب اس کی روزمرہ زندگی کے عکاس ہوتے ہیں۔ صرف ایک فیصد سے تین فیصد تک کے خوابوں کو سچا خواب کہا جاسکتا ہے اور ایسے خواب عموماً سچے لوگ ہی دیکھتے ہیں۔ قدرت خواب کی صورت انہیں مختلف معاملات کی بشارت دیتی ہے اور ایسے معاملات کا تعلق زیادہ تر مستقبل قریب کے دور سے ہوتا ہے۔

جس رات ہم نے دھماکوں اور خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز سنی تھی اس سے اگلی صبح میں نے ہٹ کے باہر دیو پیکل گلیٹیر کی چوٹی پر کسی طیارے کی دم سے مشابہہ کوئی شے دیکھی تھی۔ کا یا نے اسے میرا وہم اور نظر کا دھوکا قرار دیا تھا، پھر اسی روز دوپہر میں وحشی جنگلیوں نے مجھے اٹھا کر کسی جہاز کی طرف لے جانے کی کوشش کی مگر اور کا یا کی فائرنگ نے ان کی کوشش کو نام نہاد بنا دیا تھا۔ دور و زل جب کا یا پٹ مل کا گمان "گیٹ اٹ اسٹارٹ" سن رہی تھی تب جی ہمارے سچ ملائشین انٹر لائنز کے طیارے کی پراسرار گمشدگی اور پٹ مل کی پیش گوئیوں پر تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ساری باتیں میرے ذہن کے کسی گوشے میں جمع ہو کر خواب کی صورت مجھے ایک کہانی کی شکل میں نظر آئیں۔

باقی جہاں تک پٹ مل کی پیش گوئیوں کا معاملہ ہے تو اس نے دو سال پہلے مذکورہ گمانے میں ٹائم اسکوائر، ٹام کرو، علی، فریڈریک، ملائشین انٹر لائنز، ٹوپا سپورٹس، تھری سٹیز، نوکسٹریز کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ پورا ہوا تھا۔

جب کوئی معاملہ پراسرار انداز میں معما بن جائے تو انسانی ذہن فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر شعوری یا لاشعوری طور پر اس کے اسباب و ضوابط کی کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ کوشش لاشعوری ہو تو اس کا عکس خواب میں دکھائی دیتا ہے۔ میرا یہ خواب بھی کسی ایسی ہی لاشعوری سعی کا نتیجہ تھا۔

☆ ☆ ☆

کا یا بہت اداس اور کھوٹی کھوٹی سی تھی۔ آج اس کا کسی چیز میں من نہیں لگ رہا تھا۔ میں بھی سمجھ رہا تھا کہ اسے رائن (ryan) یاد آ رہا ہے۔ بہنوں کے لیے بھائی کی بڑی اہمیت ہوتی ہے بلکہ بھائی تو بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔ پھر جس انداز میں رائن کی موت واقع ہوئی تھی وہ روٹنے کھڑا کر دینے والا سماں تھا۔ سیکرٹ سوسائٹی کے انٹرنل سسٹم کی زندگی نے میری طبیعت کمد کر دی تھی۔ انکل علی سلطان نے مجھے ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور میں نے خود بھی اسٹڈی کیا تھا لیکن ان میں زیادہ تر باتیں مجھے

کر دی۔

”تم نہ بھی پوچھو تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گی۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ”میں نے اپنے انجام کی پروا کیے بغیر دل و جان سے سوسائٹی چھوڑ دی ہے اور یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔ جب میں کرائسٹ چرچ کی زمین پر قدم رکھوں گی تو علم بھی سوسائٹی چھوڑ چکی ہوں گی۔ تم میرا ساتھ دو گے نا؟“

”بے شک دوں گا۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”میرے ذہن میں ایک پلان ہے۔“ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولی۔ ”کرائسٹ چرچ اتر پورٹ سے ہم الگ الگ ”نیو برائنٹن“ بنائیں گے۔ نیو برائنٹن، ساؤتھ آئی لینڈ کا ایک خوب صورت ساحلی علاقہ ہے۔“

”ساؤتھ آئی لینڈ؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ میری الجھن کا سبب سمجھتے ہوئے بولی۔ ”نیوزی لینڈ دراصل دو آئی لینڈز پر مشتمل ہے۔ تازہ آئی لینڈ اور ساؤتھ آئی لینڈ۔ کیا کبھی تمہیں نیوزی لینڈ جانے کا اتفاق ہوا ہے؟“

”چند سال پہلے میں نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کا وزٹ کیا تھا۔“ میں نے بتایا۔ ”لیکن نیوزی لینڈ میں صرف آک لینڈ اور ویلنگٹن تک محدود رہا تھا اور تمہارے بتائے ہوئے ساؤتھ آئی لینڈ کی طرف جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

”تم تو یو ایس سینٹرن ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”کیا تمہارا پاسپورٹ بھی ساتھ ہے؟“

ابتدا میں کا یا کو میں نے یہی بتایا تھا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے اور یہی حقیقت بھی ہے۔ الحمد للہ! مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر بہت فخر ہے۔ میری پیدائش کراچی کی ہے لیکن ایک سال کی عمر سے اب تک میرے ساتھ مختلف حالات پیش آتے رہے ہیں۔ جب کا یا کے ساتھ میری بے تکلفی بڑھی اور اس نے بتایا کہ وہ سوسائٹی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی ہے تو پھر میں نے اسے اپنے بارے میں تفصیلاً بتا دیا تھا۔ اس کے موجودہ سوال کے جواب میں، میں نے اسے جینا کی کارگزاری سے آگاہ کیا پھر کہا۔

”اب میرے پاس صرف میں ہی ہوں۔“

نو پاسپورٹ، نو ویزا اینڈ نو ٹکٹ۔

”اب تمہارے پاس میں بھی ہوں۔“ وہ سرزنش بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور اس جیتی جاگتی حقیقت کو کبھی بھولنا نہیں ورنہ تمہاری یادداشت واپس لانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“ مجھ گئے نا؟“

میں نے پوچھا۔ ”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

”میں تین ڈگری تک کی ٹرینگ مکمل کر چکی تھی۔ بس، ایک امتحان دینا باقی تھا جس کے بعد میں تھرڈ ڈگری ہولڈر بن جاتی لیکن میں اس امتحان میں ٹیل ہو گئی۔“

لحائی توقف کے بعد اس نے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”میں تیسری ڈگری حاصل نہ کر سکی جو کہ ”یونیورسز ماسٹر ڈگری“ کہلاتی ہے۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ میں نے تاسف بھری نظر سے کا یا کی طرف دیکھا پھر گہری ہمدردی کے ساتھ پوچھا۔ ”کیا یہ امتحان بہت مشکل تھا؟“

”مشکل نہیں، کڑا تھا۔“ وہ میری آنکھوں میں بہت دور تک دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اتنا کڑا کہ میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔“

”ویری سید۔۔۔ میں یہی سمجھا کہ اس کے امتحان کا رائن سے کوئی تعلق تھا۔“ تمہاری ناکامی کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔

”اور اس ناکامی کے ذمے دار تم ہو۔“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مگر میں اپنی ناکامی پر بہت خوش ہوں۔“

”کا یا! پلیز، پہیلیاں نہیں بھجواؤ۔“ میں نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، آخر تم کہنا کیا چاہ رہی ہو؟“

”میرا ٹیسٹ یہ تھا کہ میں اس آئی لینڈ کے اس ہٹ پر تمہارے ساتھ چند دن گزاروں اور تمہارا بہت زیادہ خیال رکھوں اور وہ بھی اس طرح کہ تمہیں میری کسی بات، کسی حرکت پر کوئی شک نہ ہو۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”مگر تم قدم قدم پر میری چالوں کو ایکسپوز کرتے چلے گئے اور بالآخر میرے دل کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا۔ اب میں سوسائٹی کی غدار ہوں، ان کی نظر میں، میں تھرڈ ڈگری کی نہیں، موت کی حق دار ہوں۔“

”اب ساری بات میری سمجھ میں آگئی ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں میرا کیئر ٹیکر اور مجھ پر نگران مقرر کیا گیا تھا لیکن میں نے ایک بار بھی تمہیں کسی کو رپورٹ کرتے نہیں دیکھا۔۔۔۔۔“

”مجھے کرائسٹ چرچ پہنچنے کے بعد اپنے متعلقہ سینئر ممبر کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ گرانٹھی لیکن میں ایسا نہیں کروں گی۔“ اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ”میں نہیں پوچھوں گا کہ تم ایسا کیوں نہیں

پاس ہوتی ہے اور وہ بھی ایسے طاقتور ممالک کے سربراہ جن میں سوسائٹی کی اپنی دلچسپی ہوتی ہے اور جہاں تک میری ڈگری کا معاملہ ہے تو تم جانتے ہو، میں سوسائٹی سے بغاوت کر چکی ہوں۔ اب میرے پاس نہ تو کوئی ڈگری ہے اور نہ ہی میرا سوسائٹی سے کسی قسم کا کوئی تعلق رہتا ہے۔“

”جب تم نے بغاوت نہیں کی تھی۔۔۔۔۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کرید کا مکمل جاری رکھا۔ ”اس وقت تم کسی ڈگری پر فائز تھیں؟“

”دوسری اور تیسری ڈگری کے بیچ تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”پہلی ڈگری کو اپرٹن شپ کی ڈگری سمجھو۔ اس دوران میں ممبرز کو سوسائٹی کے تمام قواعد و ضوابط بتائے جاتے ہیں اور اپنے علم و ہنر کو استعمال کرنے کے پراسرار طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ دوسری ڈگری ”فیو کرائف“ کہلاتی ہے۔ یہ انٹرمیڈیٹ ٹائپ کی ڈگری ہے جس میں ممبرز کی برین گرومنگ کی جاتی ہے اور انہیں ایسے علوم کے بارے میں تخاری معلومات فراہم کی جاتی ہیں جن کے حصول کے بعد انسان، دوسرے انسانوں پر حکمرانی کا ہنر جان جاتا ہے۔ ممبرز کو بتایا جاتا ہے کہ اگر انہوں نے تیسری ڈگری کا امتحان پاس کر لیا تو پھر انہیں یہ علوم سکھائے بھی جائیں گے۔ اصل میں ابتدائی ڈگریوں میں تیسری ڈگری بہت اہمیت کی حامل ہوتی، جس طرح دوسری تعلیم میں میٹرک یا او۔ لیول کی کلیدی حیثیت ہے کیونکہ تیسری ڈگری حاصل کرنے کے بعد ممبر سوسائٹی کی خفیہ مینٹلز میں شرکت کا اہل ہو جاتا ہے یعنی سوسائٹی اس پر بھروسہ کرنے لگتی ہے۔ رائن پانچویں ڈگری پر تھا لیکن جیسے ہی اس کی وفاداری پر سوسائٹی کو شک ہوا، انہوں نے اسے سزا دے دی۔ سزا دینے کے معاملات میں یہ لوگ دنیا کے طاقتور صدور کو بھی نہیں چھوڑتے۔ ان کے نزدیک جھوٹ، دھوکا اور بے وفائی، ناقابلِ تلائی اور ناقابلِ معافی جرائم ہیں۔۔۔۔۔“ تھوڑی دیر کو رک کر اس نے ایک بوہل سانس خارج کج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

”سوسائٹی میں ممبر شپ کا عمل ہر سال موسم بہار میں شروع کیا جاتا ہے۔ سوسائٹی ممبرز کی آپس میں مینٹلز ہفتے میں دو بار جمعرات اور اتوار کو لازمی ہوتی ہیں۔ ممبرز، دوسرے انجینی ممبرز کو پہچاننے کے لیے ہاتھ کے مختلف اشاروں سے مدد لیتے ہیں۔ سوسائٹی کی خفیہ مینٹلز میں جو کچھ بھی ہوتا ہے اسے راز رکھا جاتا ہے۔“

”تم دوسری اور تیسری ڈگری کے بیچ میں تھیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانے پر انکشاف کیا۔

”ویسے ایک بات ماننا پڑے گی کہ جیتا تمہیں بڑی شدت سے چاہتی ہے۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔ ”نیوزی لینڈ کی طرح امریکا کا بھی ”ای۔ پاسپورٹ“ ہے۔ اس پاسپورٹک الیکٹرونک پاسپورٹ کے اندر جو چپ لگی ہوتی ہے اس کے ذریعے پاسپورٹ ہولڈر کو بے آسانی ٹریک کیا جاسکتا ہے۔ جینا نے تمہیں میڈم ڈیٹینا سے محفوظ رکھنے کے لیے تمہارے پاسپورٹ کے ساتھ جو کچھ بھی کیا وہ جینا کی محبت کا ثبوت ہے لیکن افسوس کہ اس کی ترکیب بے اثر ثابت ہوئی۔ میڈم ڈیٹینا نے تم دونوں کو چھاپ لیا پھر ایک کو آسٹریلیا میں اور دوسرے کو انٹارکٹیکا میں لا بیٹھا۔“

”جینا اور شارو تمہاری طرح میری اچھی دوست ہیں اور میری خاطر وہ اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن افسوس کہ میری یہ دونوں دوست سوسائٹی والوں کی کسٹڈی میں ہیں۔“

”زیادہ افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں علی!“ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولی۔ ”ایک مرتبہ ہم دونوں غائب ہو جائیں پھر ان دونوں کو سوسائٹی کی کسٹڈی سے نکالنے کے لیے ہم سر دھڑکی بازی لگا دیں گے۔“

مجھے کا یا کی حوصلے سے بھری ہوئی جی دارانہ باتیں بہت اچھی لگیں۔ وہ میرے لیے بڑی پرجوش اور پرجزم دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس کی وفاداری اور جاں نثاری پر ذرا سماجی شک نہیں تھا۔ اس کی بات کے جواب میں، میں نے پوچھ لیا۔

”کیا تم جادو وغیرہ بھی جانتی ہو؟“

میرے استفسار میں اس قدر مصومیت بھری ہوئی تھی کہ وہ گڑ بڑا کر رہ گئی اور اضطرابی لہجے میں بولی۔ ”نہیں تو۔۔۔!“

”ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے غائب ہونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو میں سمجھا۔۔۔۔۔“

”میرا مطلب یہ تھا کہ ہم دونوں بہت دور چلے جائیں گے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اسی سلسلے میں، میں تمہیں اپنا پلان بتا رہی تھی۔“

”شیک ہے، بتاؤ۔ میں سن رہا ہوں۔“

”یہ ساری تفصیل میں تمہیں اس لیے ذہن نشین کروا رہی ہوں کہ کرائسٹ چرچ پہنچنے کے بعد میں چند گھنٹوں کے

کیپ میں کایا کا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "تم کایا کو باہر بیچ دو۔"

"کایا سوری ہے۔" میں نے غصہ سے ہونے لہجے میں کہا۔ "تم اندر آ جاؤ۔ میں اسے چکا تا ہوں۔"

ایک لمحہ تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے ہٹ کی سمت قدم بڑھا دیے۔

ہٹ کے دروازے پر پہنچ کر میں نے اسے اندر داخل ہونے کی جگہ دی۔ وہ بے فکری سے آگے بڑھا۔ اب میں اس کی پشت پر تھا۔ میں نے ہٹ کا داخلی دروازہ بند کیا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ جیسے ہی وہ کچن کے کھلے ہوئے دروازے کے سامنے پہنچا، میں نے عقب سے اس کی کمر پر ایک طوفانی لگک جڑ دی۔

وہ مجھ سے کسی ایسے ہنگامی اقدام کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ میری لگک کھا کر وہ توپ سے نکلے ہوئے کولے کے مانند فضا میں پرواز کرتے ہوئے کچن کے اسٹوڈ والے سلیب سے ٹکرایا پھر فرش پر جا گرا۔

اس ایک سیکنڈ کی ناقابل فہم صورت حال میں آسکر نے کمال کی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ زمین پر ڈھیر ہونے سے قبل اس نے میکائی انداز میں اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا کہ وہ اپنے لباس میں سے کوئی مہلک ہتھیار نکال کر مجھ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اگر میں اسے ایسا کوئی موقع فراہم کر دیتا تو پھر مجھ سے زیادہ بے وقوف اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

میرے ہاتھ نے بجلی کی سی سرعت سے حرکت کی اور میں نے اس کے درنگ شولڈر کا نشانہ لے کر ٹیگر دبا دیا۔ اپنا کونڈا اسے نکلنے والی گولی سے آسکر کے جیکٹ کے اندر گھسے ہوئے ہاتھ کا فیوز اڑا دیا۔ میکم 44 کے فائر کی رعب دار... آواز کے ساتھ ہی آسکر کی درویش ڈولی ہوئی چیخ بھی بلند ہوئی۔ میری چلائی ہوئی گولی نے اس کے کندھے کو چھید ڈالا تھا۔

میں اس کی جیکٹ کے اندر ہی رہ گئی اور وہ خون آلود زخمی بازو کو جھٹکتے ہوئے تیزی سے میری سمت بڑھا اور غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"بائسڈ!"

آسکر کی چار انچ لمبی زبان سے خارج ہونے والی گالی کا جواب میکم 44 کی چار انچ لمبی نال سے خارج ہونے والی گولیوں نے دیا۔ میں نے اس کے گھٹنوں کا

میں یہ اندازہ لگایا کہ اگر میں بھی مکمل طور پر آسکر کے پہلو سے آ جاؤں تو اس گیت اپ میں میرے اور آسکر کے کچ میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔

"کیا بات ہے مسٹر!" میں نے آسکر کی طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ انداز میں پوچھا۔ "تم کون ہو اور کس کو تلاش کرتے پھر رہے ہو؟"

آسکر نے تھوڑے فاصلے پر وہ آٹو سلیج بھی موجود تھی، تھوڑی دیر پہلے ہٹ کے اندر ہم نے جس کے انجن کی آواز سنی تھی۔ آسکر نے سلیج کا انجن آن ہی رہنے دیا تھا جیسے ڈر ہو کہ اس برف زار کی ٹھنڈی بجلی کو بھی جھکا کر رکھ دے گی۔ میں نے آٹو سلیج (Auto Sledge) کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ "نو پارکنگ" سے گاڑیاں اٹھانے والے ٹریفک پولیس والوں کے کارلنٹر (Car Lifter) سے مشابہ تھی۔ اس کے سامنے والے حصے میں برف کو کٹانے اور ہٹانے والا بیڈ بھی لگا ہوا تھا جو اس وقت اوپر کواٹھا ہوا تھا یعنی فی الحال برف کو کٹانے یا راستے سے ہٹانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ آٹو سلیج برف پر پھسل کر نہیں بلکہ اپنے "پاؤں" پر چل کر ہمارے ہٹ تک پہنچی تھی اور یہ پاؤں حیوی سفاری نائز تھے۔

"میرا نام آسکر ہے۔" آسکر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "میں اپنی ایک ساتھی کایا کی تلاش میں ادھر آیا ہوں۔ ہم ہم جہیں۔ چند روز پہلے کایا برفانی طوفان میں ہم سے بچ کر گئی تھی۔ کیا تم نے اسے نہیں دیکھا ہے؟"

میں آسکر کی جانب بھی متوجہ تھا اور اس کے عقب میں موجود آٹو سلیج کو بھی دیکھ رہا تھا۔ ہم نے اسی برف گاڑی پر سات آٹو سلیج کا فاصلہ طے کر کے اسکاٹ میں تنگ جانا تھا۔ اس چیدہ بیج کو دیکھ کر لگتا تھا کہ آٹو سلیج ہائل سائنس روز افزوں ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

"تم اس لڑکی کی بات تو نہیں کر رہے؟" میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کسی بچے کے قد کا اشارہ کرتے ہوئے آسکر سے پوچھا۔

"ہاں ہاں، وہی۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "اس پست قامت لڑکی کا نام کایا ہے۔"

"وہ اندر ہٹ میں ہے۔" میں نے آسکر کو نوید مسرت سنائی پھر انھیں زدہ نظر سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر اس نے تو بتایا تھا کہ ان کی چار افراد کی ٹیم تھی اور تم تو اکیلے ہی ہو۔"

"ہمارے باقی کے دو ساتھی آئیلا اور اولیور ہیں

ہو۔۔۔۔۔؟"

"تمہاری مدد بہت ضروری ہے۔" اس نے بڑی رसान سے کہا۔ "آسکر کو زیر کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ ابتدائی مرحلے پر تم اسے قابو کر کے میرے حوالے کر دو گے۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم اپنا کام مجھ سے چھپا کر کرنا چاہتی ہو۔۔۔۔۔؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" وہ حتی لہجے میں بولی۔

ادھر کایا کی بات ختم ہوئی، ادھر ہٹ کے باہر کسی موٹر کے انجن کی آواز ابھری۔ میں نے رست داچ پر نگہ دوڑائی۔ اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ یہ مخصوص آواز لمحہ ہٹ کے قریب آ رہی تھی۔

کایا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "گلتا ہے، میرا شکار آ گیا۔۔۔۔۔!"

اگلے ہی لمحے کایا کی بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔ موٹر کے انجن کی وہ آواز ہٹ کے باہر ایک جگہ رک گئی تھی یعنی اب وہ بتدریج سفر میں نہیں تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس نے اپنی سواری کو ایک مقام پر ٹھہرایا تھا۔

"کایا۔۔۔۔۔" فضا میں ایک مردانہ آواز بلند ہوئی۔ "تم کہاں ہو کایا۔ ہم کافی دنوں سے تمہیں تلاش کر رہے ہیں۔ اگر میری آواز تم تک پہنچ رہی ہے تو پلےز جواب دو۔"

"یہ آسکر ہے۔" کایا نے سرسراہٹ سے لہجے میں کہا۔

"تم بیڈروم میں جاؤ۔" میں نے اپنے لباس کے اندر میکم 44 ریوالور پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں تمہیں آواز نہ دوں، تم باہر نہیں آؤ گی۔"

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بیڈروم کی جانب بڑھ گئی۔

میں نے ہٹ سے باہر نکل کر دیکھا۔ سامنے چند گز کے فاصلے پر مجھے اپنی ہی جسامت اور قد و قامت کا ایک شخص کھڑا نظر آیا۔ اس نے مخصوص گرم برفانی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس کے پاؤں میں حیوی شوز تھے اور آنکھوں پر سوئنگنگ گگلز کا پمپ کا چشمہ۔ ہڈی نے اس کے آدھے سے زیادہ چہرے کو چھپا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر بھی گرم دستانے دکھائی دیے تھے۔ میں نے سینڈ کے دسویں حصے

کایا نے امریکا بھادور کے لیے "گرینڈ پا" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ میں نے اس کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے تائیدی انداز میں کہا۔

"ایگری۔۔۔۔۔!"

☆☆☆

تیس جولائی کی صبح میں سوکر اٹھا تو کایا بیڈروم میں موجود نہیں تھی۔ میں یہی سمجھا کہ وہ حوائج ضروریہ کے لیے ہٹ سے باہر گئی ہوگی۔ تھوڑی دیر میں، میں نے بھی بستر چھوڑ دیا اور بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ اگلے ہی لمحے مجھے اسٹور روم کی طرف سے کھڑ پڑکی آوازیں سنائی دیں۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ کایا وہاں کسی کارروائی میں مصروف ہے۔

چنگیز خان کے واصل جنم ہو جانے کے بعد میں نے اسٹور روم کے دروازے پر سے تالا ہٹا دیا تھا۔ میں اسٹور روم میں پہنچا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ کایا وہاں موجود تھی۔ میں نے کھٹکھٹا کر اسے متوجہ کیا پھر پوچھا۔

"صبح صبح کیا ہو رہا ہے۔۔۔۔۔؟"

"تیاری!" اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔ "تم نے اپنے مہمان پیڈروم کی اچھی خاطر متوجہ کی تھی۔ میں بھی اپنے مہمان آسکر کو مایوس نہیں کروں گی۔ سمجھ لو کہ میں اس وقت اس کے ناشتے کے انتظام میں لگی ہوئی ہوں۔"

"گلتا ہے تمہارے اندر کا درندہ بیدار ہو گیا ہے۔"

"کوئی ایسا ویسا بیدار۔۔۔۔۔" وہ سرسراہٹ ہوئی آواز میں بولی۔ "تم جلدی سے فریش ہو جاؤ۔ کارروائی شروع کرنے سے پہلے ہمیں ناشتے سے نمٹنا ہے۔ یہ اس ہٹ پر ہمارا آخری کھانا ہوگا۔"

"اوکے۔۔۔۔۔" میں یہ کہتے ہوئے ہٹ سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں فریش ہو چکا تو ہم دونوں نے مل کر ناشتا کیا۔ اس نے مجھے ہتھوڑی، آٹھن کی پانچ انچ لمبی کیلیں، تیز دھار والی چھری اور ایک مضبوط رسی دکھاتے ہوئے کہا۔

"بس ان چیزوں سے میرا کام چل جائے گا۔"

"تم آسکر کے ساتھ کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو؟"

میں نے پوچھا۔

"جب کرچکوں کی تو تمہیں پتا چل جائے گا۔۔۔۔۔!"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم جو کچھ بھی کرو گی، میرے سامنے نہیں کرو گی۔" میں نے انھیں زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم اس کارروائی میں میری مدد نہیں لینا چاہتی

کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں میں اسٹیل کی لمبی کیلیں پیوست تھیں۔ آسکر کی کھوپڑی میں بھی مجھے بہت ساری اسٹیل کی کیلیں پیوست نظر آئیں جو کسی اینٹینا کے مانند اس کی کھوپڑی پر استادہ تھیں۔ آسکر کی دونوں کلائیوں کے نزدیک ہی برقی زین پر مجھے خون بکھرا اور پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ کیا نے آسکر کو برقی زین پر فٹس کرنے سے پہلے اس کی دونوں کلائیوں پر واقع ٹیس کاٹ ڈالی تھیں۔ یہ خون وہیں سے خارج ہو کر سفید زین کو سرخ کر گیا تھا۔

میں زیادہ دیر تک اس خوشحالا وحشت ناک منظر کو نہ دیکھ سکا۔ میرا جی متلائے لگا تھا۔ پیٹکون کی بربریت بھری حرکات سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ کافی عرصے سے بھوکے بیٹھے تھے۔ وہ آسکر کی لاش کو اپنی مٹھانک پر لمبوں کی مدد سے بھینچوڑ رہے تھے۔

پیٹکون کی نفرت اور فحشیت کے بارے میں کاہلے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہو رہا تھا۔ یہ میری خوش فہمی تھی کہ میں اس برقی زین کے بہت معصوم سمجھتا تھا۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ جب کسی بھی جاندار کی بقا کا معاملہ درجوش ہو تو وہ خوراک حاصل کرنے کے لیے کسی بھی نوعیت کی وحشت اور جنون کا مظاہرہ کر سکتا ہے لہذا پیٹکون سے کوئی شکوہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”علی! آجاؤ۔۔۔“ کا یا کی آواز ساعت سے مگرانی۔

”ہمارے رخصت ہونے کا وقت ہو گیا ہے۔“

کا یا کے لہجے سے ایک عجیب سی آسودگی نکلتی تھی۔ اس کے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ کافی عرصے سے رائن کی المناک موت کا دکھ اٹھائے جی رہی تھی۔ یہ دکھ کسی خار کے مانند اس کے دل و جگر میں پیوست تھا اور ہر لمحے اسے ایک نئی اذیت سے روشناس کرتا رہتا تھا اور۔۔۔ اس وقت اس اذیت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا جب اسے آسکر کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا تھا۔ آج کا یا کے من کا کاٹنا نکل گیا تھا۔ اس نے آسکر کو کرب ناک موت دے کر رائن کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب بے باق کر دیا تھا۔

میں آٹو سٹج کے پاس پہنچا تو کا یا نے کہا۔ ”اوپر آجاؤ۔ ہمیں زیادہ دیر یہاں نہیں رکنی چاہیے۔“

”کا یا! ابھی ایک کام باقی ہے۔“ میں نے ہٹ کی سمت نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”تم ایک منٹ روکو۔ میں ابھی آیا۔“

”اب کون سا کام رہ گیا ہے؟“ اس نے الجھن زدہ

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”علی! تم پیٹکون کو بہت معصوم سمجھتے ہو۔۔۔ آؤ، میں تمہیں دکھاؤں کہ یہ برقی جانور کتنے ظالم اور سفاک ہوتے ہیں۔“

بات ختم کرتے ہی وہ ہٹ سے باہر جانے کے لیے بڑے اعتدال سے قدم اٹھانے لگی۔ میں نے اس کی تھلید میں چلنے ہوئے پوچھا۔

”کیا تم نے آسکر کو پیٹکون کے سپرد کر دیا ہے؟“

اس نے ایک مرتبہ پھر میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔

”تم نے کہا تھا کہ تم پیٹکون کے ٹیلنٹ کو آزمانا چاہتے ہو۔“ وہ ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے عزم کے ساتھ بولی۔ ”میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے۔ وہ دیکھو، پیٹکونز اپنے ٹیلنٹ کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔“

یہ وہی مقام تھا جہاں گزشتہ روز میں نے نصف درجن پیٹکونز کو مونجہ مستی کرتے دیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہاں پیٹکونز کی ایک جماعت اپنے کام میں مصروف تھی لیکن اب کی بار ان کی مونجہ مستی کا مرکز دھجور آسکر تھا جو برف کے اوپر پت پڑا تھا اور پیٹکون اس کا تیاپنا کرنے میں مصروف تھے۔

میں تیز قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ عقب میں مجھے کا یا کی آواز سنائی دی۔

”ان کے زیادہ نزدیک نہیں جانا۔ اس وقت شاندار دعوت اڑاتے ہوئے یہ بہت وحشی ہو رہے ہیں۔ اگر انہیں ذرا سا سبب ہو گیا کہ تم ان کی خوراک چھیننے کے لیے آئے ہو تو یہ تم پر حملہ کر دیں گے اور میں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے نہیں دیکھنا چاہتی۔“

”اوکے!“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔ ”میں محتاط رہوں گا۔“

”میں ضروری سامان کو آٹو سٹج پر لوڈ کر رہی ہوں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”جب تم پیٹکون کا تماشہ دیکھ چکو تو واپس آ جانا۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔“

میں نے ”اوکے“ کہنے پر اکتفا کیا اور محدود فاصلہ رکھ کر پیٹکونز کی کارروائی دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

میں جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے مجھے سب کچھ صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ آسکر کے چاروں خانوں کو کا یا نے برقی زین کے ساتھ فٹس کر دیا تھا، وہ اس طرح

آسکر کا جو کردار رہا تھا اس کے پیش نظر وہ بدترین سلوک کا مستحق تھا۔ چاہے سوسائٹی کے سسٹم کے تحت ہی سہی لیکن اس نے کا یا کے بڑے بھائی رائن کے ساتھ بہت برا کیا تھا۔ میں جب بھی اس واقعے کے بارے میں سوچتا تو میرا جی متلائے لگتا تھا۔ رائن کی موت کا منظر انسانی درندگی کی انتہا تھی۔

اچانک کچن کی طرف سے آسکر کی چھینیں بلند ہونا بند ہو گئیں۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں آیا کہ کا یا نے آسکر کا کام تمام کر دیا ہے اور اب وہ مجھے دعوت گزارہ دے گی تاکہ میں اس کی کارکردگی کو سراہ سکوں لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔

چند لمحات تک کچن کی جانب خاموشی چھائی رہی پھر ایسی آوازیں ابھرنے لگیں جیسے گزلیوں کے کسی گھڑ کو زمین پر کھینچا جا رہا ہو۔ میں نے پوری توجہ ان آوازوں پر لگا دی۔ گزرتے لمحے کے ساتھ مذکورہ آوازیں مجھ سے دور ہو رہی تھیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ آوازیں معدوم ہو گئیں۔ ہٹ کے اندر سنا تھا گیا تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”یہ اللہ کی بندی اپنے شکار کو کہاں لے گئی ہے۔۔۔؟“

ایک لمحے کے لیے میرے جی میں آئی کہ مجھے باہر جا کر صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے لیکن پھر میں نے اس خیال کو رد کر دیا۔ ان لمحات میں کا یا جن جذباتی منازل سے گزر رہی تھی اس میں ضروری تھا کہ اسے اس کام مکمل کرنے دیا جائے تاکہ اس کے اندر بیدار درندہ شکم میرے دو بارہ گہری نیند سو جائے۔ اگر اس درندے کی پیٹ پوجا میں کوئی رخنہ ڈال دیا جاتا تو درندہ کے طور پر وہ کا یا کی نفسیات کے ساتھ کوئی کھلو اڑ کر سکتا تھا اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا لہذا میں چپ چاپ بیڈروم میں بیٹھ کر کا یا کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

پندرہ بیس منٹ کے انتظار کے بعد مجھے ہٹ کے اندر کسی کی آمد کی آواز سنائی دی۔ پھر اگلے ہی لمحے بیڈروم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ کا یا ہی تھی۔ اس نے دستک کے بعد یہ آواز بلند مجھے پکارا۔ ”علی! باہر آجاؤ۔۔۔“

میں بیڈروم سے باہر نکل آیا۔

کا یا میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر مجھے گہرا سکون اور اطمینان نظر آیا۔ میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”تم اسے کہاں چھپک آئی ہو؟“

نشانہ لے کر کے بعد دیگرے دو فائر کیے۔ اس دھواں دھار فائرنگ نے اس کے گھٹنوں کی ہڈیوں کو چھینا چور کر دیا۔ وہ مغفلات بکھتے ہوئے اوندھے منہ مچن کے فرش پر گرا۔ میں نے مزید ایک فائر کیا اور اس کے سلامت کندھے کو بھی ناکارہ کر دیا۔

میں نے بقول کے، آسکر کے چاروں خانوں کو لولا لنگڑا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ نہ تو اپنے ہاتھوں کو حرکت دے سکتا تھا اور نہ ہی اپنے پاؤں پر چلنے کے قابل رہا تھا۔ اس کے کندھوں اور ٹانگوں سے مسلسل خون نکل رہا تھا۔ مجھے آسکر کی اس کسپری پر ذرا سا سببی ترس نہ آیا کیونکہ میری نگاہ میں وہ کسی خون آشام بھیرے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔ میں نے اسے اس کے بد حال پر چھوڑا اور کا یا کو خوش خبری سنائی۔

”کا یا۔۔۔!“ میں نے بے آواز بلند اسے پکارا۔ ”باہر آجاؤ۔“

اگلے ہی لمحے وہ بیڈروم سے نکل کر کچن میں آگئی۔ ان لمحات میں کا یا کے چہرے پر بڑے خوف ناک تاثرات تھے۔ وہ ایک دم بدلی ہوئی کا یا نظر آتی تھی۔ میں نے آسکر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پھرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کا یا! میں نے تمہارے شکار کو زیر کر دیا۔ اب یہ تمہارے سامنے زبر ہونے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ تم جیسے چاہو، اس کے ساتھ پیش آسکتی ہو۔“

اس نے بغور آسکر کا جائزہ لیا پھر میری جانب دیکھے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”علی! تم بیڈروم میں جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں، تم باہر نہیں نکلو گے۔“

”اوکے!“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتی اور بیڈروم کی سمت قدم بڑھا دیے۔

میں لگ بھگ آدھا گھنٹا بیڈروم کے اندر بند رہا۔ میں کا یا کو کچن میں چھوڑ آیا تھا لیکن میرا دھیان مسلسل اسی میں لگا ہوا تھا۔ اگر کسی بھی مرحلے پر اسے میری مدد کی ضرورت پیش آتی تو میں ہلک جھپٹتے میں بیڈروم سے کچن میں پہنچ سکتا تھا لیکن ایسی کوئی ہنگامی صورت حال پیدا نہیں ہوئی۔ کا یا کے اندر کا درندہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ مجھے وقفے وقفے سے کا یا کی غرائشیں اور جھنگڑائیں سنائی دے رہی تھیں اور اس کے جواب میں آسکر کی اذیت میں ڈوبی ہوئی چھینیں بھی ہٹ کی فضا میں گردش کر رہی تھیں۔ میں کا یا سے کہے ہوئے وعدے کا پابند تھا اس لیے میرا گزارہ صرف آڈیو سے ہو رہا تھا۔ میں کچن میں جا کر یہ لائیو شو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

لجے میں استفسار کیا۔

”ہوسکا ہے، پیگنوں، آسکر کے بچے کچھ پارچے
کا باربی کیو بنانا چاہتے ہوں۔“ میں نے ہٹ کی
قدم بڑھاتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”جک
ندر مختلف سالاجات تو رکھے ہیں مگر ان معصوم بچوں
کو آگ جلا نہیں آئی۔ تم سب کے انجن کو آن رکھو۔ میں
پیگنوں کے لیے ”کوئلے دہکا“ کراتا ہوں۔“

پھر میں ہٹ کے اندر پہنچا۔ وہاں پر کیرولین آگل کا
اچھا خاصا اسٹاک موجود تھا۔ اسٹور روم میں مختلف گنز اور ان
کے ڈنڈز کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ پڑا تھا۔ میں نے ہٹ
کے گوشے میں مٹی کا تیل چھڑک دیا پھر ہٹ سے باہر
نکل آیا۔ بقول شخصے، میں نے اس ہٹ کو کیرولین آگل سے
عسل دے دیا تھا۔ اب صرف ماچس دکھانے کی ضرورت
تھی۔ اس کے بعد آگ اس چوٹی ہٹ کو اتنی ہی وحشت اور
سفاکی سے نکل جاتی جتنی بے دردی اور بربریت سے
پیگنوں آسکر کی لاش کو ننگے میں مصروف تھے۔

میں نے محدود فاصلے پر جا کر ماچس جلائی پھر اس
روشن تیلی کو مٹی کے تیل میں بے ہٹ کی سمت پھینک دیا۔
اگلے ہی لمحے آگ نے پورے ہٹ کو اپنی لپیٹ میں لے
لیا۔ میں بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے آؤٹیج پر سوار
ہو گیا۔

کایا نے سب کو آگے بڑھا دیا۔ میں نے پلٹ کر نذر
آتش ہٹ کو دیکھا۔ آگ نے بڑی تیز رفتاری سے اپنا کام
شروع کر دیا تھا۔ میں نے ایک نظر اس آئی لینڈ کے برف
زار پر ڈالی۔ ٹھنڈی ٹھار بریلی زمین غضب ناک ہو کر ہم
سے پوچھ رہی تھی۔

”تم کس قسم کے لوگ ہو..... اتنے دن سے اپنے
بدن جلا کر مجھے پھلکاتے رہے ہو اور اب..... آشیانہ جلا کر
مجھے ڈرا رہے ہو.....!“

☆☆☆

ہم سہ پہر تین بجے بخیر وعافیت اسکاٹ میں پہنچ
گئے۔

اسکاٹ میں کوہ ایبریس (Mount Erebus)
کے نزدیک چٹانوں کے اوپر قائم کیا گیا ہے۔ اس آئی لینڈ
کے بعض مقامات خصوصاً اسکاٹ میں اور سیکر ڈو پر بریلی
زمین کے پتھروں چٹانیں بھی نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں
ریسرچ اسٹیشن ایسے ہی چٹانی علاقوں میں بنائے گئے ہیں۔
ان مقامات پر عموماً برف زیادہ دیر تک جمی نہیں رہ سکتی

جس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ قریز زمین اور زمین کے اوپر
واقع لیبارٹریز میں جو سائنسی ریسرچ کی جاتی ہے اس سے
کافی مقدار میں توانائی خارج ہوتی ہے جو وہاں کی زمین کے
درجہ حرارت کو کسی حد تک بڑھا دیتی ہے۔ دوسرا سبب بالکل
قدرتی ہے اور وہ یہ کہ یہ چٹانیں اپنے اندر بھی بہت زیادہ
گرماؤ رکھتی ہیں۔

اسکاٹ میں ہر مختلف سائز کے چھوٹے بڑے کمرے
اور ہال تعمیر کیے گئے ہیں جن پر ہلکا سبز رنگ کیا گیا ہے۔
چھوٹے کمرے رے ہائٹس کے لیے ہیں اور یہ کینیڈینز پر مشتمل
ہیں یعنی کینیڈینز کو بطور کمرہ استعمال کیا جا رہا ہے لیکن بڑے
ہالز کو باقاعدہ تعمیر کیا گیا ہے اور ان کی چھتوں کو بھی کافی بلند
رکھا گیا ہے جیسا کہ بیوی کمینٹیکل ٹیکسٹریوں کے ہالز ہوتے
ہیں۔ ہم اس آئی لینڈ کے جس حصے سے ہجرت کر کے
یہاں پہنچے تھے وہاں کی بہ نسبت اسکاٹ میں کا علاقہ مجھے
خاصا روشن اور باظہر نظر آیا۔

اس وقت اسکاٹ میں کی فضا کا درجہ حرارت منفی
پینتیس ڈگری سینٹی گریڈ تھا لیکن جب ہم اپنے کمرے
(کینیڈینز) میں داخل ہوئے تو خاصی خوشگواریت کا احساس
ہوا کیونکہ اس کینیڈینز کا اندرونی درجہ حرارت روم ٹمبریچر پر
سیٹ کیا گیا تھا اور یہ سب بندوبست، انٹیکسٹریکل ہیٹنگ
سسٹم کے تحت کیا گیا تھا۔ کایا نے مجھے بتایا کہ اسکاٹ میں
پر بجلی کی پیداوار کے لیے بیوی جزیرے پر نصب کیے گئے
ہیں۔

ہمیں کینیڈینز میں آنے ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ
داخلی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر کایا کی
طرف دیکھا۔ اس نے اطمینان سے گردن ہلائی اور بولی۔

”شاید کوئی کتا کی چابی لینے آیا ہے۔“

پھر وہ اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ اس کی
واپسی تک میں شش و پنج میں مبتلا رہا۔ اس نے تھوڑا سا
دروازہ کھول کر ہاتھ باہر نکالا اور سب کی چابی کی کوٹھادی۔
جب اس کا ہاتھ اندر آیا تو میں نے اس میں ایک لفافہ
دیکھا۔ کایا دروازہ بند کر کے میرے پاس آئی تو میں نے
پوچھا۔

”دے دی چابی؟“
”ہاں.....“ اس نے اشیات میں سر ہلایا اور لفافے کو
کھولتے ہوئے بولی۔ ”اگر سب کچھ فضا میں کھڑی رہتی تو پھر
اس کا انجن برفیلے موسم کے باعث سیز ہو جاتا۔ اسٹاف کا
ایک آدمی اسے گرم گیراج میں پارک کر دے گا۔“

”اس پیچہ میں کیا لکھا ہے؟“ میں نے اس کے
ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس نے
مذکورہ لفافہ کھول لیا تھا۔

”کچھ اہم اطلاعات ہیں۔“ اس نے سرسری انداز
میں بتایا۔

میں پوچھنے نہیں رو سکا۔ ”کسی اطلاع؟“
”پریشانی والی کوئی بات نہیں ملی۔“ وہ معتدل انداز
میں بولی۔ ”ہمیں بتایا گیا ہے کہ واپسی کے سفر کے لیے ہمارا
طیارہ بدل گیا ہے۔“

”مطلب..... ہم یونگ 17 - C-17 میں نہیں
جار ہے؟“

”ہاں، اس کا بھی مطلب ہے۔“ وہ تائیدی انداز
میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ”گلوب ماسٹر C-17 میں
کوئی ٹیکنیکی خرابی پیدا ہوگئی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ اگلے
دو دن تک پرواز کرنے کے قابل نہیں ہے۔“

”تو کیا ہمیں مزید دو دن تک اسکاٹ میں پر قیام کرنا
ہوگا؟“ میرے لہجے میں الجھن عیاں تھی۔

”نہیں!“ وہ بڑی رساں سے بولی۔ ”ہمارے لیے
متبادل طیارے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ کل صبح چھ بجے
ایک یونگ طیارہ 757 میکرو ڈوائسٹیشن سے کرائسٹ چرچ
کے لیے پرواز کرے گا۔ ہمیں ٹھیک پانچ بجے سیکر ڈو پہنچنا
ہوگا۔ اسٹاف نے ہمارے لیے ایک سینٹری ہیڈ کوارٹر چپ کا
انتظام کر دیا ہے جو ہمیں یہاں سے سیکر ڈو لے جائے گی۔“
”گڈ.....!“ میں نے ایک آسودہ سانس خارج
کی۔

”اسٹاف کا ایک آدمی تھوڑی دیر میں ہمارے لیے
کھانے پینے کا سامان دینے آئے گا جو ہمارے لٹج، ڈنڈ اور
بریک فاسٹ کے لیے کافی ہوگا۔“ کایا نے بتایا۔ ”جب
دروازے پر دستک ہو تو تم جا کر اس سے وہ سامان لے لینا
تا کہ اس کینیڈینز میں ہمارا قیام بالکل نارمل نظر آئے۔
گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ بندہ تم سے کوئی سوال جواب
نہیں کرے گا اور پھر اس کے بعد کل صبح تک ادھر کوئی نہیں
آئے گا۔ ہمیں یہ تمام وقت اسی کینیڈینز کے اندر گزارنا ہوگا۔
تم چاہو تو چند گھنٹے کی نیند لے لینا۔ مجھے تو بہت سا کام کرنا
ہے۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے کینیڈینز کے اندر رکھے
ہوئے سامان میں سے ایک سفری بیگ اٹھالیا۔ یہ وہ بیگ
نہیں تھا جس کے ساتھ وہ میرے پاس ہٹ میں آئی تھی۔ وہ

سلسلہ

ایک درخت کے نیچے پانچ لڑکے بیٹھے ہاتھ کر
رہے تھے۔ ایک آدمی وہاں سے گزرا۔ اس نے کہا۔
”بتاؤ تم میں سے کون سب سے زیادہ ست ہے؟ میں
اسے انعام دوں گا۔“ اس پر تمام لڑکوں نے ہاتھ اٹھالیا
مگر ایک نے نہیں اٹھایا۔ اس آدمی نے کہا۔ ”میرا خیال
ہے کہ تم ہی سب سے زیادہ ست ہو۔ یہ تو تمہارا انعام
پانچ روپے۔“

اس پر لڑکے نے کہا۔ ”ازراہ کرم آگے بڑھ کر
میری جیب میں ڈال دیں۔“

ڈبل روٹی

گاہک۔ ”تمہاری بیکری کی ڈبل روٹی بہت
خراب ہوتی ہے۔“
دکاندار۔ ”میں اس وقت سے ڈبل روٹی بنا رہا
ہوں جب آپ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔“
گاہک۔ ”ٹھیک ہے، مگر خیال کرو بھائی اس
وقت کی ڈبل روٹی اب ہمیں تو مت بیچو۔“

گانے

ایک دن ملا نصیر الدین چند دوستوں کے ساتھ
جنگل سے گزر رہے تھے کہ اچانک گانے کی آواز آئی۔
ملاحی کے دوستوں نے انہیں پھیلرتے ہوئے پوچھا۔
”ملاحی! یہ گانے آپ سے کیا کہہ رہی ہے؟“
ملاحی نے جواب دیا۔ ”یہ کہہ رہی ہے کہ آپ
کن گدھوں کے ساتھ بھر رہے ہیں۔“

مرسلہ۔ راحیلہ شفیق، نیو کراچی

خیالات

ایڈیٹر، رائٹر سے۔ ”کیا یہ وہی کہانی ہے جسے
ایک سال پہلے میں نے ناقابل اشاعت قرار دیا تھا؟“
رائٹر۔ ”جی ہاں۔“
ایڈیٹر۔ ”تو پھر آپ اسے دوبارہ کیوں لے
آئے؟“

رائٹر۔ ”یہ سوچ کر لے آیا ہوں کہ شاید اب
آپ کے خیالات بدل گئے ہوں۔“
مرسلہ۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال

کینٹینر اندر سے ایک سٹنگ کم بیڈروم کی لک دیتا تھا۔ اس میں سونے کے لیے دوسلپٹنگ بیلز کے علاوہ ٹیبل چیئرز کا بھی بندوبست تھا اور سامان وغیرہ رکھنے کے لیے کینٹینر کی ایک دیوار کے ساتھ شیلف بھی بنے ہوئے تھے۔

”اگر تمہیں جاگ کر کوئی کام کرنا ہے تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ ہی جاؤں گا۔“ میں نے جتنی لہجے میں کہا۔

”ذرا پتا تو چلے کہ مجھے سلا کر تم کون سا ضروری کام کرنے والی ہو.....“

کاپا نے بڑی بھرپور نظر سے مجھے دیکھا لیکن میری بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ان لمحات میں وہ حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ میں یہی سمجھا کہ ادھر ہٹ کے اندر اور باہر اس نے آسکر کے ساتھ جو کچھ کیا تھا یہ سب ان واقعات کا اثر ہے۔ میں نے اس کی سنجیدگی کو تو ذکر اس کے اعصاب کو سکون پہنچانے کا فیصلہ کر لیا اور قریب جا کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

وہ ذرا سا گھسائی تاہم اس نے میری کارروائی کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کی۔ سب سے بڑا نفع اس خوشگوار حرارت والے ماحول میں پہنچ کر بدن میں ایک متناسیقی کرنٹ دوڑنے لگا تھا جس نے رگوں میں خون کی گردش کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا، نتیجتاً جذبات بھی متذوری پر اتر آئے تھے۔ ان حالات میں انسان کی نیت کو پھسلنے میں دیر نہیں لگتی۔

چند لمحات اسی کیف آور اور نشاط انگیز کیفیت میں گزر گئے پھر اس نے مجھے خود سے الگ کرنے کے لیے زور لگایا تو میں نے اسے اپنے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے ابھن زدہ انداز میں پوچھا۔

”کیا بات ہے کیا۔ تم مجھے کچھ ڈسٹرب نظر آ رہی ہو؟“

”یہ کام کا پریشر ہے۔“ وہ دوبارہ بیگ کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے بولی۔ ”تم پریشان نہیں ہو۔ جیسے ہی کام ختم ہوگا، میں ریلیکس ہو جاؤں گی۔“

”ایسا کون سا کام ہے جس نے تمہارے حواس اور اعصاب کو اپنی گتھی میں جکڑ رکھا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے آسکر کے بلیک پاسپورٹ پر تھوڑا سا ٹیکنیکل کام کرنا ہے تاکہ کسی بھی مرحلے پر تمہارے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ ہو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی اور بیگ کے اندر سے ایک جدید لیپ ٹاپ اور دیگر ٹیکنیکل سامان نکال کر ٹیبل پر بچانے لگی۔ ”میں جب تک یہ کام مکمل نہیں کر لوں گی، مجھے

اطمینان حاصل نہیں ہوگا۔“ کا یا کی وضاحت کے بعد میں چپ چاپ اسے دیکھنے لگا۔

اس نے لیپ ٹاپ کو آن کر لیا پھر دوسرے سامان کو سیٹ کرنے لگی۔ اس ٹیکنیکل سامان میں ایک ڈیجیٹل کیمرا، اسکاچ ٹیپ کے ہولڈر کی شکل کی دو ڈیوائس، مختلف سائز اور رنگ کے بٹنی کے تار اور کپسولز، فیچی، کٹر اور ای ویسٹ کی اور بھی کئی چیزیں تھیں۔ جب وہ ان اشیاء کو آپس میں منسلک کرنے میں مصروف تھی تو میں نے اس کی کارروائی کو گہری توجہ سے ملاحظہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”تھوڑی دیر پہلے جو بندہ سچ کی چابی لینے اور تمہیں لفاظی دینے آیا تھا اس کے لیے تم نے ”اسٹاف“ کا لفظ استعمال کیا تھا۔ کیا اس سے تمہاری مراد اسکاٹ میں کا ریسرچ اسٹاف ہے؟“

”جب ہم اسکاٹ میں کے ایک کینٹینر میں قیام پذیر ہیں تو ظاہر ہے، وہ بندہ اسی میں کا اسٹاف ہوتا!“ وہ اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے بولی اور بتانے لگی۔ ”راس آئی لینڈ کی کل آبادی انہی ریسرچ کرنے والوں پر مشتمل ہے۔ یہاں پر غیر متعلقہ افراد مستقل قیام نہیں کرتے کیونکہ اتنے شدید موسم میں زیادہ دنوں تک زندہ رہنا ممکن نہیں ہے۔ ہم جوئی کے لیے ادھر کا رخ کرنے والے افراد کو وہ سہولیات میسر نہیں ہوتیں جو ریسرچ اسٹیشنز کے اسٹاف کو حاصل ہوتی ہیں۔ پھر بھی.....“ لٹائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

”موسم سرما اور موسم گرما میں ان ریسرچ اسٹیشنز پر اسٹاف کی تعداد میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ انٹارکٹیکا کی موسم گرما کی کل آبادی پانچ ہزار نفوس اور موسم سرما کی ایک ہزار نفوس ہے۔ صرف راس آئی لینڈ کی بات کریں تو موسم گرما کی ایک ہزار اور موسم سرما ڈیڑھ سو۔ اگر صرف میکرو ڈو کو دیکھیں تو سرسبز میں نو سو افراد اور وینٹریز میں ایک سو افراد جبکہ اسکاٹ میں ہر سرسبز میں نوے افراد اور وینٹریز میں یعنی آج کل شخص دس افراد موجود ہیں۔ اگر ہمیں بھی شامل کر لیں تو یہ تعداد بارہ ہو جائے گی۔“

”کیا تمہارا اور آسکر کا شمار بھی اسکاٹ میں کے اسٹاف میں ہوتا ہے؟“

”ہرگز نہیں۔“ وہ قطعیت سے بولی۔

”پھر یہ لوگ تمہیں ایسا پر دو ٹوکوں کیوں دے رہے ہیں؟“

”اس وقت ہمارے لیے یہاں کے اسٹاف کی

حیثیت سہولت کا رجحان ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ہمارا ان سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم سیدھے ہو کر بیٹھ جاؤ۔“

آخری جملہ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ میں واقعتاً سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈیجیٹل کیمرے سے میری دو تین تصاویر بنائیں پھر دوبارہ لیپ ٹاپ کے ساتھ مصروف ہوئی۔ میں نے کہا۔

”میں بھی تو یہی چاہتا تھا ہوں کہ جب یہاں کے اسٹاف کا تم۔ لوگوں سے ڈائریکٹ کوئی تعلق نہیں تو پھر یہ سہولت کاری میں کیوں لگے ہوئے ہیں؟“

”ایسا کرنے کے لیے ان کے بڑوں نے انہیں حکم دے رکھا ہے۔“ کا یا نے اس کی میری جانب کھسکاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور ان کے بڑوں کو سوسائٹی کی جانب سے احکامات دیے گئے ہیں۔ تم اپنے دونوں ہاتھ اسٹیشنز پر رکھ دو۔“

میں نے کسی معمول کی طرح اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کے بعد جدید ترین اسکیئر کی مدد سے میرا مکمل بائو میٹرک کیا۔ اس کے بعد اس نے ایک اور اسکیٹنگ ڈیوائس کو استعمال کر کے میری آنکھ کے ریشینا (Retina) کو کچھ کیا پھر اس کے رزلٹ کو اپنے لیپ ٹاپ میں منتقل کر دیا۔

”جس طرح ڈیپلو میٹ پاسپورٹ ہولڈرز کو انگریزیشن پروسس سے نہیں گزرتا پڑتا بالکل ویسے ہی کراسٹ جریج کے انٹرویو پر ہمیں بہت سی ٹھکر جاتی سہولیات حاصل ہوں گی۔“ وہ آسکر کے پاسپورٹ کو کھولتے ہوئے بولی۔

”لیکن میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں وہ حفظہ بالقدم کے طور پر ہے تاکہ تم ہر زاویے سے آسکر بن جاؤ۔“

”اگر میں آسکر بن گیا تو پھر کہیں تم میرے ساتھ بھی وہ سلوک تو نہیں کرو گی؟“ میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

”ہنی مذاق بعد میں علی!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”پہلے ضروری کام.....“

اس کے بعد میں نے کا یا کو ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہیں کی اور خاموش بیٹھا اس کی کارروائی کو دیکھتا رہا۔ اس نے آسکر کا مائی نیوزی لینڈر بلیک پاسپورٹ کھول رکھا تھا۔ اس پاسپورٹ کے صفحات کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے اور اس کی ضخامت کی وجہ سے اسے مائی (Mighty) کہا جاتا ہے۔ کا یا نے آسکر کے پاسپورٹ کا مین پیج اسکرین کیا پھر اسے لیپ ٹاپ میں منتقل کرنے کے بعد وہ اسے ایڈٹ

کرنے لگی۔

سب سے پہلے اس نے میری تصویر کے ہیک گراؤنڈ کو دبائٹ کیا پھر اسے بیٹھائیں ضرب پٹتیں کی میٹر کے سائز میں کاٹ کر آسکر کی تصویر کے اوپر پیسٹ کر دیا۔ اس کے بعد وہ سیکورٹی نیچرز والے بیٹونی فونو کے ساتھ کھینچی رہی۔ آخر میں اس نے مائیکرو چپ کے ساتھ تھوڑی سی چھیڑ چھاڑی کی۔ یہ سب کچھ وہ اپنے لیپ ٹاپ پر کر رہی تھی۔ جب اس کا کام مکمل ہوا تو وہ پرنٹر کو آن کرتے ہوئے بولی۔

”میرے پاس کچھ ایسی آپٹیکل مشینز اور سافٹ ویئر ہیں جن کی مدد سے میں نے تمہیں آسکر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ آپٹیکل مشینز اور سافٹ ویئر عارضی طور پر ہمارا مسئلہ حل کر دیں گے۔ مجھے آسکر کے پاسپورٹ پر تمہارا فوٹو تبدیل کرنا ہے۔ سیکورٹی نیچرز کو اپ ڈیٹ کرنا ہے، وہ اپنی اور فنگر پرنٹس کو بدلنا ہے۔ باقی سب کچھ وہی رہے گا جو پاسپورٹ پر درج ہے اور ان مندرجات کو تم ابھی طرح یاد کر لو گے۔“

اس کے بعد اس نے پرنٹر میں سے ایک پرائیمریٹ جھلی نما پرنٹ لیا جس پر میری تصویر اور سیکورٹی نیچرز کے علاوہ اور کچھ بھی لکھی تھی۔ اس نے مذکورہ پرنٹ کو نہایت ہی احتیاط کے ساتھ ایک پیپر پر رکھ دیا۔ پھر اس نے آسکر کے پاسپورٹ کے مین پیج پر کوئی اپرے کرنے کے بعد اس پرائیمریٹ پرنٹ آؤٹ کو اس طرح پیسٹ کر دیا کہ آسکر کے فوٹو پر میرا فوٹو اور اس کے سیکورٹی نیچرز پر میرے سیکورٹی نیچرز بیٹھ گئے۔ اس کے بعد اس نے پیسٹنگ گن کی مدد سے اس پیج کی کوئنگ کو نرم کیلا پور دوبارہ اپرے کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے سارا سامان سمیٹا اور پاسپورٹ میری جانب بڑھا تے ہوئے بڑے اطمینان سے بولی۔ ”لو، دیکھو.....“

میں نے دیکھا۔ کا یا نے بڑی مہارت اور نفاست کے ساتھ اس پاسپورٹ پر بڑا امین کام کیا تھا۔ بالکل بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ اس پیج کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑی کی گئی ہے۔ اس اور لیپ پیسٹنگ سے صرف فوٹو اور سیکورٹی نیچرز تبدیل ہوئے تھے۔ باقی تمام مندرجات ویسے کے ویسے ہی تھے حتیٰ کہ مشین ریڈیبل زون کو بھی جوں کا توں رہنے دیا گیا تھا۔ اب یہ میرا پاسپورٹ تھا جس کے مطابق میرا نام آسکر براؤنگ تھا۔ براؤنگ میرا سرنام تھا اور اس کے مطابق اس وقت میں تیس سال کا تھا۔

میں نے سنا کی نظر سے کا یا کی طرف دیکھا اور کہا۔

خارزار

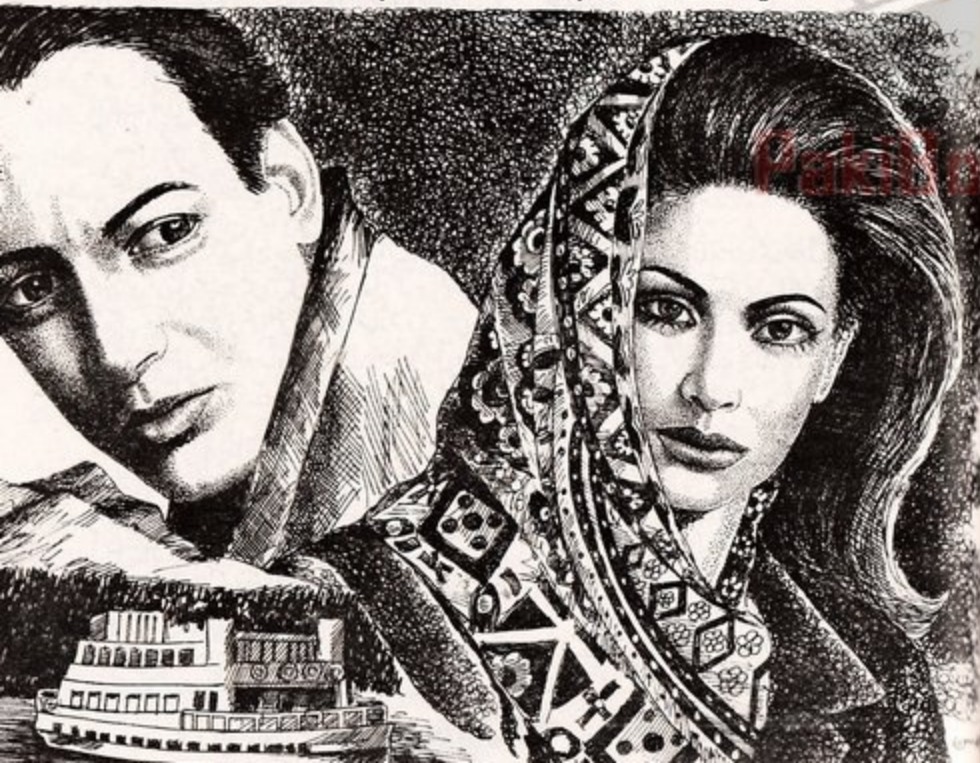
محمد الیاس

بعض اوقات گھر کو آگ لگتی ہے گھر کے چراغ سے۔ وہ دیار غیر میں اپنوں سے دور اپنوں کے تصور اور محبت میں ڈوبا زندگی گزارتا رہا اور جب اپنی مٹی کی خوشبو اسے دور سے کھینچ کر لاتی تو اپنوں کا اپنا پن ناپ تول میں پڑ کر خون کی رنگت ہی بدل گیا اور اس ... بدلاؤ پر اپنے پرانے سب حیران رہ گئے۔

ایک دل برداشتہ معشر کی حسینہ کی ایمان پر پختگی کا دلچسپ انداز

مطابق عمایا اور حجاب سے اپنے بدن اور چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ ان کے دل جوش اور جذبے سے لبریز ہو گئے۔ تینوں یعنی بیوی اپنے شوہر اور بیٹیاں اپنے باپ کے آبائی وطن کی زمین پر چل رہی تھیں، جس کے بارے میں طارق محمود

جہاز سے اتر کر طارق محمود، اس کی بیوی، ماضی کی کیتریں اور حال کی آمنہ ان کی آٹھ سالہ بیٹی آنکھ اور دس سالہ حسنہ نے اپنے خوابوں کی سرزمین پر۔ بسم اللہ پڑھ کر قدم رکھے اور کلمہ شکر ادا کیا۔ ماں بیٹیوں نے عین شریعت کے



میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس اسٹیشن کے اندرونی حصوں کی سیر کرتا۔ ہم جس جیب میں میکر ڈو پیچے تھے اس نے ہمیں بونگ 757 کے نزدیک لاکری چھوڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام کارروائی بخیر و خوبی منٹ مکی اور ہم جہاز کے اندر سیٹل ہو گئے۔ ٹھیک چھ بجے بونگ طیارے نے انٹارکٹیکا کی ٹھنڈی ٹھار دھند آلود فضا میں اڑان بھری اور آٹھ گھنٹے کی نان اسٹاپ فلائٹ کے بعد ہم پٹنگون کی نگری سے نکل کر کیوی کے دیس میں پہنچ گئے۔

موسم سرما میں راس آئی لینڈ اور نیوزی لینڈ کا مقامی وقت ایک جیسا ہے لہذا کرائسٹ چرچ پہنچ کر مجھے اپنی گھڑی کا ٹائم سیٹ نہیں کرنا پڑا۔ بونگ طیارے نے دوپہر میں کرائسٹ چرچ ائر پورٹ پر لینڈ کیا تھا۔ میں اور کیا جہاز سے باہر نکلے ہی الگ ہو گئے تھے۔ ائر پورٹ سے نکلنے کے لیے مجھے صرف ایک کاؤنٹر کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے اپنا پاسپورٹ آفیسر کی جانب بڑھا دیا۔

”ڈاکٹر آسکر! آپ راس آئی لینڈ سے آرہے ہیں؟“ آفیسر نے اپنے سسٹم کے ساتھ مصروف رہتے ہوئے سوال کیا۔

میں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”جی!“ وہ یہ دستور چند لمحات تک اپنے سسٹم سے کھیلتا رہا پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستغرق ہوا۔ ”آپ کا پرزہ آف وزٹ کیا تھا؟“

”جینیک انجیئرنگ!“ میں نے ٹھوس لہجے میں بتایا۔ ”اسٹیشن ریسرچ ڈویژن اسکاٹ میں، راس آئی لینڈ۔“ میں نے ”جینیک انجیئرنگ“ کی ٹرم اس لیے استعمال کی تھی کہ اس موضوع پر میں پورے اعتماد کے ساتھ گفتگو کر سکتا تھا۔

آفیسر نے اطمینان بھرے انداز میں گردن ہلائی اور ”انٹری“ کی اسٹیمپ کی جانب ہاتھ بڑھا دیا۔ اسی لمحے آفیسر کے پاس رکھے ہوئے فون کی صفحہ بج اٹھی۔ اس نے کال انٹینڈ کی۔ دوسری طرف کی بات سننے کے بعد اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور وہ خشک بھری نظر سے مجھ دیکھنے لگا۔

میں یکا یک سنا نے میں آگیا.....!

امنگوں حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلائی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

”تم تو کافی کارنگر ہو.....!“ ”میرے پاس ایسی ٹیکنیکس تھیں کہ جنہیں استعمال کر کے میں نے اس پاسپورٹ کو اس قابل بنا دیا ہے کہ تم... یہ آسانی ائر پورٹ کر اس کر لو گے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”فی الحال اس سے زیادہ کی تمہیں ضرورت بھی نہیں۔ تم نیوزی لینڈ کے ایک معزز ڈاکٹر ہو اور اپنے وطن واپس لوٹ رہے ہو لہذا فکرو پریشانی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری بات سمجھ رہے ہوتا.....؟“

”سمجھ گیا۔“ میں نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ”اپنی کوئین؟“ اس نے سوالیہ نظر سے مجھ دیکھا۔

میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔ اگلی صبح لگ بھگ ساڑھے چار بجے ایک سینئر لی ہینڈ جیب ہمیں لینے آگئی۔ اس رات ہم نے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ نہیں لگائی تھی اور یہی طے ہوا تھا کہ نیند کا سارا کونا بونگ 757 کی آرام دہ سیٹوں پر پورا کیا جائے گا۔ اس خوش آمدنیال کے ساتھ وہ رات ہم جاگتی آنکھوں سے ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ طلوع و غروب کا یہ عمل ایک ایسا تجربہ ہے جو ہر بار نیا اور پہلے سے زیادہ پُر لطف محسوس ہوتا ہے۔

اسکاٹ میں سے میکر ڈو لگ بھگ تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جیب کے ذریعے یہ مسافت ہم نے سات منٹ میں طے کی۔ اسکاٹ میں اور میکر ڈو اسٹیشن کے درمیان آمدورفت کے لیے برف کی سخت سطح کے اوپر باقاعدہ ایک سڑک ہی بنائی گئی ہے جس کی دونوں جانب مضبوط آہنی ریلنگ بھی لگائی گئی ہے۔ ہم نے ٹھیکے اندھیرے میں یہ سفر طے کیا لیکن جیسے ہی ہم میکر ڈو پہنچے، وہاں ہمیں اچھی خاصی رونق دیکھنے کو ملی۔

یہ اسکاٹ میں کی بہ نسبت کافی بڑا ریسرچ سینٹر تھا اور خاصے بڑے رستے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس وسیع و عریض ریسرچ اسٹیشن کو دیکھ کر پہلی نظر میں یہی محسوس ہوتا تھا کہ اس خطے میں کوئی عظیم الشان تعمیراتی منصوبہ شروع ہے اور اس تاثر کا سبب کیٹ (Cat) کمپنی کی مصنوعات تھیں۔ کیٹ یعنی کٹر پلر (Cater Pillar) کمپنی کی بیوی مشینری میکر ڈو ریسرچ اسٹیشن پر بڑی دریاہی سے استعمال ہو رہی تھی۔ اس اسٹیشن پر چاروں جانب ہر سڑک کے کناروں پر بجلی کے کھمبے بھی استادہ دکھائی دیے۔ مطلب، امریکا کے سب سے بڑے ریسرچ سینٹر پر توانائی کا کوئی بحران نہیں تھا۔

کی زبانی اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ یہاں آ کر اجنبیت کا قطعی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ایمان کی روشنی میں یہ باور کر لیا تھا کہ پاک سرزمین پر ہی وہ صحیح معنوں میں دین میں تین پر عمل پیرا رہ کر زندگی بسر کر سکتی ہیں۔

انٹرنیشنل ایئر پورٹ کے لاؤنج اور باہر پارکنگ میں مقامی خواتین میں سے بیشتر کو جدید لباس پہننے دیکھ کر ماں بیٹیوں کو حیرت ہوئی۔ آنکھ نے مایوس ہو کر باپ سے پوچھ لیا کہ ہماری ان مسلم بہنوں... کو کسی نے کیوں نہیں بتایا کہ عورتوں کو پردے میں رہنے کا حکم ہے۔ بیٹی کو دونوں کٹھنی آئینہ جواب دینے کے بجائے، طارق محمود تاہلیں پیش کرنے لگا کہ کس طرح بعض لوگ نام کے مسلمان ہوتے ہیں۔ اسلامی ملک کے شہری ہوتے ہوئے بھی شریعت پر پوری طرح عمل نہیں کرتے۔ یہ ان کی بد قسمتی ہے اور سچے مومن کا یہی امتحان ہے کہ وہ ایسے معاشرے میں بھی دامن بچا کر چلے۔ جیسے آپ کی والدہ، مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد پوری کی پوری دین حق میں داخل ہوئیں، یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔ جس کا باطن منور ہو جائے، اُس کو تاریکی میں بھی راستہ بھائی دینے لگتا ہے اور خارزار سے دامن بچا کر نکلنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ آپ دونوں بہنوں نے زندگی بھر اپنی والدہ محترمہ کے کردار عمل کی پیروی کرتی ہے۔

پندرہ برس پہلے یا یہ غیر میں طارق محمود اور کیتھرین کی ملاقات ہوئی تھی۔ دونوں ایک ہی ادارے میں ملازمت کرتے تھے۔ طارق کی مہذب گفتگو، شرافت اور کردار کی مضبوطی نے کیتھرین کو بہت متاثر کیا۔ وہ ان دنوں تینس چوبیس سالہ انتہائی پراسٹیشن اور پیر پور جوان لڑکی تھی، طارق سے عمر میں صرف ایک ڈیڑھ سال چھوٹی۔ اس عام سے قبول صورت مرد کی محبت میں ایسی گرفتار ہوئی کہ ہر قیمت پر شریک حیات بننے کی خواہش کا برملا اظہار کر دیا۔ اس کے ہم وطن دوستوں اور خصوصاً والدین نے حوصلہ افزائی نہ کی۔ ماں نے سوال کیا کہ اُسے ایک غیر مذہب اسٹیشن میں ایسی کون سی خوبی نظر آ گئی۔ ایک عام سے تارک وطن کے ساتھ ازدواجی رشتہ جوڑنا درست نہیں۔ کیتھرین نے ماں سے کہا تھا کہ اس نے طارق کی آنکھوں میں جو حیا دیکھی ہے، وہ آج تک کسی مرد میں نظر نہیں آئی اور انسان کی آنکھیں ایسا آئینہ ہوتی ہیں، جس میں اُس کے باطن کا صحیح عکس دکھائی دے جاتا ہے۔

طارق نے کیتھرین کو مزید چند مہینوں کی مہلت دے دی اور اُس کو مشورہ دیا کہ وہ اس عمر میں اچھی طرح سوچ لے۔

مذہب تبدیل کرنے کے ساتھ ہی خود کو کسر بد لانا پڑے گا، جو اتنا آسان نہیں ہوتا۔ شریعت، حدیث، سیرت اور اللہ کی کتاب کے مستند انگریزی تراجم پر مشتمل کل چار کتب بھی مطالعے کے لیے دیں، جو اُس نے بعد شوق شکر یہ کتب ساتھ قبول کر لیں اور بغور مطالعہ کرنے کا وعدہ کیا۔

پہلی ملاقات کے ٹھیک دس مہینے اور تیرہ دن کے بعد کیتھرین نے نئے مذہب اور نئے نام کی شناخت سے شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق نکاح کر لیا۔ اس نے طارق کے تجویز کردہ مختلف اسلامی ناموں میں سے اپنے لیے ”آمنہ“ ہی پسند کیا تھا۔ آمنہ نے پوری نیک نیتی سے دین اسلام کو قبول کیا اور پوری کی پوری اس میں ڈھل گئی۔ عربی صرف اتنی ہی سیکھ سکی کہ کھلے نماز اور چند آیات خوب یاد کر لیں۔ البتہ مذہب کا مطالعہ انگریزی کتب کے ذریعے بدستور ذوق و شوق سے کرتی رہی۔ نکاح سے پہلے ہی ملازمت چھوڑ دی اور صحیح معنوں میں خاتونِ غانہ بن کر رہ گئی۔ تقریباً ڈیڑھ سال کے عرصے میں اس قابل ہوئی کہ روزمرہ کی گفتگو شوہر کی مادری زبان اردو میں کرنے لگی۔ پہلی اور پھر دوسری بیٹی پیدا ہوئی۔ دونوں کی تربیت عین اسلامی تقاضوں کے مطابق کی۔

میاں بیوی نے خوب غور و خوض کے بعد باہمی مشاورت سے فیصلہ کر لیا کہ بیٹیوں کو شعور کی منزل پر قدم رکھنے سے پہلے ہی اس مادر پدر آزاد معاشرے سے نکال لیا جائے۔ وہاں، جہاں شرم و حیا کے تقاضوں کو کوئی خاطر رکھنے کا چلن ہے تاکہ ان کو آئندہ کی زندگی، شریعت کے تابع رہ کر گزارنے کے لیے سازگار ماحول میسر آ سکے۔

گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں طارق محمود چند ایک باری مختصر عرصے کے لیے وطن آ سکا تھا۔ تاہم بیرون ملک سے بھیجی ہوئی رقم کے عوض، دونوں بڑے بھائیوں نے آبائی شہر کے جدید ایریا میں ایک کنال کے پلاٹ پر کوئی تعمیر کروا رکھی تھی اور تینس فری زون میں قائم انڈسٹریل اسٹیٹ میں ٹیکسٹائل لگا رہے تھے۔ کوئی اس کے نام بھی لیکن اس کی اجازت سے دونوں بھائی مع اہل و عیال اُس میں رہائش پذیر تھے۔ تاہم ٹیکسٹائل میں طے شدہ معاہدے کے مطابق نصف کا مالک طارق اور باقی کے نصف میں دونوں بڑے بھائی برابر کے شراکت دار قرار پائے تھے۔

طارق اور آمنہ اس اطمینان قلب کے ساتھ وطن لوٹ رہے تھے کہ رتبہ کو کشادہ پُر آسائش گھر ہے اور پانچ چھ مہینوں تک ٹیکسٹائل سے بھی معقول آمدنی ہونے لگی۔ بیٹیوں کو اعلیٰ

تعلیم دلا دیں گے۔ یہاں اُن کے لیے مناسب رشتے ملنے کا بھی مسئلہ نہیں بنے گا۔ باقی کی زندگی دونوں میاں بیوی آرام سے بسر کریں گے۔ جاری تعلیمی سال اختتام پذیر ہونے کو ہے۔ دونوں بیٹیوں کو یونیورسٹی بہت نزدیک پڑتی تھی۔ ایم اے کے امتحانات دیتے ہی اُن کی رخصتی ہو جاتی۔ دونوں کئے رخصتی کے فوراً بعد کوئی خالی کر کے اپنے آبائی گھر میں شفٹ ہو جائیں گے اور یہ کوئی طارق محمود کے لیے کافی رہے گی۔

ایئر پورٹ پر ظہیر اور زبیر بھائی انہیں لینے کے لیے بڑی آرام دہ گاڑی لائے ہوئے تھے، جس میں سارا سامان آسانی سے سہا گیا۔ قیمتی سامان والا بیگ گاڑی کے پچھلے حصے میں توباتی کا ادھر رکھا گیا۔ چاروں آسودہ ہو کر بیٹھ گئے۔ بڑے بھائی نے فرنٹ سیٹ سنبھالی اور جھگڑا زبیر ڈرائیونگ کرنے لگا۔ قانون کا احترام کرنا شروع سے ہی طارق محمود کے مزاج کا فطری خاصہ رہا تھا۔ قواعد و ضوابط کی بھی خلاف ورزی نہ کی اور حق بات پر مضبوطی سے ڈٹ جایا کرتا۔ طارق کا دل جلتے لگتا کہ اپنے ملک کے لوگ اخلاقی طور پر بد دلایا ہو گئے ہیں۔ ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال کمانے کے لیے ہر ہتھکنڈا آزمانے پر ہر دم تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔

ان دنوں ملک کے زیادہ تر حصے سرشام ہی دھند کی لپیٹ میں آ جاتے اور جوں جوں رات ڈھلتی، اس میں اتنی شہرت آتی کہ چند گز آگے تک کا منظر صحیح طور پر دکھائی نہ دیتا۔ جی ٹی روڈ پر احتیاط سے سفر جاری رہا۔ مہمان مسافر جلد ہی گاڑی میں سونے۔ ہڑ بونگ بچے اور طارق کی کپٹی سے ریوالبور کی بیخ بستہ ٹال چھوٹے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ گاڑی جی ٹی روڈ کے ایک پرانے خرک ویران کھڑے پر لا کر روک دی گئی تھی۔ آمنہ بڑا کر جاگ اٹھی اور شوہر کو اسٹو کی زد پر دیکھ کر اس سے لپٹ گئی۔ پیچھے بیٹھی دونوں بچیاں رونے لگیں۔ ایک بے مل بردار لگتی سیٹ کا دروازہ کھولے پاسیناں پر کھڑا نظر آیا اور تیسرے نے جو بیوہ اسی طرح ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ کھول کر زبیر کی گردن پر بے مل کی ٹال رکھی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تین بندوں نے سارا سامان اتار کر پیچھے کھڑی پک آپ میں رکھ لیا۔ طارق کی جینیں خالی کیں اور تینوں ماں بیٹیوں کے وینڈنگ بھی چھین کر لے گئے۔ ڈاکوؤں نے آؤنی منظروں سے چہرے چھپا رکھے تھے اور اُن کے سروں پر پولیس کی ٹوپیاں تھیں۔ جاتے ہوئے گاڑی کے اگلے دایم بائزر کو گولی مار کر پھاڑ گئے۔

بڑے ارمانوں سے نئے وطن کو اپنانے کی غرض سے آنے والی ماں بیٹیوں کو اس صدمے نے دھلا کر رکھ دیا۔

طارق نے گاڑی کا بائزر بدلے ہی بھائیوں سے تھانے چلنے کو کہا۔ وہ سمجھانے لگے کہ رپورٹ درج کرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ مزید مانی بوجھ پڑنے کا امکان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ڈاکوؤں نے پولیس کی جعلی روپیاں ہمیں رکھی ہوں۔ گویا اُن کے اصل ڈاکو اور اصل پولیس اہل کار ہونے کے امکانات برابر برابر ہیں۔ لہذا بہتر ہوگا کہ اس مالی نقصان کو برداشت کر لیا جائے لیکن طارق محمود مانا اور وہ لٹا پٹا قافلہ تھانے پہنچ گیا۔

ڈیوٹی پر موجود ہیڈ کانسٹیبل نے طارق سے شروع میں چند سوالات کئے لیکن فوراً ہی ساری تحقیق اور تفتیش کا رُخ دونوں بھائیوں کی طرف موڑ دیا۔ طارق کو حیرت ہونے لگی۔ ظہیر، ہیڈ کانسٹیبل سے اُلجھ پڑا اور کہا کہ وہ ایسے سوال کر رہا ہے، جیسے ہم نے ہی اپنے بھائی کو لٹا ہے۔ زبیر نے ہیڈ کانسٹیبل کے اس سوال کے جواب میں کہ رات کے وقت، مخصوص پولیس ناگوں کے علاوہ ویران جگہ پر گاڑی کھڑی ہی کیوں کی تو جواب دیا۔ ”ڈاکوؤں کی پک آپ بالکل پولیس موہاں جیسی لگی اور وہ تقریباً آدھی سڑک روک کے کھڑی تھی۔ تین وردی پوشوں نے گاڑی کے آگے آگے آ کر ٹارچوں سے روشنی ڈالی اور کئے کا اشارہ دیا تو میں نے بیک لگا دیا۔“

ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا کہ اُن دونوں بھائیوں سے ڈاکوؤں نے کیا چھینا؟ زبیر اور ظہیر دونوں نے کہا کہ جو بھی نقدی تھی، وہ انہوں نے لے لی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے خود اٹھ کر دونوں کی پوری طرح جامع تلاشی کی اور دو اہل کاروں کو ہمراہ لے باہر آ گیا۔ گاڑی کو اندر سے دیکھا اور اگلی دونوں نشستوں کے پیچھے جھانکا۔ میٹ اٹھا کر چھوڑا سادسی ٹوپا برد کر لیا، جس میں نقد رقم کے علاوہ دونوں بھائیوں کے شناختی کارڈ، زبیر کا ڈرائیونگ لائسنس اور گاڑی کی رجسٹریشن بگ بھی تھی۔ وہ پوچھا کہ متنازع بیان دینے لگے کہ زیادہ رقم دونوں کی جیبوں میں تھی، جو ڈاکوؤں نے نکال لی۔ پرس میں ضروری کاغذات اور دو تین ہزار روپے ڈال کر گھر سے نکلتے ہی احتیاطاً میٹ کے نیچے چھپا دیے تھے، جن کے بارے میں بتانا یاد نہ رہا۔

تفتیش کے دوران ایسی صورت حال پیدا ہوئی کہ طارق محمود کا سر چکر گیا۔ اُس کو اعتبار نہ آیا کہ بڑے بھائی ہی اس کے خلاف کسی سازش کے مرکزی کردار ہو سکتے ہیں۔ وہ دونوں اس سے شکوہ کرنے لگے کہ کس لیے پولیس اسٹیشن آنے سے منع کیا تھا۔ یہاں اُلٹا مظلوم کو ہی ظالم بنا دیا جاتا ہے۔ ظہیر نے ایک طرف فیصلہ کرتے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔ ”موجودہ صاحب! ہم نے رپورٹ درج ہی نہیں کروائی۔ آج خود تجربہ کر

کے دیکھ لیا۔ پہلے صرف سنا کرتے تھے کہ ہماری پولیس مقتول کے گھر والوں کو ہی شامل تفتیش کر لیتی ہے، تاکہ مال بنایا جاسکے۔“

حوالدار کچھ زیادہ ہی دہنگ شخصیت ثابت ہوا۔ پول پڑا۔ ”بالکل صحیح سنتے رہے ہو۔ گھر سے ہی قاتل ثابت بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ جیسی روضیں دیے فرشتے۔ جیسے عوام وکی پولیس۔ یہاں اس ملک میں سنگے باپ اپنے پردیس گئے بیٹوں کو لونٹے سے باز نہ آئے، تم دونوں تو بھائی ہو اور وہ بھی محبت کو ترسے ہوئے پرچہ درج نہ کروانے کی جھجکیں ہزار روپے فیس دینا ہوگی۔ پولیس وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں بیٹھی ہوئی۔ اس کو بہت کام کرنے ہوتے ہیں۔ میں بھی رپورٹ لکھ رہا ہوں۔“

وہ براہ راست طارق سے مخاطب ہوا اور کہا۔ ”ہم معصوم بچیوں اور ان کی والدہ کو زیادہ دیر نہیں روکنا چاہتے۔ تینوں باپردہ ہیں۔ اتنا لباس سزاوار اور شاک۔ انہیں فوراً گھر لے کر جائیں۔“ پھر ظہیر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”یہ بطور ضمانت ہمارے پاس رہے گا۔ اس کا بھائی ہماری فیس لے آئے اور اس کو لے جائے۔ آپ کا ذاتی معاملہ ہے، نقصان برداشت کرنا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ویسے یہ دونوں بھائی ڈرائنگ روم میں پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر ساری کہانی بتا دیں گے۔ لہذا آپ کے حق میں یہی بہتر ہے کہ رپورٹ درج کروائیں۔“ حوالدار نے انتہائی گتے میں سفید کاغذ لگا کر اوپر قلم رکھا اور طارق کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”درخواست لکھیں، بخیرمت جناب ایس ایچ او صاحب۔۔۔۔۔ میں مختصراً لکھوا تا ہوں۔“

طویل سفر کی ٹھکان اور صدمے سے نڈھال ماں بیٹیاں، نیند پوری نہ ہونے سے آدھ سوئی ہوئی جاری تھیں۔ گھر پہنچ کر ناشتا کرتے ہی سو گئیں۔ طارق کے بزرگوں میں صرف سگی چھوٹی ہی رہ گئی تھیں۔ بیوہ اور نادار خاتون، جس کو طارق ہی باقاعدگی سے خرچ بھیجتا رہا تھا۔ اس نے ایسا انکشاف کیا کہ بیٹیجے کو ہلا کر رکھ دیا۔ کہنے لگی۔ ”میرے بیٹے اتیرے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ بات ایسے ہی نہیں اڑی کہ کوئی اور فیکٹری دونوں بھائیوں نے اپنے نام لکوا رکھی ہے۔ دفتروں کا ریکارڈ چیک کرواؤ۔ خود جاکو، کسی کا اعتبار نہ کرنا۔ تم نے دونوں خاتموں کو مختار نامہ بھی لکھ دیا تھا۔ اللہ جانے کیا کیا میرا پھیری کی ہے۔ ان کی اولاد بھی علی الاعلان کہتی پھرتی ہے کہ کون چاچا؟ کوئی اور فیکٹری ہماری ہے۔ گوری سے شادی کر لی، اب گوروں کے دیس میں رہے، یہاں کیا لینے آئے گا؟“

بات کھلنے پر آئی تو سال سینے یا دن نہیں گئے، گھنٹوں میں کھلتی چلی گئی۔ دونوں بھائیاں جوان بیٹیوں کے ہمراہ آ کر ایک لحاظ سے حملہ آور ہو گئیں۔ غدر تراش لیا کہ اس نے آتے ہی دونوں بھائیوں کو پھنسانے کی پوری کوشش کی۔ وہ تو قسمت اچھی رہی کہ پولیس کو رشوت دے کر عزت بچائی۔

شہر کے ترقیاتی ادارے اور انڈسٹریل اسٹیٹ کے ریکارڈ میں سرے سے طارق کا نام ہی نہیں تھا۔ وہ تھانے گیا تاکہ باقاعدہ رپورٹ درج کروائے۔ چھوٹے بڑے ملنے پرول پر پانی نہ پڑنے دیا۔ شور شرابا کر کے ایس ایچ او سے ملا لیکن اس نے یہ کہہ کر رخا دیا کہ گھریلو جھگڑوں میں پولیس کو الجھانے کے بجائے، آپس میں مل بیٹھ کے معاملات سمجھ کیے جائیں۔

طارق محمود کی قوت ایمانی بروئے کار آگئی کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونا چاہیے۔ مسئلہ یہ بن گیا کہ تمام تر دستاویزات، خواہ وہ جعلی تھیں یا اصلی، لوٹنے گئے سامان میں چلی گئیں۔ پاسپورٹ، زیورات، پاؤنڈ اور سب کچھ۔ لباس بھی صرف وہی رہ گئے، جو تن پر تھے۔ پرکھنے کو کچھ بچا ہی نہ تھا۔ بھائی کل کر سامنے آ گئے اور صاف کہہ دیا کہ اس نے دونوں کو تھانے میں ڈھیل کروایا، لہذا وہ ایک روپیہ بھی دینے کے روادار نہ ہوں گے۔ اس مشکل گھڑی میں بہنوئی، محمد سلیمان ساتھ چل پڑا۔ اکلوتی بہن کا شریک حیات، شہر کی سیاسی بساط کا اہم مہرہ اور موجودہ چیز میں زکوٰۃ جمنی۔ گوکہ بہن کی اپنے شوہر سے بھی نہ بنی۔ بھائی کو دیے لفظوں میں بچ کے رہنے کی تلقین کرتی لیکن اس کی مجبوری بھی کہ کوئی مشورہ دینے والا بھی نہ تھا۔ سلیمان سے احوار دم پکڑ لی تاکہ روزمرہ کا خرچ جیب میں ہو۔ اسی کی مدد سے ایس ایس پی کو جا ملنا اور متعلقہ پولیس اسٹیشن کے حوالے سے ساری زبرداد گوش گزار کر ڈالی۔

ایف آئی آر درج کر لی گئی اور ایس ایس پی نے اس کیس کو سنجیدگی سے لیتے ہوئے تفتیش ایک اچھی شہرت کے حامل سب انسپکٹر کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔ ”اور سیز پاکستانی کی جاکداز پڑپ کرنے کا سنگین مجرم ہوا ہے۔ اس کی تو مسلم بیوی نے ہم لوگوں کے بارے میں بہت بُرا تاثر لیا ہوگا۔ ڈاکے کی اصلیت سمجھنے سے بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ کیس ہمارے لیے چننے سے کم نہیں۔“

دونوں بڑے بھائیوں نے ضمانتیں کروا لی تھیں، تاہم انہیں شامل تفتیش کر لیا گیا۔ طارق نے ایک وکیل کے ذریعے بول عدالت میں کوئی اور فیکٹری کی بازیابی کا دعویٰ

بھی دائر کر دیا۔ اس نے تمام رقوم قانونی طریقے سے بذریعہ بینک بھیجی ہوئی تھیں۔ صرف یہی ایک ثبوت تھا جو متعلقہ برانچ سے یہ آسانی حاصل ہو گیا۔ نچے سے ظہیر اور زبیر سے دونوں کہا۔ ”انکم ٹیکس کارڈ ریکارڈ لے آؤ۔ تم دونوں کی آمدن ثابت ہوئی تو ٹھیک ورنہ عدالت ایک دو بیٹھیوں میں فیصلہ دے دے گی۔“ مگر اس کی نوبت ہی نہ آئی اور تفتیشی افسر نے ڈاکے کے اصل کردار گرفتار کر لیے جن میں فیکٹری کے تین مزدور، ایک کلرک اور دو سیکورٹی گارڈز شامل تھے۔ کچھ سامان، انجینیئرس، وینڈ بیگ اور پاسپورٹ بھی برآمد ہو گئے۔ تاہم زیور، پکڑوں اور فاران کرکٹ میں سے کچھ نہ ملا۔ دونوں بھائیوں کی ضمانتیں منسوخ ہو گئیں اور ہتھکڑیاں لگ گئیں۔ طارق محمود بظاہر جتنا مضبوط عقیدے کا حامل دکھائی دیتا رہا، حقیقت میں ایسا ثابت نہ ہوا۔ اسی روز گھر آیا اور دل کا دورہ پڑنے سے چل بسا۔

ظہیر اور زبیر کے سسرال والے میدان میں آ گئے۔ ساتھ ہی ان دونوں کی بیٹیوں کے بھی تھک پڑے۔ قرضہ حنہ دینے کے حوالے سے بیان حلفی لکھ گئے اور جاکداز پڑپ کرنے کی نیت سے وسیع پیمانے پر منصوبہ بندی ہونے لگی۔ آؤ من کو پیغام پہنچایا گیا کہ پیریم کورٹ تک مقدمہ بازی چلے گی۔ دوران تفتیش، ظہیر زیادہ سختی برداشت نہ کر سکا اور اس نے قبول دیا تھا کہ ڈاکا اس لیے ڈلوایا تاکہ جعلی دستاویزات ضائع ہو جائیں اور جعل سازی کا کس نہ بنے۔ علاوہ ازیں اپنے تئیں یہ باور کر لیا تھا کہ ایسی سنگین واردات سے دوچار ہونے پر بیٹیاں اور بیوی خوفزدہ ہو کر طارق کو فوری واپسی کے لیے رنج سفر باندھنے پر آمادہ کر لیں گی۔ ان کے پاسپورٹ اسی لیے محفوظ رکھے تھے کہ موقع پا کر کسی رات گھر کے کچن میں پیچیک دیں گے۔

آمنہ اپنے تمام تر معاملات کا حل، دینی احکامات کی روشنی میں تلاش کرتی۔ جو بھی مسئلہ درپیش ہوتا، مگر شوہر کی دی ہوئی کتابوں اور قرآن پاک سے رجوع کرنا اس کی پختہ عادت بن چکی تھی۔ بیٹیوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہونے پر مگر مند ضرور رہی۔ ذریعہ آمدن ندارد ہونے سے نوبت فاقہ کشی تک آ گئی۔ بڑی خواری کے بعد ایک اکیڑی میں انتہائی کم معاوضے پر کام مل گیا، جہاں نو جوان لڑکیوں کو روزمرہ کی انگریزی بول چال میں ماہر کرنے کا فریضہ دے لے لیکن اس عورت کا پردے کے شرعی احکامات پر سختی سے کاربند رہنا نہ صرف زکاوت بن گیا بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا جاتا۔ مقدمے کی پیروی بھی اسی لیے نہ کر سکی کہ بے پردگی ہوتی ہے اور مالی وسائل نہ ہونے کے

برابر تھے۔ کئی محلے کے لوگوں کو اس بے سروسامان اور منفرد مزاج کی بیوہ اور یتیم بچیوں سے دلی ہمدردی ہوئی۔ انڈسٹریل کوئٹر رہی کہ ماں بیٹیاں صبح کے وقت انتہائی معمولی ناشتا کر کے شام کے کھانے تک بیوی رہتی ہیں۔ ایک تو اس آبادی کے زیادہ تر لوگ بھی نجی دست تھے، دوسرا اس عورت کی آنا آڑے آ جاتی۔ قرض لیکن نہ خیرات قبول کرتی۔ اکیڑی سے ملنے والے حقیر معاوضے پر گزارہ چلتا رہا۔ رمضان المبارک کی آمد سے پہلے سلیمان ملنے آ گیا۔ اس نے پردے میں رہتے ہوئے دروازے کے پیچھے سے آنے کا سبب پوچھ لیا تو وہ بولا۔ ”بھائی صاحب! ہمارے دین میں اتنی سختی نہیں تھی آپ نے اپنے اوپر روا رکھی ہوئی ہے۔“

وہ بولی۔ ”جی! ہم کہتا ہے، دین میں سختی بالکل نہیں۔ ہم کو خود اس سے بہت خوشی ملا ہے۔“ وہ کہنے لگا۔ ”آپ قرآن وحدیث کا مطالعہ کرتی ہیں۔ اس میں بے شک دیکھ لیں کہ زکوٰۃ پر آپ کا جائز حق پتا ہے۔ میں زکوٰۃ لینی کا چیز میں ہوں۔ قانون یہ ہے کہ سخت فرد کو بذریعہ چیک ادائیگی کی جائے مگر میرے صوابدیدی اختیارات بھی ہیں۔ کمپنی کے ممبران کی متفقہ منظوری سے زیادہ ضرورت مند کو نقد ادائیگی کر سکتا ہوں۔“

”بہت مہربانی بھائی صاحب!“ آمنہ نے سلیمان کو ٹوک دیا اور بولی۔ ”ابھی ہم اکیڑی جانے گا۔ واپسی پر زکوٰۃ کو اچھی طرح پڑھ لیں گا۔ آپ آنے کا تکلیف مت کرو، فون پر پوچھ لو۔ اللہ کے حکم کو ہم ضرور مانے گا۔“

محمد سلیمان نے کہا۔ ”ایک اور بات کہنا چاہوں گا کہ زکوٰۃ فنڈ کی رقم آپ کو نقد مل جائے گی۔ اس کے علاوہ بہت سے اہل ثروت ہماری کمپنی کے ذریعے امداد تقسیم کرتے ہیں۔ اس میں رمضان کی بیٹیجے بنا ہوتا ہے۔ مٹی، آٹا، چینی، دالیں وغیرہ، بہت کچھ ہوتا ہے۔ وہ بھی لے آؤں گا۔ اس میں لینے اور دینے والے، کسی کا اجر کم نہیں ہوتا۔“

وہ جواب میں بولی۔ ”جی بھائی صاحب! اللہ بہت رحیم ہے، اس کا ہم کو پتا ہے۔“

اکیڑی سے واپسی پر آمنہ نے بڑی توجہ سے زکوٰۃ کے احکامات کا مطالعہ کیا اور پوری طرح مطمئن ہوئی کہ وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے۔ مزید یہ کہ اس کو قبول کرنے میں کسی قسم کی قیاحت نہیں۔ سلیمان کی فون کال آنے پر اس امر کی تصدیق کر دی اور کہا کہ وہ جس شکل میں چاہے، امداد لے آئے۔ فون بند کرنے سے پہلے جو آخری جملہ بولی، اس کا مضمون کچھ اس

طرح کا تھا۔ ”بھائی صاحب! یہ کارخیز جو آپ کرنے جا رہے ہیں، اس کا اجر صرف اللہ پاک سے مانگے گا۔“

سلیمان اپنی ذاتی کار میں اچھا خاصا سامان رکھ کر لے آیا اور ڈیوڑھی کا دروازہ کھلوادیا۔ ڈکی سے آئے کا ایک تھیلا نکال کر خود اندر رکھا۔ اس کے بعد تین کارٹن باری باری اٹھا کر اندر لایا۔ آخر میں ایک بڑا سا پلاسٹک کا تھیلا اٹھائے ہوئے آگیا۔ آمنہ پوری طرح پردے میں تھی اور کوئی نہ لگی کھڑی دیکھتی رہی۔ اس نے چند ایک بار شکر یہ کے الفاظ ادا کر دیے۔ سلیمان نے آخری تھیلا کارٹن پر رکھتے ہوئے بتایا کہ اس میں بسکٹ، مٹھائی، بکجوریں اور کچھ خشک میوہ جات ہیں۔ باقی کے تینوں کارٹنوں میں چاول، دالیں، چینی، پتی، گھی اور دودھ ہے۔ انشاء اللہ کوئی کمی نہیں آئے گی۔ میں ایک فون کال پر ہر وقت حاضر ہوں۔

جب سے یہ کیے ہوئے ہزار روپے مالیت کے چند نوٹ نکالے ہوئے سلیمان نے تین چار چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور آمنہ کے قریب آگیا۔ دایاں ہاتھ جس میں رقم تمام رکھی تھی، اس کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”یہ لیجیے۔۔۔۔۔ اور جب بھی ضرورت پڑے، صرف اشارہ کر دیجیے گا۔“ سلیمان کی آواز میں لرزش آگئی تاہم اس نے آمنہ داہنا ہاتھ آگے بڑھا رکھی تھی۔ نہ جانے کیا غصہ کی خاتون کو نوٹ پلانے کے بجائے بائیں ہاتھ سے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تمام لیا اور رقم تھیلی پر رکھتے ہی اپنی تھیلی اس پر بھادی۔ دھونچ بات سے لرزتی آواز میں بول پڑا۔ ”اسلام میں اتنی کمی نہیں، جتنی آپ نے اپنے دماغ پر سوار کر رکھی ہے۔“ ساتھ ہی اس کے سر اُپر اوپر سے نیچے تک بڑی بھرپور فریفتہ نگاہ ڈالی۔ لبوں سے کچھ اس طرح کی برسکاری برآمد ہوئی، جس کے بارے میں شاید خود بھی نہ سمجھ پایا ہو کہ بے ساختہ جی کا شعور کی خوش کا شاخسانہ۔

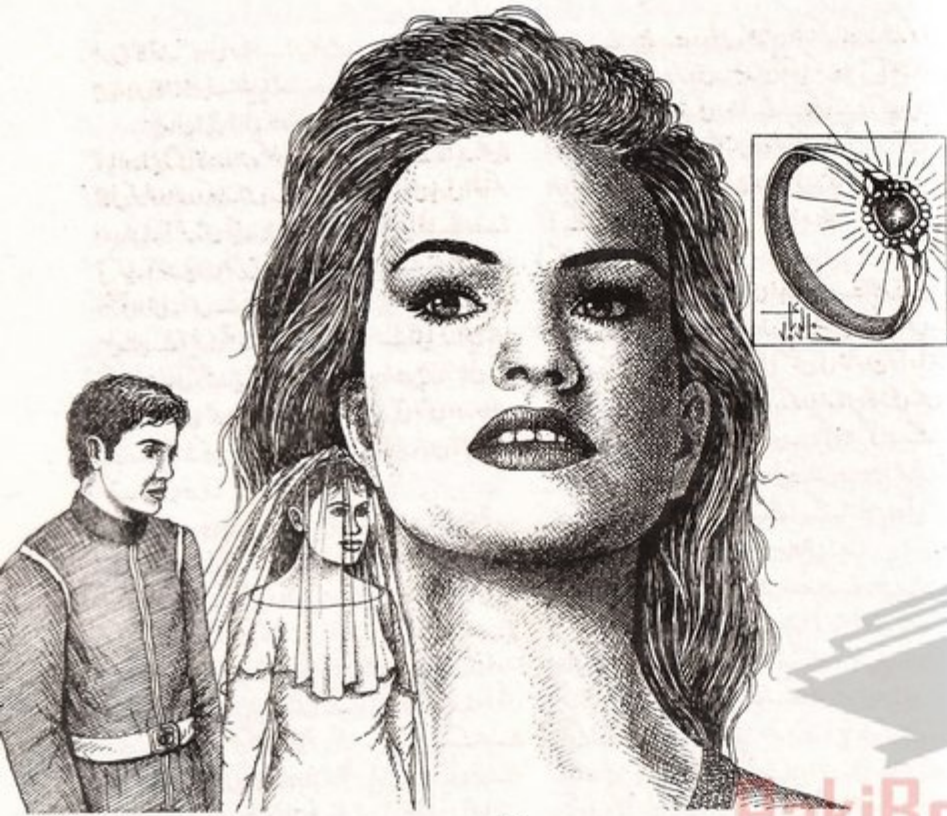
بیت بنی کھڑی خاتون ذرا بھی مشتعل نہ ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس صفائی سے صیقل کیا کہ کبھی نوٹ سلیمان کی بائیں تھیلی پر دھرے رہ گئے۔ ایک لفظ بولے بغیر آگے بڑھی۔ اُلٹے ہاتھ میں ڈرائی فروٹ والا تھیلا اٹھایا اور سیدھے ہاتھ کی انگلیاں ایک کارٹن کے گرد لپٹے اسٹریپ میں پھنسا کر اٹھا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں چیزیں دروازے سے باہر رکھ دیں۔ اُسی لمحے سامنے والے گھر سے پڑون اور اس کا جوان بیٹا نکل آیا۔ وہ دونوں اپنے گھر کی کھڑکی کا پردہ ہیرا کر ڈیوڑھی کا منظر دیکھتے رہے تھے۔ سلیمان تنگ سا کھڑا رہ گیا۔ اس نے آمنہ سے آئے والا تھیلا بھی فرش پر گھسیٹتے ہوئے گلی میں لا ڈالا۔

پڑون نے بیٹے سے دونوں کارٹن اٹھا کر باہر رکھنے کو کہا۔ اس نے فوراً تعمیل کر دی۔ سلیمان گھٹکیا کر بولا۔ ”آمنہ بہن! ایسا مت کرو۔ یہ اللہ کی رضا کے لیے کیا ہے، آپ پر کوئی احسان نہیں۔۔۔۔۔“ اس اثنا میں وہ خود بھی باہر گلی میں آن کھڑا ہوا تھا۔ اڑوس پڑوس کے چند اور مرد و خواتین بھی نزدیک آگئے۔ آمنہ کچھ نہ بولی اور دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈیاں چڑھا لیں۔

اگلے روز صبح نو بجے ہی اہلکاروں سے بھری پولیس موبائل کے ساتھ ایک لینڈ کروزر آن کھڑی ہوئی، جس سے آمنہ کے آبائی وطن کے سفارتی مشن کی خاتون کو آرڈینیٹر نکلی۔ اس کے ساتھ آئے محلے کے دو ارکان گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ ہر عمر کے مرد و خواتین سے گلی بھر گئی۔ محلے کے معزز بزرگ حاجی ذکا اللہ کی معیت میں دو ادھیڑ عمر خواتین اور دو بوڑھے مرد، آمنہ سے ملنے آگئے۔ معلوم ہو گیا کہ وہ اپنی بیٹیوں کے ہمراہ وطن واپس جا رہی ہے۔

حاجی ذکا اللہ دل گرفتہ سے ہوئے بول پڑے۔ ”بیٹی! ہم تمہارے مجرم ہیں۔ بڑی کوتاہی ہوگئی۔ مرحوم طارق محمود کے ساتھ سر اسر ظلم ہوا۔ ہمیں ہر حالت میں اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ گلی محلے کے لوگ شرمندہ ہیں اور نضا سوگوار ہوگئی ہے۔ تم واپس مت جاؤ۔ ہم تمہاری فیکٹری اور مکان کا مقدمہ جیت کے دکھائیں گے۔ طارق مرحوم اپنی بیٹیوں کو جس خراب ماحول سے نکال لایا، اس میں ان معصوموں کو واپس مت لے جاؤ۔“

آمنہ نے بڑے تحمل سے بات سنی اور کہا۔ ”جن بھائیوں نے مکان اور فیکٹری کے واسطے ایمان خراب کر لیا، اُن سے یہ چیز مت چھینو۔ انہوں نے بہت زیادہ قیمت دے دیا۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور ادھر ہمارے وطن میں بیٹی کو خطرہ نہیں۔ ادھر بیٹی اور ہم کو بھی خطرہ ہے۔ وہاں جب عورت خود خرابی مانگتا، اس کو برابر مل جاتا۔ یہاں جو عورت خرابی نہیں مانگتا، اس کو بھی بہت لوگ زبردستی خرابی دیتا۔ ہم نے شادی سے پہلے طارق محمود کا آنکھ دیکھا۔ خوب جان گیا، تنگی والا اچھا آنکھ کیسا ہوتا۔ ادھر اکیڑی کا اوزر۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ اور بہت زیادہ لوگ۔۔۔۔۔ اپنا ایک میل اسٹوڈنٹس کا آنکھ دیکھا۔۔۔۔۔ سب نہیں، جموڑا بہت عورت کو خرابی دینے کے واسطے دیکھتا۔ اچھا نہیں۔۔۔۔۔ آئی ایم سوری۔ سب اچھا ہو گیا۔ ہم کو ”خدا حافظ“ کا کفٹ دے دو۔۔۔۔۔ اور فی۔۔۔۔۔ فی امان اللہ“ کا کفٹ ہم بھی دیتا، آپ کو۔“



چور

شرعباس

روپ بدلتی اس دنیا میں انسان بناوٹ کا اس قدر عادی ہو چکا ہے کہ نہ تو اپنا اصل ظاہر ہونے دیتا ہے اور نہ ہی دوسرے کی حقیقت جان پاتا ہے مگر۔۔۔ اس کے باوجود جب دوسرے کی اصلیت کا پردہ چاک ہوتا ہے تو صرف دوسرے پر ہی غصہ آتا ہے، اسی پر افسوس ہوتا ہے مگر اس وقت بھی وہ اپنے بدلے روپ کو ظاہر نہیں ہونے دیتا، البتہ دل میں ایک کسک سی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک چور کا دوسرے چور سے ملاپ اور بعد اُن کا انوکھا ماجرا

تیس سال بعد بھی ہم اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔ ہم نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ یہ بات ہمارے درمیان ہی رہے اور کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو، ورنہ ہمارے بارے میں غلط تاثر قائم ہوتا تاہم ہر کوئی پیٹھ پیچھے کسی اور کو الزام دے رہا تھا اور وجہ تلاش کر رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بالکل اس جاسوسی کہانی کی طرح جس کے ہر کردار پر قاتل ہونے کا شبہ ہو۔ میری جو ہماری ہیڈ گرل ہوا کرتی تھی، اس کا خیال تھا

کہ یہ حرکت جبین نے کی ہوگی جسے ہم جبین دی برین کہا کرتے تھے۔

”وہ ہمیشہ بین لوپ سے ملتی جس کے پاس اس کے مقابلے میں بہت کچھ تھا۔ وہ خوب صورتی، ذہانت اور امارت میں جبین سے آگے تھی۔“ میری نے کہا۔ اس کے آباؤ اجداد جرمنی سے جنوبی افریقا آئے تھے۔

یہ سچ ہے کہ بین لوپ کے پاس وہ سب کچھ تھا جس سے جبین غروم تھی۔ وہ باکی اور ہیرا کی، کی بہت اچھی کھلاڑی ہونے کے علاوہ شیش کی کپتان بھی تھی۔ یہاں تک کہ وہ راونڈر بھی بہت اچھا کھیلتی تھی۔ اس کا قد لائبا، سیاہ کھنکھرا لے بال، خوابیدہ براؤن آنکھیں، ملائم جلد اور خوبصورت ہونٹ اس کی دلکشی میں اضافہ کرتے تھے۔ وہ جب نرم اور شائستہ لہجے میں کسی کو مخاطب کرتی تو لگتا کہ اس کی زبان سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ وہ سب کی دوست تھی۔ ہر ایک سے ہنسی مذاق کرتی اور کھلے دل کی مالک تھی۔

دوسروں کی رائے تھی کہ یہ میری کی حرکت بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اس نے بچپن میں بڑی سختیاں جھیلی تھیں اور اس وجہ سے وہ احساس محرومی کا شکار ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے جرم کو چھپانے کے لیے پولیس کو بلانے کی مخالفت کی تھی۔

کچھ لوگ شلا کو بھی مورد الزام ٹھہراتے تھے جو بالآخر جنوبی افریقا سے ہجرت کر کے امریکا چلی گئی۔ اس پر الزام لگنے کی وجہ یہ تھی کہ جب اس نے اسکول میں ہونے والے ڈانس فنکشن میں بین لوپ کو خوب صورت سفید لباس میں دیکھا تو اسے اس پر رشک آنے لگا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جبکہ شلا کا کہنا تھا کہ اسے اس لیے رونا آیا کہ بین لوپ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

اس ڈانس فنکشن میں بین لوپ نے سفید لباس پہنا تھا جس کے سامنے والے حصے پر گلابی پھول کڑھے ہوئے تھے۔ اس نے میری کو بتایا کہ یہ لباس اس کی ماں نے لندن کے ہبروڈز اسٹور سے خریدا تھا۔ میری اس وقت ہیڈ گرل تھی اور ہم سب پر حکم چلاتی تھی۔ اس نے اپنی خوبصورت اور نازک گردن میں جھپکتے ہوئے موتیوں کا ہار بھی پہن رکھا تھا۔

”بہت خوبصورت.....!“ جبین نے اسے دیکھ کر بے ساختہ کہا۔ اس نے اپنی ماں کے ہاتھ کا ہاتھ ہوا معمولی لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کی موتی گردن میں سے موتیوں کی مالا بہت تنگ لگ رہی تھی۔ بین لوپ کے خوبصورت لباس میں اس

کی پتلی کمر اور گداز شانے پوری طرح نمایاں تھے۔ وہ جب ایک میڈیم نو جوان کے ساتھ ڈانس فلور پر آئی اور اس نے ایک پھول کی طرح بازو پھیل کر..... دائرے کی شکل میں ناچنا شروع کیا تو دیکھنے والے دل تھام کر رہ گئے۔ شلا سے بھی ضبط نہ ہو سکا اور اس نے رونو شروع کر دیا۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ اسے ہمیشہ سے رونے کی عادت تھی۔ چاہے خوشی کا موقع ہو یا غم کا..... اس کے آنسو نکل پڑتے تھے۔ ”تمہیں یاد نہیں کہ جب وہ پہلی بار گر جائی اور اس نے دل کی بات کہتے ہوئے جو اعتراضات کیے تو وہ بری طرح رو رہی تھی۔“ جولیا نے کہا جو لاطینی زبان میں ہمیشہ اچھے نمبر لے کر آتی تھی۔

ہم میں سے کوئی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح کا واقعہ ہمارے ساتھ کیوں پیش آیا۔ ہماری کلاس کرچین گراؤز کے نام سے پجانی جاتی تھی۔ جب ہم گرجا میں عبادت کرتے تو اس وقت ہمیں یہ بات شدت سے محسوس ہوتی کہ ایسی لڑکیوں کے ساتھ یہ واقعہ کیسے پیش آ سکتا ہے جنہوں نے ہمیشہ یہی سیکھا کہ خدا کی نظر میں ہم سب برابر ہیں۔

ہم سب لڑکیاں ایٹھلیکن بورڈنگ اسکول میں کئی سالوں سے رہ رہی تھیں۔ اسے اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی دو غیر شادی شدہ عورتوں نے قائم کیا تھا جو بیسویں صدی کے شروع میں عیسائیت کی تبلیغ اور تعلیمات کا پرچار کرنے آئی تھیں۔ انہوں نے جو کام شروع کیا، اس میں چالیس اور پچاس کی دہائی میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

بین لوپ نے ہمارے ساتھ ہی میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس نے انگریزی اور تاریخ میں امتیازی نمبر حاصل کیے مگر اس کی جبین کی طرح فرسٹ پوزیشن نہیں آ سکی جس کے تمام مضامین بالخصوص حساب میں اچھے نمبر آئے۔ گوکہ وہ ہماری کلاس کی سب سے خوبصورت اور امیر ترین لڑکی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ اس کا باپ مرچکا ہے اور اس کی ماں کے لیے دو ذمہ داریاں دولت چھوڑ گیا ہے۔ اس کے باوجود اسے کلاس میں سب سے ہوشیار طالب علم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بہت زیادہ اساتذہ ہونا کوئی اثاثہ نہیں سمجھا جاتا تھا اور اس کی کوئی قدر نہیں تھی۔ جبین دی برین جیسی لڑکی اپنا بیشتر وقت کتابیں پڑھنے میں گزار دیتی لیکن وہ کھیلوں میں اچھی نہیں تھی جبکہ اسپورٹس کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

اسکول میں روزانہ دو پیر میں لچ کے بعد دو گھنٹے کوئی نہ کوئی کھیل کھیلا جاتا تھا۔ باکی، ٹینس اور تیراکی وغیرہ تھی۔

اگر کبھی بارش ہو رہی ہوتی جو بہت کم ہوا کرتی تھی تو ہم کوئی ان ڈور ٹیم مثلاً ٹیبل ٹینس، کیرم بورڈ یا ڈرافٹ کھیلا کرتے۔ ہمیں روزانہ دو اک کے لیے میدان میں لے جایا جاتا۔

ہمارا خیال تھا کہ موتی گردن اور چشمہ لگانے والی جبین کی کبھی شادی نہیں ہوگی اور وہ اسکول ٹیچر یا لائبریرین جیسی فصول ملازمت کر کے زندگی کے دن گزارے گی کیونکہ ان دنوں ہمارے ملک میں ذہین عورتوں کو اسی طرح کی ملازمت مل سکتی تھی۔

ہم نے اسکول چھوڑنے کے بعد کافی عرصے تک بین لوپ کے بارے میں کوئی خبر نہیں سنی۔ البتہ شلا جو بعد میں مصنفہ بن گئی، وہ بین لوپ کے گھر کے پاس ہی رہتی تھی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ بین لوپ کی ماں نے اپنا بڑا گھر اور باغ فروخت کر دیا ہے اور ایک نسبتاً معمولی علاقے کے چھوٹے سے فلیٹ میں چلی گئی ہے۔

بین لوپ اور اس کی ماں ایک بہت بڑے پارٹمنٹ میں رہتی تھیں جس میں ایک وسیع و عریض باغ، ٹینس کورٹ، روزگار ڈن اور بہت بڑا سونگ پول بھی تھا۔ ہم میں سے اکثر لڑکیوں کو اتوار کے دن وہاں مدعو کیا جاتا جہاں ہم پول کے کنارے سفید چھتریوں کے سامنے اس کے باورچی کے بنائے ہوئے چکن روٹ اور فروٹ سلاد کا مزہ لیتے۔ دھوپ کی تمناز سے ہمارے چہرے سرخ ہو رہے ہوتے اور ہم ہی تان کر سو جاتے۔ بین لوپ کی ماں بڑے مکملے دل کی عورت تھی۔ وہ اکثر ہڈ شین طالب علموں کو اپنے گھر مدعو کرتی جو اپنے گھروں سے بہت دور تھے۔ وہ خاص طور پر جبین کو ضرور بلاتی جسے ہمیں اور مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔

”اس کی ماں کا کہنا تھا کہ اسے بڑے گھر میں وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی۔“ یہ بات ہمیں شلا نے بتائی جو سائیکالوجی پڑھ رہی تھی۔ ”لگتا تھا کہ وہ اپنے لوگوں میں جانا چاہ رہی تھی۔“ شلا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ شادی سے پہلے بین لوپ کی ماں غریب بستی میں رہنے والی غریب لڑکی تھی۔ بین لوپ کا باپ بہت امیر آدمی تھا اور وہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔

اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ہم میں سے زیادہ تر لڑکیاں wits (بزنس اسکول) یا کیپ ٹاؤن یونیورسٹی کی کونسل میں بین لوپ ایک سالہ اطالوی زبان کا کورس کرنے کے لیے فلورنس چلی گئی۔ جانے سے پہلے اس نے کہا۔ ”اطالوی زبان بہت ہی خوبصورت ہے۔ میں یہ زبان سیکھنا چاہتی ہوں تاکہ دانستے کو پڑھ سکوں۔“ اس اسکول کو

چلانے والی ہمارے ہی اسکول کی ایک سابق ٹیچر تھی جس سے بین لوپ کی ماں کی دوستی ہوئی تھی اور وہ اکثر فلاحی کاموں میں اس کی مدد کرتی رہتی تھی۔

پھر ہم نے میری کی زبانی سنا کہ بین لوپ کی شادی ہو رہی ہے۔ شاید وہ سب سے زیادہ اس کے قریب تھی۔ گوکہ بین لوپ ہم سب کو کبھی پسند کرتی تھی لیکن میری اس سے راپٹے میں تھی اور ان کے درمیان خط کتابت ہوتی رہتی تھی اور خط کے ذریعے ہی میری کو اس کی شادی کی اطلاع ملی۔

”اس کی شادی ہو رہی ہے اور تمہیں اندازہ ہے کہ اس کا ہونے والا شو ہر کون ہے؟“ میری نے ہم سے پوچھا لیکن ہمیں کچھ اندازہ نہیں تھا کیونکہ وہ ابھی بہت کم عمر کی اور اتنی جلدی اس کی شادی کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس لیے ہم اس کے ہونے والے ڈیڑھ کے بارے میں کوئی قیاس آرائی نہ کر سکے۔

”تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ وہ کوئی اطالوی شہزادہ ہوگا۔ اس کا تعلق ایک قدیم ترین اطالوی خاندان سے ہے اور وہ روم کے قریب ایک بہت بڑے خوبصورت ولا میں رہتا ہے۔“

اس وقت بین لوپ کی عمر یہ مشکل انیس برس ہوگی اور اس کی شادی ہو رہی تھی، وہ بھی ایک شہزادے سے۔ ہمیں بین لوپ کی قسمت پر رشک آنے لگا اور اس کے ساتھ ہی اس کے لیے حسد کا جذبہ بھی سراٹھانے لگا۔ جب میری نے تفصیلات بتائیں تو ہم سب حیران رہ گئے۔ ٹینن ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ شادی کے بعد روم کے مصافات میں واقع اس ولا میں رہے گی جس کا نقشہ کسی نامور اطالوی آرکیٹیکٹ نے بنایا تھا۔ میری نے یہ بھی بتایا کہ اس ولا کی تاریخی اہمیت بھی ہے۔ کسی زمانے میں اسے پوپ اور جرنلوں کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا۔

ہمیں یاد تھا کہ بین لوپ محض دکھاوے کی خاطر آئینے کے سامنے ایک مخصوص قسم کے رقص کا مظاہرہ کیا کرتی تھی جس میں ایک ایک کر کے تمام کپڑے اتار دیے جاتے ہیں اور جسم کے مخصوص حصوں کو چھپانے کے لیے ان کے گرد ایک کپڑا لپیٹ لیا جاتا ہے۔ اس رقص کے دوران وہ آئینے کے سامنے چکر لگا کر ایک خاص انداز میں اپنے جسم کے کچھ حصوں کو حرکت دیتی تھی اور ہم سب تالیاں بجا کر اسے داد دیا کرتے۔ اب ہم سوچ رہے تھے کہ کیا بین لوپ نے شہزادے کو بھاننے کے لیے اس کے سامنے یہی رقص کیا ہوگا؟

وہ کوئی شرمیلی لڑکی نہیں تھی اور اس نے کئی بار اس

خواب میں کا بر ملا اٹھ کر کیا کہ وہ اداکارہ بننا چاہتی ہے۔ وہ کلاس میں نظمیں پڑھتی اور گانے سناتی۔ گوکہ اس کی زبان میں بگڑی سی تھلاہٹ تھی لیکن وہ اپنی آوازوں سے سارا باندھ دیتی تھی۔ جب وہ دونوں بازو پھیلا کر جسم کو مخصوص انداز میں حرکت دیتی تو ہم سب بے اختیار تالیاں بجانے پر مجبور ہو جاتے۔ اس نے اسکول کے ڈراما کیمپیشن میں بھی پہلا انعام حاصل کیا تھا جبکہ اس کے مقابلے میں جولیا اور شلاہٹیں جو آخری نمبر پر رہیں کیونکہ وہ اپنی لائٹیں بھول گئی تھیں۔

کچھ دنوں بعد ہمیں اس کی ماں کی جانب سے ویڈیو شاور، میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ یہ تقریب لڑکی کی شادی سے پہلے منعقد ہوتی ہے اور اس میں دوست، رشتے دار لڑکی کو اپنی حیثیت کے مطابق تحفے دیتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ شہزادے کی حیثیت کے پیش نظر یہ تقریب کسی ہول یا مال میں ہوگی لیکن بین لوپ کی ماں نے بتایا کہ انہوں نے بہت کم لوگوں کو بلایا ہے۔ اس لیے یہ تقریب گارڈن اپارٹمنٹ کے کپاؤنڈ میں رکھی گئی ہے۔ ہم سب کو اس موقع پر بین لوپ کے لیے تحائف خریدنا تھے جس پر کافی دیر تک بحث ہوتی رہی کہ اسے کیا تحفہ دیا جائے۔ روایتی طور پر کوئی چھوٹا تحفہ ہی دیا جاتا ہے، بالخصوص ایسی اشیاء جو بچپن میں استعمال ہوتی ہوں لیکن شہزادے کو کیا دیا جائے؟ اس نے تو شاید کبھی بچپن کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ سب لوگ مختلف چیزوں کے نام جو بزرگ رہے تھے لیکن کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

”تم کیا پہنو گی؟ کیا ہمیں ہیٹ بھی پہننا ہوگا؟“ جولیا نے میری سے پوچھا۔

اسکول میں ہم سب ایک جیسا لباس پہنتے تھے۔ گرمیوں میں آجی آستین کا سفید بلاؤز اور سردیوں میں پوری آستینوں کا نیلے رنگ کا بلاؤز اور ٹائی جبکہ گرمیوں میں جانے کے لیے پانا ماہیٹ پہنا جاتا تھا۔ ہم ہر روز صبح کے وقت کلاس شروع ہونے سے پہلے گرم جاتے تھے۔ ہمارے بیروں میں تسوں والے ہماری جوتے ہوتے اور ہمیں زیور پہننے یا میک اپ کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ البتہ ہم شام کو ٹیبلینے اور غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کر سکتے تھے۔

رات کو ہم طویل خواب گاہ میں قطار میں لگے ہوئے سخت بستر پر سوتے اور ہمارے کانوں میں رات والے چوکیدار کے قدموں کی آواز گونجتی رہتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے سیٹی بھی بجاتا۔ اسے

دوسروں کی نیند خراب ہونے کی بالکل پروا نہیں تھی۔ ہم ایک بہت ہی سخت اور منظم زندگی گزار رہے تھے۔ ہمیں ایک جیسے قوانین پر عمل کرنا ہوتا۔ ہم ایک ہی انداز میں سو جاتے اور ایک ہی طرح محسوس کرتے۔ ہمیں کسی لڑکے سے بات کرنے اور اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمیں اسکول اور چرچ میں یہی بتایا جاتا تھا کہ خدا کی نظر میں سب انسان برابر ہیں لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ ہمارا اس بات سے یقین اٹھ گیا۔

بین لوپ کی ماں کی طرف سے دی گئی پارٹی میں ہمیں اس بات پر شبہ ہونے لگا کہ خدا کی نظر میں ہم سب برابر ہیں اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ایسا بالکل نہیں ہے اور خدا نے سب انسانوں کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف بنایا ہے۔ ہم سب براہ راست اس دروازے میں داخل نہیں ہوں گے جو ابدی زندگی کی طرف جاتا ہے۔

بین لوپ کی ماں نے اپنے گراؤنڈ فلور اپارٹمنٹ کے دروازے پر ہمارا گرم جوش سے استقبال کیا۔ اس نے کاسنی رنگ کا چمکدار لباس پہن رکھا تھا اور اپنی عمر سے کافی کم نظر آ رہی تھی۔ بعد میں ہم سرگوشیوں میں اس پر تبصرہ کرنے رہے کہ تمام ترکوش کے باوجود وہ اپنے چہرے اور جلد کی جھریاں چھپانے میں ناکام رہی۔ گوکہ اس کی عمر بمشکل ساٹھ سال ہوگی۔

وہ ہمیں ایک چھوٹے سے تاریک ہال سے گزار کر لمختہ صحن میں لے گئی جو روشنیوں میں جھلک رہا تھا۔ شلاہٹیں کچھ جاننے کی جستجو میں رہتی تھیں۔ اس نے سرگوشی میں ہم سے کہا کہ بین لوپ کہاں ہے اور یہ کہ کیا ہم شہزادے سے مل سکیں گے؟ وہ فلیٹ کے دوسرے حصے بھی دیکھنا چاہ رہی تھی۔

اس صحن میں چھوٹی لوہے کی میزیں لگائی گئی تھیں جس پر خوبصورت گلابی رنگ کے میز پوش بچھائے گئے تھے۔ ان میزوں پر زرد اور سفید پھولوں سے بھرے ہوئے شیشے کے پیالے ایک خاص ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہر میز پر شیشے کی نازک پلیٹوں میں سینڈویچ، کیک، مختلف اقسام کے بسکٹ اور تلی ہوئی پھلتی پھل سے رکھ دی گئی تھی۔ چائے کی پیالیاں، گلاس اور مشروب کی بوتلیں بھی موجود تھیں۔ یہ ساری تیاری اس لیے کی گئی تھی کہ ہم خود ہر چیز لے سکیں کیونکہ وہاں ہماری خدمت کے لیے کوئی ملازم موجود نہیں تھا۔

”میں چاہتی تھی کہ اس تقریب میں صرف بین لوپ کی قریبی سہیلیاں ہی شریک ہوں۔“ اس کی ماں نے کہا۔

”مجھے زیادہ لوگوں کو جمع کرنا اچھا نہیں لگتا۔ تم لوگ آرام سے بیٹھو اور تقریب کا انتھار کے بغیر کھانا چٹنا شروع کر دو۔“ ہمیں یہ اہتمام دیکھ کر اسکول میں ملنے والا کھانا یاد آیا۔ ہمیں وہاں شائے اور کھانے میں دلیا، گوشت کے چند ٹکڑے اور خوب کچی ہوئی سبزیاں ملتی تھیں۔ ہمیں دو پہر کے کھانے کے بعد صرف دو تالیاں کھانے کی اجازت تھی اور اس دوران بھی ہماری نگرانی ہوتی رہتی تھی جبکہ اس پارٹی میں ہمارے سامنے جو کچھ رکھا ہوا تھا، اس کا تو ہم نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

گوکہ وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ اس طرح کے تبصرے کیے جاتے کیونکہ یہ ایک بدشگونی ہوتی اس لیے ہم نے بعد میں اس پر گفتگو کی۔ البتہ اس وقت ہم اس تقریب میں شرکت کر کے بہت خوش تھے اور دوسرے دن اس کی شادی میں آنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

ہم نے اس تقریب میں شرکت کے لیے ہلکے رنگوں کے لمبوسات منتخب کیے تھے اور چند ایک نے تو ہیٹ اور سوئی دستاں بھی پہن رکھے تھے البتہ جین کا لباس سب سے مختلف اور معمولی تھا۔ اس نے لینن کی چٹلون اور سفید قمیض پہن رکھی تھی اور اس کے بالوں کو دیکھ کر یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کے سر پر پیالہ رکھ کر چاروں طرف سے اس کے بال کاٹ دیے ہوں۔ ہم امید کر رہے تھے کہ شاید اس موقع پر ہم پرس سے ملاقات کر سکیں۔

ابتداء میں تو صرف بین لوپ کی ماں ہی وہاں تھی۔ وہ مسلسل ہمارے گرد منڈلا رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی کہ ہم کھانے میں کوئی تکلف نہ کریں اور اس بات کو جتنی بتائیں کہ ہماری پلیٹوں میں تمام چیزیں موجود ہوں اور گلاس مشروب سے بھرے ہوئے ہوں۔

ہم نے خوب ڈٹ کر کھایا۔ شراب پی اور خوش گپیاں کرتے رہے جب تک کہ بین لوپ خود وہاں نہ آگئی۔ وہ بغیر آستینوں والے گلابی لباس میں بہت خوبصورت اور تروتازہ لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھائی ہوئی تھی جس سے اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔

وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور تمام میزوں پر جا کر ہر ایک سے فردافرد اُٹھ گئی اور..... بوسہ لینے ہوئے بولی۔ ”تمہاری آمد کا شکریہ.....“ یہ الفاظ اس نے اطالوی زبان میں ادا کیے اور ہمیں یوں لگا جیسے وہ کسی ادبیرا میں نگاہی ہو پھر اس نے ایک سینڈویچ اور مشروب کا گلاس اٹھایا اور کھڑے کھڑے اس کے گھونٹ لینے لگی۔

کچھ دیر بعد پرس بھی آگیا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت تھا۔ سیاہ بال، دہلا پتلا اور درمیانہ قد..... وہ بالکل سیدھا اور باوقار انداز میں چل رہا تھا اس لیے اپنے اصلی قد سے کچھ زیادہ ہی نظر آیا۔ وہ جب صحن پار کر کے ہمارے پاس آیا تو یوں لگا کہ وہ رقص کر رہا ہو لیکن اس کے چلنے کا انداز ہی ایسا تھا۔

جین نے شلاہٹ سے سرگوشی میں کہا۔ ”ہمیں اسکول میں بتایا جاتا تھا کہ خدا کی نظر میں سب انسان برابر ہیں لیکن دیکھو، کچھ لوگ بہت خوبصورت، اسارٹ اور امیر ہوتے ہیں اور کیونکہ ان کے پاس دولت ہوتی ہے، اس لیے وہ خوب صورت لڑکیوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔“

شہزادہ صرف خوبصورت اور اسارٹ ہی نہیں بلکہ مہذب اور شائستہ اطوار کا مالک بھی تھا۔ اس نے جبکہ ہمارے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اطالوی زبان میں چند خوب صورت جملے ادا کیے جو ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آئے لیکن بین لوپ نے ان کا ترجمہ کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”بین لوپ کتنی خوش قسمت ہے کہ اسے اتنی خوبصورت سہیلیاں ملیں۔“

گوکہ ہم سب اتنے خوبصورت یا اچھے نہیں تھے لیکن ہم نے محسوس کیا کہ اس نے ہم سے ہر ایک میں کوئی قابل قدر خوبی دیکھی ہوگی، جیسی وہ ہمیں دیر تک اپنی سیاہ چمکدار آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

پھر اس نے ایک گلاس پر کاٹنا مار کر خاموشی اختیار کرنے کے لیے کہا اور ہم سب اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اب وہ ہمارے سامنے کھڑا منگرا رہا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک سرخ ویلٹ کی ڈبیا نکالی پھر اس نے اسے ہوا میں یوں اٹھرایا جیسے کوئی جادوگر ہیٹ میں سے رومال نکالتا ہے پھر اس نے وہ ڈبیا بین لوپ کو دیتے ہوئے کہا۔ ”محبت کے ساتھ“ اور ایک بار پھر شلاہٹ کے آنسو بہنے لگے۔

بین لوپ نے وہ ڈبیا کھول کر اس میں سے ایک شاندار چوکور..... زرد کی انگوٹھی نکالی۔ شہزادے نے اطالوی زبان میں بتایا کہ یہ ان کی خاندانی انگوٹھی ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی ہوئی اس کی دادی تک پہنچی اور اب وہ اسے اپنی منگیت کو پہنا رہا ہے۔ ایک بار پھر بین لوپ نے ہمیں سمجھانے کے لیے اس کا ترجمہ کیا اور ہمیں یوں لگا کہ یہ کارروائی کچھ زیادہ ہی طویل چکڑی ہے جس کی طرف بعد میں میری نے بھی اشارہ کیا لیکن اس وقت ہم نے اس بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی کیونکہ ایک تو وہ اطالوی بول رہا تھا جس کا ترجمہ کرنے میں بھی کچھ وقت لگا اور پھر اس میں تھوڑا

سا ڈرامائی عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ اس پر شیلا نے تہمرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بالکل کسی اعلیٰ ادبی اور جبر کا منظر لگ رہا تھا جب بین لوپ نے اس کی گردن میں بازو ڈال کر اس کا بوسہ لیا۔“

ہم سب اپنی گردنیں اٹھا کر اس انگوٹھی کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ بین لوپ کی ماں نے قریب آ کر اس کی تعریف کی اور اسے میز پر رکھ دیا تاکہ ہر کوئی باری باری اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اسے اچھی طرح دیکھ سکے۔ اس کے ساتھ ہی جام صحت پینے کا مرحلہ شروع ہو گیا۔

کئی لڑکیاں بین لوپ کے لیے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئیں جیسا کہ جام صحت کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ گوکہ اس مرحلے پر کچھ باتیں تھوڑی سی عجیب نظر آئیں۔ ہم نے دیکھا کہ شہزادہ ایک میز سے دوسری میز پر جا رہا تھا، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم سب کے گلاسوں میں شراب موجود ہے۔ کئی برس بعد جب ہم نے اس بارے میں بات کی تو کسی کو یاد نہیں تھا کہ کتنے شراب کے گلاس نوش کیے گئے۔ شہزادہ تقریب سے کب گیا اور انگوٹھی کس کے ہاتھ میں تھی۔

البتہ ہمیں اتنا ضرور یاد تھا کہ اس روز سب لوگوں نے شراب کے کئی گلاس طلق میں اٹھ لیے اور خوب ڈنک کر کھایا۔ جب بین لوپ نے ہمارے لائے ہوئے حقے کھولے تو میز پر گلابی اور سفید نشوونچہ زکا ڈھیر لگا گیا۔ جب بھی کوئی پیکنٹ کھولا جاتا تو اس پر تہمرے کیے جاتے اور قہقہے لگنا شروع ہو جاتے۔ سب سے زیادہ مذاق جولیا کا بنا جو اس کے لیے اٹھ بے چینی کی مشین لائی تھی جو موقع کی مناسبت سے ایک نامعقول حقہ تھا۔

اس کے بعد بین لوپ نے کھڑے ہو کر ہمارا شکریہ ادا کیا اور تقریر یاروتے ہوئے کہا کہ اس کی زندگی میں ہماری کتنی اہمیت ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے بازو پھیلا دیے جس طرح وہ گلاس روم میں گاتے ہوئے کیا کرتی تھی۔ اس نے کہا کہ سب اس سے ملنے کے لیے اٹنی ضرورت آئیں اور جتنا عرصہ چاہیں اس کے پاس قیام کریں۔ اس کے دلا میں ہمارے لیے بہت کمرے تھے اور ہمارے آنے کی اسے بہت خوشی ہوگی۔

اس نے ہمیں بتایا کہ اسکول نے اس کی زندگی بتادی اور باپ کے مرنے کے بعد وہی اس کا گھر بن گیا۔ اگر اسکول نہ ہوتا تو اس کی زندگی عذاب بتا دیتی۔ یہ سن کر اس کی ماں نے قہقہے لگایا اور بولی کہ یہ سچ ہے۔

پھر اسے اچانک یاد آگیا اور وہ بولی۔ ”میری انگوٹھی کہاں ہے؟ میرا خیال ہے کہ سب لوگ اسے اچھی طرح دیکھ چکے ہیں، اس لیے اب میں اسے واپس لیتا چاہوں گی۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک ایک کر کے تمام میزوں پر دیکھ ڈالیں لیکن اسے وہ انگوٹھی کہیں نظر نہیں آئی۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی اور ایک دوسرے سے پوچھتے رہے کہ کیا وہ انگوٹھی تمہارے پاس ہے؟ جب سب لوگوں نے لاعلمی ظاہر کی تو ہمارا اضطراب بڑھنے لگا۔ ہم نے میزوں پر سے میز پوش ہٹا دیے۔ تمام پلیٹیں اور گلاس دیکھ ڈالے۔ میزوں کے نیچے فرش پر لگا ہوا دوڑائی۔ یہاں تک کہ گمے بھی دیکھ لیے لیکن وہ زمرہ کی انگوٹھی ایسے غائب ہوئی جیسے اچانک نیند سے بیدار ہونے پر خواب بکھر جاتے ہیں۔

ایک تکلیف دہ خاموشی نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا پھر بین لوپ کی آواز آئی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”اسے یہیں ہونا چاہیے۔ میں یقین نہیں کر سکتی کہ اسے کسی نے اٹھایا ہوگا۔“

میری نے تجویز پیش کی کہ ہم میں سے ہر کوئی کھڑے ہو کر حلفیہ اقرار کرے کہ وہ انگوٹھی اس کے پاس نہیں ہے اور اگر کسی نے وہ انگوٹھی اٹھائی ہے تو وہ چپکے سے یہاں رکھ دے جیسا کہ ہم اسکول میں کیا کرتے تھے۔ شاید کسی نے مذاق میں یہ حرکت کی ہو۔

اس نے ہم سب سے اپیل کی اور یاد دلایا کہ ہم کس طرح ان اصولوں پر عمل کرتے تھے۔ اگر کوئی غلط حرکت کرتے ہوئے پکڑا جائے تو وہ اپنا جرم تسلیم کر لیتا تھا۔ ہمیں ہمیشہ ایمان داری اور سچائی کی تعلیم دی تھی۔ یہاں تک کہ ہم میں سے کوئی بھی خواب گاہ کی روشنیاں گل ہونے کے بعد باتیں نہیں کرتا تھا کہ کہیں کسی دوسرے کی نیند خراب ہو اور نہ ہم نے بھی کسی کے کام کی نقل کی۔

اس کے کہنے پر ہم سب باری باری کھڑے ہوئے اور حلفیہ کہا کہ ہم نے وہ انگوٹھی نہیں اٹھائی۔ بین لوپ نے ہم پر ایک نظر ڈالی اور کہنے لگی۔ ”اب میں کیا کروں؟ فیبریزو سے کیا کہوں گی؟“ یہ کہہ کر اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

بین لوپ کی ماں نے اب تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن وہ کافی پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے شراب کا سہارا لیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”وہ انگوٹھی انمول ہے اور اگر واپس نہ لی تو مجبوراً

پولیس کو بلانا پڑے گا پھر سب کی تلاشی ہوگی اور اس وقت تک کوئی یہاں سے نہیں جائے گا۔“

میری نے چاروں طرف ماپوسی سے دیکھا اور بولی۔ ”ہم بھی یقیناً اس واقعے کی تفسیر نہیں چاہیں گے اور اگر پولیس نے پوچھ پچھ کی یا ہماری تلاشی لی تو یہ نہ صرف ہمارے بلکہ ہمارے پرانے اسکول کے لیے بھی باعث شرم ہوگا۔ ہم سب بین لوپ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہماری بہت ہی پیاری دوست ہے۔“ اس نے تجویز پیش کی کہ ہم سب ایک نئی انگوٹھی خریدنے کے لیے چندہ کر کے رقم اکٹھی کریں کیونکہ یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے۔ ہم اس کے لیے مجھے تنگ کا بندوبست تو نہ کر سکے لیکن ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق اسے کچھ نہ کچھ دینے کی کوشش کی۔ کسی نے اس کی انمول انگوٹھی چرائی ہے اور ہمیں مل کر اس نقصان کی تلافی کرنی چاہیے۔ اگر بین لوپ اور اس کی ماں اذرا و کرم ہماری یہ پیشکش قبول کر لیں۔

بین لوپ نے اپنی ماں سے التجا کی کہ وہ پولیس کو اطلاع نہ کرے۔ وہ یہی کہتی رہی کہ ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔ اس نے ایک بار پھر سارے میز پوش اٹھا کر دیکھے۔ میزوں کے نیچے جھانکا جبکہ میری ہم لوگوں سے چپک وصول کرتی رہی اور اس نے بیچ ہونے والی رقم کا اعلان بھی کر دیا جس میں اس کا اپنا حصہ بھی شامل تھا۔ اس نے سب لوگوں اور ان کی جانب سے عطیہ کی جانے والی رقم کی تفصیل ایک کاغذ پر لکھی۔

ہم سب اچھی طرح جانتے تھے کہ جین کی مالی حالت اچھی نہیں ہے لیکن اس نے سب سے زیادہ رقم عطیے کے طور پر دی۔ بعد میں کچھ لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ ممکن ہے، اسی نے انگوٹھی چرائی ہو جبکہ دوسرے لوگ میری پر شک کر رہے تھے کیونکہ اس نے پولیس کی پوچھ پچھ اور تلاشی سے بچنے کے لیے ہم سب کو اس نقصان کی تلافی کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

دوسرے روز ہم میں سے کسی نے بھی شادی میں شرکت کرنے اور اس کا جشن منانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ہم سب اپنے آپ کو قصور وار سمجھ رہے تھے جیسے ہم سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو لہذا ہم بین لوپ کو سفید عروسی لباس پہنے اور ہاتھ میں گلہستہ پکڑے شادی کے چبوترے کی طرف جاتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ البتہ اس کی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر اخبار میں ضرور دیکھی تھی بلکہ اس کے بعد ہم نے کئی سال تک اسے دوبارہ نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا جس پر ہمیں بہت دکھ ہوا اور یہ شک

کنزنین

☆ مصیبت انسان کو پریشان کرنے کے لیے نہیں بلکہ انسان کو بیدار کرنے کے لیے آتی ہے تاکہ انسان کا رابطہ اپنے رب سے بحال رہے۔

☆ زندگی میں ”انمول“ چیز کبھی نہ توڑنا۔ دل، دوستی، بھروسہ، رشتہ، پیار، وعدہ کیونکہ یہ جب ٹوٹتے ہیں تو آواز نہیں آتی لیکن درد بہت ہوتا ہے۔

☆ عزت، احساس، پیار، شفقت اور محبت ایسے ادھار ہیں جو ضرور واپس ملتے ہیں۔

☆ جس طرح لوگ مُردے کو کندھا دینا افضل سمجھتے ہیں، اسی طرح اگر زندہ کو سہارا دینا افضل سمجھ لیں تو زندگی کتنی آسان ہو جائے۔

☆ خوف خدا ایک ایسا چراغ ہے جس کی روشنی میں نیکی اور بدی صاف نظر آتی ہے۔

☆ جب بھوک دروازے پر دستک دیتی ہے تو عقیدے کھڑکیوں سے بھاگ جاتے ہیں۔

☆ حسد دراصل ایک اعلان ہے، اس بات کا کہ میں اللہ کی تقسیم پر راضی نہیں۔

☆ صبر کے بغیر زندگی میں سکون آ ہی نہیں سکتا اور صبر کے لیے اس بات کا ادراک بہت ضروری ہے کہ مجھ تک پہنچنے والی ہر آزمائش منجانبِ رب ہے۔

☆ سب سے بہترین مددگار تمہارے اپنے دونوں ہاتھ ہیں جب تم اپنی مشکلات کا حل تلاش نہ کر سکو تو اپنے دونوں ہاتھ اکٹھے جوڑ کر اللہ کے آگے پھیلاؤ۔ اللہ، آپ کے ہاتھوں کو کبھی خالی نہیں لوٹائے گا۔

☆ دنیا میں سب سے وزنی چیز خالی جیب ہے جسے لے کر چلنا بہت مشکل کام ہے۔

☆ مسئلہ: راحیلہ شفیق، سندھی ہوئی، نیو کراچی

”حکمت اسی میں ہے کہ تم ادویوں سے بنا کر رکھو گے۔ تمہیں تعاقب کرنے والوں سے خطرہ ہے۔ اگر ادوی بھی تم سے ٹالاں ہو کر تم سے لڑنے کے لیے نکل آئے تو سوچو دو دو طاقتوں سے کیسے لڑو گے۔“
یہ دھمکی ایسی تھی کہ بنی اسرائیل کو خاموش ہونا پڑا اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ لوٹ مار نہیں کریں گے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ لوگوں کو شاہ ادوم کے پاس بھیجا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

رضوانہ صاحبہ

بادشاہت کو خطرہ ہمیشہ سے رہا ہے اور ہمیشہ ہی رہے گا۔۔۔ یہ دور مختلف انبیاء کے آنے کا اور تبلیغی کام کرتے رہنے کا تھا۔۔۔ ان میں مصریوں کے بادشاہ فرعون کا قصہ سرفہرست ہے۔۔۔ حیرت ہے قدرت بھی کیسے کیسے نظارے دکھاتی ہے۔ نجومیوں نے ایک انتہائی طاقتور بادشاہ کے لیے نومولود بچے کو خطرے کی علامت بنا کر اشارہ دے دیا تھا اور انہی اندیشوں میں اس وقت پیدا ہونے والے تمام نومولود بچے قتل کر دیے گئے ماسوائے ایک کے۔۔۔ جسے اللہ نے فرعون کی ہلاکت کا سبب اور اپنا پیغمبر بنا کر دنیا میں اتارا تھا۔ اس دور کی تمام مائیں خوف و دہشت کا شکار تھیں۔ ایسے میں موسیٰ کی ماں کو غیبی آواز آئی ”اس کو دودھ پلا۔۔۔ پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریامیں ڈال دے اور کچھ غم اور خوف نہ کر کہ ہم اسے تیرے ہی پاس لوٹائیں گے اور اسے پیغمبروں میں شامل کریں گے۔“ سبحان تیری قدرت، یہ وعدہ پورا ہوا۔

مصر کی زمین پر سرعونی سازشیں اور
پیغمبر کے معجزات کا احوال

سوال حصہ



جولیانے بتایا کہ وہ اطالوی زبان پڑھاری ہے۔
ہم سب کھانے کے دوران ایک میز کے گرد دائرے کی شکل میں بیٹھے بین لوپ کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمارا تجسس بڑھتا جا رہا تھا لیکن وہ کچھ بچکا رہی تھی جیسے اسے کوئی روک رہا ہو پھر اس نے رک رک کر بولنا شروع کیا۔

اس کی ماں اپنا تمام اثاثہ گنوا چکی تھی اور شہزادے کے پاس بھی اس حست حال ولا کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے صرف اس لالچ میں بین لوپ سے شادی کی تھی کہ وہ اسے ایک امیر زادی سمجھتا تھا اور اسے امید تھی کہ وہ اپنے باپ کی بے تحاشا دولت لے کر آئے گی کیونکہ وہ اس کی اگلی وارث تھی اور یہ کہ اس کے قدیم ولا کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکے گی۔

بین لوپ نے ہچکیاں لیے ہوئے بتایا کہ اس تقریب میں جس انمول انگوشی کے چوری ہونے پر ہنگامہ ہوا، اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ گوکہ وہ منگنی کی انگوشی پہننا چاہ رہی تھی لیکن شہزادے کے پاس اسے خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ اس کا تمام اثاثہ بہت پہلے گروی رکھا جا چکا تھا۔ ہم نے جس انگوشی کو دیکھ کر اس کی تعریفیں کی تھیں، وہ نقلی تھی اور وہ بھی گم نہیں ہوئی بلکہ خفیہ طریقے سے شہزادے کی جیب میں چلی گئی تھی۔

”اطالوی۔۔۔ چیزیں چرانے میں ماہر ہیں۔“ اس نے ایک ہنسی مسکراہٹ سے کہا۔ اس نے جو انگوشی پہن رکھی تھی، وہ ہمارے پیسوں سے خریدی گئی تھی۔ اس نے وہ انگوشی انگلی سے اتاری اور اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”اب یہ تمہاری ہے۔ میں یہ انگوشی تم لوگوں کو واپس کرنا چاہتی ہوں۔ غالباً اتنے سالوں بعد اس کی قیمت میں خاصا اضافہ ہو گیا ہوگا۔ تم اسے فروخت کر کے اس کا منافع آپس میں بانٹ سکتی ہو۔“

ہم سب نے وہ انگوشی لینے سے انکار کر دیا۔ ہمیں بین لوپ سے ہمدردی ہو رہی تھی اور ہم سوچنے لگے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ سب کتنا داہیات تھا۔ اسے بعد از قیاس ہی کہا جاسکتا ہے۔ رخصت ہوتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہمیں شیک ہی بتایا گیا تھا۔ خدا کی نظر میں ہم سب برابر ہیں۔ ہم دونوں غلطی میں مبتلا تھے۔ میں اسے شہزادہ اور وہ مجھے امیر زادی سمجھتا رہا جس کا یہی نتیجہ نکلتا تھا۔“

ہونے لگا کہ شاید اس نے ہمیں معاف نہیں کیا۔ یہاں تک کہ میری کے پاس بھی اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ اس دوران نہ تو اس نے ہمیں مدعو کیا اور نہ ہی ہم نے اپنے طور پر اٹلی جانے اور اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ تقریباً تیس سال بعد وہ اٹلی سے جنوبی افریقا واپس آئی اور ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے اسے اسکول کی تقریب میں اپنے درمیان دیکھا۔ ہم سب اس سے بڑی گرم جوشی سے ملے۔ وہ اب بھی سلیٹی رنگ کے اسکرٹ میں پہلے کی طرح دبلی اور اسہارت نظر آ رہی تھی۔ گوکہ اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی اور چہلہ پر جا بجا سیاہ دھبے نمودار ہو گئے تھے۔

کھانے کے دوران جب میری نے اس سے اس کی موجودہ زندگی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس کی ماں جو کچی برسن تک اس کے ساتھ ولا میں مقیم رہی، عرصہ ہوا انتقال کر چکی تھی لیکن وہ صرف ہم لوگوں سے ملنے اور ایک اہم بات بتانے کے لیے یہاں واپس آئی ہے جو وہ کئی سالوں سے ہمیں بتانا چاہ رہی تھی۔

”ایسی کیا خاص بات ہے جسے بتانے کے لیے تمہیں اتنا لمبا سفر کرنا پڑا؟“ میری نے پوچھا، وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔

ہم سب ایک عرصے بعد ملے تھے اس لیے فطری طور پر ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کے خواہش مند تھے۔ جین نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ اکاؤنٹنٹ ہے اور اس کی شادی ایک ڈاکٹر سے ہوئی ہے۔ وہ نیوی بلیو سوٹ میں کافی صحت مند اور خوش حال نظر آ رہی تھی۔ اس نے کنیکٹ لینس لگا لیے تھے اور غریبوں کی بھلائی کے لیے کام کر رہی تھی۔ اس نے شیلا کو بتایا کہ وہ نہیں سمجھتی تھی کہ یہاں کے سیاہ فام اتنے ناراض اور تنگ ہو سکتے ہیں۔ وہ جب بھی گھر سے باہر نکلتی ہے تو اس پر آوازے کسنا شروع کر دیتے ہیں۔

میری کا ایک بچہ کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ بالکل خاموش اور الگ تھلگ تھی اور اسے انتظار تھا کہ بین لوپ اپنے بارے میں بتائے۔ وہ جانتا چاہ رہی تھی کہ آخر ایسی کون سی اہم بات ہے جسے بتانے کے لیے بین لوپ یہاں آئی ہے۔

شیلا پبلشر تھی اور کئی کتابیں شائع کر چکی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس نے پہلے شوہر سے طلاق لینے کے بعد دوسری شادی کر لی ہے اور اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہے۔

اس کا بھتیجا چیتنے چلانے لگا کہ یہی لوگ اس کے قاتل ہیں۔ قہیلے کے بزرگوں نے ان سب کو اپنے پاس روک لیا۔ وہ لوگ سخت پریشان ہوئے کہ ہم نے تو نیکی کی تھی۔ ہم اس کے قاتل ہرگز نہیں ہیں۔
نوجوان بھتیجے نے انہیں بتایا کہ تمہارے قہیلے کے کچھ لوگوں نے میرے چچا سے قرض لیا ہوا تھا اور اب قرض لوٹانے سے انکاری تھے۔ حرکت ان ہی میں سے کچھ لوگوں کی ہوگی۔ مزید تحقیق کی تو معلوم ہوا جس دروازے پر لاش ملی ہے، وہ واقعی اس کے چچا کا قرض دار تھا۔ اسے بھی بلوایا گیا۔ اس نے بھی کہا کہ لاش میرے دروازے پر ضرور پڑی تھی لیکن میں نے اسے قتل نہیں کیا۔ اس نے جو دلیل دی، وہ سب کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے بتایا کہ اگر وہ قتل کرتا تو لاش اپنے دروازے پر ہی کیوں پھینکتا۔ کہیں دور جا کر پھینکتا۔

اس سے لوگوں نے یہ مطلب نکالا کہ اسی قہیلے کے کسی دوسرے قرض دار نے قتل کیا ہے اور لاش کسی دوسرے قرض دار کے دروازے پر پھینک دی۔
پوری رات گزر رہی لیکن کوئی کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ دوسرے دن دوسرے قرض داروں کو بھی بلایا گیا۔ انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

ان کے انکار کے بعد معاملہ بہت زیادہ پیچیدہ ہو گیا۔ بھتیجے کا اصرار تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے کیونکہ انہوں نے مل کر میرے چچا کو قتل کیا ہے اور اب انکار کر رہے ہیں۔
دوسرے قہیلے والوں کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو قتل کیا جا رہا ہے تو وہ ہتھیار بند ہو کر آ گئے۔ ادھر کے لوگ بھی لانے کو تیار ہو گئے۔

معاملہ آپس کی لڑائی تک پہنچنے لگا تھا کہ چند معززین درمیان میں آ گئے۔
”افسوس کی بات ہے کہ ہم کسی ثبوت پر پہنچے بغیر آپس میں لڑنے کو تیار ہو گئے ہیں۔ ہمارے درمیان موسیٰ موجود ہیں۔ ہمیں ان کے پاس مقدمہ لے کر جانا چاہیے۔ شاید ان کے پاس کوئی حل موجود ہو۔“
سب لوگوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔ ابتدائی بیانات سے وہ بھی کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ پہلے تو انہوں نے یہ رائے دی کہ اس معاملے کو ہمیں رفع دفع کر دیا جائے لیکن معززین نے زور دیا کہ اس معاملے کی تہ تک پہنچا جائے ورنہ دلوں میں شک باقی رہ جائے گا اور دونوں قہیلے آپس میں لڑتے رہیں گے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے رجوع کیا۔

”اس واقعے نے قوم میں سخت اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ تو علم و حکیم ہے، میری مدد فرما۔“
اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ان سے کہو پہلے ایک گائے ذبح کریں اور اس کے بعد گائے کے ایک حصے کو مقتول کے جسم سے مس کریں۔ پس اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم اس کو زندگی بخش دیں گے اور یہ معاملہ واضح ہو جائے گا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”اے قوم! تم ایک گائے ذبح کرو۔“
معاملہ حل کا تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام حکم دے رہے تھے کہ گائے ذبح کرو۔
بنی اسرائیل نے کہا۔ ”موسیٰ..... کیا تم ہم سے ہمتی مذاق کرتے ہو۔“
”میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں ہمتی مذاق کی باتوں سے۔“

”پھر تم یہ کیا حکم دے رہے ہو کہ ہم قاتل کا سراغ لگانے کے بجائے ایک گائے ذبح کریں۔“
”تم گائے ذبح کرو گے اور اس کے جسم کا ایک حصہ مقتول کے جسم سے مس کرو گے تو مقتول زندہ ہو کر خود بتائے گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔“

بنی اسرائیل کے نزدیک یہ اس سے بھی زیادہ ہمتی کی بات تھی۔ ہنسنے والوں میں مقتول کے بھتیجے کی آواز سب سے بلند تھی۔ وہ بھی سمجھا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی ایسا حل نکال رہے ہیں جس سے قاتل کا پتا بھی نہ چل سکے۔ یا ہو سکتا ہے مقتول واقعی زندہ ہو جائے اس لیے کسی بھی طرح انہیں ”ذبح بقرہ“ سے روکا جائے۔

”موسیٰ، میں تیرے پاس اس لیے آیا تھا کہ میرے چچا کے قتل کا معاملہ ہو لیکن شاید تو نہیں چاہتا کہ قاتل کا سراغ لگے۔ پھر ہم گائے بھی کیوں ذبح کریں۔ میں اپنے چچا کے قتل کو تیرے خدا پر چھوڑتا ہوں۔ مرنے والا تو مر گیا، اب زیادہ تک دو دو کرنے سے کیا فائدہ۔“

”تیرا بھائی اسرائیل یہ عرض کرتا ہے کہ تو ہماری سب مصیبتوں سے جو ہم پر آئیں، اچھی طرح واقف ہے۔ ہمارے باپ دادا مصر میں گئے اور ہم بہت مدت تک مصر میں رہے اور مصریوں نے ہم سے اور ہمارے باپ دادا سے برابر تاؤ کیا اور جب ہم نے خداوند سے فریاد کی تو اس نے ہماری سنی اور ایک فرشتہ بھیج کر ہم کو مصر سے نکال لے آیا اور اب ہم قاتل شہر میں ہیں جو تیری سرحد کے آخر میں واقع ہے۔ سو ہم کو اپنے ملک میں سے ہو کر جانے کی اجازت دے۔“

شاہ اودم نے ان انبچوں کو باپوں لوٹا دیا۔
”میں تجھے اپنے ملک سے ہو کر نہیں گزرنے دوں گا۔ اگر تیرے لاکھوں آدمی میرے ملک میں فساد پھیلا دیں گے تو اس کا ذمہ دار کون ہوگا۔ اس لیے اگر تو ادھر سے گزرا تو میں تیرا مقابلہ کروں گا۔“

بنی اسرائیل نے دوسری سفارت بھیجی اور کہلویا۔
”ہم کھیتوں اور تاکستانوں سے ہو کر نہیں گزریں گے۔ سڑک ہی سڑک جا سکیں گے۔ پانی نہیں پئیں گے۔ اگر ہم یا ہمارے چوپائے پانی پئیں گے تو ہم اس کی قیمت ادا کریں گے۔ دائیں یا بائیں ہاتھ نہیں مڑیں گے جب تک تیری سرحد سے باہر نہ نکل جائیں۔“

شاہ اودم نے پھر انکار کر دیا اور ہتھیار بند آدمیوں کو لے کر باہر نکل آیا۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ یہ ہمارے بھائی بندوں کی سرزمین ہے۔ ہمیں احتیاط کرنا ہوگی۔ زور بردستی نہیں کر سکتے۔ بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ شاہ اودم سے لڑائی کریں لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں روک دیا۔
”مجھے خداوند نے کہا ہے کہ میں کوہ ہور پر پہنچوں۔ وہ علاقہ بہت محفوظ ہے، ہمیں دشمنوں سے پناہ دے گا۔“ بنی اسرائیل اس وقت تعاقب کرنے والوں سے بہت خوفزدہ تھے لہذا فوراً حکم مان لیا اور چلنے کی تیاری کرنے لگے۔
یہ علاقہ اودم کی سرحد کے قریب تھا۔

☆☆☆

اسی صحرا انوردی کے دنوں میں کسی مقام پر ”ذبح بقرہ“ کا واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ اس واقعے سے بنی اسرائیل کی ذہنیت بھی ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی کہ وہ ابھی تک کن خرافات میں گھرے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جتنے معجزات اس قوم کو دکھائے، ان میں سے یہ بھی ایک تھا۔ اس واقعے سے بھی اللہ تعالیٰ کو بہت سی باتیں ان پر ظاہر کرنا تھیں۔
بنی اسرائیل میں ایک المداہ شخص تھا۔ روایات کے مطابق اس کا نام حامیل بتایا جاتا ہے۔ اس کا ایک بھتیجا نہایت حریص تھا اور چچا کی دولت پر آنکھ رکھے بیٹھا تھا۔ چچا کے کوئی اولاد نہ تھی، وہ اگر مرتا تو ساری دولت خود بخود بھتیجے کو مل جاتی لیکن بھتیجے کو ممبر نہ ہوتا تھا۔ چاہتا تھا بوڑھا جلد مرے تو وہ اس کی دولت پر قبضہ کرے لیکن بوڑھے کا حال یہ تھا کہ اس کی صحت سے ہرگز ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ عقرب مرنے والا ہے۔ بھتیجے اسے قتل کرنے کے درپے تھا لیکن ڈرتا تھا کہ کہیں راز نہ چل جائے۔ پھر ایک دن اسے ایک ترکیب سوچی۔ اس بوڑھے المداہ سے کئی لوگوں نے قرض لیا ہوا تھا۔ بھتیجے نے سوچا، چچا کو قتل کر کے کسی ایسے ہی قرض دار کے دروازے پر ڈال دے۔ اس طرح لوگوں کو یہی شک ہوگا کہ پیسے مانگنے پر بھگڑا ہوا ہوگا، قرض دار نے اسے مار دیا۔ اب اسے یہ طے کرنا تھا کہ کس دروازے کا انتخاب کیا جائے۔ اس نے ایک ایسے قہیلے کا انتخاب کیا جس سے اس کے قہیلے کی دشمنی نہ تھی۔

ایک رات جب اس کا چچا گہری نیند سو رہا تھا، اس نے اسے قتل کر دیا اور رات کے اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر بوڑھے کی لاش کو اٹھا یا اور بڑی دورے جا کر مخالف قہیلے کے اس شخص کے دروازے پر لاش پھینک دیا۔ گھر آنے کے بعد خاموشی سے اپنے بستر میں دیک گیا اور صبح ہونے کے انتظار میں جا گہرا۔ صبح ہوئے ہی وہ گھر سے باہر آیا اور شور مچا دیا کہ اس کا چچا رات کو بستر پر سو رہا تھا لیکن اب بستر پر نہیں ہے۔ شاید کسی نے اسے اغوا کر لیا ہے۔

”اے کون اغوا کرے گا اور کیوں کرے گا؟“
”اس نے بہت سے لوگوں کو قرض دیا ہوا تھا۔ وہ لوگ اسے دھمکیاں بھی دیتے رہے تھے۔ انہی میں سے کسی نے اسے اغوا کیا ہوگا۔“ قہیلے کے دوسرے لوگوں نے بھی اس کے ساتھ مل کر تلاش شروع کر دی۔
جب پورا دن گزر گیا تو مخالف قہیلے کے کچھ لوگ چچا کی لاش اٹھا کر آئے اور انہوں نے بتایا کہ کسی نے ہمیں لڑوانے کے لیے اسے قتل کر کے ہمارے دروازے پر پھینک دیا تھا۔

کے ہاتھ بھی گائے بیچنے سے انکار کر دیا اور یہی کہا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لوگ آئیں گے، یہ گائے میں ان کے ہاتھ فروخت کروں گا۔ جب نوجوان نے بتایا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام ہی کی طرف سے آیا ہے تو وہ تیار ہو گیا لیکن قیمت اتنی زیادہ بتائی کہ اسرائیلی نوجوان یہ قیمت ادا کرنے سے قاصر رہا۔

”میں جب تک اس کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہ ہو جاؤں اسے کسی اور کے ہاتھ فروخت نہ کرنا۔“

”مجھے معلوم ہے فرشتے کی بات غلط نہیں ہو سکتی اس لیے تم ہی آؤ گے اور اسے خریدو گے۔“

”بس دو چار دن کی بات ہے۔ میں جلد تمہارے پاس آؤں گا۔“

اس نوجوان نے قبیلے میں آکر سب کو بتایا کہ اس نے ایسی گائے دیکھ لی ہے اور وہ عنقریب اسے خریدنے جائے گا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ میں اسے خرید نہیں سکتا۔ ہم سب مل کر اسے خریدیں تو خریدیں۔

”ہم کیوں خریدیں۔ جس کا چچا مرا ہے وہی اسے خریدے۔ اس کے پاس اب دولت بھی بہت ہو گئی ہے۔ وہ اپنے چچا کے قاتلوں کو پکڑوانے کے لیے ضرور اسے خرید لے گا۔“

سب مل کر اس کے پاس گئے تو وہ پہلو بھینکے لگا۔

”میرے پاس دولت ہے لیکن اس لیے نہیں ہے کہ گائے خریدوں اور پھر اس بیش قیمت گائے کو کاٹ دوں۔“

”موسیٰ کہتے ہیں اس گائے کے ذریعے تمہارے چچا کے قاتل پکڑ لیے جائیں گے۔ کیا تم یہ نہیں چاہو گے؟“

”جو قاتل پکڑے جائیں گے انہیں تو تم لوگ سزا دے دو گے۔ گائے پر خرچ کی گئی میری دولت کا کیا ہوگا۔“

”تم عجیب بیچتے ہو۔ اپنے چچا کی دولت پر قابض بھی ہو اور اس کے قاتل کو بھی پکڑنا نہیں چاہتے۔“

لوگوں نے اسے خوب لعنت ملاحت کی لیکن وہ نہیں مانا۔ معاملہ ایک مرتبہ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس چلا گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی مشورہ دیا کہ یہ گائے مقتول کے بیچتے ہی کو خریدنی چاہیے۔

اس وقت تک بہت سے بوڑھے لوگ مر چکے تھے۔ اکثریت نوجوانوں کی تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کرتے تھے اور یہ معاملہ تو تھا ہی ایسا دلچسپ کہ ہر شخص دیکھنا چاہتا تھا کہ مقتول کیسے زندہ ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی اجازت مل گئی تو ان نوجوانوں نے چند اپنے سے بڑوں کو ساتھ لیا اور مقتول کے بیچتے کے گھر کا گھیراؤ کر لیا اور اسے مجبور کیا کہ وہ گائے کی قیمت ادا کرے۔

وہ قبیلے سے کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا تھا، کہیں بھاگ جائے یہ بھی اب ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے دروازے پر سخت پہرا لگا دیا گیا تھا۔

اس نے مجبور ہو کر گائے کی خریداری کا دم بھریا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ گیا اور گائے خرید کر لے آیا۔ اس گائے کو دیکھ کر بعض بوڑھے لوگوں نے شہادت دی کہ ایسی ہی زرد گائے انہوں نے فرعون کے پاس دیکھی تھی۔ وہ اس کی پرستش کرتا تھا۔

یہ سن کر پوری قوم افسوس کرنے لگی بلکہ بعض کے منہ سے تو یہ نکل گیا کہ کاش! ایسی نادر گائے کی پرستش ہم کرتے۔ موسیٰ نے اسے کاٹنے کا حکم کیوں دے دیا۔ مقتول کے بیچتے نے ایک مرتبہ پھر قوم کو درغلانے کی کوشش کی۔

”تم کو تو ایسی ہی ایک گائے اور خرید کر دے دوں۔ تم اس کی پرستش کیا کرنا۔“

بہت سے لوگ اس کے ہمنوا بھی ہو گئے تھے لیکن باقیوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا۔

”اگر ہمیں پرستش کرنی ہے تو دوسری گائے لا دے۔ اسے تو ہم کا کر رہیں گے تاکہ حقیقت کھلے مگر پھر بھی قاتل کا پتا نہ چلا تو ہمارے راستے الگ، موسیٰ کا راستہ جدا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس وہ گائے لے جاتی گئی۔ انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کے بیٹے کو آگے کیا۔

”آگے بڑھ اور اس گائے کو ذبح کر دے۔“

حضرت ہارون کے بیٹے نے گائے کو ذبح کر دیا اور اس کے جسم کے ایک حصے کو مقتول کے بدن سے منسوخ کیا۔

”گائے کا وہ کون سا حصہ تھا جو مردہ جسم پر کھینچا گیا۔ سو وہ کوئی بھی حصہ ہو، واقعے میں جس قدر مذکور ہے، معجزہ ہونے کے لیے یہی کافی ہے۔ اگر اس حصے کا تعین بھی ہمارے دینی یا دیوی حالات کے اعتبار سے ضروری ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور واضح فرمادے مگر اس کو ہم رکھا گیا۔“

قرآن عزیز میں اس واقعے کو اجالا یوں بیان کیا گیا ہے۔

”تو کیسا بیچتا ہے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ ”تو کیوں نہیں چاہتا کہ تیرے چچا کا قاتل سامنے آئے۔ اگر میری تجویز سے اختلاف کرنا ہی تھا تو میرے پاس کیوں آئے تھے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تیرے بدلے ہوئے دیکھے تو دوسرے لوگوں نے مداخلت کی اور اپنے لوگوں سے کہا کہ ہمیں ایک گائے ضرور ذبح کرنی چاہیے تاکہ موسیٰ کی بات رہ جائے۔

ان لوگوں کے دلوں میں مصر کی بودو باش کی وجہ سے گائے کی تقدیس ابھی تک رچی بسی ہوئی تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے گائے کاٹیں۔ کچھ لوگوں نے ہائی بھری تھی کہ وہ گائے کاٹیں گے لیکن بیشتر لوگ اس سے بچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کج بحثی شروع کر دی تاکہ یہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے۔

”موسیٰ! اپنے خدا سے پوچھ کر بتاؤ کہ وہ گائے کیسے ہو سکتی اس کی عمر کتنی ہو؟“

”وہ ایسی گائے ہو کہ تو بڑھیا ہو اور نہ پچھیا بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

”تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔“

”وہ گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے کو خوش رنگ معلوم ہو۔“

”یہ تو سب ہو گیا۔“ بنی اسرائیل نے کہا۔ ”ہم کو تو اب بھی اس گائے کی کیفیت سے آگاہی نہیں ہوئی۔ اس کے بارے میں کچھ اور بتائیے تاکہ ہمیں معلوم ہو۔“

”تم لوگ اپنے لیے خود مشکلات کھڑی کرتے جا رہے ہو۔ بہر حال سن لو کہ وہ ایسی گائے ہو کہ اس نے کبھی کھیتوں میں مل نہ چلایا ہو اور نہ کھیتوں کو سیراب کرتی ہو۔“

”کچھ اور بتاؤ۔“

”وہ بے داغ ہو۔ اس پر کسی قسم کا دھبہ نہ ہو۔“

بنی اسرائیل نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا کہ گائے درمیانی عمر کی جوان ہو۔ رنگ گہرا زرد ہو۔ محنت کی ماری نہ ہو اور اس کے جسم پر کسی قسم کا داغ نہ ہو۔

انہیں پوری طرح یقین تھا کہ نہ ایسی گائے ملے گی اور نہ اسے ذبح کرنے کا موقع آئے گا۔ سب سے زیادہ مقتول کا بیچتا خوش ہو رہا تھا کہ جان چھوٹی۔ یہ قتل ہمیشہ معائنہ رہا ہے گا۔

اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ مقتول چچا کی دولت کا وہ تباہ وارث ہو گیا۔ اس نے یہ بھی مشہور کر دیا کہ اس کے بچانے وصیت کی تھی کہ میں ہی اس کی دولت کا وارث بنوں گا۔

بنی اسرائیل کے بہت سے لوگ ان خصوصیات کی حامل گائے کی تلاش کرنے لگے لیکن ایسی گائے کہاں ملتی جس میں یہ تمام خصوصیات ایک جگہ جمع ہو گئی ہوں۔ ہر مرتبہ کی ناکامی انہیں شاد کام کر دیتی تھی۔ وہ دل سے نہیں چاہتے تھے کہ گائے کی تقدیس متاثر ہو اور وہ اسے کاٹنے پر مجبور ہوں۔ گوسالہ پرستی کے واقعے کو برسوں بیت گئے تھے لیکن گائے کی محبت ابھی تک ان کے دلوں سے مٹتی نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جا رہے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ ایسی گائے کا ملنا مشکل ہے۔ آپ اس قصے کو جانے دیں، کیوں ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں امید دل رہے تھے کہ جس قسم کی گائے تم نے اپنے لیے مقرر کی ہے، ڈھونڈتے رہو مل جائے گی۔ ایسی گائے قرب و جوار میں موجود ضرور ہے ورنہ خدا یہ نشانیاں بتاتا ہی نہیں۔ تم ادھر ادھر تلاش کرو۔ یہ گائے تمہیں ضرور ملے گی۔

اس قبیلے میں ایک نوجوان تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بہت عقیدت مند تھا اور جی جان سے چاہتا تھا کہ جس قسم کی گائے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے طلب کی ہے، وہ کہیں سے فراہم کر دے۔

وہ قریب کی بستیوں میں جا کر ایسی گائے تلاش کرنے لگا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہہ چکے تھے کہ ادھر ادھر تلاش کرو۔ اس کی محنت ضائع نہیں گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ فلاں گاؤں میں ایک غریب نوجوان کے پاس ایسی گائے موجود ہے اور وہ اسے بیچنے کا خواہاں بھی ہے۔ وہ اسرائیلی نوجوان یہ سن کر اس گاؤں میں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اس گائے کی بہت بھاری قیمت لگ چکی ہے لیکن گائے کا مالک اسے بیچنے کو تیار نہیں ہوتا۔ کہتا ہے کہ ایک فرشتہ اس کے پاس آیا تھا۔ اس نے اسے بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لوگ اسے خریدیں گے۔ تم منہ مانگی قیمت بتا کر ان کے ہاتھ بیچنا۔ کسی اور کے ہاتھ فروخت مت کرنا۔ اس اسرائیلی نوجوان نے گائے کے مالک کا پتا پوچھا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔ گائے کے مالک نے اس

السلام کے پاس پہنچ گئے۔

”میرے بھائی کیسے ہو؟“

”میری صحت جواب دے گئی۔“

”تم ابھی سے تھک گئے۔ ابھی تو ہمیں باپ دادا کی سرزمین پر جانا ہے جسے دیکھنے کو میری آنکھیں ترس رہی ہیں۔ اسرائیلیوں کی سزا مکمل ہونے والی ہے۔ چالیس سال گزرنے کو ہیں۔ ہمیں ان کی ہدایت کے لیے ان کے ساتھ رہنے کو کہا گیا تھا۔ جب وہ بیت المقدس میں داخل ہوں گے تو کیا تم ان کے ساتھ نہ ہو گے؟“

”شاید نہیں۔ مجھے اپنی صحت کی طرف سے فکر ہے۔“

”تم اس حال کو پہنچ گئے اور مجھے خبر تک نہ ہونے دی۔“

”میں نہیں چاہتا تھا کہ تم فکر مند ہو۔“

”میں تمہارے لیے خدا سے دعا کروں گا۔“

یہ دعا قبول ہونے والی نہیں تھی اور خدا انہیں چاہتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کریں اور وہ ان کی دعا کو رد کر دے اس لیے دعا سے پہلے احکام الہی آ گئے۔

”ہارون اپنے لوگوں میں جا ملے گا۔ وہ اس ملک میں جو میں نے بنی اسرائیل کو دیا ہے، جانے نہیں پائے گا۔ سو تو ہارون اور اس کے بیٹے کو اپنے ساتھ لے کر کوہ ہور کے اوپر آ جا اور ہارون کے لباس کو اتار کر اس کے بیٹے کو پہنا دینا کیونکہ ہارون وہیں وفات پا کر اپنے لوگوں میں جا ملے گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے ان کا ماضی گھومنے لگا۔ بھائی کی محبت نے جوش مارا لیکن رضائے الہی کے سامنے دم مارنے کا پارا نہیں تھا۔

”اچھے بھائی، آپ کو میرے ساتھ کوہ ہور پر چڑھنا ہوگا۔“

”میں نے کہا نا کہ میں اب چل بھر بھی نہیں سکتا۔“

”خدا نے مجھ سے یہی کہا ہے۔“

”تو پھر وہ یقیناً مجھے پہاڑ تک لے جائے گا۔“

”تم اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے لو۔“

یہ دونوں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پہاڑ پر گئے۔ کچھ روز عبادت میں مصروف رہے۔

”تم اپنا لباس اتار دو تاکہ میں اسے تمہارے بیٹے کو پہناؤں کہ یہی حکم خداوندی ہے۔“

حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنا لباس اتار کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیا جو انہوں نے اپنے پیچھے کو پہنا دیا۔ اسی پہاڑ پر حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہوئی اور وہ یہیں دفن ہوئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیچھے انہیں دفن کرنے کے بعد پہاڑ سے اترے اور قہم کو یہ خبر دی۔

حضرت ہارون کی عمر اس وقت 123 سال تھی۔

اسرائیلیوں کی سزا کی مدت اب بہت کم رہ گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو انہیں اس ملک تک پہنچانا تھا جسے خدا نے انہیں دینے کا وعدہ کیا تھا لہذا حکم ہوا کہ کوہ ہور سے کوچ کرو۔ انہوں نے قوم کو حکم دیا کہ یہاں سے کوچ کرو۔

حضرت ہارون کی وفات کو تیس دن ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل نے کوچ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام انہیں لے کر بحر قلزم کی طرف چلے تاکہ ملک اودم کے باہر باہر گھوم کر جائیں۔

اب وہ ایک ایسے لقمہ ووق صحرا سے گزر رہے تھے جہاں دور دور تک... پانی کا نام و نشان نہیں تھا۔ جتنا پانی ساتھ لائے تھے اسی پر بوند بوند کر کے گزارہ ہو رہا تھا۔ بنی اسرائیل کی جان عاجز آ گئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر موسیٰ علیہ السلام کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام انہیں سمجھا رہے تھے کہ ایک بائیس منہ سے نہ نکالیں جو خدا کو نا پسند ہوں۔ تم ان احسانات کو تو بھول گئے جو اللہ نے اب تک تم پر کیے اور ذرا سی تکلیف پر چیخ اٹھے۔

”اور کب تک صبر کریں۔ تیرے خدا نے ہمیں ان بیابانوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ہمارے تو ماں باپ بھی مر چکے تھے جنہیں تو نکال کر لایا تھا۔ چالیس سال تو ہونے کو آئے۔ تیرا خدا ہمیں نیا ملک کب دے گا۔ ہمیں تو لگتا ہے ان

”جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔ بلاشبہ تم کو خدا ہی حکم دیتا ہے کہ تم گائے ذبح کرو۔“ وہ کہنے لگے۔ ”کیا تو ہمارے ساتھ مذاق کرتا ہے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ میں اللہ سے پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ جابلوں میں شمار ہوں۔“ (یعنی یہ مذاق نہیں ہے) انہوں نے کہا۔ ”تو اپنے پروردگار سے دریافت کر کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ کہتا ہے وہ ایسی گائے ہو کہ نہ تو بڑھیا ہو نہ بچھا بلکہ درمیانی عمر کی جوان ہو۔ پس اب جو تم سے کہا گیا ہے اس کی تعمیل کرو۔“ وہ کہنے لگے۔ ”اپنے خدا سے پوچھ کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔“ حضرت موسیٰ نے کہا۔ ”اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ گہرے زرد رنگ کی ہو کہ دیکھنے والے کو خوش رنگ معلوم ہو۔“ کہنے لگے۔ ”ہم پر (ابھی تک) گائے کی کیفیت مشتبہ ہے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو ہم کا سیاب ہو جائیں گے۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے وہ ایسی گائے ہو کہ نہ محبت کی باری ہو کہ زمین میں مل چلائی ہو اور نہ محبت کو میرا کرتی ہو۔ وہ بے داغ ہو جس پر کسی قسم کا دھبہ نہ ہو۔ کہنے لگے۔ ”اب تو سچ بات لایا۔“ پس انہوں نے اسے حاصل کر کے ذبح کیا اور قریب تھا کہ نہ کرتے اور یہ جب وہ اب جب تم نے ایک جان کو قتل کر دیا۔ پھر آپس میں اختلاف کرنے لگے اور اللہ ظاہر کرنے والا ہے اس بات کو جس کو تم چھپائے ہوئے ہو۔ پس ہم نے کہا اس مقتول کو گائے کے بعض حصے کے ساتھ مس کرو۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ کر دیتا ہے اور اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ تم سمجھو۔“ (بقرہ)

حرکت ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اے شخص! تو خود بتا دیجئے کس نے قتل کیا۔“

اس شخص نے ایک راہیت بھری نظر اپنے پیچھے پر ڈالی اور ساری روداد بیان کر دی۔ اس کے مطابق اس کا قتل اس کے پیچھے نے کیا تھا۔ مقتول یہ سب بتانے کے بعد دوبارہ لیٹ گیا۔ گویا اب وہ پھر بے جان لاش تھا۔

یہ دیکھ کر پیچھے کے ہوش اڑ گئے اور اس نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن لوگوں نے اسے بھاگنے نہیں دیا۔ اسے پکڑ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس لے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقرر کردہ قاضیوں نے فیصلہ سنا دیا کہ مقتول کے پیچھے کو اسی طرح قتل کیا جائے جس طرح اس نے اپنے چچا کو قتل کیا تھا۔ اس کی لاش دو پہر تک اسی طرح کھلے میدان میں پڑی رہے جیسے اس کے چچا کی لاش پڑی رہی تھی۔

اس کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا اور پھر دونوں کو (چچا اور پیچھا) قریب قریب دفن کر دیا گیا۔

یہ مجرہ دکھانے کا مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کی عمر ایسی ہو گئی تھی کہ انہیں بتا دیا گیا کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود کر رہی ہوں۔ ان کے دلوں میں اب تک گائے کی تقدیس رہ چکی تھی لہذا بتا دیا گیا کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں اس کو قتل کیا تھا اور وہ تمہارا بھائی بھی بیکار نہ کر سکی اور اگر تم سمجھو کہ یہ گائے کی تقدیس کا اثر تھا کہ اس کے گوشت کے مس کرنے سے مردہ زندہ ہو گیا کیونکہ اگر ایسا تھا تو گائے خود زندہ کیوں نہیں ہو گئی۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اسے زندہ کرنے والا کوئی اور ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ اسی طرح مرنے کے بعد خدا تمہیں دوسری زندگی دینے پر قادر ہے اور تم

جب زندہ کیے جاؤ گے تو اپنے گناہوں کا خود اقرار کرو گے۔

کہتے ہیں اس واقعے کے بعد بنی اسرائیل میں کھلی مچ گئی تھی۔ وہ اب بھی چھپ چھپ کر گائے کی پرستش کرتے تھے۔ انہوں نے تو بہ کی اور بتوں کو توڑ دیا۔

☆☆☆

قادر کے مقام پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بہن مریم کا انتقال ہو گیا تھا۔ اب وہ کوہ ہور میں اودم کی سرحد کے قریب تھے۔ یہاں آپ کو ایک اور صدمے کا سامنا ہونے والا تھا۔

کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہے تھے کہ حضرت ہارون علیہ السلام نبوت کے کاموں میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ وعظ و نصیحت کے لیے بھی گھر سے باہر نہیں نکل رہے ہیں۔ کوششیں سے ہو کر رہ گئے ہیں۔ کچھ دنوں تک وہ یہ سمجھتے رہے کہ کثرت عبادت ان کے گھر سے نکلنے میں مانع ہے لیکن ایک روز ہارون علیہ السلام کے بیٹے کی زبانی معلوم ہوا کہ حضرت ہارون علیہ السلام بیمار ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اب اس دنیا میں ان کے علاوہ کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ ابتدائے نبوت سے دونوں بھائی

اتحاد تھے۔ غم اور خوشی مل کر بانٹتے تھے۔ اب جو یہ سنا تو بے چین ہو گئے۔ خیریت دریافت کرنے حضرت ہارون علیہ

حبشہ کی فلسطین کا ایک کلیدی مقام تھا اور اپنے چشموں کے لیے مشہور تھا۔ اسے ہر حکمران حاصل کرنے کی جستجو کیا کرتا تھا۔ ایک وقت میں یہ موابیوں کے تحت تھا پھر اسے اموریوں کے بادشاہ ”سیون“ نے فتح کر لیا۔ اموری کنعان کی اولاد تھے۔ اسرائیلیوں سے پیشتر یہ لوگ بہت مشہور و معروف تھے۔ جب شال کے لوگوں نے ان کو نکال دیا تو یہ باہل میں بس گئے۔ ان کا دور حکومت تاریخ کا سب سے خوشحال دور تھا۔ کئی صدیوں بعد جب ایک اور قوم ”عیسویوں“ نے انہیں شکست دی تو وہ کنعان کے ایک بڑے حصے میں آکر بس گئے۔ کنعان میں اپنے عروج کے زمانے میں انہوں نے مواب کی طرف پیش قدمی کی اور اس ملک کے ایک بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔ حبشہ ان میں سے ایک تھا۔ جس وقت اسرائیلی یہاں پہنچے، سیون یہاں بادشاہت کرتا تھا۔

یہ نہایت بدکار قوم تھی۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بتایا تھا کہ ان (حضرت ابراہیم) کی اولاد آکر اس قوم کی عدالت کرے گی۔ اب وہ وقت آ گیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی راہنمائی میں یہ عدالت ”حبشہ“ کے بادشاہ سیون پر قائم ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یوشع بن نون کی سربراہی میں حبشہ کے بادشاہ سیون کے پاس ایک وفد بھیجا اور اس سے اس کے ملک سے ہو کر گزر جانے کی اجازت چاہی۔

”ہم حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے پیغمبر کی جانب سے تیری خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور یہ التجا لے کر آئے ہیں کہ تو ہمیں اپنے ملک سے ہو کر گزر جانے دے اور ہماری تعداد کی طرف سے فکر مند نہ ہو۔“

”تم مجھ سے اجازت مانگتے آئے ہو یا مجھے دھمکانے۔ تمہاری تعداد کتنی بھی ہو، میں کسی سے ڈرنے والا نہیں۔“

”ہم تجھے ڈرانے نہیں آئے۔ ہم کوئی خون خرابا نہیں چاہتے۔ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کی زمینوں تک جانے کے لیے مصر چھوڑا ہے۔ تم سے ہماری قربت داری بھی ہے۔ اس کا خیال کرتے ہوئے ہمیں گزرنے دے۔“

”اگر تم نے لوٹ مار کی تو ازام یہ دھرو گے کہ ہم نے تمہیں کمزور دیکھ کر مارا۔ بہتر یہ ہے کہ تم کسی اور طرف سے ہو کر گزرو۔ یہ تو تمہیں مصر چھوڑنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ اتنی بڑی تعداد کو کون آباد ہونے دے گا۔“

”ہمارے پیغمبر نے اپنی مرضی سے مصر نہیں چھوڑا۔ اس میں خدا کی رضا شامل تھی۔ اس لیے وہی ہمیں راستہ بھی دے گا ورنہ ہم یہ زور قوت گزریں گے۔“

اس دھمکی کے بعد سیون کچھ نرم پڑا اور اس نے وفد کے ارکان سے پوچھا۔

”میرے ملک سے گزرنے کے لیے تم لوگ کس راستے سے گزرو گے؟“

”اسی راستے سے جو عام گزرگاہ ہے اور جس پر تو عام قافلے گزرنے کی اجازت دیتا ہے۔“

”وہ قافلے لاکھوں کی تعداد میں نہیں ہوتے۔ تم بے گھر لوگ بے یقینا گزرنے کے بہانے آباد ہونے کی کوشش کرو گے۔“

”ہمیں تیرے ملک سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہم تو دریائے اردن کے اس پار تک سفر کریں گے کیونکہ وہی علاقہ ہمارے آباد ہو جانے کے لیے منتخب ہوا ہے۔ ہم تیرے کھیتوں اور مٹا کھانوں میں نہیں گھسیں گے حتیٰ کہ تمہارے کنوؤں کا پانی بھی نہیں پیئیں گے اور اگر ہمیں گے تو قیامت ادا کریں گے۔ اب تو ہمیں گزر جانے دے۔ ہمیں بتا ہم اپنے پیغمبر سے جا کر کیا نہیں۔“

حبشہ کے بادشاہ یوہا، باکلام نہ ہو گیا تھا۔ وہ اجازت دینے ہی والا تھا کہ اس کے ایک وزیر نے اسے اس کے برعکس مشورہ دیا۔

”یہ لوگ یہاں سے گزرنے کا تو بہانہ کر رہے ہیں۔ ان کا اصل مقصد ہماری زمینوں پر قبضہ کرنا ہے۔ اگر یہ لوگ ایک مرتبہ یہاں گھس آئے تو انہیں یہاں سے نکالنا مشکل ہو جائے گا۔ انہیں ہرگز اجازت نہیں دی جائے اور اگر یہ لوگ زبردستی کریں تو ان سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔“

یہ بات سیون کی سمجھ میں آگئی اس کے تیور بدل گئے۔ اس نے وفد کی طرف حثارت سے دیکھا اور انہیں اپنے دربار سے نکل جانے کا حکم دیا۔

”تم لوگ جہاں بھی جانا چاہتے ہو، کوئی دوسرا راستہ اختیار کرو۔ میں تمہیں اپنے علاقوں سے گزرنے کی اجازت نہیں دوں گا اور اب تم زیادہ بحث بھی مت کرو۔ یہی بہتر ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ اپنے پیغمبر سے جا کر کہہ دو۔“

”اے سیون! ہم تجھے پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ اگر تو نے اجازت نہیں دی تو ہم زبردستی کریں گے۔ ہمارا نبی جو حکم دیتا ہے

بیابانوں میں پھٹکتے پھٹکتے ہم بھی مرجائیں گے۔“

”تمہیں اس مصیبت میں خدا نے نہیں ڈالا ہے۔ تمہارے بزرگوں نے جہاد سے انکار کیا تھا۔ یہ اس کی سزا ہے لیکن فکر مت کرو، اللہ ہمیں بہت سی جستجو قوموں پر غالب کرنے والا ہے۔“

”تم ہمیں پھر کسی جنگ میں ڈالنا چاہتے ہو۔“

”یہی تمہارے باپ دادا نے کہا تھا اور وہ عذاب سے دوچار ہوئے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی عذاب آئے۔“

”ان سختیوں سے تو اچھا ہے، ہم کسی عذاب ہی سے مر جائیں۔“

یہ اللہ کا عذاب ہی تو تھا کہ وہ جس جگہ پڑاؤ کیے ہوئے تھے وہاں دوسرے دن سانپ ہی سانپ نظر آنے لگے۔ ایک ہی دن میں بہت سے اسرائیلیوں کو ڈس لیا۔ یہ نئی آفت تھی جو اس راستے میں انہیں ملی تھی۔ اس آفت پر ان کا کوئی زور نہیں چل رہا تھا۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کوئی سانپ انہیں ڈس نہ لے۔

انہیں اپنا کھانا یاد آیا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درشت باتیں کی تھیں۔ ایک دو دن انہوں نے انتظار کیا کہ شاید سانپ خود ہی ادھر ادھر ہو جائیں لیکن جب اموات کی تعداد بڑھنے لگی تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں پہنچے۔

”ہم سے بے شک گناہ ہو گیا کہ ہم نے خداوند اور تیری شکایت کی۔ اب ہمیں سانپ پریشان کر رہے ہیں۔ ہمارے بہت سے بھائیوں کو ان سانپوں نے ڈس لیا ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو ہم میں سے کوئی بھی جیسا نہ بچے گا۔ تو جن لوگوں کو تو باپ دادا کی زمینوں کی طرف لے جانا چاہتا ہے، ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچے گا۔“

”اے میرے لوگو! تم خداوند کی شکایت کرنا چھوڑ دو اور ایسا کرو کہ عیش کا ایک سانپ بنا کر ایک لکڑی پر ٹانگ دو۔ جو سانپ کا ڈسا ہو اس پر نظر کرے گا، وہ اللہ کے حکم سے جیسا بچے گا۔“

لاکھوں لوگوں کے درمیان ایک عیش کا سانپ کس طرح کام آسکتا تھا۔ ان لوگوں نے بہت سے سانپ بنائے اور جگہ جگہ لٹکا دیے اور جب یہاں سے آگے بڑھنے لگے تو بھی ان سانپوں کو ساتھ لیتے گئے کہ اگر راستے میں سانپوں سے سامنا ہوا تو وہ مرنے سے محفوظ رہیں گے۔

اب اس قوم کا گزر ان دور دراز علاقوں کی طرف تھا کہ جس پر تاریخ آج بھی حیران ہے۔ کسی دنیاوی راہنما کی سربراہی میں یہ سفر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک پیغمبر ہی انہیں ان بیابانوں سے صحیح سلامت گزاسکتا تھا کیونکہ اسے خدا کی ہدایت اور مدد میسر تھی۔

اب وہ ”مواب“ کے میدانوں کی طرف رواں دواں تھے۔ یہ علاقہ بحیرہ مردار کے جنوبی علاقے کے مشرق میں تھا اور یہاں حضرت لوط علیہ السلام کی نسل آباد تھی۔

کوہ ہور سے نکل کر اس قافلے نے ”ابوت“ کے مقام پر ڈیرے ڈالے۔ یہ جگہ ”مواب“ کے مشرق میں تھی پھر یہاں سے بھی کوچ کیا اور مختلف چھوٹی چھوٹی بستیوں سے ہوتے ہوئے ”ارنون“ پہنچ گئے۔ یہ مواب کے ایک دریا کے نام سے موسوم تھا۔ یہ دریا ایک گہری گھاٹی سے ہوتا ہوا بحیرہ مردار میں گرتا تھا۔ یہ ”لیردن“ کے مشرق میں تین اہم دریاؤں میں سے ایک تھا اور اموریوں اور موابیوں کے درمیان سرحد کا کام دیتا تھا۔

مواب کی سرحد یعنی ”ارنون“ پر بنی اسرائیل نے ڈیرے ڈال دیے پھر اللہ نے انہیں ایک کنوئیں کے پاس بھیجا جو ”بیر کا کنواں“ کہلاتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سب کو ایک جگہ جمع کیا اور وہ کنواں دکھایا۔

مصر میں کسی کنوئیں کا مل جانا نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے اور خوشی سے ناچنے لگے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ مناجات پڑھی۔

”اے کنوئیں تو اعلیٰ آ

تم اس کنوئیں کی تعریف گاؤ

یہ وہی کنواں ہے جسے رئیسوں نے بنایا

اور قوم کے لوگوں نے

اپنے عصا اور لاکھوں سے کھودا

اب انہیں مواب کی طرف اور آگے بڑھنا تھا۔

ایک خوفناک معرکہ شروع ہوا۔ حیون کے لوگ نہایت جنگجو اور زور آور تھے۔ ان کے پاس لشکر بھی بہت تھا۔ بادشاہ اپنے بیٹوں کے ساتھ خود اس جنگ میں شامل تھا اور اپنے لوگوں کی ہمت بڑھا رہا تھا۔

اسرائیلی تعداد میں زیادہ ضرور تھے لیکن یہ سب عام لوگ تھے۔ ان میں باقاعدہ لڑنے والے بہت کم تھے اور پھر اس سے پہلے انہیں کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ مال غنیمت کا لالچ تھا جو انہیں یہاں تک لے آیا تھا۔ اب مصر کو یاد کرنے والے پرانے لوگ ان میں نہیں رہے تھے۔ ان جوانوں کو یہ امید بھی تھی کہ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو یہاں انوں میں رہنے کے بجائے شہروں میں رہنے کے قابل ہو جائیں گے۔ بس یہی آسرا تھا جو انہیں لڑنے پر مجبور کر رہا تھا لیکن جلد ہی انہیں یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ امور یوں سے لڑنا آسان کام نہیں۔ حیون کا پلہ بھاری تھا۔ وہ بار بار اسرائیلیوں کو پیچھے ہٹا تھا۔ اسرائیلی پھر آگے بڑھ جاتے تھے۔ دوپہر تک یہی کشمکش جاری رہی لیکن دوپہر کے بعد اچانک ایسا ہوجیسے امور یوں پر ٹھکن طاری ہو گئی ہے۔ اسرائیلیوں کا ہر حملہ کامیاب ہو رہا تھا۔ حیون کے تمام بھائی اور بیٹے مارے جا چکے تو حیون کو یقین ہو گیا کہ اسے شکست ہو جائے گی۔ وہ فرار ہونے ہی والا تھا کہ ایک اسرائیلی کی تلوار نے اس کا کام تمام کر دیا۔

خدا نے وعدہ کیا تھا، دیکھ میں حیون اور اس کے ملک کو تیرے حوالے کرنے کو ہوں۔ خدا کا وعدہ پورا ہوا۔ بادشاہ کے مرتے ہی امور یوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اسرائیلیوں نے بھاگتے ہوئے امور یوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ ”بہش“ کا میدان لاشوں سے بھر گیا۔

اسرائیلیوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی کہ انہوں نے مانی ہوئی جنگجو قوم کو اتنی بڑی تعداد میں کیسے ہلاک کر دیا۔ یہ سب اتنی آسانی سے ہو گیا تھا کہ حیرت کے سوا وہ کچھ اور کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔

اموری جہاں جہاں بھی بھاگے، اسرائیلیوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کے سب شہروں میں گھس گئے۔ ہر آباد شہر کو عورتوں اور بچوں سمیت بالکل نابود کر دیا۔ چوپایوں اور مال و زر کو اپنے قبضے میں کر لیا۔

بنی یدون اور بنی روبن کو حکم دیا گیا کہ وہ اس علاقے میں آباد ہو جائیں۔ غرض یہ کہ بنی اسرائیل نے یہاں کے سب شہروں کو لے لیا۔ حیون اور اس کے آس پاس کے قصبوں میں یہ لوگ آباد ہو گئے۔

حیون نے یہ ملک موآبیوں سے چھینا تھا اور اب اسرائیلیوں نے اس کی بادشاہت ختم کر دی۔

گلیل جمیل کے مشرق کی طرف ایک زرخیز ترین علاقہ ”ہسن“ تھا۔ یہاں کا اموری بادشاہ عوج بن عنق تھا اور ساٹھ فیصل وار شہروں کا حاکم تھا۔ یہاں کے لوگ غیر معمولی طویل القامت اور زور آور تھے۔ اتنے دراز قامت کہ عام آدمی ان کی پنڈلی تک پہنچتا تھا۔ عوج کا پنگل نو ہاتھ لمبا اور چار ہاتھ چوڑا تھا۔ اس سے اس کی قامت کا اندازہ لگا یا جاسکتا تھا۔

ان کے شہر مضبوط، فیصل دار اور اونچے تھے۔ اسی لیے لوگوں کا خیال تھا کہ عوج بادشاہ کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا۔ ”اب آگے بڑھا اور ”ہسن“ میں جا کیونکہ میں نے اس ملک کو تیرے حوالے کر دیا ہے۔ عوج سے مت ڈر۔ جیسا تو نے حیون کے ساتھ کیا، ویسا ہی اس اموری بادشاہ کے ساتھ بھی کرنا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے سپہ سالار حضرت یوشع کو بلوایا اور انہیں خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ ”پس تو تیار کر اور گلیل جمیل کی طرف چل اور ”ہسن“ کو اپنے قبضے میں کر لے کہ وہ بھی اموری ہے اور اس کا ملک خدا نے ہماری میراث میں لکھ دیا ہے۔“

بنی اسرائیل کو جب معلوم ہوا کہ اب ہسن پر حملے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں تو وہ سخت خوفزدہ ہوئے۔ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ وہاں کے لوگ نہایت طویل القامت ہیں۔ وہ گھبرا کر کہنے لگے کہ ہماری تو تلواریں بھی ان کی گردنوں تک نہیں جا سکی۔ ہم ان سے جنگ نہیں کر سکتے۔ حیون اور امور یوں کے دوسرے شہر جن پر ہم قبضہ کر چکے، ہمارے لیے بہت ہیں۔

”تو کیا تم خدا کا حکم نالے کی غلطی ایک مرتبہ پھر کر دے گے؟“ حضرت یوشع نے ان سے کہا۔

”موسیٰ سے کہو وہ اپنے خدا سے ہماری طرف سے معذرت کر لے۔“

”کیا تم اس سے پہلے حیون بادشاہ کو شکست نہیں دے چکے؟“

”ان کی بات اور تمہی۔ عوج بن عنق کا مقابلہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ہلاک ہو جائیں۔“

”تم لوگ اتنی ہی بات کیوں نہیں سمجھتے کہ اب چالیس سال کی مدت پوری ہو چکی ہے۔ تمہارے باپ دادا جنہوں نے

ہم اس پر عمل ضرور کرتے ہیں اور خدا ہمارے ساتھ ہے۔“ حضرت یوشع بن نون نے کہا۔

”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔“ حیون نے کہا۔ ”اگر تم لوگ اتنے بہادر ہوتے تو یوں عرصہ دراز سے بھٹکتے نہ پھر رہے ہوتے۔ خدا تمہارے ساتھ ہوتا تو اب تک کہیں آباد ہو چکے ہوتے۔ تمہارا بنی تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے اور تم بے وقوف بن رہے ہو۔ کیوں اپنی جانوں کے دشمن بنے ہوئے ہو۔ تم میرے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جاؤ اپنے نبی سے جا کر کہہ دو کہ وہ یہ ارادہ ترک کر دے ورنہ اسرائیلیوں کے خون سے زمین کو رنگین کر دوں گا۔ اس سے پہلے کہ میں تم سب کو یہیں موت کے گھاٹ اتار دوں، یہاں سے چلے جاؤ اور میرا پیغام اپنے نبی تک پہنچا دو۔“

”تو کیا ہم سمجھ لیں کہ تو جنگ کیے بغیر ہمیں یہاں سے نہیں گزرنے دے گا؟“ یوشع بن نون نے کہا۔

”یہی سمجھ لو اور مجھ سے جنگ کرنے کی غلطی بھی مت کرنا۔“

”ہم وہی کریں گے جو ہمارا نبی ہم سے کہے گا۔“ یوشع بن نون نے کہا اور وفد کے ارکان کے ساتھ وہیں چلے آئے۔

وفد نے واپس جا کر وہ تمام باتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتا دیں جو ان کے اور حیون کے درمیان ہوئی تھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر یوشع بن نون کو قریب بلا کر فرمایا۔

”یوشع! میں نے تو یہی چاہا تھا کہ جنگ سے گریز کروں لیکن مشیت ایزدی یہی ہے کہ ہم حیون سے جنگ کریں لیکن حیون نے غرور کیا ہے۔ مجھے خدا نے بتایا ہے کہ وہ حیون کو ہمارے حوالے کر دے گا۔ اے یوشع! تم جنگ کی تیاری کرو۔“

حضرت یوشع تو عرصہ دراز سے کہہ رہے تھے کہ مقامی لوگوں سے جنگ کر کے اپنے آباد ہونے کا انتظام کریں لیکن خدا کا حکم یہی تھا کہ ارد گرد سب تمہارے قربت داروں کی آبادیاں ہیں، ان سے چھین چھاڑ مت کرو۔ اب جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اجازت دی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ حکم خداوندی ہے۔

جنگ کا اعلان ہوتے ہی بنی اسرائیل کو اپنی آرام طلبی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے کوشش کرنے لگے کہ کسی طرح جنگ ٹل جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوئی اور راستہ اختیار کر لیں تاکہ حیون سے آمناسامنا نہ ہو۔ اس سلسلے میں انہوں نے یوشع بن نون سے ملاقات کی۔

”اے یوشع! تم جنگ کی تیاری کر رہے ہو لیکن کیا تم ان دراز قامت کو ہستانی لوگوں کا مقابلہ کر سکو گے جن کے پاس ہتھیاروں سے تیس تربیت یافتہ لشکر موجود ہے؟ ہمیں جنگوں کا کوئی تجربہ بھی نہیں۔ ہمارے تو ہتھیار بھی کند ہو چکے ہیں۔“

”ظاہری اسباب میں ہم کمزور ہیں لیکن ہم خدا کے حکم سے لڑ رہے ہیں۔ وہ ضرور ہمیں غلبہ دے گا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے زمین کے بغیر ہمیں زندہ رکھا ہے۔ زمین کا سینہ چیر کر ہمیں پانی دیا ہے۔ ہمارے لیے آسمان سے غذا اتاری ہے۔ تو کیا اس وقت وہ ہمیں تنہا چھوڑ دے گا؟ تم بہت پکڑو۔ اللہ ہماری ضرورت مدد کرے گا۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے حکم آیا۔ ”کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہ کرنا۔ جو مقابلے پر آئے اسے ہلاک کر دینا۔ شہروں اور آبادیوں کو نیست و نابود کر دینا۔ ان کا مال و زر اور چوپائے تمہاری ملکیت ہوں گے۔“

بنی اسرائیل یوں گھومتے رہنے سے عاجز آ چکے تھے۔ وہ کوئی مستقل ٹھکانا ڈھونڈ رہے تھے۔ انہیں اب یقین ہو چکا تھا کہ بغیر جدوجہد کیے کوئی حصہ زمین انہیں نہیں مل سکے گا۔ یہ لالچ بھی ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا کہ فتح کی صورت میں حیون کے چوپائے اور بے پناہ مال و دولت ان کے ہاتھ لگے گا۔ وہ غصوں کے بجائے غلوں میں رہیں گے۔ وہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

حیون کے جاسوس ”دشت قدیمات“ میں یہ دیکھنے کے لیے آ جا رہے تھے کہ بنی اسرائیل کیا سوچ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے حیون کو بتا دیا کہ بنی اسرائیل جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ وہ راستہ بدلنے کے لیے تیار نہیں، اردن پار جانے کے لیے ہمارے ہی ملک سے ہو کر گزریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ حیون پر قبضہ بجا کر بیٹھ جائیں۔

یہ سن کر حیون نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کا راستہ روکنے کے لیے تیار رہیں۔

جب اسے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل نے اپنے خیمے اٹھا لیے ہیں اور ہتھیار بند ہو کر کوچ کے لیے تیار ہو گئے ہیں تو وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ آ کر مل گیا۔

ایک مقام پر دووں قوموں یعنی امور یوں اور بنی اسرائیل کا آمناسامنا ہوا۔ اس مقام کا نام توریت میں ”بہش“ بتایا گیا ہے۔

جہاد سے انکار کیا تھا اور سزا کے مستحق ٹھہرے تھے، وہ مر چکے۔ اب ہمارے آباد ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اب تم جس قوم سے بھی لڑو گے فتح یا ب ہو گے۔ اس طویل جسموں والی قوم سے خوفزدہ مت ہو اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ من علاقہ اپنے سویڈیوں کے لیے شہرت رکھتا ہے۔ نایاب مویشی تمہارے ہاتھ آئیں گے۔ جو اس جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے گا اور مفتوحہ شہروں کو تباہ و برباد کرنے میں پیش قدمی کرے گا، اسے یہ علاقہ میراث کے طور پر دیا جائے گا۔“

یوش بن نون جانتے تھے کہ طویل مدت تک بیابانوں میں پھرنے کی وجہ سے بنی اسرائیل بہت سی دنیاوی نعمتوں سے محروم رہے ہیں۔ انہیں یہ سب چیزیں اپنی طرف منتقل ہوتی ہیں لہذا انہوں نے من کی فتح کی صورت میں ان چیزوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ وہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور من کی طرف چلے۔

”من“ کے امور یوں کو جب علم ہوا کہ اسرائیلی ان پر حملہ آور ہونے کے لیے آرہے ہیں تو انہیں ہنسی بھی آئی اور تعجب بھی ہوا۔ انہیں تو اس وقت بھی تعجب ہوا تھا جب حیون کو اسرائیلیوں نے لے لیا تھا کہ خانہ بدوش کی زندگی گزرانے والی یہ قوم کس طرح اس قابل ہو گئی کہ حیون اور اس کے دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیا اور اب تو سخت تعجب ہو رہا تھا کہ ان کی اتنی ہمت ہو گئی کہ ہماری فصیلوں سے سرنگرانے چلے آرہے ہیں۔

”آؤ ان مڑا انسا نوں کا تماشا دیکھنے باہر نکلتے ہیں۔“ عوج بن عنق نے اپنے جنگجوؤں سے کہا۔ ”ان لوگوں کو تم لوگ اپنے پیروں تلے روند کر ہی ختم کر دو گے۔ جنگ کی تو نوبت ہی نہیں آئے گی۔“

دونوں فریق جب آمنے سامنے ہوئے تو یہ معلوم ہوتا تھا ایک طرف دیو کھڑے ہیں، دوسری جانب انسان ہیں۔ دونوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔

یہ منظر دیکھ کر بنی اسرائیل پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ان میں سے بہت سے پلٹ کر پچھلی صفوں میں آ گئے۔ یوش بن نون بارہا یقین دلا رہے تھے کہ خدا نے فتح تمہارے نام کر دی ہے۔ ان سے خوفزدہ مت ہو۔ آگے بڑھو۔ انہیں شکست دو اور ان کی زمینوں پر آباد ہو جاؤ۔ تم یقین کرو تمہاری کوتاہ قاصدی تمہاری راہ میں قطعی مزاحمت نہیں ہوگی۔

جب ”من“ کے لوگوں نے دیکھا کہ اسرائیلی پہل کرنے میں جھجک رہے ہیں بلکہ ہم سے خوفزدہ ہیں تو آگے بڑھے تاکہ ان کوتاہ قاصدوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالیں۔ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے انہیں یہ سوچنے ہی نہیں دیا کہ جنہیں وہ روندنے جا رہے ہیں، وہ غیر مسلح نہیں ہیں۔

جب چاروں طرف سے گھر جائے، راہ فرار کوئی نہ ہو تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے شیر پر بھی حملہ آور ہو جاتی ہے۔ یہی حال بنی اسرائیل کا بھی ہوا۔ تنگ آمد جنگ آمد کے مصداق انہوں نے بھی اپنی کواروں سے ان امور یوں کی پنڈلیاں زخمی کرنی شروع کر دیں۔ انہوں نے اپنے پاؤں پر خود کھلاڑی مار لی۔ جب ٹانگیں ہی زخمی ہو جائیں یا کٹ کر بدن سے الگ ہو جائیں تو آدمی کھڑا کیسے رہ سکتا ہے۔ یہی حال ان امور یوں کا ہوا تھا۔ بہت سوں کی ٹانگیں کٹ گئیں، لا تعداد زخمی ہوئے اور لڑنے کے قابل نہ رہے۔ باقیوں پر ایسا رعب طاری ہوا کہ چند گھنٹوں کی لڑائی کے بعد لڑائی سے ہاتھ اٹھالیا اور فرار ہونے میں عافیت سمجھی۔ یوش بن نون نے حکم دیا کہ فرار ہونے والوں کا پیچھا کیا جائے۔ کوئی بھی زندہ نہ بچنے پائے۔

اس پچھلے میں ”عوج“ کو موقع مل گیا اور وہ بھی فرار ہو گیا۔ یہ فتح اس وقت تک نامکمل رہتی جب تک عوج کل نہیں ہو جاتا اور وہ بچ کر نکل گیا تھا۔ یہ سخت خطرے کی بات تھی۔ اس کے بچ جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیل کو کہیں بھی چین سے نہیں رہنے دے گا۔

اس کی قوم کے جو افراد گرفتار ہو کر آئے تھے، ان سے معلوم کیا گیا کہ ان کا بادشاہ بھاگ کر کہاں گیا ہوگا۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے نہایت مضبوط اونچی فصیلوں والے ساتھ شہر ہیں۔ وہ ان میں سے نہیں گیا ہوگا۔ اب وہ تمہارے ہاتھ آنے والا نہیں کیونکہ جب تم ایک شہر میں جاؤ گے تو وہ دوسرے شہر میں چلا جائے گا۔

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن، مولانا محمد حفظ الرحمن۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر۔ توریث، ارض القرآن، سلیمان ندوی۔ ترجمان القرآن، ابو الکلام آزاد۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔

جین کو وہ گڑیا میل باکس میں پڑی ہوئی ملی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ یہ کہاں سے اور کس نے بھیجی ہے کیونکہ اس پر کوئی نام و پتا موجود نہیں تھا۔ گڑیا بہت خوبصورت تھی۔ اس کا قد تین فٹ اور بال گہرے سمورے رنگ کے تھے۔ گڑیا کی نیلی آنکھیں بالکل حقیقت کا گمان دے رہی تھیں۔ اس گڑیا کو بنانے والے نے بہت ہی مہارت اور نفاست سے بنایا تھا۔

اس نے گڑیا کو باکس سے باہر نکال لیا۔ جیسے ہی اسے باہر نکالا جین نے دیکھا کہ اس کے نیچے ایک ہندو لفظ منسک تھا۔

گریا

محمد سب اول خان

کچھ لوگوں کا تخیل اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ انہیں اس پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ وہ بھی تصوراتی دنیا کی شیدائی تھی اور ہر عکس میں اپنی منشا کے مطابق جھلک دیکھنا چاہتی تھی... بس یہی عادت اس کی جان کا روگ بن گئی۔

شادی جمادوں سے پھرنے والی ایک گڑیا کا انجام



رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ جب اس نے گڑیا کو باس سے نکالا تھا تو اس کا سر نیچے کی جانب تھا۔ اس سے زیادہ خوف کی بات یہ تھی کہ گڑیا کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔ ایسی مسکراہٹ جس میں کوئی گہرا راز پنہاں ہو۔

جین نے وہ خط میز پر رکھا اور گڑیا کو اٹھا کر اپنے رہائشی کمرے میں داخل ہو گئی اور گڑیا کو ایک کونے میں رکھ دیا۔ اگلے دس منٹ تک وہ اپنے اپارٹمنٹ میں شہلے رہی تا کہ وہ اپنے آپ کو خوف کے اس احساس سے باہر نکال سکے جو اسے گڑیا کو دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا۔

دوپہر کے تقریباً دو بجے اس نے اپارٹمنٹ سے باہر جانے کا پروگرام بنایا تا کہ تھوڑا فریش ہو سکے۔ اس کے لیے اس نے اپنی بہن کے ہاں جانے کا سوچا۔ اس کے خاندان میں اس کی بڑی بہن بیگنی کے علاوہ کوئی نہیں بچا تھا۔ بچپن سے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھیں۔ اپارٹمنٹ سے باہر نکلتے ہی جین نے ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ پندرہ منٹ بعد ڈرائیور نے اسے بیگنی کی بلڈنگ کے سامنے اتار دیا۔ جین نے ٹیکسی ڈرائیور کو دس ڈالر دیے اور ٹیکسی سے باہر آئی۔

جین بلڈنگ کے انترکام کی جانب بڑھی اور اپنی بہن کو کال کی۔

”ہیلو کون؟“ بیگنی نے پوچھا۔

”ہیلو بیگنی! یہ میں ہوں۔“

دروازہ ایک آواز کے ساتھ کھلا اور جین لفٹ میں داخل ہوئی اور چوتھی منزل کا مین وادیا۔ جیسے ہی لفٹ کا دروازہ کھلا اس کی بڑی بہن اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”تمہیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تمہارے دروازے تک آ رہی تھی۔“ جین نے بہن کو گلے ملنے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں..... میں نے تمہیں بہت یاد کیا۔“

بیگنی نے کہا۔

”اور سناؤ کیا حال چال ہیں، سب کیسا چل رہا ہے؟“

اس نے اپارٹمنٹ کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

”ہاں فی الحال تو سب بڑھا ہے۔“ جین نے کہا۔

چلتے چلتے وہ اپارٹمنٹ میں پہنچ گئے۔ بیگنی نے چائے بنائی اور دونوں گپ شپ مارنے بیٹھ گئیں۔

”میں کب سے اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ جین نے کہا۔

”جو کچھ بھی ہوا تھا تم اس کے لیے خود کو ذمہ دار مانتی تھی۔“

”سبھی تم جانتی ہو وہ سب تمہاری غلطی نہیں تھی۔“ بیگنی نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ اس مشکل وقت کے بارے میں سوچے بٹھائیں رہ سکتی تھی جس سے وہ دو سال سے غمزدار رہی تھی۔ اپنی شیزوفرینیا کا شکار ماں کی دیکھ بھال کرتے ہوئے اس کی ماں اسے اس حال تک لے آئی تھی جہاں وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ جین نے فیصلہ کیا تھا کہ ان کی ماں کی بہتر دیکھ بھال کسی ذہنی امراض کے اسپتال میں ہو سکتی ہے جس پر بیگنی بھی متفق تھی۔ دونوں لڑکیاں مسلسل کئی مہینے تک اسپتال میں ماں سے ملتی رہی تھیں مگر آخر کار ان کی ماں بہت متشدد ہوئی اور ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔ ایک سال بعد ان لڑکیوں کی ماں پوائنٹ ویو دماغی اسپتال میں اپنے کمرے میں اکیلی مر گئی۔ جین کے لیے یہ بہت سخت اور مشکل وقت تھا۔ وہ اپنی ماں سے بہت محبت کرتی تھی مگر پچھلے چند سالوں میں وہ بالکل بدل چکی تھی۔ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اتنی مضبوط نہیں تھی۔

”اب تمہیں زندگی میں آگے بڑھنا ہوگا۔ ہماری ماں بھی یہی چاہتی تھی۔“ بیگنی نے کہا۔

”ہاں میں جانتی ہوں۔“ جین نے سوگوار انداز میں کہا پھر موضوع بدلتے ہوئے مزید بولی۔ ”آج مجھے سیل باکس میں ایک گڑیا پڑی ہوئی ملی۔“

”اچھا..... بیگنی کو اسے کسی اور موضوع پر بات کرتے ہوئے دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔

”ہاں۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ بالکل ایسی دیکھتی تھی جیسے.....“ جین بات کرتے کرتے رک گئی۔

”کیا ہوا؟“ بیگنی نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

”وہ بالکل ایسی دیکھتی تھی جیسے ہمیں بچپن میں کھیلنے کے لیے دیتی تھی۔ بس یہ اس سے تھوڑی سی ہے۔“

”کس نے بھیجا ہے؟“ بیگنی نے پوچھا۔ اس کے جسم میں ایک خوف کی لہری دوڑ گئی۔ یہ خوف کا احساس اسے اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی بہن کے لیے محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب بیواں ہے مگر وہ پھر بھی خود کو خوف کے اس حصار سے باہر نہ نکال پائی۔

”میں نہیں جانتی۔ اس پر سمجھنے والے کا نام وپتا موجود نہیں تھا۔“ جین نے جواب دیا۔

”بڑی عجیب بات ہے۔“ بیگنی نے عجیب و غریب خیالات کو دماغ سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

اگلے چند گھنٹے وہ چائے پی کر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اس کے بعد بیگنی نے ڈنگا لیا اور کھانا کھانے کے بعد

جین نے اپنے گھر جانے کا پروگرام بنالیا۔ اب اس کی طبیعت تھوڑی سنبھل چکی تھی۔

باہر جا کر اس نے ایک ٹیکسی پکڑی اور بیک سیٹ پر آرام سے بیٹھ گئی۔ پندرہ منٹ میں ڈرائیور نے اسے اپنی بلڈنگ کے سامنے اتار دیا۔ وہ دروازہ کھول کر اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئی۔ آج وہ خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی اور کچھ دیر سونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور لائٹ جلائی۔ جیسے ہی اس کی نظر گڑیا پر پڑی اس کے قدم دبیں جم گئے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہاں گڑیا نہیں بلکہ ایک جیتی جاتی لڑکی بیٹھی ہو۔

وہ بالکل اصل انسان کی طرح لگ رہی تھی اور جین کو کسی کی یاد دلا رہی تھی۔ اسے رنگوں میں خون نمود ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اپنی انگلی تک نہیں ہلا پارہی تھی۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پایا اور کمرے سے نکل کر ہال وے کی جانب دوڑ پڑی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے گڑیا کی آنکھیں ابھی تک اسے دیکھ رہی ہوں۔

وہ ہاتھ روم میں کھس گئی اور شاور کھول دیا۔ گرم پانی کے نیچے کھڑے ہوئے ہی اسے اپنی بہن کے ساتھ کی ٹکٹی مفلکتہ یاد آ گئی۔

..... کہ یہ گڑیا بالکل اس گڑیا کی طرح تھی جیسی ان کی ماں نے انہیں بچپن میں خرید کر دی تھی۔ یہ بالکل ایک عجیب و غریب اتفاق لگتا تھا۔ جیسے اس کی ماں نے ہی اس کو یہ گڑیا بھیجی ہو تاہم اس پر سمجھنے والے کا نام وپتا بھی تو نہیں تھا۔ جین نے پانی بند کیا اور ایک تولیہ لپیٹ کر شاور سے باہر نکل آئی۔

اجانک اس کے قدم پھر جم گئے۔ اسے اپنے کمرے سے کسی کے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ یہ فہمی بہت جانی پہچانی تھی۔ اس نے ہاتھ روم کا دروازہ کھولا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائی ہوئی ہال وے کی جانب بڑھ گئی۔ جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا اس کی نظریں گڑیا سے ٹکرائیں۔ اس کی سانس رک گئی۔ خوف کی لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔

گڑیا کے خدو خال بدلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بالکل ایک اصل انسان کی طرح لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اتنی روشن اور جاندار تھیں کہ جین کو ایسا لگا یہ وہ گڑیا نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہی چیز ہے..... کچھ بہت ہی پر اسرار شیطانی قسم کی چیز۔

وہ گڑیا کھڑی رہی تھی۔ جتنے غور سے وہ اسے دیکھتی اسے ایسا لگتا جیسے یہ بالکل اس کے کسی جاننے والے سے

بچنے پر جوش لہجے میں باپ کو بتایا ”پاپا! اس کس میں ایک آدمی گھوڑے پر بڑے مزے مزے کے کرتب دکھاتا ہے..... وہ اچھل کر گھوڑے پر بیٹھتا ہے..... کبھی لٹک کر اس کے پیٹ کے نیچے آ جاتا ہے..... کبھی دم پکڑ کر لٹک جاتا ہے..... کبھی گھوڑے کی گردن سے چٹ جاتا ہے۔“

”یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے چٹا!“ باپ نے بے نیازی سے کہا ”میں جب زندگی میں پہلی مرتبہ گھوڑے پر سوار ہوا تھا تو میں نے بھی یہی کچھ کیا تھا۔“

خواب

ایک مریض گھبراہوا ڈاکٹر کے پاس آیا اور بولا۔

”ڈاکٹر صاحب! رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میں نے ایک بہت بڑا تربوز کھایا ہے۔“ ڈاکٹر نے اسے تسلی دیتے ہوئے پوچھا۔

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ مریض نے فوراً کہا۔

”جناب پریشانی کی بات یہ ہے کہ جب میں صبح سو کر اٹھا تو بستر سے میرا کئی غائب تھا۔“

رضوان احمد مدحمان، اورنگی ٹاؤن کراچی

مشاہرہ ہو۔

وہ بالکل اسے اپنی ماں کی طرح لگ رہی تھی۔

جین نے گڑیا کو اٹھایا اور کباڑے والے کمرے کی جانب دوڑ لگا دی۔ اسے اندر پھینکا اور کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

وہ بار بار اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ یہ سب اس کا دماغ ہے۔ اسے بس کچھ دیر نیند کی ضرورت ہے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس خوفناک احساس سے باہر نہیں نکال پارہی تھی کہ اس کی ماں اب بھی اس کے آس پاس ہی ہے۔

جین اچانک جاگ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیوں جاگ گئی؟ آخر وہ کیا احساس تھا؟ یا تو اسے کوئی برا خواب آیا تھا یا اسے ہاتھ روم کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی تو اسے پتا چلا کہ آخر وہ کس وجہ

سینس ڈائجسٹ 243 اکتوبر 2018ء

کیکر

ظفر اقبال ظفر

دنیا کا سب سے خوبصورت رشتہ قدرت نے ماں اور بچے کا بنایا اور ماں کے دل میں اپنی محبت کا کچھ حصہ رکھ دیا... اور پھر ایسی اولاد جو منت اور مرادوں سے ملی ہو لیکن وہ اچانک زندگی کے اندھیروں میں گم ہو جائے... پھر کیسے کسی کو چین آئے... اسے بھی صبر نہیں آ رہا تھا... باپ کو بھی یہی غم دیمک کی طرح لگ چکا تھا... جن کے طفیل بچے والدین سے جدا کر دیے جاتے ہیں ان سنگ دلوں سے قدرت بہت کر بٹاک انتقام لیتی ہے مگر وہ یہ حقیقت بھول جاتے ہیں۔

کیکر کے درخت تلے بیٹھی ایک بے بس عورت کی آواز زاری کا دل ٹکا رہے



اپنا ضبط بکھر گیا اور وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگا۔
”جا جا فیضو تو جا کے چھوٹے خان کا دلا جی گھوڑا
ڈھونڈ، اس کا ٹھون لگا۔ میرے نصیب میں میرا حسنی ہوا تو
وہ خود ہی لوٹ کے آجائے گا ایک دن۔“ اور پھر یہ کہہ کر

نرس نے جواب دیا۔
ڈاکٹر نیل نے دروازے کو کھولا اور کمرے میں داخل
ہو گیا۔ جین وہاں کی گھٹنوں سے موجود تھی۔
”ہیلو جین! میرا نام ڈاکٹر نیل ہے۔ تم اس وقت پوائنٹ
ویوسائیکلر اسپتال (نفسیاتی اسپتال) میں موجود ہو۔“
جین ایک ٹنگ ڈاکٹر کو خالی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
وہ منہ ہی منہ میں کچھ ان کی آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔
”کیا تمہیں یاد ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟“
ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔
کوئی رسپانس نہیں ملا..... ڈاکٹر نے ایک نئی سمت میں
کوشش کی۔ ”تمہاری بہن، جین، موجود ہے۔ میں اسے بلاتا
ہوں اور تم اس سے بات کر سکتی ہو۔“

جب ڈاکٹر کمرے سے باہر نکلا۔ جین تب بھی غلامیں
گھور رہی تھی مگر اس کی آواز تھوڑی بڑھ گئی۔
”اب چونکہ تم نے مجھے ڈھونڈ لیا ہے۔ اب ہم بھی جدا
نہیں ہوں گے۔“

”بھی بھگی کوئی چیز تھامے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔
”میری پیاری بہن، اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟“
بھگی نے انفر دیکر کہا۔ وہ ان سب حالات کے بارے
میں سوچ کر بہت پریشان سی تھی اور اسے یہ حالات خامے
جانے بچانے لگ رہے تھے۔

جین کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔ وہ ان
آنسوؤں کی پیش محسوس کر سکتی تھی۔

”ارے نہیں جین..... تم رومت۔ دیکھو میں تمہارے
لیے کیا لے کر آئی ہوں۔ یہ تمہیں اچھی کہنی فراہم کرے گی۔“
بھگی نے ایک چار عیروں والی گڑیا اس کے سامنے کی۔
جین نے اپنی ماں کے چہرے والی گڑیا کو دیکھا اور ایک فلک
ڈگاف چیخ ماری۔ وہ اب سمجھ چکی تھی کہ وہ اب اپنی ماں سے بھی
بھی پیچھا نہیں چھڑا سکتی۔ ”بھی بھگی نہیں.....“

”کیا ہوا جین..... کیا ہوا؟“ بھگی نے بڑی حیرت سے
پوچھا۔ وہ سمجھ اپنی بہن کو دیکھتی اور بھی اس گڑیا کو۔

بھگی کو تو وہ ایک بہت ہی خوبصورت اور دلربا دیکھنے
والی گڑیا دکھائی دے رہی تھی اور اسی لیے وہ بڑی متحیر تھی۔

بھگی ڈاکٹر نیل کمرے میں داخل ہوا اور بھگی سے بولا۔
”میرے خیال میں اس وقت عقل کا تقاضا یہی ہے کہ
اسے ابھی ہم نہیں رکھیں کیونکہ اب اس میں شیر ذریعہ کی
علامات ظاہر ہونا شروع ہوئی ہیں۔“

سے بیدار ہوئی تھی۔ ہال وے سے شور کی آواز آرہی تھی۔
یہ دروازہ کھلنے کی اور کسی کے قدموں کی چاپ کی آواز تھی۔
ایسا لگ رہا تھا جیسے باہر کوئی ٹہل رہا ہو۔ قدموں کی آہٹ
قریب آتی جا رہی تھی۔ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ
خود بخود تھوڑا سا کھل گیا۔ اب اس کی حالت یہ تھی کہ کاٹو تو
بدن میں لہو نہیں۔ وہ بستر پر بالکل ساکن بیٹھی ہوئی تھی اور
اس نا دیدہ چیز کے قریب آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ قدم چلتے
رہے اور پھر وہ اس کے دروازے کے باہر رک گئے۔ جین
دروازے کے نیچے کے سوراخ سے دو نیچے قدموں کا سایہ
واضح طور پر دیکھ سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ دروازہ تھوڑا اور کھل
گیا اور اچانک گڑیا نے کھلے ہوئے دروازے سے اندر
جھانکا۔ اس کا کول اور خوبصورت چہرہ اب ایک شیطانی
بدروح کی طرح لگ رہا تھا۔

”اب میں کیا کروں؟“ جین نے سوچا۔
گڑیا دروازے والی جگہ پر کھڑی اسے گھور رہی تھی۔
وہ آنکھیں جو پہلے بالکل زندہ اور اصلی لگتی تھیں، اب ان کی جگہ
تاریکی اور مردہ پن تھا مگر ابھی ان میں ویسی ہی نیچنی گئی جیسے
اس نے پہلی بار اسے پاس سے باہر نکالتے ہوئے دیکھی تھی۔
وہ گڑیا کچھ بول رہی تھی مگر جین کو اس کی آواز سنائی نہیں
دے رہی تھی لیکن وہ گڑیا کے ہونٹوں کی زبان سمجھ پارہی تھی۔
جیسے وہ کہہ رہی ہو.....

”تمہیں پتا ہے تم نے کیا کیا ہے؟“
”مگر تم کیا چاہتی ہو مجھ سے؟“ جین اچانک چلائی۔

وہ خوف سے ٹنگ رہ گئی جب اس نے گڑیا کو اپنی
جانب چل کر آتے ہوئے دیکھا اور جین کو پہلی بار اس کی آواز
سنائی دی۔

”اب میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا ہے۔ ہم اب کبھی بھی
جدا نہیں ہوں گے۔“

جین زور زور سے چلانے لگی۔ اسے ایسا محسوس
..... ہو رہا تھا جیسے وہ کسی گڑیا سے نہیں بلکہ اپنی ماں سے
بات کر رہی ہو۔

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور وہ بلا مزاحمت
اندھیرے کی آغوش میں چلی گئی۔

☆☆☆
”اس کی یہ حالت کتنی دیر سے ہے؟“ ڈاکٹر نیل نے
دروازے کے باہر سے اس کا معائنہ کرتے ہوئے نرس سے پوچھا۔
”اس کی یہ حالت کتنی گھٹنوں سے ہے۔ وہ بس خاموشی
سے بنا کوئی آواز نکالے سامنے والی دیوار کو گھورتی رہی ہے۔“

سکینہ نے سینے پر ہاتھ مارا اور پچھائیں کھانے لگی۔
اگلے ہی لمحے برابر والی ہمسائی بختو دیوار سے آدمی
لنگ کر اسے سمجھا رہی تھی۔ ”سکینہ مرے کی کیا رو کر اپنی
جان دے گی؟“ ارے دعا کر اللہ سامعین سے۔ مصلّا بچا
کے بیٹے جانا۔ اکیلی تو نہیں سارا وسیع تیرے حسنی کے لیے
ترپ رہا ہے۔ ہائے اللہ کہاں گیا ہنسا کھلتا پچا! بختو کی
آواز بھرا گئی۔ پھر سکینہ نے ایک دلدوز چنچ ماری اور پہلو
کے بل لیتی چلی گئی۔ فیضو نے جلدی سے اس کا سرا اپنی گود
میں رکھا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ بختو
دیوار پھانڈ کر آگن میں کود گئی اور سکینہ کے کمرے میں گئی۔
حسنی کو مہوئے آج پانچواں دن تھا۔

شادی کے تیسرے سال بھی جب سکینہ کی گود ہری نہ
ہوئی تو فیضو سکینہ کو لے کر کہاں کہاں نہ پھرا۔ احمد و کبھار یہ کیا
جھوپڑا اور جگہ جگہ اپنے ترے کے میں چھوڑ کر مارتا تھا جن میں
سے ایک گدھے کا کھر گل گیا اور وہ دو مہینے کے اندر اندر مر
گیا۔ دو گدھے فیضو نے سکینہ کے دوا دارو کی خاطر بیچ
دیے۔ جس نے جو ٹوکنا بتا دیا وہ کیا۔ جس پر فقیر کا نام سنا، فیضو
سکینہ کو لے کر وہاں پہنچا۔ سکینہ کی کچھ پھر بھی سوچی رہی۔
سات برس تک فیضو کے گھر میں دکھ اور اداسی کی رتی رتی
رہی۔ آخوئیں برس کے تیسرے مہینے کی وہ ٹھنڈی میٹھی سی
رات تھی جب سکینہ فیضو کی طرف کروٹ لے کر بولی۔
”فیضو.....!“

”کیا ہے سکینہ؟“ فیضو نے سکینہ کی طرف سے تھکا تھکا
جواب دیا۔ آج سارا دن وہ رمضان کے بھٹے سے اٹھیں
لا دلا کر بڑے خان کی حویلی میں ڈال رہا تھا۔ کوئی بیسیوں
پکڑے ہوں گے اس نے بھٹے سے حویلی تک۔ سولہویں پکڑ
میں تو ایک گدھا ڈھیر ہو گیا تھا۔ حویلی کا رستہ سامعین فیلے
کے دربار کی چڑھائی سے ہو کر جاتا تھا۔ گدھا بھی کیا کرتا،
مشقت کی انتہا ہو گئی تھی آج۔ دن ڈھلے بڑے خان نے
واپسی کی اجازت دی تو فیضو کو یوں لگا جیسے عرقید کی سزا
کاٹ کر جا رہا ہو۔ جاتے جاتے بڑے خان نے فیضو کبھار کو
میں سیر گندم پٹ سن کی ایک پٹی میں بندھوا کر بخش دی جسے
اس نے ایک گدھے پر لا دیا تھا اور حویلی سے نکلے ہی اپنے
سر پر رکھ لیا تھا۔ فیضو کو اپنے دونوں جانوروں کی بیچارگی پر
ترس آرہا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ گھر پہنچا۔ اپنی ٹھکان اور
ٹوٹے ہوئے بدن کے باوجود اس نے ٹھکانا بھر دونوں
گدھوں کو کھیرا کیا پھر ان کے چارے پانی سے فارغ
ہو کر وہ روستی کے پاس پڑی چار پانی پر ڈھیر ہو گیا۔

اس کے سر ہانے کی طرف پٹی میں بندھی میں سیر گندم
دھری تھی۔ فیضو نے آج دن میں کتنی ہی بار اپنے مرے
ہوئے باپ احمد و کبھار کو کوسا تھا جس نے اپنے ترے کے میں
مشقت اور یہ گدھے چھوڑے تھے اس کے لیے۔ اب وہ
بے سدھ چار پانی پر پڑا آگن میں لگے کیکر کو گھور رہا تھا پھر
وہ سوچنے لگا، سکینہ بھی تو کیکر کا ایک درخت ہی ہے جس پر
کوئی پھل ہی نہیں آتا۔ یہ تو بس ایندھن ہے جسے جلانے رکھو
اور خود کو گرمائے رکھو۔ سکینہ بھی تو سات سال سے ایندھن کی
طرح ایک جلتا ہوا وجود کی اس کے لیے۔ جس نے اسے
گرمائے ہوئے تھا، مگر کیکر میں تو تیز اور ٹیکلے کانٹے ہوتے
ہیں۔ سکینہ کے وجود میں تو کوئی کانٹا نہیں تھا، اس کے تو دل
میں ایک پھانس تھی، اولاد سے محرومی کی پھانس۔ یہ پھانس تو
خود فیضو کے دل میں بھی تھی۔ اور یہ پھانس اس وقت
زیادہ سرا بھارتی تھی جب وہ گلی میں بچوں کو کھیلنے، دوڑتے
دیکھتا تھا۔ تو کیا میں اس کیکر کو دیکھتے دیکھتے بوڑھا ہو جاؤں
گا؟ دکھ کی ایک بجلی فیضو کے سینے میں گونڈی اور اس کی
آنکھوں سے گرم گرم پانی سا بہنے لگا۔ ”فیضو!“ اس بار
سکینہ نے اس کا اندھا بھٹہ جوڑ ڈالا۔
”ہاں کیا ہے سکینہ؟“ ایک دم فیضو نے اپنی نظریں
کیکر سے ہٹے اتار لیں۔

”آج تو نے ہاتھ نہ بھی نہیں دھویا۔ روٹی بھی نہیں
کھائی اور لگتا ہے تو تھکا ہوا بھی بہت ہے۔“ سکینہ اب فیضو
کے دھول سے اٹنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔
”بس یو بھی پڑا رہنے دے مجھے سکینہ۔ نہ ہاتھ منہ
دھو کر کد ل کر رہا ہے اور نہ روٹی کھانے کو۔“ فیضو کو تو
آج بس کیکر کے ساتھ اچھا اچھا لگ رہا تھا اور پھر اس نے
دوبارہ اپنی نظریں میں کیکر کے کانٹے پر ڈالے۔ آج سے
پہلے سکینہ نے فیضو کو کبھی اتنا چپ چاپ نہیں دیکھا تھا اور سکینہ
خود بھی اس سے بولتے رہنے کے لیے اتنی بے چین نہیں ہوئی
تھی۔ آج سکینہ کا دل بولنے رہنے کو چاہ رہا تھا۔ اب کے
دن کسی اور طرح چڑھے تھے۔ جب سکینہ نے بازار جاتی
ہوئی بختو سے تیسری بار اہلی منگوائی تو بختو نے سکینہ کو اپنے
سینے سے لگا کر سمجھایا پھر اپنے دو سال کے بچے کو گود سے اتارا
اور بڑی کاتھلا پھینک کر کریمین دان کی کولانے چلی گئی۔

کریمین دان کی ساتھ سال کی تجربہ کار عورت تھی۔ اس
نے سکینہ کو ایک نظروں دیکھتے ہی اپنی چادر کا پلو پھیلا دیا۔ بختو
نے پہلے تو سکینہ کی پشت پر ایک چٹنی بھری پھر روستی سے سیر
بھرا آٹا اور پاؤ بھر لاکر کریمین دان کی کولانے پلو میں باندھ دیا۔

اس بات کو آج ساتواں دن تھا۔ بختو نے سکینہ کو قسم دے
رکھی تھی کہ فیضو کو ابھی کچھ نہ بتائے مگر آج ساتویں دن سکینہ
کا پیٹ اولاد کے بوجھ سے کم اور بات کے بوجھ سے زیادہ
بھاری ہو رہا تھا اور پھر رات کے نہ جانے کس پہر سکینہ نے
فیضو کے کان میں اپنے بھاری ہوتے ہوئے وجود کی ساری
خوشبو انڈیل دی۔

آگن میں تپتی ہوئی دکھ اور اداسی ٹوٹ چکی تھی۔ فیضو
نے خوب مسل مسل کر ہاتھ نہ دھویا اور پیٹ بھر کر روٹی
کھائی۔ اگلے دن بختو نے دیوار سے جھانک کر دیکھا تو فیضو
اپنے آگن میں لگا کیکر کا درخت کٹا رہا تھا۔ اس نے
شرارت بھری نظریں سے سکینہ کی طرف دیکھا اور واپس
پلٹ گئی۔

سردیوں کے شروع دنوں میں سکینہ کی گود ہری
ہو گئی۔ مٹکی کی ساری عورتیں ایک ایک کر کے سکینہ کے گھر
مبارکباد دینے آئیں اور بختو نے سب کا منہ میٹھا کرایا۔ حسن
بخش کی صورت میں بختو کے بچوں کو ایک کھلونا مل گیا تھا۔
سارا سارا دن سکینہ کے آگن میں بچوں کے شور اور حسنی کی
فلقار یوں کی سرسوں پھوٹی اور دن ڈھلے تک سکینہ اپنے حسنی
کو بتا سنوارا دیتی جسے فیضو آتے ہی سینے کا تعویذ بنا کر چومنے
چاہنے لگ جاتا۔

حسنی اب چوتھے سال میں جا لگا تھا۔ کبھی کبھی ضد
کر کے فیضو کے ساتھ گدھے پر سوار ہو کر گاؤں میں نکلتا۔
فیضو اسے سامعین فیلے کے دربار کی چڑھائی تک سیر کرا کے
واپس گھر چھوڑ جاتا تھا۔ شام کو بختو کی پانچ سالہ فاطمہ اسے
اپنے ساتھ مائی حاجن کے گھر لے جاتی جہاں وہ دوسرے
بچوں کے ساتھ مل کر نورانی قاعدہ پڑھ رہی تھی۔ کبھی
فیضو کو نئی دن گھر سے باہر بھی گزرتا تھا۔ سکینہ جانتی تھی کہ
فیضو کا باپ احمد و کبھار اس علاقے کا مشہور کھوئی تھا اور فیضو
نے جیتے جی اپنے باپ سے یہ فن سیکھ لیا تھا۔ اب اس گاؤں
میں کہیں بھی کوئی چوری چکاری ہوئی تو فیضو کبھار فیضو کھوجی
بن کر کھرا تلاش کرنے کے لیے لوگوں کے ساتھ نکل کھڑا
ہوتا۔ اکثر چوریوں کا کھوج لگانے کے صلے میں انعام لے
کر گھر لوٹتا تھا۔ گاؤں کے کچھ بھجھدار اور محتاط طبیعت لوگوں
نے فیضو کو کوئی بار سمجھا یا کہ وہ اس کام کو چھوڑ دے، جراثیم پیشہ
لوگوں سے دشمنی مول لیتا پھر تباہ ہے مگر فیضو کو اس کا مرابا
اسی رخ سے اچھا لگتا تھا کہ اس نے ساری زندگی مظلوم
لوگوں کے لیے کھرا تلاش کرنے میں گزاردی تھی۔ فیضو بھی
کسی لالچ کے بغیر لوگوں کے ساتھ چل پڑتا تھا۔

سنہری باتیں

☆ مصیبت میں آرام کی تلاش مصیبت کو ترقی
دیتی ہے۔

☆ ہمت سے زندگی بنتی ہے اور بے دلی سے
موت۔

☆ جدوجہد نہ کرنا عثمائی کا باعث ہوتا ہے۔

☆ مطالعہ غم اور اداسی میں بہترین دوست
ہے۔

☆ بغیر کوشش کے کامیابی حاصل کرنا ایسے ہی
ہے جیسے بغیر پروں کے اڑانے کی کوشش کرنا۔

☆ سختی کے سامنے پہاڑ ٹکڑے ہیں اور ست کے
سامنے نگر پہاڑ ہیں۔

☆ غلام حسین اختر، سرگودھا

تخمینہ

☆ جس زمانے میں وزن کرنے کی مشین ایجاد نہیں
ہوئی تھی تو شائستہ عورتیں چوڑیوں کے ٹھک ہونے اور مرد

چار پائی کے بان کے دباؤ سے دوسروں کے وزن کا تخمینہ
کرتے تھے۔ اس زمانے میں چار پائی صرف میزان جسم

ہی نہیں بلکہ معیار اعمال بھی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جنازے کو
کندھا دینے والے چار پائی کے وزن کی بنا پر مرحوم کے

جنتی یا اس کے برعکس ہونے کا اعلان کرتے تھے۔ یہ کوئی
دھکی چھپی بات نہیں کہ ہمارے ہاں دیلے آدی کی دنیا اور

مولے کے عقبے عام طور سے خراب ہوتی ہے۔

☆ مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ”چراغ تلے“ سے اقتباس

☆ ایک دن نور کے ترے کے حویلی سے فیضو کا بلاوا آ گیا۔

☆ فیضو نے سمجھا کہ آج پھر دن بھر کی بیگار بھیلی پڑے گی اور

صلے میں وہی دس بیس سیر گندم..... بڑے خان کا بلاوا تھا اور

باہر کھڑا آدی آوازوں پر آوازیں دیے جارہا تھا۔ فیضو جلدی

سے اٹھا اور جاگے ہوئی سکینہ کے پہلو میں لیٹے ہوئے حسنی کو

پیار بھری نظریں سے دیکھتا ہوا دروازے تک جا پہنچا۔

☆ ”کیا ہے بھئی..... سویرے سویرے خیر تو ہے؟“ فیضو

نے دروازے سے نکلے ہی باہر کھڑے آدی سے پوچھا۔

☆ ”اوائے تو یہیں کھڑا سوال کرتا رہے گا یا پلے گا بھی

سہی۔“ اس نے ترخ کر جواب دیا تو فیضو اسے پہچان گیا۔

☆ وہ حویلی کا وفادار ملازم اچھو موچی تھا۔

☆ ”یا تو روتے سے اکھڑ رہا ہے اچھو۔ میں تو یہ پوچھ رہا

ہوں کہ میں اکیلا چلوں یا گدھے کھول لوں؟“ فیضو نے سوال کیا۔

”او یار تو اکیلا چل تجھے بلایا ہے، وڈے خان صاحب نے۔“ اور اگلے ہی لمحے فیضو اچھو کے ساتھ حویلی کی طرف جا رہا تھا۔

”اوائے آج تک کسی مائی کے لال کی جرأت نہیں ہوئی کہ حویلی سے بھوسے کا ایک تکا بھی چرا لے۔“ مصطلب سے ولا جی گھوڑا کوئی کھول کر لے گیا اور تم لمبی تان کر سوتے رہے۔“ بڑے خان عالمگیر مصطلب کے دونوں ملازموں پر ہنسر رہا ہے تھے۔ اچھو موچی نے فیضو کھار کو بڑے خان کی خدمت میں حاضر کیا اور ہاتھ باندھے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”اوائے فیضو! اپنے مرے باپ کا سارا فن اور اپنی ساری ذہانت داد پر لگا اور ہمارے ولا جی گھوڑے کا کھوج نکال۔“ جہانگیر کو پتا چل گیا تو وہ مصطلب کو ان دونوں کینوں سمیت آگ لگا دے گا۔“ بڑے خان نے ایک بار پھر اوندھے پڑے ہوئے ملازموں پر اپنا ہنسر ادا کیا۔

دن چڑھتے ہی سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ بڑے خان کی حویلی سے ان کے بیٹے چھوٹے خان جہانگیر کا پالتو ولا جی گھوڑا کوئی کھول کر لے گیا ہے اور فیضو کھار اس چوری کا کھوج لگائے گا۔ شام تک سکینہ فیضو کی راہ دیکھتی رہی۔ دن ڈھلے بختو نے دیوار پر پھیلائی ہوئی گدڑی اتارتے ہوئے اسے بتایا کہ فاطمہ کا ابا کبہر رہا تھا فیضو بڑے خان کے آدمیوں کے ساتھ نکلا ہے گھوڑے کا کھوج لگانے اور یہ چوری معمولی چوری نہیں ہے۔ کیا پتا کتنے دنوں میں کھار ملتا ہے چوروں کا۔

تیسرے دن فیضو گھر لوٹا۔ وہ ناامید اور تھکا تھکا سا تھا۔ ”کوئی کھوج ملا کہ نہیں؟“ سکینہ نے پوچھا۔

”گاؤں کا چپا چپا چھان مارا، نہ کھوڑے کا کھار ملتا ہے نہ کسی چور کا۔“ فیضو نے جواب دیا۔

”تو پھر گھر بیٹھ آرام سے۔“ کیوں اپنی جان ہلکان کرتا ہے۔“ سکینہ بڑبڑائی۔

”پاکل ہوئی ہے تو۔“ یہ چوری کسی عام بندے کے گھر نہیں، بڑے خان کی حویلی میں ہوئی ہے۔ بڑے خان کی نینداڑی ہوئی ہے غصے کی وجہ سے اور پھر..... یہ استحان ہے احمد و کھار کے بیٹے فیضو کا..... آج تیسرا ہی تو دن ہے، کل پھر نکلیں گے۔“ فیضو یہ کہہ کر چار پائی پر لیٹ گیا۔

حاجن مائی کے گھر بھول آیا تیرا بیٹا۔“ بختو نے دیوار سے جھانک کر قاعدہ سکینہ کی طرف لہرایا۔

”حسنی کا قاعدہ؟ حسنی خود کہاں ہے؟..... حسنی گھرتو نہیں آیا۔“ سکینہ نے تعجب اور تشویش بھرے لہجے میں بختو کی طرف دیکھا۔

”کہاں رہ گیا حسنی؟“ فیضو ایک دم جھٹکے سے اٹھا۔

”فاطمہ کبہر رہی تھی آج حسنی کچھ دیر پہلے ہی حاجن مائی کے گھر سے نکل آیا تھا۔“ بختو کا جواب سن کر سکینہ کا دل پیٹنے لگا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ فیضو تیزی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ حویلی دیر بعد بختو اور سکینہ بھی گلی کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دس چکر کاٹ کر واپس آ چکی تھیں۔ سکینہ کی دہلی دلی سسلیاں سید تھوڑ کر باہر آنے لگیں۔ بختو، فیضو کے آنے تک اس کی ڈھارس بندھاتی رہی۔ رات گئے تک فیضو گھر لوٹا تو وہ اکیلا تھا۔ اسے اکیلا اور تھکا تھکا دیکھ کر سکینہ نے پہلی پچھاڑ کھائی اور بے ہوش ہو گئی..... رونے پینے کی آوازیں سن کر اڑوس پڑوس کی کچھ عورتیں اور مرد بھی آگئے۔ سکینہ بے ہوش پڑی تھی۔ بختو اس کے تلوے سہلا رہی تھی اور فیضو سر جھکا کر جی زمین کو گھورے جا رہا تھا جیسے حسنی کا کھرا ڈھونڈ رہا ہو۔

رات دھیرے دھیرے گزرتی رہی۔ پڑوس کے کچھ مردوں نے ہمت کر کے دن نکلنے تک گاؤں کے قریب دیوار کی خاک چھان ماری، حسنی کا کچھ پتا نہیں چلا۔ فیضو ساری رات گرتی پڑتی سکینہ سے بے نیاز کھنٹوں میں سر دیے بیٹھا رہا۔ صبح ہوتے ہی حویلی سے فیضو کا بلاوا آ گیا۔ بڑے خان نے بلایا تھا۔ فیضو سر جھکا کر سکینہ کی طرف دیکھے بغیر چل دیا..... اگلے چار دنوں تک سکینہ کے سینے میں غم کے پہاڑ ٹوٹتے رہے۔ بختو سے سکینہ کا رونا دیکھا نہیں جاتا تھا۔ گاؤں کا بچہ بچہ آکر سکینہ کو تسلیاں دیتا تھا مگر سکینہ، حسنی کے کپڑوں میں منہ چپا چپا کر ڈراتی تھی۔

ادھر گاؤں کے اونچے نیچے رستوں میں کھرا حلاش کرتے ہوئے فیضو کی آنکھیں پتھر اری تھیں۔ اس نے کئی بار بڑے خان کے پاؤں پکڑے اور اپنے بیٹے کی کشدگی کا دکھ سا کھر گھر جانے کے لیے ایک دن کی مہلت مانگی مگر..... بڑے خان کی آنکھوں میں تو ولا جی گھوڑے کی تاپیں دھول اڑا رہی تھیں۔ وہ اپنی جیب میں تین وقادار ملازم اور شکاری کتے سمیت فیضو کو کموں اور ٹیلوں میں لیے پھر رہا تھا.....

فیضو کا دل اس کی بے خواب آنکھوں میں دھڑک رہا تھا۔ وہ پھیلی ہوئی زمین پر جہاں جہاں نظر ڈالتا اسے حسنی کے کھرے کا گمان ہوتا..... آخر چاروں کی دوڑ دھوپ کے بعد تیسرے گاؤں میں جا کر بدنام چور عاشق درکھان کے اصطبل میں بڑے خان کے گھوڑے کا کھرا ل گیا۔

پانچویں دن گھوڑا حویلی کے اصطبل میں کھڑا پہنچا رہا تھا۔ اس بار بڑے خان نے لٹھے کی ایک نئی چادر میں تیس سیر گندم بندھوا کر فیضو کے سر پر رکھوائی اور فیضو پانچویں دن اپنے گھر کے دروازے پر آکر ڈھیر ہو گیا۔ ٹھنڈی ایک طرف کوڑھیک گئی۔ گھر کے اندر سے سکینہ کی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا حسنی ابھی تک اس کے کلیجے سے دور تھا۔ پھر وہ ہمت کر کے اٹھا اور اندر داخل ہو گیا۔ پانچ دن میں سکینہ کیسی ہو گئی تھی جیسے چار سال پہلے والا آگمن میں لگا ہوا کیکر کا درخت۔ فیضو نے آگے بڑھ کر سکینہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ سکینہ سے تواب رو یا بھی نہیں جا رہا تھا۔ روروں کا گھا بیٹھ گیا تھا، آنکھیں سوچ گئی تھیں۔ اگلے دن حویلی میں جشن منایا جا رہا تھا۔ ہر طرف خبر پھیلی ہوئی تھی کہ آج چھوٹے خان جہانگیر اپنے ولا جی گھوڑے پر پورے گاؤں کے گلی کوچوں کی سیر کریں گے۔ دن چڑھا تو فٹیلے سا بھیج کے دربار کے پچھواڑے پرانے کنوئیں میں تیرتی ہوئی حسنی کی لاش کسی نے دیکھ لی۔ پھر تو سارا گاؤں کنوئیں کی منڈ پر اٹھ آیا۔ سکینہ گھر کے آگن میں دروازے پر نظر پڑا گاڑے کتے کے عالم میں بیٹھی تھی۔ گاؤں کی عورتیں اس کے گرد جمع تھیں۔ سکینہ کی حالت دیکھ دیکھ کر ان کے دل دھل رہے تھے۔ بختو سکینہ کا سر تھامے اسے سہارا دیے دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی۔

”اللہ سامیں اس نصیبوں ماری کو یہ صدمہ جھیلنے کا حوصلہ دے۔“

سکینہ کی نظر کٹے کوڑوں پر ٹھہری ہوئی تھی اور سب عورتوں کے دل سکینہ میں ایک رہے تھے۔ فیضو دیوانہ وار فٹیلے سا بھیج کے دربار کی طرف دوڑے جا رہا تھا۔ دربار کی چڑھائی پر پہنچ کر اچانک اس کے پاؤں رک گئے۔ حسنی کو گدھے پر سوار کر کے وہ یہیں تک لایا کرتا تھا۔ ایک دم وہ سینے پر ہاتھ مار کر ڈکرایا اور پھر دربار کے پچھواڑے کنوئیں کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ لوگوں کو چہرے ہوا آگے پہنچا تو منڈ پر حسنی کی پھولی ہوئی لاش دھری تھی۔ اس نے ایک دلدرد و نوحہ ماری اور منڈ پر کے ساتھ گرتا چلا گیا۔

بڑے خان کی حویلی کے دست و دھریض صحن میں جشن

منایا جا رہا تھا۔ چھوٹے خان جہانگیر کی سواری تیار تھی، ڈھول شہنائی والے خنجر کھڑے تھے۔ بڑے خان شیروانی درست کرتے ہوئے باہر آئے، ان کے ساتھ چھوٹے خان جہانگیر بھی تھے۔ اچھو موچی نے اپنے کاندھے پر بڑے ڈور بے کے رومال سے جہانگیر خان کے سیاہ جینکے جوتوں سے خوشامد کی گرد صاف کی اور پھر اصطبل کے دونوں خادموں نے چھوٹے خان کو گھوڑے پر سوار کرادیا۔ اسی لمحے بڑے خان نے اپنے ایک محافظ سے بندوق لے کر ہوائی فائر کیا۔ فائر کی آواز پر گھوڑا تھوڑا سا کسمسایا اور اس کے پیروں کی جما بھرج اٹھیں۔ ڈھول اور شہنائی کی آوازوں کے ساتھ ولا جی گھوڑے کی سواری گاؤں کے آباد گھروں کی طرف روانہ ہو گئی۔

سچ آگمن میں حسنی کی میت دھری تھی۔ گاؤں کی عورتوں اور مردوں کے سینے فیضو کھار کی چیخوں سے پیٹے جا رہے تھے۔ سکینہ میت کی چار پائی تھامے حسنی کو گھورے جا رہی تھی۔

”اری اونیویوں ماری رو لے اپنے حسنی کو۔ دیکھ یہ چلا جائے گا ہمیشہ ہمیش کے لیے۔“ بختو کتے میں آئی ہوئی سکینہ کو رلانے کے جن کر رہی تھی..... لیکن سکینہ کی آنکھوں میں طوفان کے بعد جیسا خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ آگے بڑھ کر کریم دانی نے سکینہ کے سر پر ہاتھ دھر تو سکینہ کی ٹھنڈی ہوئی آنکھوں میں حسنی چلے پھرنے اور دوڑنے لگا۔ آنکھیں سادوں کی طرح کل کر برس پڑیں۔ اب سکینہ اپنے بال نوحہ رہی تھی۔ بار بار حسنی کی طرف لپک رہی تھی۔ دیکھنے والی ہر آنکھ سکینہ اور فیضو کے کرب کو محسوس کر کے رورہی تھی۔

”بچے کے ماں باپ کو ہمر اور حوصلہ دلاؤ..... جلدی کرو..... میت میں دیر مت کرو۔“ مولوی عبداللہ نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے تلخین کی۔ اسی لمحے چار آدمی بڑھے اور چار پائی کا گندھوں پر اٹھالی۔ حسنی گھر سے جا رہا تھا۔ میت کی چار پائی دروازے سے باہر نکلی۔ چھوٹے خان جہانگیر کی سواری سامنے سے آرہی تھی۔ بڑے خان کے اشارے پر ڈھول اور شہنائی کی آوازیں غم گھن گئیں مگر..... گھوڑے کے پیروں میں بندھی ہوئی جما بھرجیں اب بھی بج رہی تھیں۔ یہ وہی گھوڑا تھا جس کا کھرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے فیضو کھار نے اپنے حسنی کا کھرا گنوا دیا..... سکینہ رات گئے تک بچے صحن میں وہیں بیٹھی رہتی ہے جہاں کیکر کا درخت ہوا کرتا تھا۔

معاشرے کے سب سے خطرناک اور پرکڑھلا کوا جا کر کرنے والی تحریر..... جنگ آمد جنگ آمد کی آغوش

جنگ آمد

طاہر جاوید معن

مشرق ہو یا مغرب... انسانی معاشرہ اگر حدود و قیود سے آزاد ہو جائے تو... انسانیت اور حیوانیت میں فرق مٹ جاتا ہے... گویا قدرت نے جس کی جو حد مقرر کر دی اسے اس تک محدود رہنا چاہیے مگر... کیا کیا جائے جب ظلم حد سے بڑھ جائے اور برداشت اپنی حد سے باہر ہو جائے تو انتقام کی چنگاری رفتہ رفتہ حالات کی تیز ہوا سے بھڑک کر ایک دن شعلہ بن جاتی ہے۔ یہی حال اس بد حال کا ہوا جو جوانی اور دولت کے نشے میں بدمست پاتھی کی طرح سرشار بڑھتا چلا جا رہا تھا کہ ایک دن اس مظلوم کی برداشت نے جواب نہ دیا... اس کے بعد قدرت نے ایسا طوفان اٹھایا کہ بھڑکتے شعلوں کے رقص نے معاشرے میں بلند مقام پانے والے ظالموں کے نشیمن کو جلا کر راکھ کر دیا... وہ بچیاں جو معصومیت کا پیکر... دلوں کا سکون... گھروں کی رونق تھیں... ان درندہ صفت بھیڑیوں کے خونیں جیڑوں سے محفوظ نہ رہ سکیں جو عزتوں کے جنازہ نکالنے کے لیے ہی شاید دھرتی کا بوجھ بنتے ہیں۔



ہوا ہے؟“ عروہ نے زور لگا کر اسے خود سے دور ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ تو جیسے ماں کے ساتھ لپٹ کر اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی آہ و بکا میں ایسی شدت تھی کہ عروہ کا سینہ پھٹنے لگا۔ درود بوار اس کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ ہاں، وہ ایک ماں تھی اور بیٹی کے کچھ کے بغیر ہی اس قیامت کو سمجھ رہی تھی جو اس ہنستے ہنستے گھر پر ٹوٹ چکی تھی۔

اس نے خود کو بہ مشکل بولنے کے قابل کیا اور دل بھنگا آواز میں بولی۔ ”حریم! کون آیا تھا اس گھر میں..... مجھے بتاؤ کون آیا تھا؟“

حریم بدستور ماں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور آہ و بکا کر رہی تھی۔ عروہ نے بڑی دشواری سے خود کو بیٹی سے جدا کیا اور بیٹی کو لایوٹ کا ادھ کھلا دروازہ بند کر دیا کہ نہیں ماں بیٹی کی آوازیں ساتھ والے گھر میں نہ سنی جائیں۔ اس نے حریم کو بازو سے پکڑا اور کھینچ کر کمرے میں لے آئی۔ اس نے لائٹ آن کی اور بیٹی کو پہلی بار دھیان سے دیکھا۔ وہ برپادی کی تصویر تھی۔ اس کی گردن اور کلائیوں پر گہری خراشیں تھیں اور کئی خراشوں سے خون رس رہا تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں روٹی بھنکتی ہوئی حریم نے آہوں و سسکیوں کے درمیان عروہ کو جو کچھ بتایا، وہ واقعی قیامت صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ گرد و پیش کی ہر شے جیسے عروہ کی نظروں میں گھونکنے لگی۔ حریم نے بتایا کہ اس کے ساتھ ”زیادتی“ ہوئی ہے..... ہاں، وہی سب کچھ جو کسی بھی عورت کو زندہ درگور کر سکتا ہے۔

زیادتی کرنے والا مخلک کا بی ایک نوجوان عدیل تھا۔ ڈور تیل ہونے پر حریم جھن میں گئی تھی تب تک بار پال کر کٹ کھیلنے کے لیے جا چکا تھا۔ حریم نے پوچھا کہ باہر کون ہے۔ جواب نہ پا کر اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔ عدیل نے کوئی بات کی اور پھر تیزی سے حریم کو دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ حریم کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب، کیا اور کیسے ہوا؟ ہاتھ کی مضبوط گرفت نے اس طرح اس کے منہ کو ڈھانپ لیا تھا کہ وہ چلا بھی نہ سکی۔ اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا، اسے سننے کے لیے پتھر کا کیچا چاہیے تھا۔

عروہ نے حریم کو اپنے سینے سے لگالیا اور ماں بیٹی دونوں ہی ہچکیوں سے رونے لگیں۔ ایک طوفان برپا تھا عروہ کے دل و دماغ میں..... عدیل عرف عادی نام کے اس ادبائش کی صورت اس کی نگاہوں میں گھوم رہی تھی اور اس کا بی چاہہ رہا تھا کہ وہ اس کے سامنے ہوا اور وہ ابھی اسی وقت اس کی جان لے لے۔ کسی تیز دھار آلے سے اس کے

لیں اور انہیں اندرونی کمرے میں رکھنے کے لیے ٹی وی لائوٹ میں آئی۔ ایک دم وہ کھنگلی۔ اسے قائلین پر مٹی کے نشان نظر آئے۔ جیسے کوئی کچھ زردہ جوتوں کے ساتھ یہاں سے گزر رہا ہو۔ وہ غور سے دیکھنے لگی۔ یہ بار پال کے جوتوں کے نشان تو ہرگز نہیں تھے۔ ویسے بھی وہ اتنا بد تہذیب نہیں تھا کہ اس طرح کی بے پروائی کرتا۔

تو کون آیا تھا یہاں؟ اور اگر آیا تھا تو حریم نے ابھی تک بتایا کیوں نہیں تھا؟ ایک دم اس کا دل زیادہ شدت سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگا کہ اس گھر میں کچھ ایسا ہو چکا ہے جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کا منہ ایک بار پھر خشک ہونے لگا۔ اس نے سامان سینئر ٹیل پر رکھ دیا اور تحفوں کے تینوں بے ایک الماری میں کپڑوں کے پیچھے رکھنے کے لیے آگے بڑھی۔ اس نے الماری کھول کر اس کے بڑے خانے میں ڈھیر کی صورت پڑے کپڑوں کو پیچھے ہٹایا تاکہ تحفوں کے ڈبے ان کے پیچھے رکھ سکے۔ یکا یک ایک منظر دیکھ کر اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اسے اپنی نگاہ پر بھر وسا نہیں ہوا۔ اس نے وہاں حریم کے کپڑے دیکھے۔ وہی کپڑے جو چند گھنٹے پہلے تک اس نے پہن رکھے تھے لیکن اب یہ کپڑے سلامت حالت میں نہیں تھے۔ کئی جگہ سے دھجیوں کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ حریم نے ان کپڑوں کو بھائی اور ماں کی نظروں سے بچانے کے لیے اس بند الماری میں دیگر کپڑوں کے پیچھے گھمبیر دیا ہے۔

گھٹ بھٹس عروہ کے ہاتھوں سے گر گئے۔ ”حریم..... حریم!“ وہ چلائی اور حریم کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اس کے ایک ہاتھ میں حریم کی پچھی ہوئی گلابی بیس تھی، اس مرتبہ اس نے حریم کے کمرے کا دروازہ پیٹ دیا.....

”دروازہ کھولو حریم..... دروازہ کھولو۔“ وہ بیجانی انداز میں پکاری۔

اس کی تیری چوٹی زوردار دسٹک پر حریم نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور نیم تاریکی میں آنکھیں سرخ نظر آ رہی تھیں۔

”یہ کیا ہے حریم؟“ عروہ درونک انداز میں چلائی۔ ماں کے ہاتھوں میں اپنی دریدہ قمیص دیکھ کر حریم ماں سے لپٹ گئی اور دھائیں مار مار کر رونے لگی۔ اس کی آواز میں وہ درد و کرب تھا کہ گھر کی دیواریں لرزتی محسوس ہوئیں۔ خود حریم کا سارا وجود بھی کانپ رہا تھا اور اس نے ماں کو اپنی ہاتھوں میں جکڑا ہوا تھا۔

”حریم! میری بیٹی..... مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے، کیا

ذرا..... لینے دیں۔“ حریم کی آواز جیسے تکلیف کی شدت سے ٹوٹ رہی تھی۔

عروہ نے غور سے بیٹی کو دیکھا اور پھر جیسے کانپ کر بولی۔ ”اود خدا! تمہارا تو برا حال ہو رہا ہے۔ اگر زیادہ درد ہے تو چلو ڈاکٹر کو دکھا تے ہیں۔“

”ڈاکٹر اس وقت کہاں ہوں گی..... مم..... میں نے میڈیسن لی ہے..... لگ..... کچھ دیر آرام کروں، شاید ٹھیک ہو جاؤں۔“ وہ بھلائی۔

حریم کو بھی بکھار سر کا درد ہوتا تھا..... خاص طور سے جب پڑھائی کا بوجھ بڑھ جاتا تھا۔ تاہم یہ درد جب بھی ہوتا، شدید نوعیت کا ہوتا تھا۔ عروہ نے بیٹی سے پوچھا کہ اس نے کون سی دوا کتنی مقدار میں کھائی ہے پھر اس نے اسے ماتھے پر ”آکٹنٹ“ لگانے کا مشورہ بھی دیا اور اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے باہر آ گئی۔ بد حال حریم نے دروازہ پھر اندر سے بند کر لیا۔

عروہ بیٹی کے کمرے سے باہر تو آ گئی تھی مگر اس کا دل بری طرح لرز رہا تھا۔ وہ ایک ماں کا دل رکھتی تھی اور یہ دل کبہر ہاتھ کا معاملہ کچھ اور ہے شاید..... کہیں زیادہ سنگین نوعیت کا۔ وہ بے قرار ہو کر کمرے میں کھینچنے لگی۔ ایک بار پھر حریم کے کمرے کی طرف گئی لیکن ”ناک“ کرتے کرتے رک گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے لگا کہ سردی کے باوجود اس کے ہاتھ پر پینے کی گئی تھی۔ وہ ایک مضبوط اور حوصلہ مند عورت تھی مگر جب سے شوہر اس کو دل کا عارضہ ہوا تھا، وہ خود پر کئی اضافی ڈسے داریاں محسوس کرنے لگی تھیں۔ کسی بھی مسئلے کی صورت میں اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس پر بہت برا بھلا ہو جائے پڑا ہے۔ اب بھی وہ کچھ ایسا ہی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ امین کو آفس میں فون کرے اور انہیں حریم کی تکلیف کے بارے میں بتائے لیکن پھر اس نے ہمیشہ کی طرح ارادہ ملتوی کر دیا اور شوہر کو پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ گھر میں بس وہ اور حریم تھے۔ بار پال سے چھوٹی بیٹی مائین چند روز کے لیے اپنی پچیو کے گھر گئی ہوئی تھی۔ عروہ نے سوچا کہ ابھی بار پال کر کٹ کھیل کر واپس آتا ہے تو وہ حریم کو لے کر ڈاکٹر کے پاس جاتی ہے۔ اس کا منہ خشک ہونے لگا تھا۔ اس نے تھوڑا سا پانی پیا، پھر اسے گاڑی میں پڑے سامان کا خیال آیا۔ اس میں وہ تحائف بھی تھے جو امین، بار پال اور خود عروہ کی طرف سے حریم کو دیے جانے تھے۔ اس نے وہ چیزیں نکال

وہ دسبر کی ایک چمکیلی اور خوشگوار سر پہر تھی۔ سڑکوں پر رش بھی کچھ کم ہی تھا۔ عروہ کو اپنی چھوٹی سوزوکی کار ڈرائیو کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ آج اس کی بیٹی حریم کی ایک سوئیں سالگرہ تھی۔ وہ سالگرہ کی شاہنگ کرنے ہی لگی ہوئی تھی اور اب جلد از جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی کیونکہ عصر کی نماز کا وقت نکلتا جا رہا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے خود ہی گیٹ کا لاک کھولا اور گاڑی اندر لے گئی۔ اس کا اٹھارہ سالہ بیٹا بار پال شاید کرکٹ کھیلنے کے لیے جا چکا تھا۔ کالج سے لوٹنے ہی اسے گروانڈ جانے کی بہت جلدی ہوئی تھی۔ تحائف اور دیگر سامان عروہ نے گاڑی کے اندر ہی رہنے دیا اور بس ایک دو شاہ پرزے لے کر اندر چلی گئی۔

”حریم! کہاں ہو بیٹی؟“ عروہ نے بیٹی کو آواز دی اور پھر جواب نہ پا کر اس کے کمرے کی طرف ہی چلی گئی۔ حریم کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے بولے سے دسٹک دی۔ ”دروازہ کھولو حریم۔“

دوسری دسٹک پر بھی دروازہ نہیں کھلا تو اس نے کان لگائے۔ واش روم میں پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ حریم واش روم میں تھی۔

عروہ نے وال کلاک دیکھا۔ عصر کی نماز کا وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اس نے شاہ پرزے ایک طرف رکھے اور جلدی جلدی وضو کر کے نماز پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ وہ نماز پڑھ چکی، دعا مانگ چکی لیکن حریم کے کمرے کا دروازہ پھر بھی نہیں کھلا۔ عروہ کو تھوڑی سی توشیش ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دوبارہ دروازہ ”ناک“ کیا۔ اس مرتبہ ذرا بلند آواز میں کہا۔ ”حریم! دروازہ کھولو، کیا کر رہی ہو؟“

اندر سے حریم کی کھانسی کی مدھم آواز سنائی دی۔ پھر قدموں کی چاپ ابھری اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے کمرے میں اندر ہوا کرکٹ اور چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ عروہ کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید بہن بھائی میں کوئی جھگڑا ہوا ہے جس کا حریم نے کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے لیکن پھر جب عروہ نے غور سے بیٹی کا چہرہ دیکھا تو اس کی حالت زیادہ ابتر نظر آئی۔ رنگ بالکل زرد ہو رہا تھا۔

”کیا ہوا میرا بچہ؟“ عروہ جلدی سے اندر آ گئی اور اس کے دونوں شانے تھام لیے۔ وہ لائٹ آن کرنا چاہ رہی تھی مگر حریم نے اسے روک دیا۔

”میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے گی۔ پلیز..... مجھے

وکیل تھے جبکہ والدہ ایک مشہور انگلش میڈیم اسکول کی وائس پرنسپل تھیں۔ ان دونوں کو اپنے اپنے پروفیشن سے کچھ ایسی انیسیت تھی اور سروں پر مزید سے مزید ترقی کا کچھ ایسا بھوت سوار تھا جس نے انہیں اپنی اولاد کے تربیتی تقاضوں اور اس سلسلے میں اپنے دیگر فرائض سے غافل کر رکھا تھا۔ اپنے بچے کی آوارہ گردی کو انہوں نے اولاد کے سماجی حقوق کا نام دے رکھا تھا۔ عدیل اب یونیورسٹی کا طالب علم تھا لیکن اس نو برائے نام طالب علم کی بہن کا چاہیے۔ اس کے آوارہ گرد اور اوباش دوست اسکول کے زمانے سے ہی اس کے ساتھ رہے تھے اور اب تو عدیل کے ماں باپ کو اس بات کی زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی کہ یونیورسٹی میں امتحانات کی تیاری کا بہانہ کر کے راتیں باہر بسر کرنے والا ان کا بیٹا درحقیقت کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتا ہے۔ گھر کے لیے ایک ادھیڑ عمر، کل وقتی ملازمہ رکھ کر عدیل کی والدہ گھر کے کام کاج اور عدیل کی ذمہ داریوں سے "سبکدوش" ہو چکی تھیں۔ شریفان نامی یہ ملازمہ جب بھی عدیل کے کمرے کی صفائی کرتی، ڈسٹ بن سے کاغذ میں لپٹے ہوئے سکرپٹ کے ٹکڑے اور کبھی کبھی شیشے کی کوئی خالی بوتل بھی نکلتی جس میں سے عجیب طرح کی بدبو آ رہی ہوتی۔ ایسی بوتلوں کے ٹیبل پچھنے ہوئے ہوتے اور صاف پتا چلتا تھا کہ ان کی اصل کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نقش ٹکڑوں کی سی ڈیز بھی اکثر شریفان کو دکھائی دے جاتیں۔ ایک دودھ اس بے چاری ہمدرد نوکرانی نے دلی دلی زبان میں عدیل کی والدہ کو یہ سب کچھ بتانے کی کوشش بھی کی، لیکن بدلے میں اسے اچھی خاصی ڈانٹ کھانا پڑی۔ اس سے یہ کہا گیا کہ اسے عدیل کے ذاتی معاملات میں دخل دینے اور اس کے کمرے کی تلاشیاں لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اب بالغ ہے اور اپنا بھلا برا جانتا ہے اور اگر واقعی ایسی کوئی بات ہوئی تو اسے سمجھانے کے لیے اس کے ماں باپ موجود ہیں۔

اس کے بعد سے ملازمہ شریفان نے اس حوالے سے بالکل چپ سا مدھ لے لی لیکن پچھلے چند ماہ سے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ عدیل کی آوارہ گردی میں اسے بڑی مدد دینی چاہی ہے۔ کبھی کبھی تو اسے اس لڑکے سے خوف سا آنے لگتا تھا۔ اس نے اسے گود میں کھلایا تھا، لیکن اب اسے یوں لگتا تھا کہ یہ کوئی اجنبی شخص ہے جسے وہ جانتی ہی نہیں۔

☆☆☆

اتوار کا دن تھا۔ عروہ کے شوہر اہمن سرور پچھلی رات کافی دیر تک جاگتے رہے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں

تھے۔ آنکھوں میں نمی تھی اور رخساروں پر زردی کھنڈی تھی۔ بولے۔ "عروہ! ابھی ٹھہر جاؤ۔ کچھ اور سوچ لیں۔ ادھر آؤ میرے ساتھ۔"

اہمن اور عروہ ایک بار پھر اپنے کمرے میں آن بیٹھے۔ اہمن نے دلدوز لہجے میں کہا۔ "ایک بار یہ بات کھل گئی تو پھر بہت دور تک جانی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ہم ان سارے حالات کا سامنا کر پائیں گے یا نہیں۔ پتا نہیں کہ کیا کیا باتیں بنائی جائیں گی۔ اور۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ تھانہ چکری۔۔۔۔۔ یا اللہ! ہم کس آفت میں پھنس گئے ہیں۔"

عروہ بھی جیسے بے دم ہی ہو گئی۔ حرم کی منگنی ہو چکی تھی۔ پروگرام یہی تھا کہ گرہ بیکش کے فوراً بعد اس کی شادی کر دی جائے۔ ان کے خاندان میں لڑکیوں کو دیر تک گھر میں نہیں بٹھایا جاتا تھا۔ عروہ نے ابھی سے اس کی شادی کے لیے چھوٹی موٹی چیزیں انکشی کرنا شروع کر دی تھیں۔ حرم کے حوالے سے بڑے خوبصورت سہنے سہارے تھے اس نے اپنی آنکھوں میں اور آج۔۔۔۔۔ دسمبر کی سیاہ شام میں اس چار دیواری کے اندر کیا آفت مچ گئی تھی۔

اس نے بے بسی سے اپنے سر کو دائیں بائیں ہلایا پھر سسک کر بولی۔ "انتہا بڑا ظلم ہوا ہے ہمارے ساتھ۔ کیا ہم چپ رہیں، اپنے ہونٹ سی لیں؟ یہ تو۔۔۔۔۔ یہ تو ظلم کا ساتھ دینے والی بات ہے۔ ہمارا اسلام بھی یہی کہتا ہے جو ظالم کے خلاف آواز بلند نہیں کرتا، وہ ظالم کا ساتھ دیتا ہے۔"

"لیکن عروہ! یہ ہماری بیٹی کی زندگی کا سوال بھی تو ہے بلکہ ہماری دونوں بیٹیوں کی زندگی کا سوال ہے۔ ہم کس کس کا منہ بند کریں گے۔ اودھ خدایا۔۔۔۔۔ اودھ خدایا۔"

عروہ نے شوہر کے سارے بدن پر لرزہ طاری دیکھا تو اپنے لرزے کو بھول کر اہمن کے دونوں ہاتھ تھام لیے، ان کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ یہ بات وہ بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ اگر ایک بار یہ بات کھل گئی تو پھر کمان سے نکلنے تیر کی طرح ہوگی جو واپس نہیں آتا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس پہاڑ جیسے صدمے کو اپنے سینے کی گہرائی میں چھپالیا جائے؟ اس قیامت صغریٰ کو اس چار دیواری کے اندر دفن کرنے کی کوشش کی جائے؟ ایک بار پھر عدیل عرف عادی کا محسوس چہرہ عروہ کی نگاہوں میں ٹھوما اور اسے اپنے جسم میں چنگاریاں لپیچتی محسوس ہوئیں۔

☆☆☆

عدیل عرف عادی اپنے ماں باپ کا اکھوتا بیٹا تھا۔ اس کے والد ہائی کورٹ دپریٹیم کورٹ کے ایک نامی گرامی

ہوئے۔ "کہاں ہے حرم۔۔۔۔۔ کہاں کہاں ہو؟" وہ بے حد زخمی لہجے میں پکارے۔

عروہ نے ان کے کندھوں پر دباؤ ڈال کر انہیں دوبارہ صوفے پر بٹھا دیا۔ "میں بتاتی ہوں آپ کو سب کچھ۔۔۔۔۔ سب کچھ بتاتی ہوں۔" وہ سسکی اور الماری کی طرف بڑھی۔ اس نے اہمن کو ایمر چکی میں دی جانے والی میڈیسننگ کالی اور پانی کے ساتھ کھلا دی۔

تب اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آہستہ آہستہ وہ سب کچھ اہمن کے گوش گزار کر دیا جو آج کے روز ایک بہت بڑی آفت کی طرح ان پر مسلط ہوا تھا۔ اگلا فریڈ ایک کھٹا بے حد اذیت ناک تھا۔ میاں بیوی اٹک بار آنکھوں کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ بار یال بھی اب گھر واپس آ چکا تھا۔ ابھی اسے صرف اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ اس کی بہن کے سر میں شدید درد ہے۔ بہر حال وہ اتنا بھی نا سمجھ نہیں تھا کہ اس بات پر مکمل یقین کر لیتا۔ وہ بھی کم صدم اور حیران دکھائی دیتا تھا۔

بندر کمرے میں عروہ نے اہمن سے کہا۔ "کچھ کہہ نہیں سکتے۔۔۔۔۔ اور چپ بھی نہیں رہ سکتے۔ آپ کے ذہن میں کیا آتا ہے؟"

اہمن نے اپنے خشک ہوتے لیوں پر زبان پھیری۔ "میرا تو خیال ہے پہلے حرم کے خالو جی سے بات کر لی جائے۔" "ہاں اہمن! میرے ذہن میں بھی یہی آ رہا ہے۔" "میں انہیں فون کرتی ہوں۔۔۔۔۔ اگر۔۔۔۔۔ وہ گھر آ چکے ہیں۔ تو انہیں یہیں بلا لیتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔۔۔ کرو فون۔" اہمن نے رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

حرم کے خالو یاور حیات کو لٹسرہ چکے تھے اور ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازمت بھی کرتے تھے۔ وہ تھانہ چکری کے معاملات کو سمجھتے تھے اور ان کا ایک حلقہ احباب تھا۔ وہ عروہ سے بہت انس بھی رکھتے تھے۔

عروہ کچھ دیر تک سر پکڑ کر بیٹھی رہی۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ آخر وہ ایک طویل سانس لے کر اُٹھی اور دوسرے کمرے میں رکھے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ بار یال کا کلر کالج میں ٹیسٹ تھا۔ عروہ نے کہہ کر اسے اوپر ٹیکری میں بھیج دیا تھا۔ وہ کچھ دیر لرزاں وترساں، فون ہاتھ میں لیے کھڑی رہی پھر اس نے حرم کے خالو کا نمبر پریس کرنا چاہا۔ یہی وقت تھا جب اس نے کندھے پر ہاتھ کا ٹیس محسوس کیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عقب میں اہمن کھڑے

نکلے کر ڈالے۔ اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟ یہ سوال ایک دہائی ہوئی میخ کی طرح اس کے دماغ میں گھستا جا رہا تھا۔

کیا وہ ابھی اپنے شوہر اہمن کو بتائے؟

کیا وہ پولیس کو فون کرے؟

کیا فی الحال وہ خاموش رہے اور اہمن کے گھر آنے کا انتظار کرے؟

ایک ساتھ کئی سوچیں اس کے ذہن پر یلغار کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ اور وہ کا پتچی چلی جا رہی تھی۔ اسی دوران میں موٹر بائیک کا ہارن سنائی دے گیا۔ یہ اہمن ہی تھے۔ عروہ نے اپنی اٹک بار آنکھوں سے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ شاید حرم کی سالگرہ کی وجہ سے ہی آج اہمن ذرا جلدی گھر آ گئے تھے۔ غم کی شدت سے عروہ کے دل کی رگیں جیسے ٹوٹنے لگیں۔ اس نے زیر لب قرآنی آیات کا ورد کیا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔

اہمن اپنی بائیک اندر لے آئے۔ اس کی طرف دیکھے بغیر بولے۔ "کیا بات ہے بھئی۔ آج گھر میں سناٹا کیسا ہے؟ بار یال ابھی آیا نہیں؟"

عروہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ تب موٹر بائیک کو اسٹینڈ پر لگاتے ہوئے اہمن نے عروہ کی طرف دیکھا اور بے طرح چونک گئے۔ "کیا ہوا عروہ؟" وہ لپک کر عروہ کی طرف آئے اور اسے دونوں شانوں سے تھام لیا۔

"آ۔۔۔۔۔ آپ اندر چلیں۔ میں بتاتی ہوں آپ کو۔"

وہ بہ مشکل بول پائی۔

اہمن کا چہرہ ایک دم ہلدی ہو گیا۔ "عروہ! کیا ہوا؟ بار یال تو ٹھیک ہے؟ حرم کہاں ہے؟ حرم۔۔۔۔۔ حرم۔"

انہوں نے مضطرب ہو کر حرم کو آوازیں دیں۔ تب تک حرم خود کو کمرے میں بند کر چکی تھی۔

عروہ، شوہر کو اندر لے آئی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں انہیں کچھ ہو ہی نہ جائے۔ اس نے لرزاں آواز میں پوچھا۔ "آپ نے شام والی میڈیسن لے لی ہے؟"

"ہاں لے لی ہے۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟" وہ تقریباً چلا اٹھے۔

عروہ نے واقعے کی شدت کم کرنے کے لیے پہلے صرف یہ بتایا کہ وکیل ریاض صاحب کا لڑکا عدیل زبردستی گھر میں گھسا ہے اور اس نے حرم سے "دست درازی" کی ہے۔

اہمن کا سارا وجود جیسے پتے کی طرح لرزے لگا۔

"اودھ گاڈ! ان کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا اور وہ بے دم سے ہو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ لیکن پھر فوراً ہی اٹھ کھڑے

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

مہلکی

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر اجیل زیدی کے لیے پاکستان کا معتبر ترین



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD OF BEST ACHIEVEMENT



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل 30 تا مئی
9-اگست 30 تا ستمبر
9-دسمبر 30 تا جنوری

مکان نمبر 482 سرحد نمبر 20 بکھر G-8/1
سرحد نمبر 482 بکھر 482
فون: (051) 32331725
موبائل: 0300-8566188

لاہور

گلف سینٹر
آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ حرک چوکی
نزد لائیو ٹیک لائبر
موبائل نمبر 0300-8566188

14-فروری 27 تا فروری
14-جون 27 تا جون
14-اکتوبر 27 تا اکتوبر

بشاور

ہوشل السیج
نی نرؤڈ نزد بھجری چوک چارٹر
موبائل: 0300-8566188

یکم فروری 11 تا فروری
یکم جون 11 تا جون
یکم اکتوبر 11 تا اکتوبر

ملتان

ہوشل السیج
آفس نمبر 7.706 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بینک
فون: (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

28 مارچ 6 تا اپریل
28 جولائی 6 تا اگست
28 نومبر 7 تا دسمبر

کراچی

ہوشل السیج
آفس نمبر 7.706 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بینک
فون: (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

13 مارچ 27 تا مارچ
13 جولائی 27 تا جولائی
13 نومبر 27 تا نومبر

دور رہی۔ رات چار بجے کے قریب انہوں نے سکون آور گولی لی اور پھر سو گئے۔ اب صبح گیارہ بجے نہا کر وہ پوچھل قدموں سے باہر لان میں آئے تو عروبہ، کہیں کھوئی کھوئی سی، پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھی۔ آج اس قیامت کو گزرے چوتھا روز تھا مگر صدمہ کی شدت وہی تھی۔ عروبہ کا چہرہ دیکھ کر امین سرور کو اپنا کیجا ہوا محسوس ہوا۔ لان میں لگے پھول پودوں کے درمیان وہ خود ایک مرجھا یا ہوا پھول نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے کا تنہا بتا رہا تھا کہ وہ بھی رات کو ٹھیک سے سو نہیں پائی۔

امین سرور نے آہستگی سے اس کے ہاتھ سے شاد پکڑ کر ایک طرف رکھا اور بولے۔ ”ادھر آؤ، یہاں بیٹھے ہیں۔“ لان ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے ٹیبل تک لے آئے۔ ”دیکھو عروبہ! یہ مشکلات اور پریشانیاں زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔“ امین ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ عروبہ رو ہانسی ہو گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھ کر امین خاموش ہو گئے۔

عروبہ بولی۔ ”لیکن امین! اتنی بڑی پریشانی، اتنا بڑا دکھ ہمارے لیے ہی کیوں؟ ہم سیدھے سادے، بے ضرر سے لوگ، نماز روزے کے پابند، بھی کسی سے کوئی اونچ نیچ نہیں کی اور نہ ہی ایسے ویسے لوگوں سے کوئی تعلق رکھا، اپنے بچوں کو باپا اور سلیقہ مند بنایا، پھر ایسی پریشانی ہم پر ہی کیوں آئی؟“ عروبہ کی درم زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ رات بھر انہی جاناکہ خیالات کی زد میں رہی ہے۔

امین نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے اور چپ رہنے کا اشارہ کیا کہ کہیں اس کی آواز بچوں تک نہ پہنچ جائے۔ امین نے کہا۔ ”دیکھو عروبہ! اس دنیا میں کوئی انسان بھی اللہ پاک سے اس بات کی سند لے کر نہیں آیا کہ اس پر کس قسم کی پریشانیاں آئیں گی اور کس قسم کی نہیں۔ وہ ہمارا معبود ہے، ہمارا مالک ہے۔ وہ بھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ ہمیں آزما رہا ہے، کبھی خوشی دے کر، کبھی تکلیف دے کر، کبھی تھوڑی دے کر، کبھی زیادہ دے کر۔۔۔۔۔ اور قدرت کا یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ امیر غریب، عقل مند یا بے وقوف، نیک یا بد کسی کو اس سے چھٹکارا نہیں ہے۔“

امین کی بات سے عروبہ کی بے پناہ بے قراری میں ذرا سی کمی واقع ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے تم کناروں کو چھوٹی انگلی سے صاف کیا۔ امین نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہر مصیبت کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے عروبہ! اور حالات سے مقابلہ کرنے کی صفت بھی اللہ پاک نے انسان کے اندر ہی رکھی ہوئی ہے۔“

”یہی بات تو میں بھی آپ سے کہنا چاہ رہی تھی۔“ عروبہ بے چین ہو کر بولی۔ ”آپ کو نہیں لگتا کہ ہمیں یہ سب کچھ خاموشی سے نہیں سہنا چاہیے۔ ہمیں انصاف ملنا چاہیے۔ ہمیں قانونی چارہ جوئی کرنی چاہیے۔“

”کون سا قانون؟“ امین نے زخمی لہجے میں عروبہ کی بات کاٹ ڈالی۔ ”میں ساری رات اس بارے میں سوچتا رہا ہوں عروبہ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں لوگوں نے قانون کو موم کی ناک بنا رکھا ہے۔ انصاف حاصل کرنا ہی تو اس ملک میں سب سے مشکل کام ہے۔ بہت سے لوگوں کو ایسے کیسوں میں رتلے اور خوار ہوتے دیکھا ہے۔ بدنامی اور جگ ہٹائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ طاقتوروں کی دنیا ہے عروبہ! یہاں سب کچھ اثر رسوخ اور تعلق ناتوں سے ہوتا ہے۔ یہاں تو کسی بڑے آدمی کے چڑا سی کا بھی کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔۔۔۔۔ اور اس خبیث کا باپ تو خود ایک بڑا آدمی ہے۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ وپرمیم کورٹ ریاض احمد جاوید صاحب۔“ امین نے بڑے درد سے کہا اور پھر خاموشی اختیار کی۔

اسی طرح کی گفتگو کل اور پرسوں بھی میاں بیوی کے درمیان ہوئی تھی اور نتیجہ یہی ایک کرناک خاموشی نکلا تھا۔ کچھ دیر بعد اس خاموشی کو امین نے ہی توڑا۔ ”ماہین اور باریال کی کیا پوزیشن ہے؟“ اس نے عروبہ سے دریافت کیا۔

”دونوں اس دن سے چپ چپ ہیں۔ باریال ایک دو بار مجھ سے پوچھ چکا ہے کہ اگر آپ کی کو بخار ہے تو ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھا رہے۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹالا ہے کہ وہ پرانے نسخے کے مطابق خود ہی دوا کھا رہی ہے۔“

”خبیث ہے۔ تم حریم کو بھی اچھی طرح سمجھا دو کہ کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نہ نکالے۔“

عروبہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو وہ کمینہ مٹلے سے غائب ہے لیکن آج نہیں توکل واپس تو آئے گا۔ انہی گلیوں میں کھوے پھرے گا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ جب اس سے آمتنا سامنا ہوگا تو دل کی کیا حالت ہوگی۔۔۔۔۔ میں کچھ کہہ رہی نہ بیٹھوں۔“

”میں نے کل بھی تم سے کہا تھا عروبہ! سوچ بچار کے بعد جو بات میری سمجھ میں آئی ہے، وہ یہی ہے کہ ہم وقتی طور

دور رہی۔ رات چار بجے کے قریب انہوں نے سکون آور گولی لی اور پھر سو گئے۔ اب صبح گیارہ بجے نہا کر وہ پوچھل قدموں سے باہر لان میں آئے تو عروبہ، کہیں کھوئی کھوئی سی، پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھی۔ آج اس قیامت کو گزرے چوتھا روز تھا مگر صدمہ کی شدت وہی تھی۔ عروبہ کا چہرہ دیکھ کر امین سرور کو اپنا کیجا ہوا محسوس ہوا۔ لان میں لگے پھول پودوں کے درمیان وہ خود ایک مرجھا یا ہوا پھول نظر آ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور چہرے کا تنہا بتا رہا تھا کہ وہ بھی رات کو ٹھیک سے سو نہیں پائی۔

امین سرور نے آہستگی سے اس کے ہاتھ سے شاد پکڑ کر ایک طرف رکھا اور بولے۔ ”ادھر آؤ، یہاں بیٹھے ہیں۔“ لان ٹیبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے ٹیبل تک لے آئے۔ ”دیکھو عروبہ! یہ مشکلات اور پریشانیاں زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔“ امین ابھی اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ عروبہ رو ہانسی ہو گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک دیکھ کر امین خاموش ہو گئے۔

عروبہ بولی۔ ”لیکن امین! اتنی بڑی پریشانی، اتنا بڑا دکھ ہمارے لیے ہی کیوں؟ ہم سیدھے سادے، بے ضرر سے لوگ، نماز روزے کے پابند، بھی کسی سے کوئی اونچ نیچ نہیں کی اور نہ ہی ایسے ویسے لوگوں سے کوئی تعلق رکھا، اپنے بچوں کو باپا اور سلیقہ مند بنایا، پھر ایسی پریشانی ہم پر ہی کیوں آئی؟“ عروبہ کی درم زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ رات بھر انہی جاناکہ خیالات کی زد میں رہی ہے۔

امین نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھے اور چپ رہنے کا اشارہ کیا کہ کہیں اس کی آواز بچوں تک نہ پہنچ جائے۔ امین نے کہا۔ ”دیکھو عروبہ! اس دنیا میں کوئی انسان بھی اللہ پاک سے اس بات کی سند لے کر نہیں آیا کہ اس پر کس قسم کی پریشانیاں آئیں گی اور کس قسم کی نہیں۔ وہ ہمارا معبود ہے، ہمارا مالک ہے۔ وہ بھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ ہمیں آزما رہا ہے، کبھی خوشی دے کر، کبھی تکلیف دے کر، کبھی تھوڑی دے کر، کبھی زیادہ دے کر۔۔۔۔۔ اور قدرت کا یہ قاعدہ سب کے لیے ہے۔ امیر غریب، عقل مند یا بے وقوف، نیک یا بد کسی کو اس سے چھٹکارا نہیں ہے۔“

امین کی بات سے عروبہ کی بے پناہ بے قراری میں ذرا سی کمی واقع ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے تم کناروں کو چھوٹی انگلی سے صاف کیا۔ امین نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہر مصیبت کا کوئی نہ کوئی حل ضرور ہوتا ہے عروبہ! اور حالات سے مقابلہ کرنے کی صفت بھی اللہ پاک نے انسان کے اندر ہی رکھی ہوئی ہے۔“

”یہی بات تو میں بھی آپ سے کہنا چاہ رہی تھی۔“ عروبہ بے چین ہو کر بولی۔ ”آپ کو نہیں لگتا کہ ہمیں یہ سب کچھ خاموشی سے نہیں سہنا چاہیے۔ ہمیں انصاف ملنا چاہیے۔ ہمیں قانونی چارہ جوئی کرنی چاہیے۔“

”کون سا قانون؟“ امین نے زخمی لہجے میں عروبہ کی بات کاٹ ڈالی۔ ”میں ساری رات اس بارے میں سوچتا رہا ہوں عروبہ! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں لوگوں نے قانون کو موم کی ناک بنا رکھا ہے۔ انصاف حاصل کرنا ہی تو اس ملک میں سب سے مشکل کام ہے۔ بہت سے لوگوں کو ایسے کیسوں میں رتلے اور خوار ہوتے دیکھا ہے۔ بدنامی اور جگ ہٹائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ یہ طاقتوروں کی دنیا ہے عروبہ! یہاں سب کچھ اثر رسوخ اور تعلق ناتوں سے ہوتا ہے۔ یہاں تو کسی بڑے آدمی کے چڑا سی کا بھی کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔۔۔۔۔ اور اس خبیث کا باپ تو خود ایک بڑا آدمی ہے۔ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ وپرمیم کورٹ ریاض احمد جاوید صاحب۔“ امین نے بڑے درد سے کہا اور پھر خاموشی اختیار کی۔

اسی طرح کی گفتگو کل اور پرسوں بھی میاں بیوی کے درمیان ہوئی تھی اور نتیجہ یہی ایک کرناک خاموشی نکلا تھا۔ کچھ دیر بعد اس خاموشی کو امین نے ہی توڑا۔ ”ماہین اور باریال کی کیا پوزیشن ہے؟“ اس نے عروبہ سے دریافت کیا۔

”دونوں اس دن سے چپ چپ ہیں۔ باریال ایک دو بار مجھ سے پوچھ چکا ہے کہ اگر آپ کی کو بخار ہے تو ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھا رہے۔ میں نے اسے یہ کہہ کر ٹالا ہے کہ وہ پرانے نسخے کے مطابق خود ہی دوا کھا رہی ہے۔“

”خبیث ہے۔ تم حریم کو بھی اچھی طرح سمجھا دو کہ کوئی ایسی ویسی بات منہ سے نہ نکالے۔“

عروبہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو وہ کمینہ مٹلے سے غائب ہے لیکن آج نہیں توکل واپس تو آئے گا۔ انہی گلیوں میں کھوے پھرے گا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ جب اس سے آمتنا سامنا ہوگا تو دل کی کیا حالت ہوگی۔۔۔۔۔ میں کچھ کہہ رہی نہ بیٹھوں۔“

”میں نے کل بھی تم سے کہا تھا عروبہ! سوچ بچار کے بعد جو بات میری سمجھ میں آئی ہے، وہ یہی ہے کہ ہم وقتی طور

دوسری تیسری دسک پر حرم نے دروازہ کھولا۔ عروہ نے اندر آکر فوراً لائٹ آن کی۔ حرم کو دیکھ کر عروہ کا دل ہول گیا۔ اس کے خوبصورت، شہد رنگ بال اجڑے ہوئے، آنکھیں سوچی ہوئی اور چہرہ تپا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ”حرم! میری بیٹی۔“ عروہ نے تڑپ کر اسے گلے سے لگایا۔

اس کے جسم کی حرارت سے عروہ کو فوراً پتا چل گیا کہ وہ بخار میں مبتلا رہی ہے۔ اس لمحے اپنے شوہر امین کی باتیں اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔ اس نے آنکھوں کے آنسوؤں کو اپنے حلق میں انڈیل لیا اور بولی۔ ”ادھر آؤ میری بیٹی! ادھر بیٹھو۔ یہ کیا حالت بنا رہی ہے؟“ اس نے حرم کو بازوؤں سے تھام کر بیڈ پر بٹھایا۔ ٹیکے سے ٹیک لگوا کر اس کی ٹانگیں سیدھی کیں اور کمبل اوڑھا دیا۔ تب اس نے بچن میں جا کر فریج ٹوسٹ اور چائے بنائی اور اپنے ہاتھ سے حرم کو ناشا کرایا۔ اسے بخاری دوا دے کر وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

وہ دسبر کی ایک سرد دودھ پر تھی۔ تھوڑی دیر پہلے نکلنے والا سورج اب کہیں بادلوں کی دھیرے میں چھپ چکا تھا۔ عروہ نے کمرے کی لان کی طرف گھلنے والی کھڑکی بند کی اور پردے درست کر کے اس کے پاس ہی کمبل میں بیٹھ گئی۔ اس نے حرم کے سر کو ہولے ہولے دباتے ہوئے وہ ساری باتیں اپنے انداز میں اسے سمجھائیں جو کچھ دیر پہلے امین نے اسے سمجھائی تھیں۔ آخر میں وہ بولی۔ ”دیکھو میری بیٹی! یہ ہم سب کا سانچا دکھ ہے۔ اور اسے ہم سب نے مل کر جھیلنا ہے۔ خود کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہ سمجھنا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم ہو تو ہم ہیں۔ جو لوگ حوصلے کے ساتھ دکھوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اللہ بھی ان کا ساتھ دیتا ہے اور دیکھنا اللہ ہمارا ساتھ دے گا، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیا ٹھیک ہوگا ماما؟ مجھے لگتا ہے کہ میرا دل دھڑکتا ہے، سانس چلتی ہیں لیکن میری روح نے میرے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ میں ایک مردے کی طرح اپنے آپ کو کھینچتی پھرتی ہوں۔ میں کسی سے آنکھ نہیں ملا سکتی ماما۔“ وہ ایک بار پھر سسک پڑی۔

عروہ نے اسے اپنے ساتھ لگا کر بھینچا۔ ”چپ کر جا میری بیٹی! جو کچھ ہوا ہے، اس میں تیرا کوئی قصور نہیں۔ وہ اوپر والا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس کی لامٹی بے آواز ہوتی ہے۔ تم دیکھ لینا بہت جلد اس بد بخت کو اپنے کپے کی سزا ملے گی۔ مل کر رہے گی۔ سب کچھ تیری آنکھوں کے سامنے

رضامندی حرم کی رضامندی بھی بن گئی اور اس طرح ان دونوں کی باقاعدہ گفتگو ہو گئی۔ گفتگو کے بعد بیڈ میں ایک دو بار فون پران کی بات ہو جاتی تھی یا پھر کسی تہوار یا شادی بیاہ کے موقع پر آنا سامنا ہوتا۔ آصف کے بقول وہ حرم کو ایک عرصے سے پسند کرتا تھا پر کبھی یہ بات اس سے کہہ نہ پایا۔ اب وہ اکثر کہتا تھا کہ اس نے حرم کو پا کر سب کچھ پایا ہے۔ وہ اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہے، اس کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی خاطر اپنی جان بھی دے دینا اس کے لیے آسان ہے اور..... ایک نئی فہرست تھی مہم دو پیمان کی جو حرم کو کٹر سنا پڑتی تھی۔ ایسے میں وہ ہنس دیتی..... اور کبھی کبھی ڈر بھی جاتی۔ وہ سوچتی کہیں یہ آصف کا وقتی جوش اور اس کے سطحی جذبے تو نہیں؟ بہر حال اس کے لیے اس کی تعلیم، والدین اور بہن بھائی اولین ترجیح رہے اور اس کی ہر غلطی انہی کے ساتھ جڑی رہی۔ بس اسی دھوپ چھاؤں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور پریشانیوں کے درمیان زندگی کا سفر جاری رہا تھا اور اب..... اب حرم کی زندگی میں ایک ایسا طوفان آیا تھا جس نے اسے بنیادوں سے ہلا کر اس کی ساری ہستی کو لرزہ بر اندام کر دیا تھا۔ یہ کیا ہو گیا تھا اس کے ساتھ؟ کیوں ہو گیا تھا؟ کبھی بھی تو اسے اپنے جسم سے محبت آنے لگتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ دو ناپاک ہاتھ ابھی تک اس کے جسم سے چپکے ہوئے ہیں اور بد بو دار سانس زہریلی پنکھاروں کی طرح اس کی سماعت کو اور حس شامہ کو بھروسہ کر رہی ہیں۔ کسی وقت اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنی جلد کو اپنے جسم پر سے کھینچ کر غیبیہ کر دے یا پھر آنکھیں بند کر کے کوئی ایسی چیز نگل لے جو اس کی جان کو اس کے داغ دار جسم کی قید سے آزاد کر ڈالے۔ اس وقت بھی وہ کسی ایسی ہی کیفیت میں بستر پر بے سادہ پڑی تھی۔ اس نے وال کلاک کی طرف نگاہ اٹھائی، وہ پھر ہوجی تھی لیکن دروازہ کھولنے اور باہر نکلنے کو اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جب وہ دروازہ کھولے گی اور باہر نکلے گی تو بے شمار نگاہیں اس کے چہرے پر جم جائیں گی۔ ان میں ایک نگاہ..... ہاں، ایک نگاہ آصف کی بھی ہوگی۔ یہ نگاہ اس سے پوچھنے گی..... تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے حرم! تم وہ پہلے والی حرم تو نہیں ہو؟ تم نہیں ہو وہ پہلے والی حرم۔

☆☆☆

”حرم بیٹا! دروازہ کھولو۔“ عروہ نے بے قراری سے بیٹی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

☆☆☆

امین سرور نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”آج اتوار ہے۔ میں ایک دو ”سوسائز“ کا پیکر لگا کر آتا ہوں۔ لاہور بہت بڑا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی مناسب سا پارٹنرٹ یا پورشن کرائے پر مل ہی جائے گا۔“

”اور یہ گھر؟“ عروہ نے اداسی سے پوچھا۔

”ابھی جوں کا توں رکھتے ہیں۔ آگے چل کر اگر اچھی قیمت ملے گی تو فروخت کر دیں گے۔“ پھر امین سرور نے ذرا توقف کیا اور عروہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم ذرا حرم کے کمرے کا پیکر لگاؤ۔ اسے دیکھو، اس کے ساتھ تھوڑا وقت گزارو۔“ یہ کہہ کر امین سرور اٹھے اور گیراج میں کھڑی مہران کا رخ کیا۔

عروہ نے اپنی رست واپس دیکھی اور بڑبڑائی۔ ”بارہ بجتے والے ہیں، ابھی تک ناشتے کے لیے بھی نہیں لگتی۔“ اس نے امین کو آف کیے بغیر ہی حرم کے کمرے کا رخ کیا۔

☆☆☆

حرم اپنے کمرے میں تھی اور سوچوں میں گم تھی۔ وہ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھی۔ امین اور عروہ نے اسے بڑے ناز و نخرے سے پالا تھا۔ بچپن سے ہی وہ اس کی چھوٹی سی تکلیف پر بے قرار ہو جاتے تھے۔ اپنے اپنے کام کے علاوہ جتنا وقت ان دونوں میاں بیوی کے پاس ہوتا، وہ اپنی نئی حرم کے ساتھ گزارتے۔ حرم کے بعد ان کے دو بچے اور پیدا ہوئے۔ ایک بیٹا یا پال اور بیٹی ماہین۔ ان دونوں سے بھی ان کو ویسا ہی پیار تھا جیسا حرم سے تھا۔ لیکن اس سے بہت کر ایک کشش، ایک انسیت تھی جو وہ حرم کے لیے محسوس کرتے تھے اور یہ بات حرم بڑی اچھی طرح جانتی تھی۔

حرم جب ذرا بڑی ہوئی تو اس کے پاپائے اس کے لیے سننے دیکھنے شروع کر دیے۔ وہ حرم کی ماں سے کہتے۔ ”عروہ! میں اپنی حرم کو ڈاکٹر بناؤں گا۔ چاہے مجھے اس کو پرائیویٹ ہی کیوں نہ پڑھانا پڑے۔“

انہوں نے ایک اچھی سوسائٹی میں پانچ مرلے کا پلاٹ اسی نیت سے لیا ہوا تھا کہ وقت آنے پر وہ اسے بچوں کے تعلیمی اخراجات کے لیے فروخت کر دیں گے۔ حرم میٹرک میں تھی جب اس کے تایا نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے اس کا ہاتھ مانگا..... آصف! آج بھی رنگ کا طالب علم تھا۔ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور اچھے گزرتی حیثیت سے ملتے تھے۔ حرم کے والدین کو یہ رشتہ ہر لحاظ سے مناسب لگا۔ والدین اور دیگر اہل خانہ کی

پر اس سارے منظر سے اوجھل ہو جائیں۔ خاموشی سے کہیں چلے جائیں اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ یہاں سے شفٹ ہو جائیں؟“ عروہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں عروہ! اس طرح کی بات جب پھلتی ہے تو جنگل کی آگ بن جاتی ہے۔ ہمیں حرم کا ہی نہیں، ماہین کے مستقبل کا بھی سوچنا ہے بلکہ اپنے تینوں بچوں کا سوچنا ہے، ہمیں حکمت سے کام لینا پڑے گا عروہ۔“

عروہ نے کن انیموں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ امین بزدل نہیں ہیں۔ وہ جب صحت مند تھے تو مشکل ترین حالات میں بھی اپنے موقف کے لیے سینہ تان کر کھڑے ہو جاتے تھے لیکن جب سے دل کا عارضہ لاحق ہوا تھا، ان کے مزاج میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئی تھیں۔ ان میں دھماپن اور مصلحت پسندی آتی چلی گئی تھی اور یقیناً وہ ٹھیک ہی تھے۔ رنج و غم سے ان کے دل پر براہ راست اثر پڑتا تھا۔ ایسے کئی موقعوں پر انہیں سیدھا اسپتال جانا پڑا تھا..... اب وہ ایک پرائیویٹ فرم میں کمپیوٹر کے شعبے میں کام کر رہے تھے۔ آمدن محدود تھی، خدا کا شکر تھا کہ عروہ کو اپنے نانا کی پر اپنی میں سے تھوڑا سا حصہ ملا ہوا تھا۔ یہ تین دکانیں تھیں جن کے کرائے سے ان کی گزر بسر یہ آسانی ہو جاتی تھی۔

ابھی گھر چھوڑنے کی صرف بات ہی ہو رہی تھی، لیکن عروہ کو ایک دم سب کچھ اجنبی اجنبی سا لگنے لگا۔ اس نے گھر کے دروازے پر طائرانہ نظر ڈالی۔ اسے اپنے اس گھر سے اور جگہ سے محبت تھی۔ وہ بیاہ کر اسی گھر میں آئی تھی۔ ان کی شادی شدہ زندگی کے بائیس سال یہیں بیتے تھے۔ وہ آہ بھر کر رہ گئی۔

”دیکھو عروہ! تم ہمت دکھاؤ اور خود کو مضبوط کرو۔ تم حرم کی ماں ہو۔ جو باتیں وہ تم سے کر سکتی ہے، مجھ سے نہیں کر سکتی۔ تم مضبوط ہوگی تو اس کو بھی سنبھال پاؤ گی۔ اس کو تمہاری جتنی ضرورت اب ہے، شاید تب بھی نہیں ہوگی جب تم نے اسے جنم دیا تھا۔ وہ اس وقت شدید ترین شاک میں ہے۔“

یہ سب کہتے ہوئے امین سرور کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ان کے دلوں کی طرح اس گھر کے تمام در و باہر پر مردنی چھائی دکھائی دیتی تھی۔ یہی وہ لان تھا جہاں ان کی حرم کے ننھے ننھے قدموں کے نشان ثبت ہوئے تھے اور پھر اس کے بعد بدلتے موسموں میں آن گشت سہائی یادوں کا سلسلہ تھا۔

خاموش ہو گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
آصف بولا۔ ”آپ لوگوں کی اچانک شغفگ نے مجھے حیران کر دیا تھا لیکن پھر ابوجان سے پتا چلا کہ آپ گھر کو ”ریٹوئٹ“ کر کے بیچنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چلیں اچھی بات ہے۔ وہ علاقہ کافی نجان ہو چکا ہے۔ طرح طرح کے لوگ آگئے ہیں۔“

”ہاں آصف! شفت ہونے کا ارادہ تو کافی دیر سے تھا لیکن پھر پچھلے مہینے اچانک پروگرام بھی بن گیا۔“
”چلیں جی۔ ہونے والا کام ہو گیا۔ ویسے ہم لوگ اگلے ہفتے لاہور آ رہے ہیں۔ آپ کی طرف بھی چکر لگے گا۔۔۔۔۔ ویسے چچی۔۔۔۔۔ ایک بات پوچھوں آپ سے؟“
آصف نے ذرا رکے رکے لہجے میں کہا۔

دوسری طرف عروبہ کو لگا کر دل اچھل کر گلے میں آ گیا ہے۔۔۔۔۔ کہیں آصف کچھ جان تو نہیں گیا ہے؟ اسے یا اس کے گھر والوں کو کوئی شک تو نہیں پڑ گیا؟ نہیں نہیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عروبہ نے خود کو سمجھا یا اور سنبھالا۔
”ہیلو چچی! ہیلو۔۔۔۔۔ آپ سن رہی ہیں؟“

وہ جیسے چونک کر بولی۔ ”جی جی جی! میں سن رہی ہوں۔“ عروبہ کی آواز میں لرزش تھی۔

”چچی! چھ سات روز پہلے فون پر آپ سے ای ایبو کی بات ہوئی تھی۔ بقول امی، آپ کچھ پریشان لگے تھے انہیں۔ اس دوران میں حرم سے بھی میری بس ایک دو دفعہ ہی بات ہو سکی ہے۔ یا تو اس کا فون بند ہوتا ہے یا پھر وہ شیک طرح سے بات ہی نہیں کرتی۔ کیا معاملہ ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟“

آصف کے لہجے کے تجسس اور ذومعنی انداز کو عروبہ نے پوری طرح محسوس کیا۔ ایک لمحے میں کئی خدشات اس کے ذہن میں ابھرے۔ تاہم وہ اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں آصف! بالکل خیریت ہے۔ تم یونہی پریشان ہو رہے ہو۔ اصل میں امتحانات قریب ہیں۔ پڑھائی کا بوجھ ہے۔ اس وجہ سے ”اسٹریس“ لے رہی ہے۔ میں بات کروں گی اس سے۔ تم فگر نہ کرو۔“

ساتھ ہی ڈور تیل کی آواز آئی۔ اس سے عروبہ کو رابطہ منقطع کرنے کا جواز ملا۔ ”شاید کوئی دروازے پر ہے۔“ اس نے کہا۔

”شیک ہے چچی! سب کو سلام دیجیے گا۔ ہم لوگ اس ہفتے ضرور چکر لگائیں گے۔ خدا حافظ۔“
فون بند ہوا تو عروبہ کچھ دیر یونہی کھڑی رہی۔۔۔۔۔

اسے پانی پلایا۔ حرم اور ماہین کو آواز دی۔ آنٹی کے کہنے پر حرم اپنی ماں کے شائع دہانے لگی۔ ایک لمحے کے لیے عروبہ کا دل چاہا کہ اپنا کتا بھانپ لیا اپنی اس ہمدرد کے سامنے رکھ دے اور چچا کی کمرے کے مٹھے کو اکٹھا کر لے۔ ان سب کو اس سوال کا جواب دے جو وہ سب پوچھ رہے تھے۔ انہیں بتائے کہ وہ یہاں سے کیوں جا رہے ہیں؟ کیوں اپنے اس گھر کے درو یار کو خیر باد کہہ رہے ہیں؟ کیوں اس مٹی کو اور اس سے وابستہ ساری یادوں کو الوداع کہہ کر یہاں سے منہ موڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔

لیکن وہ یہ سب کہہ نہ سکی۔ اگر وہ کبھی تو اس علاقے کی ہر دیوار پر اس کی اور اس کے اہل خانہ کی بدنامی کے اشتہار لگ جاتے۔ ایسے معاملوں میں یہ معاشرہ ایسا ہی سنگدل ہو جاتا ہے۔ اس نے اپنے سارے ہونٹوں کو مسکایا رہنے دیا۔

☆☆☆

کچھ دن پہلے تک انہوں نے سوچا بھی نہ تھا کہ حالات ان کی زندگی میں ایسی حیران کن تبدیلیاں لائیں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہیں اپنا وہ پیارا آگمن چھوڑنا پڑا تھا جہاں ان کی زندگی کے کئی برس سنہری یادوں کی صورت بکھرے ہوئے تھے۔ اب یہ ایک ناموس جگہ تھی۔ ارد گرد کے ناموس لوگ تھے۔ پانچ مرلے کا یہ پورن سامان رکھنے اور رہنے کے لحاظ سے کافی تو نہیں تھا مگر گزارہ ہونے لگا تھا۔ روز و شب کے معمولات ترتیب پا کر شروع ہو گئے تھے۔

جتنے کا دن تھا۔ صبح گیارہ ساڑھے گیارہ کا وقت ہوگا جب عروبہ سو سائیکل کی مارکیٹ سے گزری لے کر گھر پہنچی۔ کچھ سامان اس نے گاڑی میں ہی رہنے دیا جبکہ گوشت، بھری اور انڈے وہ اپنے ساتھ لے آئی۔ آج وہ حرم کا پسندیدہ چکن کارن سوپ بنانے جا رہی تھی۔ حرم ابھی کالج میں تھی اور وہ اس کے آنے سے پہلے سوپ تیار کر لیتا چاہتی تھی۔ ابھی اس نے چکن ابلانے کے لیے دھکی ہی تھی کہ اس کے سل فون پر کال کے سنسل آئے۔

”السلام علیکم چچی! میں آصف بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے آواز آئی۔
”علیکم السلام بیٹا! کیسے ہو؟“ عروبہ نے رکے رکے لہجے میں جواب دیا۔

”میں تو شیک ہوں چچی! آپ اور چچا تو خیریت سے ہیں نا۔ نئی جگہ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“
”نہیں بیٹا خدا کا شکر ہے، سب شیک ہے۔ اب تو ”سینگ“ وغیرہ بھی سب ہو گئی ہے۔“ اتنا کہہ کر عروبہ

یہ جھکی جھکی نگاہوں والا انداز بہت بھاتا تھا۔ وہ اکثر عروبہ کے سامنے عمر کی شریف انٹرسی کی تعریف کرتی اور کہتی کہ عمر بھائی بالکل اپنے اپنے گتے ہیں۔

سامان لے جانے والا مرد اپنا دوسرا پھیرا لے کر چاچا کا تھا، اب عروبہ اور اپنے اپنی مہراں کار پر جانے کے لیے تیار تھے۔ آنٹی شمینہ پریشان صورت بنائے ان کے پاس آئیں اور بولیں۔ ”عروبہ! آنا فانا یہ سب کیسے ہو گیا۔ کیا پہلے سے کوئی پلان تھا؟ تم نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ مجھے ابھی پندرہ منٹ پہلے پتا چلا ہے۔“

عروبہ بولی۔ ”بس باجی! فیملی میں ذرا پراپرٹی کی تقسیم کی بات چل رہی تھی۔ امین نے سوچا ہے کہ اپنی زندگی میں ہی بھرچ کر چھوٹے بھائی اور بہنوں کو ان کا حصہ دے کر قارغ ہوجاؤں۔ بعد میں اپنا گھر بھی بنالیں گے۔ ابھی تو شفت ہو رہے ہیں۔ یہاں رنگ روغن کرائیں گے۔ کوئی اچھی قیمت لی تو بیچ دیں گے۔“ عروبہ نے شمینہ آنٹی سے آنکھیں چراتے ہوئے تھوڑی سی مزید وضاحت کی پھر انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ فون پر انہیں اپنی نئی رہائش کا ایڈریس send کریں گی اور رابطہ برقرار رہے گا۔

ابھی شمینہ آنٹی کے ساتھ عروبہ کی بات ہو رہی تھی کہ اچانک عروبہ کی نگاہیں بیرونی گیٹ سے گزر کر سڑک کی طرف چلیں۔ اس کی رگوں میں جیسے خون جم گیا۔ اس نے اسی منٹوں میں عدیل کو دیکھا جس کو دیکھنے کے خوف نے اسے کئی دنوں سے ہلکان کر رکھا تھا۔ وہ غیبیت اپنی سوئیاٹیک کے پیچھے اپنے کسی اوباش دوست کو بٹھائے بڑی دھیمی رفتار سے ان کے گیٹ کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس کی شیطانی نگاہیں ان کے گھر پر ہی مرکوز تھیں۔ اس کے لیے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ عروبہ کو محسوس ہوا کہ چند لمحے رگوں میں جامد رہنے کے بعد اس کے جسم کا سارا خون چہرے اور سر کی طرف یلغار کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کے کنارے جلنے لگے۔ ایک چکر سا آیا اور اس نے دروازے کی چوکت کو منہ بولی سے تمام لیا۔

آنٹی شمینہ نے اس کی کیفیت دیکھ کر ”ہائے اللہ“ کہا اور تیزی کے ساتھ اسے بازوؤں سے تمام لیا۔ ”ارے عروبہ کیا ہوا؟“

عروبہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ بولیں۔ ”چلو، اندر چل کر بیٹھو۔۔۔۔۔ لگتا ہے کہ کچھ کھائے پیے بغیر تم اندھا دھند کام کر رہی ہو۔“
آنٹی شمینہ اسے اس کے بیڈروم تک لے آئیں۔

ہوگا۔“

اس نے دیر تک بیٹی کو اپنے ساتھ لگے رکھا۔ اس کا اپنا دل بھی رورہا تھا لیکن آنکھیں خشک تھیں۔ کچھ دیر بعد حرم نے سسک کر کہا۔ ”اما! کہیں باریال اور ماہین کو کوئی شک تو نہیں ہوا؟“

”نہیں حرم! عروبہ نے اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے کہا۔“ انہیں صرف یہی پتا ہے کہ تمہاری طبیعت شیک نہیں ہے اور پڑھائی میں بھی دقت پیش آ رہی ہے۔ ایک دو ٹیسٹ اچھے نہیں ہوئے ہیں۔“

”اما! کسی وقت باریال مجھے عجیب نظروں سے دیکھتا ہے جیسے کچھ پوچھتا چاہ رہا ہو مگر پوچھ نہ پاتا ہو۔۔۔۔۔ ماہین بھی بات کرتے کرتے ایک دم چپ ہو جاتی ہے۔“
”نہیں میری بیٹی! اس طرح کے واقعات کو دماغ میں جگہ نہ دو۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔“

عروبہ دیر تک اسے تسلی دیتی رہی اور پرسکون کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ اس نے اشارے حرم سے یہ ذکر بھی کر دیا کہ اس کے پاپا اس گھر سے شفت کرنے کا سوچ رہے ہیں۔

☆☆☆

امین سرور نے شہر کے شمالی علاقے میں ایک نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں پانچ مرلے کے مکان کا اپنا پورن کرائے پر لے لیا اور دو دن بعد ہی انہوں نے ایک مرد کو کرا کر اپنا سامان بھیجنا شروع کر دیا۔ ہمسائے اور آس پاس کے لوگ ان کی آنا فانا نقل مکانی پر حیران تھے۔ خاص طور پر شمینہ آنٹی۔۔۔۔۔ شمینہ آنٹی کو تقریباً سب ہی چھوٹے بڑے شمینہ آنٹی کہتے تھے۔ وہ اپنی ساس، دو بہنوں اور شوہر کے ساتھ امین صاحب کے گھر سے دائیں جانب دو گھر چھوڑ کر رہتی تھیں۔ چھوٹا بیٹا علی، باریال کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا جبکہ بڑا بیٹا عمر میڈیکل کر رہا تھا۔ اس کے والد صحافت کے پیشے سے شغف تھے۔

شمینہ آنٹی اور عروبہ کے درمیان اچھے تعلقات تھے اور یہ وہ واحد بڑی دوست تھیں جن کی طرف عروبہ بھی بکھار چکر لگایا کرتی تھی۔ شمینہ آنٹی بھی کسی نہ کسی بہانے عروبہ سے ملنے آ جاتی کرتی تھیں۔ دونوں کی مشترکہ پسندیدہ سندھی بریانی کا تبادلہ بھی چلتا رہتا تھا جبکہ باریال اور علی اکٹھے کرکٹ کے میدان میں نظر آتے تھے۔ عروبہ جب بھی سرراہ عمر کو دیکھتی، وہ بڑے ادب سے سر جھکا کر سلام کہتا ہوا گزرتا۔ اس کی یہ ادا عروبہ کو بہت بھلی لگتی۔ حرم کو بھی اس کا

ان گنت اندیشے اس کے ذہن میں کھلبلا رہے تھے۔

☆☆☆

عروبہ نے اپنے شوہر امین سرور کو رات والی دوا کھلائی۔ خود ہی ان کا بلڈ پریشر چیک کیا پھر لائٹ آف کی۔ سائڈ لیپ آن کیے اور ان کے پاؤں کی جانب بیٹھے ہوئے یہ خبر ان کے گوش گزار کی کہ آصف کا فون آیا تھا۔ اس نے مختصر آسانی گفتگو کا ذکر بھی کیا۔

امین سرور نے سر دھڑا کر کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ہماری حریم ٹوٹ چھوٹ کر رہ گئی ہے۔ پتا نہیں کہ وہ بھی نارمل ہوگئی یا نہ؟“

”وقت سب سے بڑا مرہم ہے امین۔ آہستہ آہستہ اس کے دل کے زخم مندمل ہونے لگیں گے لیکن اس میں پتا نہیں کتنی دیر لگے۔ دوسری طرف مسئلہ یہ ہے کہ وہ آصف سے اپنا سابقہ رویہ اور تعلق برقرار نہیں رکھ پا رہی۔ وہ بے حد اپ سیٹ ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے رویے کی وجہ سے آصف کے امی اب بھی کچھ شکے ہوئے ہیں۔“

امین سرور کا رنگ زرد ہونے لگا۔ عروبہ اسی لیے شوہر سے کسی نازک موضوع پر بات نہیں کرتی تھی۔ ان کے دل کا عارضہ ایک دم انہیں شدید تباہی میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ان کی ٹانگیں دبائے لگی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولے۔ ”قدرت انسان کو جب امتحانوں میں ڈالتی ہے۔ کبھی بھی انسان کھرا اور سچا ہونے کے باوجود چپ رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہمارے دل میں کوئی کھوٹ نہیں، نہ ہی آصف کے لیے یا اس کے گھر والوں کے لیے کوئی دغا ہے، اس کے باوجود ہم مجبور ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ اس طرح کے معاملات انسان کو خاموشی سے اللہ پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ جہاں پر ہماری عقل اور ہمت جواب دے جاتی ہے، وہاں سے اس کی تدبیر شروع ہوتی ہے۔ تم بھی اسی سے مانگو۔“ امین سرور سیدھے لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی آنکھوں کے گوشے نم تھے۔ وہ نماز روزے کے پابند تو پہلے ہی تھے لیکن جب سے حریم والا سامنے ہوا تھا ان کا رجحان مذہب کی طرف اور بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے جیسے، اپنا اور اپنی لاڈلی بیٹی کا انصاف اللہ پر چھوڑ دیا تھا لیکن عروبہ کے ذہن میں اکثر یہ سوال ابھرتا تھا کہ کیا بندہ جس طرح اپنے ہاتھ پاؤں پلائے بغیر اپنا رزق حاصل نہیں کر سکتا..... کیا انصاف حاصل کر سکتا ہے؟

کچھ دیر بعد امین سو گئے۔ عروبہ نے ان کی ٹانگوں پر کنبل درست کیا اور بہت ہولے سے اپنے نیچے پر سر رکھ کر

نیم دروازہ ہو گئی۔ ان گنت دوسوے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے اور دھندلا رہے تھے۔ اپنے ہمارے شوہر کو مزید پریشانیوں سے بچانے کے لیے عروبہ نے ”نکراؤ“ کا راستہ اختیار نہیں کیا تھا اور اپنے شوہر کا کہا مان کر خاموشی سے اس نئی رہائش گاہ پر چلی آئی تھی لیکن اس بد بخت نے اس کی پھول سی بیٹی کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، وہ کسی طور عروبہ کے ذہن سے نکلتا نہیں تھا۔ عدیل اور اس کے گرانڈ نیل پاپ ایڈووکیٹ ریاض کے منہوں پر عروبہ کی نگاہوں میں ٹھونچے رہتے تھے۔

وہ نیچے سے ٹیک لگائے نیم خود کی کیفیت میں تھی جب اس کے تصور نے ایک بار پھر اسے وہی منظر دکھایا جو وہ پچھلے چند برسوں میں درجنوں بار دیکھ چکی تھی۔ کھیت..... سرکنڈے..... گلاب ہی گلاب..... چھینے ہی چھینے..... وہ بھاگ رہی ہے۔ ایک دائرے میں گول گول پھولوں پر خون کے سرخ چھینے..... گلاب ہی گلاب..... چھینے ہی چھینے..... وہ بھاگ رہی ہے۔ ایک دائرے میں گول گول پھولوں پر خون کے سرخ آشام جانور اسے گھیر رہے ہیں۔ اسے چیر پھاڑ دینا چاہتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کدھر جائے۔ کہاں سے راستہ پائے۔ جانوروں کا گھبراہٹ بھرا ہوا جا رہا ہے۔ اس کا دم گھٹنے لگا ہے پھر ایک دم وہ اپنے تصور سے باہر نکل آئی۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ پیشانی پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ اس نے اٹھ کر پانی پیا۔ مقامی مسجد کے امام صاحب نے اسے ایک چھوٹا سا ورد بتایا تھا۔ وہ زیر لب پڑھتی رہی اور سوچتی رہی کہ یہ مناظر ایک ہی ڈھنگ سے کیوں بار بار اس کے ذہن پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے؟

وہ زیر لب پڑھتی رہی اور پھر اپنے شوہر کے پہلو میں لیٹے لیٹے سو گئی۔

☆☆☆

بٹنے کا دن تھا اور فروری کی ایک چمکیلی دوپہر۔ حریم آج پہلی مرتبہ اپنی اس نئی رہائش گاہ کے میسر میں آکر بیٹھی تھی۔ آج صبح سے ہوا کے ہلکے جھوکے دروازوں اور کھڑکیوں پر مدھم دستک دے رہے تھے۔ ذرا فاصلے پر سڑک کے درختوں سے ہوا کرتی تپوچوں کے سازنچ اٹھتے۔ حریم ہوا میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ یہ تبدیلی ایک موسم کا دوسرے موسم سے ملنے کا اشارہ تھا۔ موسم بدلنے والا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اس کے دل کا موسم جوں کا توں تھا۔ ایک بے نام خزاں جیسے اس کے اندر ٹھہری گئی تھی۔

ہوا کے جھوکے اس کے شہد رنگ ریشمی بالوں کو لہرائے لگے۔ اس نے اپنی اذہنی درست کی اور ہاتھ بڑھا

بھنگ آمد

”کیا کرتی ہو حریم۔“ عروبہ نے اسے شہو کا دے کر کہا۔ ”مڑھ آئے گا۔ تھوڑی آؤنگ ہو جائے گی۔ چلو اٹھو۔“ ”نہیں می! میں نہیں جاؤں گی۔ میں کچھ دیر ادھر ہی بیٹھوں گی۔ پرسوں ایک ٹیسٹ ہے، اس کی تیاری بھی کرنی ہے۔“ حریم نے جلدی سے بہانہ کر ڈالا۔

کچھ ایسی ہی طبیعت ہو گئی تھی اس کی۔ کہیں آنے جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کالج بھی مجبوری کے تحت اور خوف کے سائے میں جاتی تھی کیونکہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا اور یہ جو ٹیسٹ کے لیے پڑھنے کا بہانہ کیا تھا اس نے، یہ بالکل ہی ”بہانہ“ تھا۔ عروبہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ جب سے یہ حادثہ ہوا ہے، حریم نے شاید ایک دن کے لیے بھی توجہ اور دل جمعی سے نہیں پڑھا۔

وہ بیٹی کے کندھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”بھئی! میں نے سوچا تھا کہ کچھ شاپنگ کر لیں گے اور کل کے ڈنر کے لیے میں کچھ سامان بھی خرید لوں گی۔ تمہارے تایا تائی آرہے ہیں نا.....“ عروبہ نے منع دیکھ کر آصف اور اس کے گھر والوں کے آنے کی اطلاع بڑے ہلکے ہلکے انداز میں حریم کو دی۔ یہ اطلاع یا کر حریم کے صبح چہرے پر بے چینی کے سوا کوئی تار نہیں ابھرا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”نہیں می! آپ لوگ ہو آئیں۔ میں اگلی دفعہ چلی جاؤں گی۔“

عروبہ نے مزید اصرار نہیں کیا۔ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ ہم.....“ ڈیڑھ دو گھنٹے میں واپس آجائیں گے، پھر مل کر چائے پئیں گے اور زیادہ دیر باہر مت بیٹھنا۔ جاتی سردی تیار کر دیتی ہے۔ دروازے اچھی طرح بند کر لیتا۔

حریم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ اس اندوہناک واقعے کے بعد آج حریم پہلی مرتبہ گھر میں تنہا تھی۔ عروبہ نے اسے بھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔ حریم میسر میں بیٹھی رہی۔ ماضی قریب کی اس اندوہناک سہ پہر کے مناظر اس کے ذہن پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ کرخت گرفت..... بدبودار سانسیں، سرخ انگارہ آنکھیں۔ اس نے اپنی سوچوں کو ان اذیت ناک مناظر سے دور رکھنے کے لیے اپنی توجہ ارد گرد کے مناظر پر مرکوز کر دی۔ میسر کے خوبصورت پھول، سڑک کی دوسری جانب لہلہاتے پودے، کھڑکیوں پر دستک دیتے ہوئے ہوا کے جھوکے۔ اب آہستہ آہستہ اسے اپنی سوچوں اور اپنے

کر اپنا سیل فون آف کر دیا۔ فون آف کر کے اسے ایک عجیب سا سکون ملا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ آصف اور اس کے سوالوں سے بہت دور چلی گئی ہے۔ وہ اس کا منتظر تھا۔ اس سے بات کرنا حریم کو ہمیشہ اچھا لگتا تھا لیکن اب اس کے برعکس تھا۔ اسکرین پر اس کا نمبر دیکھ کر حریم کا دل بول جاتا تھا۔ وہ فرار کے راستے سوچتی تھی۔ کبھی چار جنگ ختم ہونے کا بہانہ، کبھی فون دوسرے کمرے میں ہونے کا عذر اور کبھی اس طرح کا کوئی اور ایسی کجی..... اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کرے۔ ایک دو بار تو اس کے دل میں آئی تھی کہ وہ بیٹے پر بہت بڑا پتھر رکھ کر سب کچھ آصف کو بتا ڈالے۔ اس سے کہہ دے کہ اس پر کیا گزری ہے، پھر سب کچھ اس پر چھوڑ دے کہ وہ کیا کرتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں وہ اس سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنا پاتی تھی۔

جب عروبہ نے بچن کی کھڑکی سے حریم کو میسر میں بیٹھے دیکھا تو اسے تھوڑی سی خوش محسوس ہوئی۔ وہ فوراً گارڈ اور موٹی کاٹ کر اور اس پر تھوڑا سا چاٹ مسالا چھڑک کر باہر میسر میں لے آئی اور حریم کے پاس جا بیٹھی۔ حریم کچھ دیر ماں کو دیکھتی رہی پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ”ممی! مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے آپ کو اور پاپا کو اتنی پریشانی ملی ہے۔“

وہ مزید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر عروبہ نے اسے وہیں روک دیا۔ ”حریم! ابے ذوق مت بنو۔ اب ان باتوں سے آگے نکلو۔ یہ دیکھو، میں تمہارے لیے بنا کر لائی ہوں۔ کھاؤ اسے۔“ عروبہ نے گارڈ کا ایک ٹکڑا کر زبردستی حریم کے منہ میں ڈالا۔

اسی دوران میں بار یال اور ماہین بھی وہاں پہنچ گئے۔ ماہین نے عروبہ کی گردن میں بائیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”ممی! آپ نے کہا تھا کہ گراسری کرنے چلتا ہے۔ وہاں سے جوئے لینے بھی چلیں گے۔“ ماہین ابھی میسرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھی۔

بار یال بولا۔ ”ممی! مجھے بھی اپنے لیے نیا کرکٹ بیٹ دیکھنا ہے۔“ وہ حریم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آئی! آپ بھی ساتھ چلیں گی نا؟“ بار یال کو حریم والے سانچے کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔ پھر بھی اتنا تو وہ جانتا تھا کہ کسی وجہ سے اس کی آئی اور می، پاپا بہت ڈسٹرب ہیں۔ وہ اکثر حریم کی دلجوئی میں لگا رہتا تھا۔

بار یال کی بات کے جواب میں حریم نے کہا۔ ”نہیں بار یال! میں نہیں جاسکوں گی۔“

کے پلو سے اپنی آنکھوں کے کنارے صاف کرتے گئیں۔
عروبہ کو لگ رہا تھا کہ ارد گرد کی ہر شے اس کی نگاہوں میں گھوم رہی ہے۔ چند ہفتے پہلے جو کچھ اس کی معصوم حریم کے ساتھ ہوا تھا، وہی کچھ اب، اسی محلے میں مسز فرحت کی بے گناہ بیٹی زویا کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ چند ہفتے یا چند مہینے بعد کسی اور جگہ کوئی اور زویا کوئی اور حریم اسی بد بخت عدیل عادی کا نشانہ بن جاتی۔

ایک دم اچانک ہی ایک بلند دالا آواز عروبہ کے سینے میں گونجی، اس چلاتی ہوئی آواز نے کہا۔ ”عروبہ! ہفتے کے روز وہ گڑیا سی زویا اس لیے ظلم کا شکار ہوئی ہے کہ وہ ماہ پہلے تم نے اور تمہارے شوہر نے اپنی حریم پر ہونے والی زیادتی کو خاموشی سے برداشت کر لیا تھا۔“ عروبہ کو اپنا کلیجہ شیش ہوتا محسوس ہوا۔ وہ بیچانی انداز میں بڑبڑاتی۔ ”مجھے چپ نہیں رہنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔ مجھے چپ نہیں رہنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔“

”کیا ہوا عروبہ؟ کیا کہہ رہی ہو؟“ آگنی شمینہ کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہوئے۔
عروبہ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ ان لمحوں میں اس کے اندر ایک خوفناک کشش جاری تھی۔ وہ لمبے تھے لیکن اپنے اندر صدیوں کی تاثیر رکھتے تھے۔ آخر عروبہ نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا اور اپنے کپکپاتے ہاتھوں سے آگنی شمینہ کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”ہائی! میں۔۔۔۔۔ آپ نے ایک بات کرنا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ آج میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔“

عروبہ کے تاثرات دیکھ کر شمینہ آگنی بری طرح چونک گئیں۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عروبہ کوئی بہت خاص بات کہنے جا رہی ہے۔ بند کمرے میں اور دھیمی آواز میں بولتے ہوئے، اگلے آدھ گھنٹے میں عروبہ نے وہ سب کچھ آگنی شمینہ کے گوش گزار کر دیا جو کچھ عروبہ پہلے اس پر اور اس کی بیٹی پر بلکہ پورے گھرانے پر گزرا تھا۔ آگنی شمینہ ہکا بکا سستی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف آمیز حیرت تھی، ان کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ چار دن پہلے جو کچھ زویا کے ساتھ ہوا ہے، وہی دو ڈھائی ماہ پہلے حریم کے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔ اور یہی وہ واقعہ ہے جس کے سبب ان لوگوں کو آغا فنا وہ گھر اور محلہ چھوڑنا پڑ گیا تھا۔

یہ ذکر اتنا سمجھ گیا کہ اس روز آگنی شمینہ زیادہ دیر ان کے گھر نہ رک سکیں اور نہایت بوجھل دل کے ساتھ واپس لوٹ گئیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے بس اتنا ہی کہا۔ ”تم

کھا کر سوئی پڑی تھی، بچی ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ وہ بد معاش دیوار پھاندر اندر چلا گیا۔ پہلے مین سوئچ سے پورے گھر کی لائٹ بند کی پھر زویا کو پکڑ لیا۔ یہ بات بھی سنی ہے کہ شاید اس غیبت کا کوئی ساقی بھی تھا لیکن ابھی یہ کنفرم نہیں ہوا ہے۔ مگر سے بھاگتے ہوئے بس اسی منہوں عدیل کو دیکھا گیا ہے۔“

شمینہ کی آنکھوں میں نمی چپکنے لگی تھی۔ عروبہ کا یہ حال تھا کہ کاتو تو بدن میں لبو کا قطرہ نہیں۔ سینے میں اس کا دل کسی مشین کی طرح چل رہا تھا۔ جسم کے ہر سام سے پینا بہہ نکلا تھا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر بہ مشکل کہا۔
”اور۔۔۔۔۔ اس ملازمہ کو کچھ پتا نہیں چلا؟“

”وہ مرن جوگی بھی بس مردار کی طرح پڑی رہی۔ وہ تو جب فرحت اور اس کا میاں گھر پہنچے اور انہوں نے دھڑا دھڑکٹ ٹھٹھکانا شروع کیا تو اندر سے چلانے کی مدغم آوازیں آئیں۔ اڑوس پڑوس والے بھی آگئے۔ محلے کا ایک لڑکا دیوار پھاندر اندر گیا اور اس نے مین سوئچ آن کیا۔ یہی وقت تھا جب وہ حرامزادہ پچھلی دیوار کو دھک بھاگا۔ وہ بندوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی پر وہ نکل گیا۔“

عروبہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی، اس کی نگاہوں میں معصوم صورت، نرم و نازک زویا کی شبیہ گھوم رہی تھی۔ وہ کالج جاتے ہوئے ہا قاعدہ حجاب لیتی تھی۔ انتہائی بااخلاق اور رشتہ کش۔ بھی بھی حریم سے ملنے ان کے گھر بھی آتی تھی۔ یہ کیسی قیامت گزرتی تھی اس پر۔

شمینہ کہہ رہی تھی۔ ”اگلے روز بے چاری نے مٹی بھر کر گولیاں کھائیں۔ اسی وقت اسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے کہا دو اشتر کچلے۔ بچتا محال ہے، انہوں نے معدہ واں کیا اور ہر طرح کی طبی امداد پہنچائی۔ 48 گھنٹے تک تو یہی لگتا رہا کہ ابھی اسپتال سے کوئی بری خبر آجائے گی لیکن پھر اتنا تو ہوا کہ اس کی جان بچ گئی۔“

”پپ۔۔۔۔۔ پولیس۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ رپورٹ وغیرہ درج ہوئی؟“ عروبہ نے پوچھا۔

”وہ تو ہوا ہی تھی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات تو رہی نہیں تھی۔ اللہ کرے کسی کی آئی ہوئی اس غیبت کو آجائے۔ وہ تو اس دن سے غائب ہو گیا ہے۔ پولیس اس کے چھوٹے بھائی کو پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس کا بے شرم باپ اپنی وکالت کا زور چلانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن یہ زور چلے گا نہیں۔۔۔۔۔ بد نصیب بچی کی بد دعائیں اس کے گلے کا پھندا ضرور بنیں گی۔ انشاء اللہ۔“ شمینہ کی آواز بھرائی اور وہ اپنی چادر

امین کی وفات کے بعد ایک دو ہفتے تک تو عزیزوں اور دیگر، پرسر دینے والوں کا آنا جانا لگا رہا تھا پھر بتدریج سناٹا چھانا شروع ہو گیا تھا۔ قطع شمینہ آگنی شمینہ جو پرانے محلے سے آٹھ سو کلومیٹر کا سفر طے کر کے ہر دوسرے تیسرے روز ان کے پاس چلی آتی تھیں اور ان کا دکھ بانٹنے کی کوشش کرتی تھیں۔ یقیناً وہ اس گھرانے کی جی ہمدرد اور عسکرا تھیں۔ ان کی موجودگی میں عروبہ اور حریم کو بہت اچھا محسوس ہوتا تھا۔ اتنی بات تو شمینہ آگنی کو بھی معلوم ہو چکی تھی کہ امین کی وفات سے دو تین روز پہلے حریم کی مکتی ٹوٹ گئی تھی اور ممکن ہے کہ امین کو جو شدید ہارٹ ایک ہوا، اس میں اس واقعے کا بھی مل دخل ہو۔

وہ آتیں تو دیر تک بیٹھتیں اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے عروبہ اور بچوں کا دھیان بنانے کی کوشش کرتیں لیکن ایک دن جب وہ عروبہ سے ملنے آئیں تو اپنے ساتھ پراٹھے محفلے کی ایک اندوہناک خبر بھی لائیں۔ اس خبر کا تعلق ایک سنگین واردات سے تھا اور یہ ویسی ہی واردات تھی جو کچھ عروبہ پہلے عروبہ اور امین کے گھرانے کی زندگی کو تیر دالا کر چھٹی تھی۔

شمینہ آگنی کو مسلسل خاموش دیکھ کر عروبہ نے پوچھ ہی لیا۔ ”آپ جب سے آئی ہیں، کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟“ شمینہ نے دائیں بائیں دیکھا۔ بیچے آس پاس موجود نہیں تھے۔ حریم بچن میں چائے بنا رہی تھی۔ شمینہ نے دل دھڑکے میں کہا۔ ”عروبہ! تجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا ماحول اور معاشرہ کس سمت میں جا رہے ہیں۔ تم زویا کو جاتی ہو نا۔ فرحت باجی کی چھوٹی بیٹی؟“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں جانوں گی۔ میری حریم کی ہم عمر ہے۔ اللہ خیر کرے، کیا ہوا اسے؟“

شمینہ نے پھر محتاط نظروں سے ارد گرد دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ ”عروبہ! بڑا ظلم ہوا ہے اس بے چاری کے ساتھ، ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ اخباروں میں خبر تک چھپ گئی ہے، شاید تمہاری نظر سے نہیں گزری۔“

”ہائے میں سرگئی، ہوا کیا ہے؟“ عروبہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کر بے تابگی سے پوچھا۔

”وہی حرامزادہ عدیل۔۔۔۔۔ وکیل ریاض جاوا کا بیٹا۔ اللہ کرے شام سے پہلے جنازہ اٹھے اس کا۔ اس نے پھول جیسی پتی کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ پچھلے ہفتے کی رات کی بات ہے۔ فرحت اور اس کا میاں محلے میں ہی ایک ہندو پر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں پتی بھی یا ایک ملازمہ تھی۔ ملازمہ دو

لاغر دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ عروبہ اور حریم نے پنجاب کا رڈ یا لوٹی جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ امین سرور کو بیڑھیاں اتار کر گیارہ بجے لے جانے کی تدبیر سوچ رہے تھے جب عروبہ کو محسوس ہوا کہ اس کے شوہر کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ وہ امیر جنسی والی میڈیسن لینے کے لیے دوسرے کمرے کی طرف دوڑی۔ لیکن اس کے لیے بھی دیر ہو چکی تھی۔ اس کے واپس لوٹنے سے پہلے ہی امین سرور دنیا اور اس کے دکھوں سے منہ موڑ چکے تھے۔ حریم کی مکتی کے بعد ان کی زندگی کی ڈور بھی ٹوٹ گئی تھی۔

”امین۔۔۔۔۔ امین!“ عروبہ دلدوز انداز میں پکاری۔
بچے بھی دوڑے ہوئے آئے پھر پورا گھر دھاڑوں سے گونجنے لگا۔ حریم اپنے پیارے پاپا کی چھاتی پر گر گئی۔ یہ قیامت کا سال تھا۔۔۔۔۔

☆☆☆

عروبہ کے گھر کا ماحول جو بتدریج بہتری کی طرف جا رہا تھا، امین سرور کے چلے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر سراسیمگی اور اندوہ کی لپیٹ میں آگیا۔ بیماری سے پہلے اور بیماری کے بعد بھی امین سرور نے اپنی ہمت طاقت کے مطابق اس گھر کے سربراہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اپنے شوہر کی موجودگی میں عروبہ کو ہمیشہ ایک احساس تحفظ رہا تھا لیکن اب اسے یوں لگا کہ وہ زمانے کے گرم سرد کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تنہا رہ گئی ہے۔ باپ کی جدائی نے سب بچوں کو بری طرح متاثر کیا تھا لیکن سب سے زیادہ اثر حریم پر ہوا تھا۔ عروبہ کو یوں لگتا تھا کہ وہ خود کو براہ راست اپنے پیارے پاپا کی موت کا ڈسے دار سمجھتی ہے۔ اس نے خود کو اپنے گھر کے میں بند کر لیا تھا اور روز روز پکڑ پکڑا ہوتی رہتی تھی۔ کالج اور ایڈمی جانا بالکل چھوٹ چکا تھا۔ چوبیس گھنٹے میں مشکل دو چار لٹے لیتی تھی۔ اس کی صحت روز بروز گری رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ان سارے دکھوں کی بنیاد سمجھتی تھی۔

عروبہ نے اپنی دلکش حریم کو ہمیشہ پر اعتماد اور بلند حوصلہ پایا تھا لیکن اب وہ اس کی حالت دیکھتی تھی تو اندر سے ٹوٹ چھوٹ جاتی تھی اور ایسے ہی لمحوں میں عدیل عرف عادی کا مکروہ چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتا تھا۔ سوچی سوچی ہی مجھوری آنکھیں۔ سر کے لیے بال، قدرے موٹی ناک اور کسی سائڈ جیسا چوڑا چمکا جسم۔ اس کا دل چاہتا وہ اس کے سامنے ہو۔ وہ اس کا گریبان پکڑے، پوری طاقت سے اپنی طرف کھینچے اور چلا کر پوچھے۔ شیطان باپ کے شیطان بیٹے، تجھے پتا ہے تو نے کتنی زندگیاں برباد کی ہیں؟

لاڈلی کے بارے میں پتا نہیں کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ دونوں کا ساتھ چھوٹ گیا، اس سے بڑا غم کیا ہوگا۔

وہ دونوں تھوڑی دیر تک حریم کے گھر بیٹھ اور تعلیمی مسائل کے بارے میں بات کرتے رہے، پھر عرصہ کھانے کی ٹیبل پر جانے کے لیے اٹھ گیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا، عمر کی آنکھ کھلی تو اسے اپنے امی ابو کے کمرے سے باتوں کی مدغم آواز سنائی دی۔ وہ ننگے پاؤں ادھ کھلے دروازے کے نزدیک گیا تو الفاظ اس کے کانوں تک پہنچے گئے۔ اس کی امی اس کے ابو سے جو گفتگو کر رہی تھیں، اس کا موضوع حریم اور اس کی فیملی ہی تھی۔

..... اور پھر جو کچھ اس نے سنا اس نے اس کی روح تک کوٹنا کر دیا۔ اس پر جو لرزہ خیز انکشاف ہوا وہ جانکا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا کھڑا پسینے میں نہا گیا۔

حریم کا چہرہ وہ چہرہ تھا جو ایک دیے کی طرح برسوں سے اس کے سینے میں روشنی بکھیر رہا تھا۔ بڑی خاموشی لیکن بڑے تسلسل کے ساتھ یہ روشنی اس کے جسم کے ہر مسام میں سرایت کر چکی تھی۔ خاموش محبت جو کسی طوفان کی طرح پُر شور نہیں بلکہ جھیل کی طرح گہری اور پرسکون ہوتی ہے۔ یہ وہ محبت نہیں تھی جس کے تار من اور شادی بیاہ پر اکڑنے لگتے ہیں۔ یہ ہر قسم کے بندھن سے آزاد غیر مشروط محبت تھی، صرف محبت تھی۔

وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ عمر لڑکپن سے اسے دیکھتا چلا آیا تھا۔ اس کی خوشنما جھلکیاں اس کے دل و دماغ پر نقش تھیں۔ اس کا اجلا یو نیفارم پہن کر اسکول جانا، گھر کے بیرونی دروازے پر نظر آنا، چھت پر گھومنا، کسی حسنِ تہوار پر خوش رنگ کپڑوں میں ملبوس ایک روشن کبیر کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر جانا۔ کبھی بھار اپنی امی کے ساتھ عمر، ان کے گھر بھی جایا کرتا تھا لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی ایک دو جملوں سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ حالانکہ وہ اس سے دُھروں باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے قریب سے اور قور سے دیکھنا چاہتا تھا، خاص طور سے اس کی آنکھوں کو۔ اس نے حریم سے بات کرنے کے اور اس کو اپنے دل کا حال سنانے کے ان گنت پلان بنائے تھے۔ مگر لڑکپن کے یہ سارے پلان صرف پلان ہی رہے تھے۔ اور وقت گزرتا چلا گیا تھا۔ دن بٹھے اور مینے خشک ریت کی طرح اس کی مٹی سے پھسلنے چلے گئے تھے۔ ایک آج پر جب اسے میڈیکل کالج میں داخلہ ملا تھا، اس نے بڑی سنجیدگی سے سوچا تھا کہ وہ اپنی امی کو اپنے دل کے حال

دفعہ بھی حریم کو نہیں دیکھا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس کے بارے میں سوچتا اور فکر مند رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ حریم میں کوئی خاص تبدیلی آ چکی ہے۔ ایسی تبدیلی جس کو شہت نہیں کہا جاسکتا۔ وہ اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ ایک دفعہ اس کے سامنے آئے اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھ سکے۔ وہ حریم کے بارے میں اس انداز میں کیوں سوچتا تھا؟ وہ بھی خود بھی نہیں سمجھ پاتا تھا۔ وہ سوچنے لگا، بہتر تو یہ تھا کہ وہ جانے کے لیے منع نہ کرتا، شاید اسی بہانے وہ اسے ایک دفعہ دیکھ لیتا۔

”مئی! اچانک بن چکی ہے، میں لا رہی ہوں۔“ کچن کی جانب سے ایک نرم، ہلکتی ہوئی آواز آئی جو سیدھی اس کے دل پر لگی۔

دو منٹ بعد حریم چائے کی ٹرائی و حکلیتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس نے اپنے سوٹ سے بیچنگ شال کے بجائے ایک گرے رنگ کی کسی قد رسلوٹوں والی شال، اسکارف کی صورت میں لپیٹ رکھی تھی۔ عمر جو اکثر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی نظریں جھکا لیتا تھا، آج ایسا نہ کر سکا۔ وہ بے ساختہ اسے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے دل پر جیسے کسی نے ایک گھونسا مار دیا تھا۔ اداس چہرہ، زردی مائل رنگ، آنکھوں کے گرد حلقے..... کیا یہ حریم ہی تھی؟

ٹھمنہ نے عمر کو یوں بے ساختہ حریم کو نکتے پایا تو اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”بیٹا! اب چائے پی کر لگتے ہیں، جلی گھر میں اکیلا پریشان ہو رہا ہوگا۔“

”جی امی!“ عمر نے فوراً اپنا کپ اٹھالیا۔ حریم جس طرح ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کے ساتھ آئی تھی، اسی طرح واپس چلی گئی اور عمر چائے حلق سے نیچے اتارتے ہوئے یہی سوچنے لگا کہ اس پھول سی لڑکی کو کس موسم کی کرخت دھوپ نے ادھ موا کر دیا ہے۔

واپس اپنے گھر پہنچ کر بھی عمر، حریم کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ والد کی موت کا صدمہ بے شک اپنی جگہ موجود تھا لیکن پتا نہیں کیوں عمر کو لگتا تھا کہ بات اس صدمے کے علاوہ بھی کچھ ہے۔ امی اس سے کھانے کا پوچھنے کے لیے اس کے کمرے میں آئیں تو وہ جیسے بے ساختہ بول اٹھا۔ ”امی! حریم کو کیا مسئلہ ہے..... میرا مطلب ہے کہ اس کی صحت تو ٹھیک ہے نا؟“

اسے محسوس ہوا کہ اس کی امی کچھ گڑبڑا گئی ہیں لیکن پھر خود کو سنبھال کر بولیں۔ ”ہاں بیٹا! ٹھیک ہے وہ۔ اپنے والد سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس بے چارے نے بھی اپنی

آئی تھیں۔ عروہ کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے چھوٹی ماہین کو ساتھ ملا لیا۔ آلو کی لٹیاں اور ایک دو سالن بنا کر فریز کر دیے۔ وہ اکثر ایسا ہی کرتی تھیں۔

عروہ نے کہا۔ ”باجی! آپ یہ سب کچھ نہ کیا کریں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ اتنی دور سے چل کر آ جاتی ہیں میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“

”نہیں عروہ! غیروں جیسی باتیں نہ کیا کرو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم زیادہ سے زیادہ وقت بچوں کے ساتھ گزارو۔ خاص طور سے حریم کو بہت زیادہ وقت دو۔ اس کو تمہاری توجہ کی بے حد ضرورت ہے۔ سچ پوچھو میری تو اب ہمت نہیں ہوتی اس کا سامنا کرنے کی۔ پھول کی بچی کیسے مرجھا کر رہ گئی ہے۔“ آئی ٹھمنہ کی آنکھیں نم ہوئیں۔ اس نمی کو چھپانے کے لیے انہوں نے چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ پھر وال کلاک کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”عمر آنے ہی والا ہوگا، چار بجے اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے..... اور ہاں، میں تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔ عمر کا ہاؤس جاب ختم ہو چکا ہے۔ اب وہ موہنی روڈ والے اسپتال میں آ گیا ہے۔ مجھ کو کہہ تمہارے گھر کے پاس ہی۔ میرا خیال ہے ابھی دس منٹ میں پہنچ جائے گا۔“

وہ واقعی دس منٹ میں پہنچ گیا۔ اکثر وہ والدہ کو باہر سے ہی لے کر چلا جاتا تھا لیکن آج عروہ نے اصرار کر کے اسے اندر بلا لیا۔ وہ کچھ تھکا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ ڈرائنگ روم کے صوفے پر اکڑوں بیٹھا وہ عروہ کو بہت نفیس اور بے حد شریف انفس لگا۔ کچھ جھکی گئیں، چہرے پر شرم دھنیا کا لمس۔

عروہ نے حریم کو آواز دی۔ ”حریم! بیٹا! بھالو۔“

”نہیں آئی! بالکل ضرورت نہیں۔ ابھی دس منٹ پہلے پی کر آیا ہوں۔“ اس نے ارد گرد دیکھا۔ ”باریال اور ماہین نظر نہیں آ رہے؟“ اس نے پوچھا۔

باریال اور ماہین دونوں عمر سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ عمر ہمیشہ باریال سے ایک بڑے بھائی کی طرح چپ چس آتا اور اس کی اسٹڈی کے حوالے سے سوال جواب کرتا رہتا۔ چھوٹی ماہین بھی اس سے کافی بے تکلف تھی۔

عروہ نے کہا۔ ”فائل ہو رہے ہیں ان دونوں کے۔ آج کل پر حا کو بچے بنے ہوئے ہیں۔ ٹھہر، میں بلاتی ہوں۔“

ٹھیک ہی کہتی ہو عروہ! ہم شریف لوگوں کی خاموشیاں ان بد معاشر کی طاقت بن جاتی ہیں۔ ان کے حوصلے آسمان کو چھونے لگتے ہیں لیکن میں یہ بھی سمجھ رہی ہوں کہ تم لوگوں کی مجبوریاں کیا تھیں۔ میں جانتی ہوں کہ اللہ بخشے تمہارا شوہر امین ”بے ہمت“ شخص نہیں تھا۔ اگر وہ بیماری کے گھیرے میں نہ ہوتا تو ہو سکتا ہے کہ ساری مصلحتوں کو ایک طرف رکھ کر قانونی کارروائی کا ارادہ کر لیتا۔“

اگلے تین چار روز تک آئی ٹھمنہ ان کے گھر نہیں آئیں۔ شاید حریم والے صدمے سے ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک دن وہ آئیں تو انہیں پھر تہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملا۔ گفتگو کا سلسلہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ عروہ کے لب و لہجے میں ایک نیا عزم اور ارادہ تھا..... بلکہ ایک طرح کی بغاوت بھی اپنی مجبوریوں کے خلاف۔ وہ بولی۔ ”باجی! اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ خاموش نہیں رہوں گی۔ یہ خاموشی مجھے ہمیشہ ایک گناہ کی طرح لگی ہے اور اب شاید یہ ثابت بھی ہو گیا ہے کہ وہ خاموشی ایک گناہ اور جرم تھی۔ اگر ہم اس وقت چپ نہ سادھتے تو شاید پچھلے بیٹھے وہ معصوم زویا اس جانور کی زد میں نہ آتی۔ مجھے لگتا ہے باجی کہ اب میرے پاس صوفے کو زیادہ کچھ نہیں ہے۔ امین دنیا سے چلے گئے۔ حریم ایک زندہ لاش بنی ہوئی ہے۔ بچے ڈری بھی زندگیاں گزار رہے ہیں۔ اب میں بولوں گی باجی! اب میں آواز اٹھاؤں گی اور تب تک خاموش نہیں ہوں گی جب تک میں مر نہیں جاتی یا وہ مکروہ انسان کیفر کردار کو نہیں پہنچ جاتا۔“ عروہ کے لہجے میں عجیب سی آگ تھی اور آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔

آئی ٹھمنہ نے عروہ کو گلے سے لگایا۔ اس چھوٹے سے کنبے کے درد کا احساس ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا۔ انہوں نے بس اتنا کہا۔ ”یہ بڑا مشکل راستہ ہے عروہ..... اور تم تنہا عورت ہو۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، تمہیں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بہت سوچ سمجھ لینا چاہیے۔“

”میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچ بچار کی ہے باجی! حریم سے بھی تھوڑی بہت بات ہوئی ہے۔ لاہور ہی میں حریم کے ایک خالو یا ور حیات ہیں۔ وہ کونسلر وغیرہ رہ چکے ہیں۔ ان کے لوگوں سے اچھے تعلقات ہیں۔ میں ان سے بات کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ابھی وہ فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔ جیسے ہی واپس آتے ہیں، ان سے ملتی ہوں پھر جو بات ہوگی آپ کو بتاؤں گی.....“

آئی ٹھمنہ ان سے ساتھ کچھ چکن اور سبزی وغیرہ لے کر

چاہیے پاپا.....

برداشت کا بند ٹوٹا تو ختم کا سلاب اتنی تیزی سے پھیلا تھا کہ حریم کی ذات اس میں ایک تنگ کی طرح بہہ گئی تھی۔ وہ جیسے اپنے حواس میں ہی نہیں رہی تھی۔ اس کا ذہن اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کیوں روتی ہوئی بستر سے اٹھتی اور اس الماری کی طرف جاتی جہاں اس کے پیارے پاپا کی ذاتی اشیا "پادگار" کے طور پر رکھی ہوئی تھیں..... ان کی کچھ کتابیں، کپڑوں کے ایک دو جوڑے،

ان کی رست واپج، ان کا پرس جس میں حریم، باریال اور ماہین کی تصویریں تھیں اور ایسی کئی چیزیں۔ اسی الماری کی ایک دراز میں ابھی تک کچھ ایسی دوامی بھی پڑی تھیں جو اس کے پاپا کے زیر استعمال رہی تھیں۔ ان میں ایک ٹرکولاٹر بھی تھی۔ یہ خاصی تیز دوامی۔ ایک بھائی کیفیت کے زیر اثر حریم نے دوا کی بوتل کھولی اور انٹھی آٹھ دس گولیاں پھانک کر پانی کے چند گھونٹ پی لیے۔ وہ ایک ایسی خود فراموشی جا رہی تھی جس کا اختتام ابھی نیند پر ہو۔

یہ کام کر گزرنے کے میں تیس سیکنڈ بعد اس کے دل و دماغ کو ایک شدید کچھکھسوس ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ دیر کے لیے ایک نہایت خطرناک بہاؤ میں بہہ گئی تھی اور اسی بہاؤ میں وہ ایک ایسا کام کر گزری ہے جو اسے ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس نے مدہوشی کی کیفیت میں خود سے سوال کیا۔ "حریم! تم اتنے بڑے گناہ کی مرتکب کیسے ہو سکتی ہو؟ تم خود سے ہونے والی زیادتی کا بدلہ اپنے آپ سے لے رہی ہو، حرام موت کو گلے لگا رہی ہو؟ دنیا میں تو رسوائی ہونی ہی ہوتی ہے، تم تو اپنے رب کی بارگاہ میں بھی ذلیل و رسوا ہو گئی ہو....."

پتا نہیں کہ کچھ دیر کے لیے یہ کیسا پردہ پڑ گیا تھا اس کی آنکھوں پر۔ اب اس کے حواس ایک جان لیوا تیرگی میں ڈوبے جا رہے تھے۔ اپنے پاپا کے پاس جانے کا یہ یوں سا طریقہ سوچا تھا کہ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور کہا ابھی۔ ان لمحوں میں اپنے پیاروں کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومے اور ان میں سب سے نمایاں چہرہ اس کی مٹی کا تھا۔ اس نے بڑبان خاموشی خود سے کہا۔ "اپنی تنہا دکھائی دیاں کے ساتھ یہ کیسا ظلم کیا ہے تم نے؟ وہ کیسے جھیل پائیں گی یہ سب کچھ۔ ان کی تو کمر ٹوٹ کر رہ جائے گی۔"

وہ زور سے چلائی، پھر ڈگڈگاتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اس کو اپنا جسم بے جان محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ مرنے سے پہلے اپنی دکھائی دیاں سے معافی مانگتا

کے ستم کا شکار ہوئی تھی۔ فون پر ہونے والی اس گفتگو نے حریم کو ایک دم بکھیر سادیا۔ اس طویل گفتگو میں ایک موقع پر زویا نے ان سوال و جواب کا ذکر کیا تھا جو دعا کی کارروائی میں وکیل وغیرہ اس سے پوچھتے رہے تھے۔ بے شک یہ سوال جواب قانون کے مطابق تھے مگر اتنے شرمناک تھے کہ حریم سن کر ہی پیسے میں نہا گئی۔ مثلاً ملزم نے تمہیں کہاں کتنی بار اور کیسے چھو۔ اس نے تمہارے لباس کا کیا کیا؟ وہ کتنی دیر تمہارے پاس رہا۔ دوران جرم اس نے کیا کیا الفاظ بولے وغیرہ وغیرہ۔

زویا سے اس غم ناک گفتگو کے بعد حریم رات آخری پہر تک سو نہیں سکی۔ اس کے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اگلے روز ایک بچہ عروہ نے وکیل سلطان صاحب سے دوبارہ ملاقات کرنے کا جانا تھا۔ انہوں نے حریم کا ب فارم، آئی ڈی کارڈ اور کچھ دیگر کاغذات منگوائے تھے۔ ماں کے جانے کے بعد حریم نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور بستر پر ایک گھنٹہ سی بی بی کے پہلو کے بل لیٹ گئی۔ حریم اور اس کی مٹی نے ایک نہایت دشوار اور پرخطر راستے پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن حریم جتنی بھی کہ وہ اپنی مٹی کی طرح دلیر نہیں ہے۔ شاید اس لیے کہ اس کی رگوں میں مٹی کے ساتھ ساتھ پاپا کا خون بھی دوڑتا تھا۔ پاپا جو بہت اصول پسند ہونے کے باوجود نہایت جیسے مزاج کے اور خاموش طبع شخص تھے۔ پاپا یاد آئے تو اس کی آنکھوں سے لگا تار آنسو بہنے لگے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس وقت گھر میں آئی ہے اور اس کی آہ و بکا سننے والا کوئی نہیں، اس لیے وہ بلند آواز سے روتے اور ہچکیاں لینے لگی۔

"پاپا! مجھے نہیں جینا ہے ایسی زندگی۔ مجھے اپنے پیاروں کے لیے دکھوں کی بنیاد نہیں بنتا ہے، مجھے بھی آپ کے پاس آنا ہے۔ مجھے اپنے پاس بلا لیں پاپا۔"

اس کی گریہ و زاری بڑھتی گئی۔ سینے کے اندر مرے سے جمع ہونے والے دکھ اور اشک، آنکھوں کے بند تو ذکر آزادانہ بہہ نکلے۔

وہ مسک رہی تھی۔ "مجھے نہیں پڑھنا، مجھے نہیں شروع کرنی تھی زندگی..... میں بہت تھک گئی ہوں پاپا۔ میں اب آرام کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کے پہلو میں ایک قبر میری بھی بن جائے، میری بس یہی خواہش ہے۔ مٹی جو کچھ سوچ رہی ہیں، وہ بالکل درست ہے لیکن وہ کیسے کر پائیں گی یہ سب کچھ؟ باریال اور ماہین کا کیا کریں گی۔ وہ کب تک میری زندہ لاش کو گود میں اٹھائے در در کی شو کریں کھائیں گی؟ اس لاش کو..... اب دفن ہو جانا چاہیے..... ہاں مجھے دفن ہو جانا

باریال اور ماہین نے شدید دھچکا تو محسوس کیا تاہم وہ بہت جلد سنبھل گئے اور یہ جان کر عروہ کو حیرت ہوئی کہ ان کے خیالات ابھی تقریباً وہی تھے جو خود عروہ پر اور کسی حد تک حریم کے بھی تھے۔ خاص طور پر باریال نے کم عمر ہونے کے باوجود ایک نوجوان کی طرح "ری ایکٹ" کیا۔ وہ غم آنکھوں کے ساتھ بولا۔ "اس بارے میں خاموش رہیں گے مٹی، تو مطلب یہی ہوگا کہ ہم ایک عالم کی مدد کر رہے ہیں۔ آپ کی سخت ترین مزا ضرور ملتی چاہیے۔"

بیٹے اور بیٹی کو اس بارے میں بتاتے ہوئے عروہ کو کوفت تو بہت ہوئی لیکن بتانے کے بعد اس نے خود کو ایک دم ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسے لگا کہ اس کے آگم میں جھوٹ کے جو سانسے لیے ہو رہے تھے اور ان کے باہمی اعتماد کو ٹکڑے کر رہے تھے، وہ مسٹ گئے ہیں..... اسی روز شام کے بعد اس نے حریم سے جو باتیں کی تھیں، وہ حریم کی سمجھ میں بھی آئی تھیں۔ وہ بھی اپنے جرم کو، زویا کے جرم کو اور نجانے کتنی لڑکیوں کے جرم کو بغیر کردار تک پہنچنے دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے اندر ایک آگ تھی جو اسے مسلسل جلا رہی تھی اور جسم کر رہی تھی۔ وہ اس طرح گھٹ گھٹ کر مرنے لگی تھی لیکن اس سب کے باوجود وہ ایک نوعمر لڑکی تھی۔ صنف نازک سے تعلق رکھتی تھی، اس کے اندر کے خوف، اس کے چہرے پر زردی بکھیر دیتے تھے۔

عروہ نے اپنے پروگرام کے مطابق حریم کے خالو یا در حیات صاحب سے ملاقات کر لی تھی (حریم کی خالہ یعنی عروہ کی بہن کی سال پہلے انتقال کر چکی تھیں) یا در حیات نے بھی حریم والی خبر بے پناہ حیرت اور دکھ سے سنی تھی۔ بہر حال یا در بھائی کو اپنا مہراز اور معاون بنانے کے بعد عروہ کو ایک بڑا سہارا ملا تھا۔ یا در بھائی کے ساتھ جا کر اس نے ایک وکیل سے بھی ابتدائی بات چیت کر لی تھی۔ جب اس نے یہ ساری باتیں حریم کو بتائیں تو وہ چپ سی ہو گئی۔ وہ اس شخص راستے پر چلنے کے لیے پر عزم تھی لیکن اس راستے کی دشواریاں بھی اس کے لیے ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ تھانے کے چکر، پتھریوں کے پھیرے، تھکے سوالات، بدنامی، چرچے..... یہ سب کچھ اس کی نگاہوں میں گھومنے لگا تھا۔ عروہ نے اس کے تاثرات دیکھے اور اسے حوصلہ دینے کی کوشش کرنے لگی۔

اس روز رات کو حریم کی بات اپنی اس دیرینہ دوست زویا سے ہوئی جو چند روز پہلے اس کی طرح اس درندے

سے آگاہ کرے گا اور کہے گا کہ وہ انکل اسٹین کی بیٹی کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہے..... لیکن پھر انجی دونوں اسے یہ گھائل کر دینے والی اطلاع ملی تھی کہ حریم کا رشتہ اس کے خاندان میں ہی بتایا کے بیٹے سے ملے ہو گیا ہے۔ وہ کی بہنوں تک ایک بے گل پرندے کی طرح رہا تھا مگر اپنی کم ہمتی کے بجنے میں بند پرندہ پھڑ پھڑانے کے سوا اور کچھ بھی کیا سکتا ہے۔ دیر سے دیر سے اس نے خود کو سنبھال کر اپنی اسٹڈی میں غرق کر لیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا اسے، لیکن وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ بھلانے سے لوگ بھولا نہیں کرتے۔ وہ دماغ کے ایک حصے سے نکل جاتے ہیں لیکن دل کے خاموش گوشوں میں زیادہ گہری جگہیں بنالیتے ہیں۔ حریم کی چاہت بھی اس کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں نہیں نہ نہیں موجود تھی۔ چاندنی راتوں، ساون کی جھڑیوں، سرمائی دھوپوں اور تھوڑوں کے رنگوں میں لپٹی ہوئی یہ چاہت اب بھی کی کو ڈھونڈتی تھی.....

"حریم! کیا کیا ہو؟" اس نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا اور اس کی آنکھوں کے کنارے بھجک گئے۔ وہ رات عمر کی غم ناک ترین راتوں میں سے ایک تھی۔

☆☆☆

رشتہ ٹوٹنے کا صدمہ بہت بڑا تھا، مگر اس صدمے میں سے عروہ کے لیے بے خوفی اور جرأت کے نئے راستے نکلے تھے۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب پیچھے نہیں ہٹے گی۔ اس کا پروگرام تھا کہ باریال اور ماہین کو مستقل طور پر ان کی پچھو کے پاس کوئینسٹن دے گی اور اپنی لٹی بیٹی بیٹی حریم کے ساتھ غم ٹھونک کر میدان میں آجائے گی۔ اس نے تمام مصلحتوں کو ایک طرف رکھ کر براہ راست انصاف کے حصول کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے اپنے مرحوم نانا سے بہت سی باتیں بھی تھیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ حق سچ کے لیے آواز اٹھانا ایک جہاد ہے۔

عروہ نے سب سے پہلے حریم کو اپنے اعتماد میں لیا..... اور اس کے بعد بڑا حوصلہ کر کے اور دل پر پتھر رکھ کر باریال اور ماہین کو بھی وہ سب کچھ بتا دیا جو ان کی آبی پر غزرا تھا۔ یہ سب کچھ بتانا اس لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ وہ دونوں بچے عجیب سی الجھن اور شکوک کا شکار نظر آتے تھے۔ وہ جانتے بھی تھے کہ ان کی بڑی بہن کے ساتھ سب اچھا نہیں ہے لیکن کوئی عمل کر انہیں بتاتا بھی نہیں تھا اور ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے یہ پردہ داری ان کے رویوں پر نفسیاتی طور پر مٹی اثرات ڈال رہی تھی۔

رہی کہ اکاؤنٹ گاہ گروہ کے علاوہ اسے کسی نے نہیں دیکھا۔
حرم کو گھر سے اسپتال پہنچانے میں اسے دس منٹ سے
زیادہ نہیں لگے۔ وہ ہرگز اسے ”میڈیکل ٹیکسٹ“ کیس بنانا
چاہتا تھا۔ وہ حرم کو لے کر اپنے ایک سینئر دوست ڈاکٹر
رضوان شہزاد کے پرائیویٹ کلینک میں ہی آیا تھا۔ ڈاکٹر
شہزاد کو اس نے راستے میں ہی آگاہ کر دیا تھا۔ کلینک پہنچتے
ہی حرم کی ٹریٹمنٹ شروع ہوئی۔

اسی دوران میں پھر..... عروبہ کا فون بھی آگیا۔
اب عمر نے کال ریسیو کی۔ اس نے کہا۔ ”آئی! آپ
ریٹیکسڈ ہو جائیں۔ میں حرم کو یہاں کلینک میں لے آیا
ہوں۔ اس نے کسی چیز کا زیادہ اسٹریس لیا ہے اور بے ہوش
ہو گئی ہے لیکن آپ فکر نہ کریں۔ ٹریٹمنٹ ہو رہی ہے.....
بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

کلینک میں معدے اور جگر کا اسپیشلسٹ ڈاکٹر موجود
تھا، مگر سڑکوں پر بد امنی کی وجہ سے وہ بھی ابھی تک ڈیوٹی پر
نہیں پہنچ سکا تھا۔ عمر نے ڈاکٹر رضوان کے ساتھ مل کر معدہ
واش کرنے کا عمل مکمل کیا اور پھر حرم کو ڈریس وغیرہ لگا
دیں۔ چند منٹ کے لیے اسے ”بر-تھنگ مشین“ پر بھی رکھنا
پڑا لیکن پھر اس کی ضرورت نہ رہی۔ اس کی حالت، بروقت
طبی امداد کے سبب تیزی سے سنبھل رہی تھی۔

عمر نے بھی حرم کو چھوڑا تھا لیکن اب ایک ڈاکٹر کی
حیثیت سے وہ اس کے جسم کے مختلف حصوں کو مسلسل چھو رہا
تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی اس کی۔ کئی موقعوں پر تو ضرورت
کے باوجود اس نے حرم کو چھونے سے گریز کیا اور وہ کام
ڈاکٹر رضوان پر چھوڑ دیا۔ اس کا دل بار بار بے طرح
دھڑکنے لگ جاتا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد حرم اپنی جگہوں کو
ایک دم سی حرکت دینے لگی۔ اس کی سانس بھی ہموار ہو
رہی تھی۔ جب اس نے کن آنکھیں سے عمر کی طرف دیکھا۔ وہ
اس کی تس میں آنکھیں لگانے میں مصروف تھا۔ عمر کو دیکھ کر
اس کی غنودگی بھری آنکھوں میں شدید حیرت نمودار ہوئی،
تاہم اس حیرت میں ایک طرح کا اطمینان بھی تھا۔

وہ کسمپاسی اور ہولے سے کچھ کہا۔ عمر نے اپنا کان
اس کے ہونٹوں کے پاس کیا۔ وہ رندھی ہوئی کمزور آواز میں
کہہ رہی تھی۔ ”میں کہاں ہوں..... ممی کہاں ہیں؟“
”وہ کسی ٹریفک جام میں پھنسی ہوئی ہیں..... اور
آپ بھی اب بالکل ٹھیک ہیں، بالکل پریشان نہ ہوں۔“
عمر نے چادر اس کے سینے تک چھینٹی اور دوپٹے سے
اس کا سر ڈھانپ دیا۔ حرم کی آنکھوں کے گوشے نم

منٹ پہلے حرم کا فون آیا ہے۔ وہ..... وہ..... دہشت سے
عروبہ کی آواز نونٹے لگی۔

عمر کی ریڈ کہ ہڈی میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ وہ
بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھا اور آفس سے
نکل کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”آپ.....
پوری بات بتائیں! کیا ہوا حرم کو؟“

”بیٹا..... وہ فون پر کچھ کہنا چاہ رہی تھی..... مگر بول
نہیں پاری تھی۔ وہ بہت زیادہ ڈری ہوئی بھی شاید.....
”اب میں اسے فون کر رہی ہوں تو ریسیو نہیں کر رہی۔“ یہ کہہ
کر عروبہ نے سکینوں سے رونا شروع کر دیا۔

”آئی! آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں ہوگا اسے۔
میں آپ کے گھر جا رہا ہوں۔ ابھی کال کرتا ہوں آپ کو۔“
اس کے اسپتال سے حرم کے گھر کا فاصلہ دس منٹ
سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اس نے گاڑی، پارکنگ لاث سے
نکالی اور طوفانی رفتار سے حرم کے گھر کا رخ کیا۔

گھر پر پہنچ کر اس نے ڈور بتل..... بجائی اور گیٹ
کھٹکھٹایا پھر پنجوں کے بل اچھل کر گیاراج میں جھانکا۔
باریال کی موٹر بائیک بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس کا مطلب
تھا کہ حرم ابھی تک گھر میں ایکی ہے۔ مزید تاخیر کا فائدہ
نہیں تھا۔ اس نے اپنی گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر کے
باؤنڈری وال جئے بالکل ساتھ کھڑی کی۔ ادھر ادھر دیکھا اور
پھر یونٹ پر پاؤں رکھ کر بڑی تیزی سے باؤنڈری وال پار
کر گیا۔ وہ میڑھیاں پھلانگتا ہوا بالائی پورشن کی طرف دوڑا۔
”حرم..... حرم! کہاں ہو؟“ اس نے دو تین بار اسے بلند
آواز سے پکارا..... تب وہ بلا توقف حرم کے کمرے میں
داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر دلخراش تھا۔ حرم کروت کے بل
قالین پر پڑی تھی اور بالکل ساکت تھی۔ اس کے قریب ہی
ایک گلدان ٹوٹا پڑا تھا۔ اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ بے ہوش
ہو کر گری ہے۔

”حرم..... حرم! آنکھیں کھولو۔“ عمر نے اسے
کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑا پھر اس کی نبض چیک کی۔ ایک
ڈاکٹر کی حیثیت سے ساری صورت حال اس کی سمجھ میں
آ رہی تھی۔ بیسنے کے قطرے اس کی ناک کی چونچ سے گر کر
حرم کے ریشمی بالوں میں جذب ہوئے گئے۔ وہ غلٹ کے
ساتھ حرکت میں آیا۔ سب سے پہلے اس نے سائڈ ٹیبل پر
پڑی نیند آور گولیوں کی ”ڈائل“ اٹھا کر اپنی پینٹ کی جیب
میں ڈال لی پھر حرم کو ایک اوڑھنی میں لپیٹ کر اپنے
بازوؤں میں اٹھایا اور نیچے گاڑی کی طرف لپکا۔ خوش قسمتی

فورا کال کی جو دوسری یا تیسری تیل پر عمر نے ریسیو کر لی۔

☆☆☆

عمر آج کل بہت ڈسٹرب تھا۔ حرم کا اجڑا ہوا چہرہ اس
کی نگاہوں میں گھومتا رہتا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ عدیل
عرف عادی کا چہرہ بھی۔ وہ ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ وہ
عادی کو ایک اوباش اور بد چلن محلے دار کی حیثیت سے بخوبی
جانتا تھا لیکن اس نے بھی سوچا نہیں تھا کہ یہ اوباش ایک دن
اس ہستی کے ہی در پے ہو جائے گا جو ایک مدت سے اس کے
دل کے نہال خانوں میں ایک خوشبو اور ایک پاکیزہ روشنی کی
طرح موجود تھی۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا تھا کہ کہیں آتے
جاتے عدیل عرف عادی سے اس کا سامنا ہو جائے، وہ سب
اندیشے بالائے طاق رکھ کر اس پر پل پڑے۔ اسے کسی گیند
کی طرح کھینچ کھینچ کر دیواروں سے مارے۔ خود مر جائے یا
اسے مار ڈالے لیکن وہ لئیر اور در کہیں نہیں تھا۔ عمر کو پتا چل
گیا تھا کہ زیادہ لے لیس کے بعد سے وہ غائب ہے اور مبینہ
طور پر اسے ڈھونڈا جا رہا ہے۔

محسوس یہی ہوتا تھا کہ یہ عدیل عرف عادی واقعی ایک
عادی مجرم ہے..... یقیناً اس کا شمار صرف حرم اور ذویانی
نہیں تھیں۔ اس شیطان صفت کی زندگی کے کچھ اور ناپاک
گوشتے بھی ضرور موجود رہے ہوں گے۔ عمر نے ایک کام یہ
کیا تھا کہ اپنے ابو کے ایک صحافی معاون سے ملا۔ اس کا نام
محسن تھا اور اس نے کرانمر رپورٹنگ میں کافی نام کمایا تھا۔ عمر
نے اپنے ہم عمر محسن رشید سے مشاورت کی اور اس کے ذمے
یہ کام لگا دیا کہ وہ ایڈووکیٹ ریاض کے اس بد معاش بیٹے
کے روز و شب کا کھوج لگائے..... اور پتا چلائے کہ ماضی
قریب میں اس کی سرگرمیاں کیا رہی ہیں؟

اب بھی وہ فون پر محسن رشید ہی سے بات کر رہا تھا۔
دونوں اس کام کے لیے لانگٹل بنائے تھے۔ جونہی یہ گفتگو
ختم ہوئی، عمر کے فون پر پھر کال کے سگنل آنے لگے۔ اس
مرتبہ کال عروبہ آئی کی طرف سے تھی۔ اس کا دھیان سیدھا
حرم کی طرف گیا اور دل دھک سے رہ گیا۔

”السلام علیکم آئی۔“ عمر نے فون، کان سے لگاتے

ہوئے کہا۔
”عمر..... عروبہ کی گھبراہٹ ہوئی لرزاں آواز ٹریفک
کے شور میں سے ابھری۔

”جی آئی! میں بول رہا ہوں، خیریت ہے نا؟“
”پتا نہیں بیٹا۔ میں یہاں ٹریفک میں پھنسی ہوئی
ہوں۔ باریال اور ماہین بھی گھر میں نہیں ہیں۔ ابھی دو تین

چاہتی تھی۔ وہ یہ آواز بلند اپنے رب سے بھی معافی مانگ رہی
تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ مر رہی ہے۔ آنکھوں کے آگے
اندھیرا چھار ہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے سب فون تک پہنچنے اور اپنی
ممی کا قبر پر بس کرنے میں کامیاب ہوئی۔

☆☆☆

وکیل صاحب سے ملنے کے بعد جب عروبہ نے اپنی
مہران کار پر گھر کا رخ کیا تو اسے شدید ٹریفک جام کا سامنا
کرنا پڑا۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ ایک معروف سیاسی
شخصیت کا ”مرڈر“ ہو گیا ہے اور اس وجہ سے شہر بھر میں
ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے۔ اب بھی متعلق لوگوں کا ایک
ہجوم، جلوس کی صورت میں گزر رہا تھا اور لاعد گاڑیاں
اپنی جگہ جام ہو کر رہ گئی تھیں۔ موسم اب تبدیل ہو رہا تھا اور
گاڑی کے اندر سورج کی تیز خاصی تیز محسوس ہوئی تھی۔
عروبہ نے گاڑی کا پچھلا آن کر دیا۔ اسی دوران میں اس
کے سب فون کی تیل ہوئی۔ اسکرین پر حرم کا نام تھا۔ اس
نے فورا کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے بس تیز سانسوں
کی آواز آئی تھی۔

”بیٹا! بات کرو، چپ کیوں ہو؟“ عروبہ نے
پریشان ہو کر قدرے بلند آواز میں کہا۔

”ممی..... ممی..... آ..... آپ.....“ اس کی لڑکھاتی
ہوئی سی آواز گلے میں گھٹ گئی۔

”حرم..... عروبہ نے چیخے ہوئے کہا۔

عروبہ نے مزید دو تین دفعہ اس کا نام پکارا، پر اب
دوسری طرف سنا تھا۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔ اس کی سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے اور وہ کیا کرے؟ اس نے
کال منقطع کر کے اپنی لینڈ لڈ کی فون ملا یا مگر وہ بند جا رہا
تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ سے اٹھائے اور پھر اپنا
سر تھام لیا۔ نہایت گھبراہٹ میں اس نے حرم کا نمبر دوبارہ
پریس کیا۔ اب تیل تو جاری تھی لیکن کال ریسیو نہیں ہو رہی
تھی۔ عروبہ کا سارا خون جیسے اس کے چہرے پر آگیا۔

”یا اللہ! میری بچی کی حفاظت فرما۔“ اس نے اپنے
ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف اٹھائے۔

ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں آیا کہ وہ اس جام
ٹریفک میں گاڑی سے باہر نکل آئے اور پیدل چل کر کسی
سواری تک پہنچنے کی کوشش کرے لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا، پھر
اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ آیا۔
اس نے ”فون بک“ آن کر کے عمر کا نمبر تلاش کیا، جو کچھ دن
پہلے ہی شمنہ باجی نے اسے نکھوا یا تھا۔ نمبر موجود تھا، اس نے

حرم کی امی اب تہیہ کر چکی تھیں کہ انہوں نے اب آواز اٹھانی ہے۔ دودن پہلے ماں بیٹی میں رات کو طویل گفتگو ہوئی تھی۔ انہوں نے سارے منفی اور شبہت پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد وکیل صاحب سے مزید بات بھی کر لی تھی..... اب حرم اور اس کی امی کو پہلا کام یہ کرنا تھا کہ تھانے جانا تھا اور اپنے مجرم کے خلاف ایف آئی آر درج کرانا تھی۔ انتظار صرف اس بات کا تھا کہ حرم شیک سے چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے۔

اور آخر وہ تھکے خیز دن آن پہنچا جب چادروں میں لپٹی دونوں ماں بیٹی تھانے پہنچیں۔ حرم کے خالو یا ر حیات کو بھی ساتھ جانا تھا مگر ایک ار جٹ کام کے سبب وہ آنے پائے تھے۔ عروہ کا حوصلہ جوان تھا، اس کے باوجود وہ اندر سے کانپ رہی تھی۔ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس نے تھانے کی دلیز پار کی تھی۔ تھانے میں داخل ہونے کے دو تین منٹ بعد ہی عروہ کو اپنے خوف میں نمایاں کی محسوس ہوئی۔ اس کی کپکپاہٹ مں ہوری تھی اور اس کی جگہ ایک طرح کا طیش اور رنج غم اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگا تھا۔

وہ مطلوبہ اہلکار کے سامنے پہنچی اور مستحکم لہجے میں بولی۔ ”میں رپورٹ درج کرانا چاہتی ہوں۔“
 موٹے تازے عمر نے ماں بیٹی کو سرتاپا گھورا پھر انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اکھڑے سے لہجے میں بولا۔ ”کس بات کی رپورٹ لی بی بی؟“

”مجرمانہ حملے کی..... میری بیٹی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔“ عروہ ایک ایک لفظ چپا کر مستحکم لہجے میں بولی۔
 مقرر نے حیران ہو کر دونوں کو دیکھا۔ وہ پردے میں تھیں۔ عروہ کی طرح حرم کی بھی بس آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ مقرر نے اپنا رجسٹر بند کیا اور ذرا تعجب سے بولا۔

”کس کے ساتھ ہوئی ہے زیادتی؟“
 ”میری اس بیٹی کے ساتھ۔“ وہ بے خوف اور بے جھجک لہجے میں گویا ہوئی۔
 ”..... آپ دونوں کے ساتھ بھی کوئی آیا ہے یا اکیلے آئی ہیں؟“

”ہمارے ساتھ کوئی نہیں۔ ہم اکیلے ہیں۔ آپ بس رپورٹ درج کریں۔“
 بے کے مقرر نے معنی خیز نظر سے اپنے ساتھ بیٹھے اہلکار کی طرف دیکھا۔ اس نظر میں شاید گھوڑا سا حسرت بھی شامل تھا پھر اس نے ٹھٹھکاہار کا گلا صاف کیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔ ”آپ دونوں کافی پریشان لگ رہی ہیں۔“

سے ہوئی، وہ ایسے ہی تو نہیں ہو جاتی نا؟“
 ”ہوسکتا ہے کہ میں جانتا ہی ہوں۔“ وہ جیسے بے ساختہ کہہ گیا۔

حرم نے چونک کر عمر کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر زرد رنگ لہر گیا۔ عمر نے جلدی سے بات بدل دی اور اسے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ”دیکھو حرم! ہمیں ہر تکلیف اور پریشانی میں بھی اس رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ایک تکلیف اور پریشانی اس موجودہ تکلیف اور پریشانی سے بھی بڑی ہے جس کا سامنا ہمیں نہیں کرنا پڑا۔ اپنے آپ کو سنھالیں حرم۔ خود کے لیے نہیں تو اپنے باقی گھر والوں کے لیے۔ آپ بڑی بہن ہیں۔ آپ پر اس فحری بہت سی ذمے داریاں ہیں۔ ذرا سوچیں کہ آپ کی اس حرکت کا پتا باریاں اور مابین وغیرہ کو چلے تو کیا اثرات پڑیں گے ان پر؟“ عمر کے لہجے میں ایک اپنائیت بھرا غصہ تھا۔

وہ کئی منٹ تک بڑی دردمندی اور اپنائیت کے ساتھ حرم کو تسلی دیتا رہا اور اس کا حوصلہ بڑھا تا رہا۔ وہ اسے اسٹڈی وہاں شروع کرنے کا بھی کہہ رہا تھا۔ اس کی باتوں میں ایک پُر خلوص خوشبو تھی اور یہ خوشبو خود عمر کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مناسب ترین الفاظ جیسے بے ساختہ اس کی زبان سے ادا ہوتے چلے جا رہے تھے۔ آخر میں اس نے بہت کر کے حرم سے بس اتنا کہا۔ ”اپنی مشکلات میں خود کو بھی جھانکنے لگے گا۔“

وہ ایک بار پھر شیک کر عمر کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ اس کا یہ انداز اتنا پیارا تھا کہ عمر کو اپنی روح میں اترتا ہو محسوس ہوا۔

☆☆☆

حرم کو پوری طرح شیک ہونے میں کئی روز لگ گئے۔ وہ خود کو بہت کمزور محسوس کر رہی تھی مگر والدہ اور بہن بھائی کے سامنے تندرست اور خوش نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔
 عمر کے علاوہ یہ حقیقت کسی کو معلوم نہیں تھی کہ پریشانی اور مایوسی کی انتہا کچھو کچھ اس سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔

اس دوران میں عمر دوبار ان کے گھر آیا۔ اس نے حرم کی والدہ کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ حرم پر گزرنے والی قیامت سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اس نے حرم کی والدہ کو مشورہ دیا کہ وہ اس ظلم کے خلاف خاموش نہ رہیں لیکن اپنے اس مشورے پر وہ زیادہ زور بھی نہیں دے سکا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ستر کتنا دشوار اور کانٹوں بھرا ہے۔
 مگر عمر جانتا نہیں تھا کہ ہونے والا فیصلہ تو ہو چکا ہے۔

چاہتا تھا۔ تیسرے چوتھے روز اسے اتفاقاً ثابت کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ وہ اپنی امی کے ساتھ حرم کو دیکھنے آیا تھا۔ وہ لوگ چائے پی رہے تھے جب کسی طرحی گھر سے رونے دھونے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا کہ سامنے والے گھر میں ایک خاتون دل کے دورے کے سبب انتقال کر گئی ہیں۔ آئی عروہ اور عمر کی امی جلدی سے فوٹلی والے گھر میں چلی گئیں۔

عمر صوفے پر بیٹھا تھا۔ حرم سامنے کرسی پر سر جھکائے ہوئے تھی۔ عمر نے کہا۔ ”حرم! مجھے آپ سے اس طرح کی حرکت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ آپ جیسی باشعور اور دین کی سمجھ رکھنے والی لڑکی سے ایسی مایوس کن حرکت کا سرزد ہونا بہت تکلیف دہ ہے۔“ حرم اپنی نظریں اٹھائیں پارہی تھی۔
 ”حرم! میں جانتا ہوں کہ اپنے پاپا کی جدائی آپ کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے حالات میں بہت سختی ہے لیکن سختیوں کا مقابلہ کرنے اور حالات سے لڑ کر انہیں سدھارنے کا نام ہی تو زندگی ہے۔“
 وہ دھیمے لیکن پوچھل لہجے میں حرم کو سمجھاتا رہا۔ آخر میں وہ ایک گہری سانس بھر کر بولی۔ ”وہ کیسے ہوا، کیوں ہوا؟ مجھے خود بھی پتا نہیں۔ میں اس پر بہت شرمندہ ہوں لیکن اب بھی کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ میں مری جاتی تو اچھا تھا۔“

”ایسی باتیں منہ سے مت نکالیں۔“ وہ قدرے ترشی سے بولا۔ ”زندگی خدا کی نعمت ہے..... اور آپ کی زندگی آپ کے ارد گرد موجود لوگوں کے لیے بہت اہم ہے۔ بہت زیادہ اہم۔“ اس نے یہ بات کچھ ایسے لہجے میں کہی تھی کہ حرم بے ساختہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس لمحے میں ان دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں۔ ایک خیال بکلی کی ہی تجویز کے ساتھ ان دونوں کے ذہنوں سے گزرا۔ اس برقی لہر والے خیال نے خاموشی کی زبان میں حرم سے کہا۔
 ”ہاں..... تم شیک سمجھ رہی ہو حرم۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں جن کے نزدیک تمہاری زندگی کی بہت..... بہت زیادہ اہمیت ہے اور یہ اہمیت اب سے نہیں، بہت عرصے سے ہے۔ اس اہمیت کے پیچھے کئی موسموں، چاندنی راتوں، چٹیلی صبحوں اور خوش رنگ تہواروں کی چھوٹی چھوٹی یادیں ہیں۔“

حرم نے گڑ بڑا کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے ریشمی بالوں کی لٹکیں اس کے چہرے کی طرف پھسل آئیں اور چہرے پر ایک چھوٹا سا گھونٹ بننا دیا۔ وہ اسی گھونٹ کی اوٹ سے بولی۔ ”آپ میری مشغلوں کے بارے میں جانتے ہوں گے لیکن زیادہ نہیں جانتے۔ جو..... غلطی مجھ

ہو گئی۔ اسی دوران میں آئی عروہ کا فون پھر آگیا۔ ”بیٹا! حرم کیسی ہے اب؟“ ان کی آواز زندگی ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ روتی رہی ہیں۔

”آئی! حرم بالکل شیک ہے اب۔ ابھی تھوڑی دیر میں، میں اس سے آپ کی بات کرانا ہوں۔ میں نے گھر بھی فون کر دیا ہے۔ باریاں اور مابین گھر پہنچ چکے ہیں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“

”بیٹا! اب ٹریک تھوڑا تھوڑا حرکت میں آنا شروع ہو گیا ہے۔ میں بھی یہاں سے نکلتی ہوں تو کلینک پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں۔“

”ارے نہیں آئی..... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ حرم کو اب ادے کر دیا گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ آدھ پون گھنٹے میں ہم ویسے ہی یہاں سے فارغ ہو جائیں گے۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ یہاں سے نکل کر سیدھا گھر ہی پہنچیں۔ ہم بھی بس پہنچ جاتے ہیں۔“ عمر نے صورت حال کو سنھالتے ہوئے کہا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ آئی عروہ کو اصل بات کا پتا چلے۔ اولاد کی طرف سے ”سوسائڈ ایسٹ“ کتنی اذیت ناک ہوتی ہے، اس کا اندازہ لگانا محال ہے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد حرم اس قابل ہوئی کہ اسے کلینک سے گھر لے جایا جاسکے۔ آئی عروہ اب بھی تنگ گھر نہیں پہنچ پائی تھیں۔ بڑا زبردست قسم کا ٹریک جام ملا تھا انہیں۔ گاڑیاں چار چار گھنٹے سے پھنسی ہوئی تھیں۔ عمر نے گھر پہنچنے کے لیے ایسا راستہ اختیار کیا جس پر ”ٹریک جام“ کا احتمال نہیں تھا۔ اس نے اپنے پہلو کی نشست اسٹریچ کر دی تھی اور حرم اس پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ عمر کے دل میں بہت رنج تھا اس واقعے کے حوالے سے..... لیکن حرم کی حالت فی الحال ایسی نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کوئی سخت بات کی جاتی۔ ہاں، عمر نے اسے اس بات کی تاکید ضرور کی کہ وہ گولیاں نگفنے والی بات، اپنی امی کو اور دیگر گھر والوں کو ہرگز ہرگز نہیں بتائے گی۔ حرم نے آنکھیں بند کیے کیے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

دو روز بعد حرم کی طبیعت مزید سنبھل گئی۔ عمر کی ہدایت کے مطابق اس نے گولیاں نگفنے والی بات بھی سے بھی چھپائی تھی۔ عمر کو اس بات کی خوشی تھی کہ حرم نے اس کی بات کو اہمیت دی ہے اور اسے تسلیم کیا ہے۔ تاہم جو حرکت حرم نے کی تھی، وہ اس کے حوالے سے حرم سے بات ضرور کرنا

خالو یا در حیات بھی ساتھ تھے۔ پتا چلا کہ ایس انج او صاحب آئے تو تھے مگر علاقے میں ایک ”وی آئی پی“ مودنٹ تھی، اس وجہ سے فیلڈ میں چلے گئے ہیں۔

یہ کام آغاز میں ہی اتنا دشوار ثابت ہو رہا تھا کہ عروہ کو دانتوں پیسے آگئے۔ کیس شروع ہونا تو دور کی بات، ابھی تک رپورٹ ہی درج نہیں ہوئی تھی۔ معاملے کو ٹالنے اور لٹکانے کے، پولیس والوں کے پاس سیکڑوں پیسے بہانے تھے۔ وہ دودھ گھٹنے پولیس اسٹیشن میں بیٹھی رہیں اور پولیس والے دزدیدہ نگاہوں سے انہیں گھورتے رہتے۔ ایک بار خالو یا در حیات کی ہلکاروں سے جھڑپ بھی ہوئی۔ آخر ایک روز عروہ اور یا در حیات رنج ہو کر مقامی ایم پی اے کے پاس جا پہنچے۔ اس کی منت ساجت کر کے اسے اپنے ساتھ لیا اور اس روز بہ مشکل ان کی رپورٹ درج ہو پائی۔

☆☆☆

حرم اب صرف اپنے گھر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ تعلیم کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ خود کسی کی ناکام کوشش کو اب تقریباً تین بیٹے گزر چکے تھے مگر کسی وقت اب بھی طبیعت خراب ہو جاتی تھی، سر بری طرح پکڑنے لگتا تھا۔ یہ والدہ کی حوصلہ افزائی اور ان کی دی ہوئی ہمت ہی تھی جس نے حرم میں پھر سے نہ صرف جینے کی امنگ پیدا کی تھی بلکہ اپنی زندگی برباد کرنے والے کے خلاف لڑنے کا حوصلہ بھی دیا تھا۔ والدہ کے بعد عروہ دوسرا شخص تھا جس کی ہمت افزائی نے حرم کو کھینچنے میں مدد دی تھی، وہ دو چار دن بعد ان کے گھر کا چکر لگاتا تھا، لیکن آتا آتا اس وقت تھا جب اسے یقین ہوتا تھا کہ حرم کی امی بھی گھر پر ہوں گی اور ایک مرتبہ تو امی گھر پر نہیں تھیں، وہ دروازے سے ہی واپس چلا گیا تھا۔ اس کی شخصیت میں عجیب سی سنجیدگی اور ایک یا معنی خاموشی تھی جو اس سے ملنے والے ہر شخص کو متاثر کرتی تھی۔ شاید حرم بھی ان متاثر ہونے والوں میں شامل تھی۔ عروہ کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ حرم اور آئی رنج عروہ نے کمال ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے ایف آئی آر درج کرائی ہے اور اس مفروضہ بد معاش ”عادی“ کے خلاف قانونی لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ عمر نے اس فیصلے کو بہت سراہا تھا اور ہر ممکن اپنے تعاون کا یقین دلایا تھا۔ عمر کے والد احسان سرمدی ایک معروف صحافی تھے، ماشی میں کرائم رپورٹر بھی رہ چکے تھے۔ عمر نے ان سے بھی بات کی تھی اور انہوں نے بھی اپنی سی کوشش کرنے کا یقین دلایا تھا۔

اس روز حرم کی امی کو بخار تھا وہ دکھا کر سوئی ہوئی

بھائی کو کچھ دن کھڑی میں رکھا گیا تھا بعد میں اسے بھی چھوڑنا پڑا۔ یہ لوگ ملزم کو بچانے کے لیے سارے ہنگاموں سے استعمال کر رہے ہیں اور ابھی تک کامیاب ہیں۔“ لیکن بھائی صاحب اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مجرم طاقتور شخص ہے اس لیے ہم صبر کا گھونٹ بھر کر بیٹھ جائیں۔ ہم میں جتنی ہمت طاقت ہے، ہم آواز بلند کریں گے اور کر کے رہیں گے۔ ہر دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اخباروں تک جائیں گے۔ الیکٹرانک میڈیا تک جائیں گے۔“ عروہ رہائی ہو رہی تھی۔

”یہ کوششیں اس دوسری پارٹی نے بھی کی ہیں۔ ایک دو اخباروں میں ایڈووکیٹ کے بیٹے کے بارے میں کوئی لمبے چوڑے آرٹیکل بھی چھپے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے بی بی کہ اس سے ہونا ہونا کچھ نہیں۔ اگر لڑکا پکڑا بھی گیا تو بہت ہوا دو ڈھائی سال کی سزا ہو جائے گی لیکن اس کے لیے بھی مدی پارٹی کو بہت کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔“

”جو بھگت چکے ہیں اس سے زیادہ اور کیا بھگتنا پڑے گا۔“ حرم جواب تک خاموش بیٹھی تھی، جیسے سچ کر بولی۔ ”آپ کی بہت مہربانی، آپ بس ہماری رپورٹ درج کریں۔“ نقاب کی اوٹ سے حرم کی بس آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں اور ان میں آتشیں آنسو تھے۔

سب انسپٹر عطا اللہ نے طویل سانس لے کر اپنی ڈاڑھی کھٹائی اور بولا۔ ”چھوٹی بی بی! تم بچتے نہیں رہی ہو۔ یہ بڑا کائنات بھر اتر رہا ہے۔ بلکہ رستہ بھی کیا ہے، بس کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ بڑے بڑے پاؤں پیلے پڑتے ہیں پردہ دار بیبیوں کو۔ پوچھ کچھ، طبی معائنے، آئے دن تھانے چھری کے چکر۔ اور پھر عدالت میں صفائی کے ویل جیسے جیسے سوال پوچھتے ہیں بیبیوں سے۔ اللہ معاف کرے۔“

عروہ نے سچ لکھ میں کہا۔ ”سب انسپٹر صاحب! لگتا ہے کہ آپ کی ڈیوٹی یہاں شکایت سننے کی نہیں، بلکہ ڈرانے کی ہے۔ آپ ہماری گھر نہ کریں۔ ہم نے اب اپنے آپ کو ہر صورت حال کے لیے تیار کر لیا ہے۔ آپ بس انج او صاحب سے ہماری ملاقات کرا دیں تاکہ ہماری رپورٹ درج ہو سکے۔“

”شک ہے بی بی، جیسے تم لوگوں کی مرضی۔ تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ بہتر ہے کہ آپ ساتھ والے کمرے میں بیٹھ جاؤ۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولا۔

کافی دیر انتظار کے بعد بھی ایس انج او سے ملاقات نہیں ہو پائی۔

دوسرے روز وہ دونوں بھر تھانے پہنچیں۔ اس مرتبہ

سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی پلکوں سے دھمکتی جھڑپ اس کی جمبولی میں گرے۔

مخمر نے ذرا حیرت سے کہا۔ ”بی بی! تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایڈووکیٹ ریاض صاحب کے بیٹے عدیل احمد نے آپ کی بیٹی کے ساتھ بھی۔“ اس نے حیرت کے عالم میں فقرہ ادا چھوڑ دیا۔

”ہاں وہی ہے ظالم۔ نہ جانے اب تک کتنی عزتوں پر ڈاکا ڈال چکا ہے۔ کاش ہم نے پہلے ہمت کر لی ہوتی۔ کاش ایک اور ”حرم“ اس کے ظلم کا شکار نہ ہوتی۔“ عروہ اب ہچکچاہٹوں سے رو رہی تھی۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں عروہ نے بلا جھجک پورا وقوعہ پولیس ہلکاروں کے سامنے کھول کر بیان کر دیا۔ پتا نہیں کہ اتنی توانائی اور دلیری کہاں سے آئی تھی اس کے اندر۔ اس نے جو کچھ بھی بتایا، پولیس والوں نے ایک سادہ کاغذ پر لکھ لیا۔ آخر میں مخمر نے کہا۔ ”بی بی! ابھی رپورٹ تو ہم نے لکھ لی ہے۔ پر یہ ایف آئی آر والا معاملہ اتنا آسان نہیں ہے۔ ویسے بھی ایس انج او صاحب اس وقت گشت پر ہیں۔ آپ کل دوپہر کے بعد کسی وقت آجائیں پھر یہ بات آگے بڑھ سکتی ہے۔“

اگلے روز دوپہر تک کا وقت عروہ اور حرم نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ اور تب ایک بار پھر تھانے جا پہنچیں۔ ایس انج او صاحب تو آج بھی نہیں تھے، تاہم چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی والے ایک اڈیٹر عمر سب انسپٹر سے ان کی بات ہوئی۔ سب انسپٹر کا نام عطا اللہ تھا اور وہ شکل و صورت سے کچھ شریف انسان ہی لگتا تھا۔ اس کو بھی پوری بات کا علم ہو چکا تھا۔

اس نے عروہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”بی بی! ایسے وقوعہ میں رپورٹ جلدی درج کرانا پڑتی ہے۔ تب ہی کچھ فائدہ ہوتا ہے۔ اب تو آپ نے لگ بھگ تین مہینے گزار دیے ہیں پھر بھی آپ زور دین کی تو رپورٹ تو ہم درج کر رہے ہیں گے کیونکہ یہ ہماری ڈیوٹی ہے لیکن آگے سے معاملہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”بی بی! میں اب آپ کو کیا بتاؤں۔ یہ بڑا اوکھاراستہ ہے۔ ایک تو جن لوگوں کے خلاف آپ کیس کرنا چاہتی ہیں، وہ کوئی عام لوگ نہیں ہیں۔ ایڈووکیٹ ریاض ایک دہنگ بندے کا نام ہے۔ ابھی جو پہلا کیس درج ہے، اس پر بھی کوئی خاص کارروائی نہیں ہوئی۔ ہم نے بڑا بھلا چالان عدالت میں بھیج دیا ہے۔ ملزم مفروضہ ہے، اس کے سونپنے

بہر حال کب ہوا ہے وقوعہ۔ اور الزام کس پر ہے؟“ ”میں آپ کو بتاتی ہوں سب کچھ۔“ آپ رپورٹ لکھیں۔“ عروہ نے کہا۔

مخمر جیسے لکھ میں بولا۔ ”بی بی! رپورٹ ایسے درج نہیں ہوتی، آپ کسی سیانے بندے کو اپنے ساتھ۔“

”سیانے بندے نے کیا کرنا ہے یہاں؟“ عروہ ترخ کر بولی۔ ”جس بچی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے وہ یہاں ہے۔ اس کی ماں یہاں ہے۔ وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے یہاں آئی ہیں اور آپ کی ڈیوٹی ہے کہ آپ ان کی بات سنیں۔ ان کی شکایت درج کریں۔“ عروہ کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔

”لگتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی گرمی شری چڑھ گئی ہے آپ کے دماغ کو۔ اوئے نیاز محمد، ٹھنڈا پانی لے کر آجی دو گلاس۔“ مخمر کا انداز مذاق اڑانے والا ہی تھا۔

عروہ جیسے شیش سے پھٹ پڑی، وہ بولی۔ ”آپ رپورٹ درج کرتے ہیں یا پھر میں ایس پی کے پاس جاؤں۔“ یا پھر اس سے اوپر؟“

عروہ کا لب و لہجہ دیکھ کر نائب مخمر نے بات کو سنبھالا اور بولا۔ ”بی بی! ایف آئی آر اس طرح درج نہیں ہوتی۔ پہلے آپ ہم کو اپنا مسئلہ بتائیں۔ ہم اس کی جتنی رپورٹ لکھیں گے، پھر آپ کے بیان میں کوئی وزن ہوا تو بات آگے بڑھے گی۔“

”آپ نے جو بھی کرنا ہے کرو لیکن ایک بات اپنے دماغ میں رکھو۔ کوئی عورت جب اپنی زبان سے اتنی بڑی بات کہتی ہے تو پھر وہ بے وزن نہیں ہوتی۔ اور اس کو مذاق میں لینے والا سخت بے وقوف شخص ہی ہو سکتا ہے۔“ مخمر کا سانولا چہرہ ایک بار پھر سرخی مائل ہوا لیکن اس کے بولنے سے پہلے ہی نائب مخمر بول اٹھا۔ ”جس وقوعے کی آپ بات کر رہی ہیں، یہ کب ہوا ہے؟“ ”یہ مہر کی تین تاریخ کی بات ہے۔“

مخمر اور نائب مخمر نے ایک بار پھر متحرک نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

مخمر بولا۔ ”یعنی کوئی تین مہینے گزر چکے ہیں۔ چلو خیر۔ یہ کیس قسم کا واقعہ تھا اور آپ کو کس پر شک ہے؟“ ”شک نہیں ہے، یقین ہے۔ پورا یقین ہے۔ یہ ایڈووکیٹ۔ ریاض احمد کے بد معاش بیٹے عدیل عرف عادی کا کام ہے۔ اس غیبت نے سب کچھ لٹ لیا ہے۔ سب کچھ۔“ عروہ سکیوں سے رونے لگی۔ حرم

میں سر دے لیا تو موسلوں سے کیا ڈرتا۔ آپ تھا عورت ہوکر، انصاف کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ بولی ہیں۔ کسی جہاد سے کم نہیں ہے اور میں اپنی امت طاقت کے مطابق اس میں شرکت ضرور کروں گا۔

کچھ دیر بعد وہ اللہ تعالیٰ ہوا۔ ”اچھا آئی اب میں جاتا ہوں۔ اکیس آپ سے ملنے کے لیے یہاں آئی ہیں۔ دو تین دن تک وہاں کے ساتھ آپ کے ہاں کارنگا کی گئی۔“ عروہ بولی۔ ”کل کسی گیل والے کا لون آگیا تھا، کہہ رہا تھا کہ وہ ہمارے کس کو ہائی لائٹ کرنا چاہ رہا ہے۔ خود ا وقت مانگ رہا تھا۔“

”تو آپ آئے دیں ان لوگوں کو۔ جو کچھ پوچھتے ہیں آپ ان کو بتائیں۔۔۔۔۔۔ ہاں اگر حریم ان کے سامنے آتا نہیں چاہتیں تو نہ آئیں۔ اب یہ کھلی لڑائی ہے آئی! اور یہ کئی محاذوں پر لڑنا ہوئی۔“

عروہ کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلتے ہوئے، عمر نے بے ساختہ اس دروازے کی طرف دیکھا جس کے پیچھے حریم اوجھل ہوئی تھی۔ شاید اس نے خاموشی کی زبان میں اسے بھی الوداع کہا تھا۔

عمر کے جانے کے بعد عروہ کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ آہستہ آہستہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ عمر جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کے پیچھے اپنائیت اور انسانی ہمدردی تو ہے ہی، کوئی اور جذبہ بھی ہے۔ ایسا جذبہ جس کا تعلق حریم سے ہے۔ حریم کے لیے عمر کی آنکھوں میں اس نے بے پناہ عزت کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی دیکھا تھا۔ کچھ ایسا۔۔۔۔۔۔ جس کو کوئی بھی عورت بہت جلدی محسوس کر لیتی ہے۔

☆☆☆

ایک جھٹکے سے عروہ کی آنکھ کھلی۔ وہ پیسے میں شرابور ہو رہی تھی۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ جھٹکے کی آواز کے علاوہ کمرے کے اندر یا باہر کسی قسم کا شور نہیں تھا۔ سنہری دھوپ پردوں سے چھنتی ہوئی اندر آ رہی تھی اور کمرے کو تھوڑا سا روشن کر رہی تھی۔ عروہ نے آج پھر وہی خواب دیکھا تھا جو پچھلے برسوں میں وہ بیسیوں مرتبہ دیکھ چکی تھی۔

ایک جنگل نما جگہ ہے۔ جہاں نیل میز میز پکڑنے لگے ہیں، کہیں کہیں جنگلی پھولوں کی جھلک نظر آتی ہے۔۔۔۔۔۔ کچھ جانور ہیں جو اسے گھیر رہے ہیں، بڑانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ فرار کا راستہ نہیں ڈھونڈ رہی، شاید حریم بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی آگے نکلتی ہے۔ اسے اپنے ارد گرد سفید گلاب کے پھول نظر آتے ہیں

جواب دینے کے بجائے حریم نے ماں کے کندھے سے سر لگا لیا اور آنسو بہانے لگی، پھر بچکیوں کے درمیان اس نے ایڈ ووکیٹ ریاض احمد کے کارندے سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بتایا۔

عروہ کی پیشانی پر پیسے کے قطرے نمودار ہو گئے۔۔۔۔۔۔ کیا مکمل تھا یہ؟ کیا بخیر تھا؟ یوں لگتا تھا کہ ان پر ہر وقت نظر رکھی جا رہی تھی۔ عروہ سر ہاتھ کر رہی تھی۔ عمر کے چہرے پر پیش کے آثار تھے۔ عروہ نے حریم کو کندھوں سے تھام کر صوفے پر بٹھایا اور خود بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔ عمر نے جگ سے دو گلاسوں میں پانی انڈیا اور انہیں تھمایا۔ پھر خود بھی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”آئی! آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ معاملات اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایسی گیدڑ بھکیاں چلتی ہی رہتی ہیں۔“ اس نے حریم کے من موہنے چہرے پر نظر ڈالی جو اب بھی آنسوؤں سے تر تھا۔

وہ بولا۔ ”ان فرعون صفت لوگوں کے خلاف اگر کوئی آواز اٹھائے کی ہمت کر بھی لیتا ہے تو یہ لوگ اپنے دفاع کے لیے براہِ جھجھکاں استعمال کرتے ہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو عمر! ایف آئی آر درج ہونے کے بعد سے یہ جیل پاؤں کی بجلی بنے ہوئے ہیں۔ ان کو کبھی آ رہی ہے کہ ان کے خلاف کھیرا تنگ ہوگا۔ زویا کے والدین سے بھی ملاقات ہوئی ہے۔ ان کو بھی دھونس اور لالچ سے بیرونی سے دھوکے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر وہ ڈٹے ہوئے ہیں۔“

حریم اٹھ کر اندر جا چکی تھی۔ عمر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”اس شخص نے میرے حوالے سے جو دھمکی آپ کو دی ہے اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ یہ لوگ بس ہوا میں تلوار چلا رہے ہیں۔ اس سے انشاء اللہ ہمارا کچھ بگڑنے والا نہیں۔ ویسے میں نے اپنے طور پر بھی اپنے ایک صحافی دوست کو ایک ٹاسک سونپا ہوا ہے۔ وہ ریاض احمد کی کپشن اور اس کے بیٹے کی بدنامیوں کے بارے میں ثبوت جمع کر رہا ہے۔ شاہدہ کے قریب ایک اور دھمکی کا کھوج بھی ملا ہے جن کی بیٹی کو عادی اور اس کے ایک دوست نے بلیک میل کیا ہے۔ جلد ہی اس واقعے کے ثبوت بھی سامنے آ جائیں گے۔“

”عمر ذرا احتیاط سے۔“ عروہ نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔ ”تم بچوں کو ٹھیک سے پتا نہیں ہوتا کہ تمہاری تکلیف پر تمہارے پیدا کرنے والوں کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔“ ”آئی! اب جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ جب اوکھلی

آپ کی والدہ صاحبہ کو ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔“ ”کیسا مشورہ؟“ حریم نے تیریاں چڑھا کر پوچھا۔ ”ان سے کہیں کہ وہ اس کیس کی بیرونی نہ کریں۔“

میں سچ کہتا ہوں کہ بیرونی کر کے آپ لوگوں کو پریشانی اور جگ بھائی کے سوا اور کچھ نہیں ملے گا۔ میں نے آپ کی فائل پڑھی ہے۔ یہ بڑا کمزور کیس ہے اور یہ بات آپ کو آپ کا وکیل بالکل نہیں بتائے گا کیونکہ اس نے آپ سے بے کار میں ڈھائی تین لاکھ روپے کھینچے ہیں۔۔۔۔۔۔“

”آپ اپنے قیمتی مشورے اپنے پاس رکھیے اور پلیز اس نمبر پر دوبارہ فون نہ کیجیے گا۔“ حریم خشک لہجے میں بولی۔ اس سے پہلے کہ حریم فون بند کر دیتی، دوسری طرف سے بات کرنے والا تیزی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے بیٹائی۔ آپ کو میری بات بری لگی ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کا ٹائم خراب کیا۔۔۔۔۔۔ ویسے بھی ٹائم آپ دونوں ماں بیٹی کے پاس کافی کم ہوتا ہے۔ ملنے جلنے والے آتے رہتے ہیں۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے بولنے والا کالجی مٹی خیر ہو گیا۔

”آپ۔۔۔۔۔۔ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ حریم بمشکل خود پر ضبط کر کے بولی۔ ”آپ سن ملنے جلنے والوں کی بات کر رہے ہیں؟“

”ویسے تو کوئی ہیں مگر ایک سو ہٹا منڈا تو کافی آمدورفت رکھے ہوئے ہے۔ کیا بھلا سامان ہے اس کا۔۔۔۔۔۔ ہاں عمر۔۔۔۔۔۔ عمر ولد احسان ایک لمبا چوڑا آئینک بھی چھپوایا ہے اس نے تم ماں بیٹی کے حق میں بلکہ ماں بھی کیا صرف تمہارے لیے ہی چھپوایا ہوگا۔ خیر ہمیں کیا۔ یہ ساری اندر کی باتیں ”کیس“ میں خود ہی ڈسکس ہو جائی ہیں۔“

”تم۔۔۔۔۔۔ تم دھمکی دے رہے ہو ہمیں؟“ ”کیوں اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں۔۔۔۔۔۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ یہ تو شروعات ہے بیٹائی۔ آگے آگے دیکھو۔“

”یوشٹ اپ۔۔۔۔۔۔ یوشٹ اپ۔“ حریم نے دھاڑ کر کہا اور فون بند کر کے صوفے پر پھینک دیا۔ اس کا سارا بدن خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔

”کہا ہوا حریم! کون تھا یہ؟“ عمر نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”حریم سن سکتی تھی۔“ حریم کی بلند آواز سن کر اس کی ماما بھی جاگ گئی تھیں۔ وہ بوکھلائی ہوئی سی حریم اور عمر کی طرف آ رہی تھیں۔ ”یہ کس سے بول رہی تھیں حریم؟“ انہوں نے پاس آ کر پوچھا۔

تھیں۔ اسی دوران میں کال بیل ہوئی۔ حریم کے دلی سے آواز آئی کہ یہ عمر ہوگا۔ وہ دروازے پر پہنچی۔۔۔۔۔۔ واقعی یہ عمر ہی تھا۔ ”آئی گھر پر ہیں؟“ اس نے حسب معمول پوچھا۔ حریم نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ اندر آ گیا۔

اس کو راستہ دینے کے لیے حریم پیچھے ہٹی تو اٹھا تا پیچھے ایک خالی پلیٹ پڑی تھی جس میں تھوڑی سی پیلے بلی کو دودھ ڈالا گیا تھا۔ حریم کا پاؤں پلیٹ پر پڑ کر پھسلا اور وہ پہلو کے بل چھوٹے بھائی باریال کی موٹر سائیکل پر مگر۔ اس کی ایک کھائی اور کہنی پر چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ چوٹ زیادہ سنگین نہیں تھی مگر مزے تپ اٹھا۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ بڑھائے اور حریم کی پچھلی ہونٹ کھینچ کر دیکھا۔ خون بند کرنے کے لیے اس نے اپنا رومال کہنی پر باندھ دیا اور اسے کمرے میں لے آیا۔

”پائیدین اور کائن وغیرہ ہے؟“ اس نے بے تابانی سے پوچھا۔

”ہاں الماری میں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں خود ہی لگا لیتی ہوں۔“

”کیسی بات کر رہی ہیں آپ۔ اچھا خدا بخون نکل رہا ہے۔ آپ یہاں سے دبا کر رکھیں۔ میں دوا لے کر آتا ہوں۔“ حریم نے کن آنکھوں سے دیکھا، عمر کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت بناوٹی نہیں تھی۔ وہ جیسے اندر سے تڑپا تھا۔ حریم ہنسنی سانس بھر کر رہ گئی۔

عمر نے بڑی توجہ اور فکر مندی سے حریم کی کہنی اور کھائی پر بیٹن جک کی۔ وہ کھائی کی پٹی کو آخری گرہ دے رہا تھا جب فون کی بیل ہوئی۔ یہ حریم کی امی کا فون تھا۔ وہ سوئی ہوئی تھیں۔ حریم انہیں جگتا نہیں چاہتی تھی۔ نامعلوم نمبر تھا پھر بھی اس نے کال ریسیور کر لی۔ ”ہیلو کون؟“ اس نے پوچھا۔

”عروہ بی بی لی بول رہی ہیں؟“ دوسری طرف سے بھاری مردانہ آواز آئی۔

”جی نہیں۔ ان کی بیٹی بات کر رہی ہوں۔“ ”اچھا حریم سرور۔ سبھی آپ سے غائبانہ تعارف تو پہلے ہی تھا، چلو آج بات بھی ہوئی؟“

”آپ کون؟“ حریم نے حسیلے لہجے میں پوچھا۔

”میں ایڈ ووکیٹ انور شاہ بات کر رہا ہوں۔ عدیل احمد کے محترم والد ایڈ ووکیٹ ریاض صاحب نے قانونی مشاورت کا جو ادارہ قائم کر رکھا ہے میں اس میں ملازمت کرتا ہوں۔ آپ کے والد مرحوم سے بھی تھوڑی سی جان پہچان تھی۔۔۔۔۔۔ بیٹائی! خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر میں

جن پر خون کے چھینٹے ہیں۔ یہ کس کا خون ہے، یہاں کون مرا ہے، کیا وہ اور حرم بھی اسی طرح مرجائیں گی؟ جانوروں کی ٹانوس آوازیں قریب تر ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ کون سے جانور ہیں..... جب ان کے تھیلے دانتوں کی کٹ کٹ اس کے کانوں میں گونجتی ہے تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی ہے۔ وہ آج بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی تھی۔ اس کا دل اس کے سینے میں مٹین کی طرح چل رہا تھا۔ کام دالی کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے سو گئی تھی۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا بارہ بج رہے تھے۔ اسے ماہین کو اسکول سے لینے جانا تھا اسی لمحے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور حرم اندر آئی (عروبہ، حرم سے یہ کہہ کر سوتی تھی کہ وہ اسے وقت پر چگا دے) عروبہ نے فوراً اپنے دوپٹے سے اپنے چہرے اور گردن کا پینا پونچھا۔

”اما! طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ حرم نے تشریحات سے پوچھا۔
 ”ہاں بیٹا! پتا نہیں، آج گرمی محسوس ہو رہی ہے..... چلو خیر میں ماہین کو لینے جا رہی ہوں اور پکانے کے لیے پھنک بھی لے آؤں گی۔“ یہ کہتے ہوئے عروبہ نے واش روم کا رخ کیا۔
 چہرے پر مکمل پانی کے چھینٹے ڈالے تو اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ تب اس نے الماری سے اپنی بڑی چادر نکالی اور باہر کا رخ کیا۔ ماہین انکس لینگوئیج کی کلاس لے رہی تھی اور آج کل اس کی جلدی چھٹی ہو رہی تھی۔ وہ اسے خود ہی لینے جاتی تھی۔ پچھلے تین چار روز سے گاڑی چونکہ مسئلہ کر رہی تھی اس لیے وہ پیدل ہی نکل جاتی تھی۔ ایک ٹیویٹر سے زیادہ کا فاصلہ نہیں تھا۔

ماہین کو اسکول سے لے کر اس نے چکن شاپ کا رخ کیا جو سڑک کے پار مارکیٹ کی پچھلی طرف تھی۔ عروبہ اور ماہین پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں۔ سڑک پر معمول کا ٹریفک تھا۔ اچانک ایک تیز رفتار کار عقب سے آئی اور اس نے بلند آواز میں ہارن بجایا۔ عروبہ کو یہی لگا کہ وہ گاڑی ان کے بالکل عقب میں ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ واقعی عقب میں تھی اور تیز رفتار کی سے ان کی طرف آرہی تھی۔ عروبہ بے ساختہ چلائی اور ماہین کو اپنے ساتھ دھکیلتی ہوئی فٹ پاتھ سے نیچے اتر گئی۔

برقی رفتار گاڑی بس چند انچ کے فاصلے سے ان کے پہلو سے گزر گئی، اس کی اڑائی ہوئی گرد سے ماہین بری طرح کھانسنے لگی۔

ارد گرد کے راہ گروں نے بھی چونک کر یہ منظر دیکھا تھا۔ گاڑی اب موڑ کاٹ کر ایک قریبی سڑک پر داخل ہو چکی

تھی۔ چند افراد ہمدردانہ انداز میں ماں بیٹی کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ کسی نے کہا۔ ”کوئی چری لگتا ہے حبیث..... یا شاید لپا رکھی تھی۔“
 کوئی اور بولا۔ ”گاڑیوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کو پیدل چلنے والے کیڑے کوڑے نظر آتے ہیں۔ اس حرامزادے کا نمبر نوٹ کرنا چاہیے تھا۔“
 عروبہ کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ ماہین کا رنگ بھی ہلدی تھا۔ عروبہ نے تیم پختہ راستے سے شارٹ کٹ لیا اور چکن وغیرہ خریدے بغیر ہی پریشان حال گھر واپس آگئی ابھی وہ چابی سے گیٹ کا لاک کھول رہی تھی کہ اس کے موبائل فون پر کال آئی نبرا اجنبی تھا۔ نجائے کیوں اسے لگا کہ اس کال اور ابھی تھوڑی دیر پہلے جیش آنے والے واقعے کا آپس میں تعلق ہے۔

”ہیلو۔“ عروبہ نے کہا۔
 ”جی جی، عروبہ میڈم! کیسے حال ہیں آپ کے؟“
 ”کون بول رہا ہے؟“ عروبہ نے بے حد سنجیدہ اور درشت لہجے میں کہا۔
 ”ارے، یہ کیا بات ہوئی؟ اتنی جلدی بھول بھی گئے“
 خاکسار کو؟ اچھا ہاں..... یاد آیا۔ اس سے پہلے آپ کی بیٹی حرم سے بات ہوئی تھی نا..... میں آپ کا خیر اندیش، ہمدرد ایڈووکیٹ انور شاہ عرض کر رہا ہوں۔“ اس نے تقریباً لفظوں والے انداز میں کہا۔

”کیا تکلیف ہوئی ہے جہیں اور جہیں مع کیا گیا تھا نا کہ اب ادھر کال مت کرنا۔“ عروبہ نے سچے سچے لہجے میں کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”ہمیں دھمکانا چھوڑ دو۔ ورنہ تکلیف میں آ جاؤ گے۔“

”ارے واہ کیا بات کہی آپ نے۔ اور میڈم..... تکلیف تو ابھی ابھی آپ کو ہوئی ہے۔ بہت بڑا دل ہے آپ کا۔ اپنی تکلیف کو بھول کر دوسروں کی تکلیف کا سوچتی ہیں۔“
 ”کیا..... کیا مطلب ہے تمہارا؟“ عروبہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

”میڈم! آپ سمجھ تو سب کچھ گئی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ کا ایکڈنٹ ہوتے ہوئے بچا ہے۔ پیاری سی بیٹی ہوئی ہے آپ کے ساتھ۔ اسی طرح لوگ نقصان کر کے نکل جاتے ہیں۔ کوئی پکڑنے پوچھنے والا بھی نہیں ہوتا۔ برا وقت آ گیا ہے۔“ اس غبیث نے معصومی افسوس کا اظہار کیا۔ عروبہ کو اپنی کنشیاں بھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”دیکھیں جی! اب آپ جس جیکر میں پڑ رہی ہیں

نا..... اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر بہت ہوشیار اور چونکا رہا کریں۔ جوان بچیاں ہوتی ہیں آپ کے ساتھ..... سوچن سوچن دشمن۔“ آخری الفاظ اس نے چپا چپا کر ادا کیے۔
 ”غبیث کی اولاد، ڈر پوک انسان! تو اس وقت ہے کہاں پر؟ سامنے آ کر بات کر، تیری آنکھیں نہ نکال دیں میں نے تو کہا۔“ عروبہ نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

”ارے اتنا غصہ میڈم! میں آپ کے آس پاس کہاں۔ میں تو اپنے آفس میں ہوں۔ بس ایک ہمدردی کا جذبہ ہے جس کی وجہ سے دل کی آنکھ آپ پر اور آپ کے پیاروں پر لگی رہتی ہے۔ زمانہ خراب ہے اور بیٹیاں جوان ہیں آپ کی..... ویسے تو آپ خود بھی اتنی کمی گزری نہیں۔ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ آپ کو بھی جوان ہی کہا جاسکتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ تھا.....“

”بکواس بند کر۔“ عروبہ سینے کی پوری قوت سے دھاڑی۔ ”تو حرامزادہ ہے اور تیرا وہ پاس تجھ سے بڑا حرامزادہ ہے۔ بتا دے اس سو کو بھی کہ ہم اس سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ نہیں ہیں ڈرنے والے..... پتا نہیں کہ شہید پیش کے عالم میں وہ کیا کچھ بولتی چلی گئی پھر اسی کیفیت میں اس نے اپنا سیل فون کھینچ کر فرش پر مارا فون کے پرزے ادھر ادھر بکھر گئے۔ جن میں ٹوٹی ہوئی اسکرین کی کڑچیاں بھی تھیں۔ اس کے مرحوم نانا ایک فوجی آفیسر تھے۔ عروبہ کی رگوں میں ان کا خون تھا۔ کبھی کبھی جب غصے کے عالم میں یہ خون اس کے اندر جوش مارتا تھا تو اس کا چہرہ لال بھجھوکا ہو جاتا تھا۔

اسی دوران میں حرم گھبراہٹی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اترتی اور دروازہ کھولا..... پندرہ سولہ سالہ ماہین نے وحشت زدہ انداز میں ماں کا بازو تھام رکھا تھا۔

”اما! کیا ہوا؟“ حرم نے تقریباً چلاتے ہوئے پوچھا اور ماں کا بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی۔ ”اما! آخر بات کیا ہوئی ہے؟“

”اوپر چلو..... میں بتاتی ہوں۔“ عروبہ نے جیسے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ دراصل وہ چند لمحوں کی مہلت یہ سوچنے کے لیے چاہ رہی تھی کہ حرم کو پوری بات بتائے یا نہیں۔ اسے ڈر تھا کہ حرم زیادہ ہی نہ گھبرا جائے۔ ابھی اس کے نروس بریک ڈاؤن کا پہلا واقعہ ہی اسے بھولا نہیں تھا۔ عروبہ اپنی چادر ایک طرف رکھ کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ حرم فوراً اس کے لیے پانی لے کر آئی اور خود بھی ماں اور بہن کے پاس بیٹھ گئی۔ ماہین کا چہرہ بھی حالات کی سنگینی کی

چنگلی کھا رہا تھا۔
 حرم بولی۔ ”اما! دیکھیں، مجھ سے کچھ چھپانا نہیں۔ اس مشکل میں جتنی ثابت قدم آپ ہیں اتنی ہی میں بھی ہوں..... میرا خیال ہے کہ ریاض کے اس عچے وکیل کا پھر فون آیا ہوگا۔“

عروبہ نے ایک گہری سانس لی اور حرم کو شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتا دیا۔ ساتھ ساتھ وہ حرم کے تاثرات بھی دیکھ رہی تھی۔ اسے یہ جان کر ایک اطمینان سا ہوا کہ حرم کے چہرے پر پہلے کی طرح ہلدی نہیں بکھری ہے۔ وہ بتدریج خود کو حالات کے سانچے میں ڈھال رہی تھی اور مضبوط بننے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ بولی۔ ”اما! آپ فکر نہ کریں۔ ہم ان گیدڑ بھکیوں سے نہیں ڈریں گے۔ اس کو نہ اس کا باپ بچا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے آوارہ کتے۔ اب یہ لوگ جو اوجھے بھگنڈے استعمال کر رہے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ ہمارا کیس مضبوط ہے اور بہت جلد اس غبیث انسان کے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔“

عروبہ جب حرم کو اس انداز سے بات کرتے ہوئے دیکھتی تھی تو اسے لگتا تھا کہ وہ اکیللی نہیں ہے۔ اس کی جوان، بہادر بیٹی اس کے کندھے سے کندھا ملانے کھڑی ہے۔ ماہین دبی دلی آواز میں بولی۔ ”اما! یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ہمیں گاڑی کے نیچے دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ خالو یا در کو فون کر کے بلائیں.....“

کچھ دیر تینوں ماں بیٹیوں میں اس موضوع پر بات ہوئی، پھر فیصلہ ہوا کہ اس بار سے میں تھوڑا سا اور سوچ لیا جائے۔

حرم نے جیسے چو گتے ہوئے کہا۔ ”اما! مجھے یاد ہی نہیں رہا، جب آپ باہر گئیں تھیں آئی کا فون آیا تھا، وہ کہہ رہی تھیں کہ ہماری طرف آنے کے لیے گھر سے نکل رہی ہیں۔ علی بھی ان کے ساتھ ہے۔“

”اوہ، پھر تو وہ بیٹھے والے ہوں گے۔ تم ایسا کرو لاؤنچ کو دیکھو، میں چکن میں جاتی ہوں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد تھینہ آئی اور علی ان کے ٹی وی لاؤنچ میں بیٹھے تھے۔ رکی گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں بار پال بھی ٹیوشن سے آگیا اور علی کو اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا۔ دونوں بڑے دنوں سے کہیں اکٹھے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

تھینہ آئی حسب معمول کچھ فرس بھی لے کر آئی

فلم نگری سے

جس کام نے ہوتا ہوتا ہے یا جس کو شہرت ملی ہوتی ہے، اس کا سبب خود بخود بن جاتا ہے۔ 1948ء کے اوائل میں برصغیر میں ایک ایسی آواز گونجی جس نے گیتوں کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ یہ آواز ان گھٹیلے کی ہے لیکن بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ اس کے گھڑی دھڑے سے اس کی کہیں آواز آئے اس سے زیادہ گیت گار (بلکہ بالکل دھڑکی کا پوری کے) سب سے زیادہ گیت گار کا اچھا نام اس آواز سے لگتا ہے۔ اس میں درج کر دیا۔ یہ گیت گار گیتوں کے دو ہفتار اولیٰ تا 1962ء میں کئی بار فلم آسان میں موسیقی دینے کا جاس ملا۔ جس کے گاروں کے لیے ان کو کب کیا گیا تھا کہ جب ان کو یہ پتا چلا کہ اس فلم کی موسیقی بالکل نئے موسیقار اولیٰ تیز دے رہے ہیں تو اس نے یہ کہہ کر گانے سے انکار کر دیا کہ نئے موسیقار کے ساتھ میں گانا نہیں گاسکتی۔ وہ خدا معلوم کیسی دھن بنائے۔ اولیٰ تیز نے اس کے بعد ان سے کوئی گیت نہ گویا بلکہ اس کی چھوٹی بہن آشا سے گیت گوائے۔ بعد میں اولیٰ تیز کے نام کا ڈنکا بجا تو ان کو بہت افسوس ہوا۔ اس نے اولیٰ تیز سے معذرت بھی کی لیکن اولیٰ تیز راضی نہ ہوئے۔

زخمی کا پتھری کی کتاب ”دور کوئی گائے“ سے انتخاب مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

نیا شاعر

ایک نیا شاعر کسی رسالے کے ایڈیٹر کے پاس غزل لے کر گیا۔

ایڈیٹر نے پوچھا۔ ”کیا یہ غزل آپ کی ہے؟“

شاعر نے کہا۔ ”بے شک۔“

ایڈیٹر بولا۔ ”یہ غزل رسالے کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔“

شاعر صاحب آہستہ سے بڑبڑائے۔ ”یا اللہ اب غالب کی غزلیں بھی غیر معیاری ہونے لگیں۔“

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

کی اسی چونکہ اپنا لون مگر ہول مٹی جس اس لیے اسے خیال آیا کہ شاید یہ ان کی کال ہو۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز نے اسے پتھر ادا دیا۔ وہ یوں سکتے زوہ ہوئی کہ کال کاٹ بھی نہ سکی۔ دوسری طرف وہی منحوس تھا۔ وہ بولا۔ ”عدیل بول رہا ہوں۔ کال کاٹنے سے پہلے میری بس ایک بات سن لیتا۔ میں تم لوگوں سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ جب چاہوں سامنے آکر تمہیں ہیلو سویت ہارٹ بول سکتا ہوں۔ اگر یقین نہیں ہے تو میری بات نہ مان کر آزمالو۔ میں آج رات ساڑھے دس بجے دوبارہ فون کروں گا۔ اگر چہارا فون بند ملا یا تم نے ریسیو نہ کیا تو تھارہا“ چھوٹی ”کل کال“ میں اپنی پہلی کال نہیں لے سکے اور اگر گئی تو۔ تو۔ تو۔ روتی ہوئی واپس آئے کی۔ گڈ بائے۔“

کال ختم ہو گئی، مگر حرم اسی طرح سکتے زوہ ڈھکی رہی۔ اس کے جسم کے ہر ماسم نے پینا اگل دیا تھا۔ اس نے جلدی کے ساتھ آچکل سے اپنا چہرہ پونچھا کیونکہ ماہین کے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ وہ حرم کو اپنی ٹی ٹی نیفا رام اور بکس وغیرہ دکھانے میں مصروف ہوئی۔ وہ چپک رہی تھی اور حرم کے دل میں جیسے ماتم ہو رہا تھا۔

”کہاں کم ہیں آپنی! کیا ہوا؟“ ماہین نے اس کا چہرہ دیکھ کر پوچھا۔ لہجہ میں انجانا سا خوف اتر آیا تھا۔

”جس ماہین کچھ بھی نہیں۔ یونہی بس کوئی بات یاد آگئی تھی۔“ حرم نے چھوٹی بہن کو یہ مشکل ٹالا۔

اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے خوف و ہراس کی بھنگ بھی اس کے گھر والوں کو ملے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ اپنی ماں کی طرح اپنا ہر صدمہ اپنی ذات تک محدود رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔

رات تک اس نے بہت سوچا۔ اور پھر جب ساڑھے دس بجے کے قریب وہ منحوس کال آئی تو اس نے ریسیو کر لی۔ وہ اس وقت اس چھوٹے سے کمرے میں ایکلی تھی جسے وہ لوگ اسٹڈی کے لیے استعمال کرتے تھے۔

”ہیلو سویت ہارٹ! مجھے پوری امید تھی کہ تم غلطندی کا ثبوت دو گی۔“ مکروہ آواز اس کے کانوں سے نکل گئی۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ حرم نے دھبی مگر شعلہ بار آواز میں کہا۔ اس کا پورا جسم غم و غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ”چاہتا تو بہت کچھ ہوں سویت ہارٹ، مگر فی الحال صرف اتنا چاہتا ہوں کہ پرانی بات کو بھول جاؤ، جو ہو گیا سو ہو گیا، ایک دوسرے کی طرف دوتی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں۔“

”اور اس دوستی کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ حرم

کھٹے لوگ زخم کھائے بیٹھے ہوں گے۔ ایسے جانور کا آزاد پھرنا کسی طور بھی خطرے سے خالی نہیں۔“

”تمہاری باتیں درست ہیں بیٹا، مگر بات پھر ملاقت اور کمزوری کی آجاتی ہے۔ ایڈوکیٹ ریاض اور اس کے بھائیوں کی سیاسی وابستگی کے بارے میں سب لوگ جانتے ہیں۔ یہ لوگ خود کو بچانے کے لیے ہر چکنڈا استعمال کرتے ہیں۔ اب بھی کر رہے ہیں۔ مگر ہم اس معاملے کو اتنی آسانی سے دے نہیں دیں گے۔ ویسے عدالتی کارروائی ٹھیک ہی جارہی ہے۔ ایک دو پیشیوں کے بعد عدیل کو اشتہاری قرار دے دیا جائے گا۔“

☆☆☆

ماہین کے داخلے کا مسئلہ تھا۔ زلزل کارڈ میں چھوٹا سا نقص پریشان کر رہا تھا۔ تین دن سے، ماہین کو ساتھ لیے لیے پھر رہا تھا اور آخر آج مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ ماہین بہت خوش تھی۔

حرم سبزی کاٹ رہی تھی کہ وہ اس کے پاس آن بیٹھی۔ ”آپنی! بڑے اچھے ہیں عمر بھائی۔ بھی بھی تو مجھے سگے بھائیوں کی طرح لگتے ہیں۔ اتنا پیار، اتنا خلوص، آج کل کون کسی کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کرتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔۔ آخری نمین بھی تو کم اچھی نہیں ہیں۔ آخر ان ہی کے بیٹے ہیں۔“ حرم نے بھی بھی نظروں کے ساتھ کہا۔

وہ عمر کے لطیف احساسات سے کافی حد تک آگاہ ہو چکی تھی۔ مگر وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ

احساسات بھی اس کی زبان تک نہیں آئیں گے۔ باقی رہی خود حرم کی بات۔ تو وہ تو بس زندہ چل پھر رہی تھی، یہی بڑی بات تھی۔ زندگی کے سارے روشن اور خوشبودار پہلو اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ اب اگر کوئی چیز

اسے تھوڑی بہت خوشی دے سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ اس کا مجرم کیفر کردار کو پہنچے۔ ماہین نے ایک دوسرے کو گلے سے لگا کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ انصاف کے حصول کے لیے ہر حد تک جائیں گی اور ہر خطرے کا سامنا کریں گی۔ اب بھی اس کی

ای ایک فیملی سے ملنے لاہور کے نواحی علاقے شاہدہ میں گئی ہوئی تھیں۔ یہ ان فیملیز میں سے ایک تھی جو عدیل عرف عادی کے خلاف زیادتی کا کیس درج کرانے کے بعد اور تھوڑی بہت بیرونی کرنے کے بعد ہمت ہار چکی تھی اور کیس واپس لیا ہوا تھا۔

اچانک حرم کے فون کی تیل ہوئی۔ اس نے انجان

نمبرز سے کال وصول کرنا چھوڑ دی تھی۔ لیکن اس

کے لیے یوں لگا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر عمر کے بال مٹھی میں جکڑ لے گا اور اسے کھینچتا ہوا لاک اپ کی طرف لے جائے گا تاہم عمر کے ڈیڈی احسان صاحب نے عمر کو پیچھے دھکیلا اور ایس ایچ او سے دور لے گئے۔

ایس ایچ او سکندر دہاڑا۔ ”لے جاؤ اپنے اس بھنے خاں کو یہاں سے، ورنہ ابھی اس کی بولتی بند کردوں گا۔“

رستم کہیں کا۔۔۔۔۔۔

عمر بھی آگ بگولا ہو رہا تھا۔ دروازے پر سے گر جا۔

”تم اکیلے نہیں ہو یہاں کے کرتا دھرتا۔ اس شہر میں کچھ لوگوں کے نمبر زندہ ہیں ابھی۔ وہ تمہاری طرح زور آروں کے پٹو نہیں بنے ہوئے۔ ہم انصاف کے لیے لگے ہیں اور

انشاء اللہ انصاف لے کر رہیں گے۔ ہم آج ہی پریس کانفرنس کریں گے، میڈیا کو بلائیں گے۔ انہیں بتائیں گے کہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔“ عمر مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔

اس کے ڈیڈی اسے بہ مشکل وہاں سے کھینچ کر لے گئے۔

باہر گاڑی میں بیٹھ کر ڈیڈی نے اسے سمجھایا بھجایا اور دماغ کو ٹھنڈا کر کے کا مشورہ دیا۔ عمر پریس کانفرنس بلانے پر

زور دے رہا تھا۔ ڈیڈی نے کہا۔ ”وقت آنے پر یہ بھی کریں گے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا ہے۔۔۔۔۔۔ میڈیا اور

این جی او وغیرہ ایسے ایڈوکیٹوں کی لائٹ کو ضرور کرتے ہیں۔ کچھ دنوں تک ہنگامہ بھی چلتا ہے لیکن پھر۔۔۔۔۔۔ اصل لڑائی

بندے کو خود ہی لڑنا پڑتی ہے۔“

”ڈیڈی! وہ لوگ دھکیلاں دے رہے ہیں آئی

عمر یہ کہ اور باقی گھر والوں کو۔۔۔۔۔۔ ان کے لیے زمین تنگ کر رہے ہیں یہ لوگ۔ اگر ان کے خلاف کھل کر بات نہ کی گئی اور ان کو لگام نہ ڈالی گئی تو یہ لوگ سانس لینا مشکل کر دیں گے اس گھرانے کے لیے۔“

ڈیڈی نے ذرا دھیان سے عمر کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں تجسس تھا اور جیسے ایک سوال تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں عمر سے پوچھ رہے تھے۔ میرا بیٹا!

کچھ زیادہ ہی ”انوالو“ لگ رہا ہے اس معاملے میں۔ ہمیں اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے؟

عمر نے پوچھل خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڈی!

اب یہ بات تقریباً ثبوت کو پہنچ رہی ہے کہ عادی صرف نام کا ہی نہیں حقیقتاً بھی عادی ہے اور مجرم ہے۔ آپ نے اخبار

میں جو رپورٹ چھپوائی ہے اس کو تو باقاعدہ عدالتی کارروائی کا حصہ بننا چاہیے۔ یہ سیریل کرائم ہے۔ کم از کم چار کیسوں کا ذکر تو آپ کی رپورٹ میں بھی ہے، اس کے علاوہ بھی بنجانے

زہر خند لہجے میں بولی۔

”کچھ زیادہ نہیں..... کچھ زیادہ نہیں..... بس اتنا کر دو سوئی! کہ اپنی بیاری ماما کو اور خود اپنے آپ کو تھوڑا سا سمجھا دو۔ آپ دونوں اس گندے کھیل میں ہاتھ نہ ڈالیں تو اچھا ہے۔ ورنہ اس گندے کچھینے دو درونک جا میں گے۔“

..... اور اگر میں تھوک دوں تو پر اور تمہاری اس بات پر تو۔“

دوسری طرف چند سینکڑ خاموش رہی پھر وہ اطمینان سے بولا۔ ”پھر بھی کچھ نہیں ہوگا جان من۔ میں کوئی دھمکی بھی نہیں دوں گا۔ نہ یہ کہوں گا کہ میں دوبارہ تمہارے گھر کی دیوار پھانسا سکتا ہوں، نہ یہ کہوں گا کہ کالج کے راستے میں تمہاری پھوٹی چڑیا کے پر جھڑکتے ہیں، نہ یہ کہوں گا کہ تمہاری ماما آج شام گھر آتے ہوئے کسی گاڑی سے ٹکرا سکتی ہیں۔ کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ اس لیے کہ آج تم نے عقلمندی کا ثبوت دیا ہے اور میری کالی ریبیو کی ہے۔ مجھے اچھا لگا ہے..... اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی کبھی کبھار اس منگل مندی کا ثبوت دیتی رہو گیونکہ..... کیونکہ..... کیونکہ اگر کبھی میری کالی آئی اور تم نے ریبیو نہ کی تو پھر وہ سب کچھ ہوگا جو میں نے تم سے کہا نہیں۔“ آخر میں الفاظ کہتے کہتے عادی کا لہجہ اتنا زہر ناک ہو گیا کہ طیش میں ہونے کے باوجود وہ اندر سے لرز گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

چند سینکڑ خاموش رہی، پھر اس کی نرم آواز ابھری۔ ”معاف کرنا سوچی! شاید میں کچھ زیادہ ہی بولی گیا۔ تمہارا موڈ خراب ہو گیا ہے۔ اس لیے اجازت چاہتا ہوں۔ گڈ بائے..... اور..... ایک اور بات یاد آئی۔ وہ جو ایک پیارا سا لٹو میاں مشو ہے تمہارا، وہ کل تمہارے میں جا کر بڑا ناگین ناگین کر رہا تھا اور ہمیں یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ میرے خلاف اخبار میں جو گندہ اچھا لگایا ہے اس میں بھی تمہارے اسی میاں مشو کا ہاتھ ہے۔ اس کے کھینے دوست محسن نے یہ سن گھڑت رپورٹ تیار کی ہے۔ میاں مشو کے لیے وارننگ ہے کہ وہ ایویں نہیں ضائع شائع نہ ہو جائے۔ تم لوگ بھی اس سے کچھ فاصلہ ہی رکھو تو اچھا ہے۔ اوکے گڈ بائے۔“ فون بند ہو گیا۔

حرم لرز رہی تھی اور اس کے پورے جسم کا خون اس کے سر میں جمع تھا۔ ان لمحوں میں اس کا دل چاہا، کاش کہیں سے اس کے پاس کچھ بارودی مواد آجائے، وہ اس بارود کو اپنے بے وقعت جسم کے گرد باندھ لے۔ پھر فون کر کے اس کو مکرہ فحش کو اپنے پاس بلائے اور اس کو دوبارہ اپنے ساتھ اسے بھی ٹکڑوں میں تقسیم کر دے لیکن یہ صرف بیجانی

سوچیں تھیں۔ عملی طور پر ایسا کرنا اس کے لیے کہاں ممکن تھا۔ اسی دوران میں مہران کا کارڈ ہارن سنائی دیا۔ اس کی امی گھر واپس آگئی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنا پیوٹو پٹھا اور آنکھوں سے آنکھیں آنسو صاف کیں۔ وہ اس فون کال کے بارے میں ای کو بتا کر ان کی پریشانیوں کو مزید عروج دینا نہیں چاہتی تھی۔

ای بھی کچھ زیادہ امید افزا خیرے کر نہیں آئی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ جس مشاعرہ میٹی کی طرف گئی تھیں وہ لاہور سے باہر گئی ہوئی تھی، صرف لڑکی کے تایا اور تاتی سے ملاقات ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ بڑی مشکل سے بچی کے رشتے کی امید پیدا ہوئی ہے۔ اب وہ کسی بھی طرح اس کیس کی پیروی کرنا نہیں چاہتے۔ وہ بہت تھک گئے ہیں۔

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ صبح ہوتی تھی، شام ہوتی تھی۔ کھنٹے دنوں میں، دن ہفتوں میں بدل رہے تھے۔ موسم بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ عروہ اور اس کی بیٹی نے سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر انصاف کے حصول کے لیے جو طمٹ اٹھایا تھا وہ ابھی تک اٹھا رکھا تھا۔ وہ تھک ضرور گئی تھیں لیکن ہاری نہیں تھیں، ان کے جسم شکستہ ضرور تھے، لیکن حوصلے ٹوٹے نہیں تھے۔ وہ اپنے جسم و جان پر وقت اور معاشرے کا ہر اداسہہ رہی تھیں، جو لوگ ان کے ہمنواؤں میں شامل تھے، ان میں عمر اور اس کے والد احسان صاحب سرفہرست تھے۔ وہ اپنی ہی ہر کوشش کرنے میں مصروف تھے۔ عدیل عرف عادی کا حال مفرد تھا۔ غالب امکان ابھی تھا کہ پولیس کے کچھ کرپٹ آفیسر ریاض فیلی کا حق نمک ادا کرتے ہوئے عدیل کو تحفظ دینے میں مصروف ہیں۔ انجانے اندیشوں سے مجبور ہو کر حرم نے اپنی اکی کو ان فون کالز کے بارے میں بتا دیا تھا جو اسے وقتاً فوقتاً آتی رہتی تھیں۔ وہ مکرہ فحش اسے تقریباً ہر باری ”سم“ بدل کر فون کرتا تھا اور کبھی کبھی ایس ایس ایس بھی۔ ایک دو بار ایسا ہوا تھا کہ اس کی متوقع کال کے خوف سے حرم نے اپنا فون بند کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا تھا۔ ایک بار اس کی والدہ کو ایک نہایت دھمکی آمیز کال موصول ہوئی تھی، دوسری مرتبہ بدھ ہوئی تھی۔ باریال کھیل کے میدان سے گھر واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے نمبر سے ایک فون کال آئی تھی جس میں کسی گمنام شخص نے حرم اور اس کی والدہ کو بتایا تھا کہ باریال کو فوٹو لکرایا گیا ہے۔ اگر وہ اس کی زندگی چاہتی ہیں تو 24 گھنٹے کے اندر اندر پچاس لاکھ روپے ”نیٹ

کیش“ کی صورت میں ادا کرنے کا اہتمام کر لیں۔ یہ اتنی خوفناک خبر تھی کہ حرم نے چلا کر شروع کر دیا تھا اور اس کی امی بے ہوش ہوتے ہوئے پٹی تھیں لیکن پھر فوراً ہی ایک پر لطف قبضہ سنائی دیا تھا اور دھمکانے والے نے کہا تھا کہ پریشان ہونے کی بات نہیں، باریال اس وقت خیریت سے ان کے پاس موجود ہے اور بڑی کھار رہا ہے۔ ابھی آدھ پون گھنٹے میں بخیریت گھر پہنچ جائے گا، لیکن اگر ان ماں بیٹی نے اپنی روش نہ بدلی تو یہ کال مذاق نہیں رہے گی، حقیقت بن جائے گی۔ باریال تو آدھ پون گھنٹے بعد واپس آ گیا تھا لیکن اس روز حرم اور اس کی امی کا جو اعتماد اور حوصلہ ان سے جدا ہوا تھا وہ اپنی اصل شکل میں واپس نہیں آیا۔ اگلے ہی روز ماہین کا کالج جانا بند کر دیا گیا تھا اور باریال کا کرکٹ کھیلنا بھی موقوف ہو گیا تھا۔ وہ کالج ضرور جاتا تھا لیکن اب اسے حرم کی امی گاڑی پر خود چھوڑنے جاتیں اور لاتی تھیں۔ اس فون کال نے انہیں اس قدر ہراساں کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہمدرد منگسار عمر کو بھی اس سے بے خبر رکھا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے اپنی جدوجہد ترک کر دی تھی۔ ماہین کو اس کی پچھو کے پاس کوئٹہ بھیج دیا گیا اور وہ وہیں رہنے لگی۔ حرم کی تعلیم کا سلسلہ تو بے ہی منقطع ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ تر گھر میں رہتی تھی۔ کبھی تاریخ پر عدالت میں جانا ہوتا، یا کسی آفس وغیرہ کا چکر لگانا پڑتا تو وہ اپنی امی کے ساتھ ہوتی۔ وہ ایک عادی مجرم کے ساتھ قانونی لڑائی لڑ رہی تھیں اور اسے انجام تک پہنچانا چاہتی تھیں۔ اب تک اپنی ان کوششوں میں انہوں نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ تھانے پچھری کے پکر، تاریکیں، گواہوں کی تلاش، ایسے بااثر لوگوں سے ملاقاتیں جو انہیں انصاف کے حصول میں مدد دے سکیں، وہ سب کچھ کر رہی تھیں۔ دوسری طرف عمر نے بڑی خاموشی سے اپنا محاذ سنجال رکھا تھا۔ اس نے سوگل میڈیا پر ایڈ ووکیٹ ریاض اور اس کے بدقماش بیٹے کے خلاف باقاعدہ ایک مہم چلا دی تھی۔ وہ اپنے والد کے تعاون سے صحافتی محاذ پر بھی کردار ادا کر رہا تھا اور اس نے اس معاملے کو دبے نہیں دیا تھا۔

لیکن پتا نہیں کیوں جوں جوں وقت گزر رہا تھا ایک مایوسی سی حرم اور عروہ پر طاری ہونے لگی تھی۔ انہیں لگتا تھا، جیسے ہر راستے پر کوئی رکاوٹ موجود ہے اور ہر دروازے پر عدیل اور اس کے باپ کا کوئی خفیہ ہمدرد بازو پھیلائے کھڑا ہے۔ انہیں ہر طرح سے ”ڈس ہارٹ“ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ تلویدہ لوگوں کی طرف سے حرم کے

علاوہ عروہ کے ماضی پر بھی کچھ اچھا لگایا تھا اور اب بھی اچھا جا رہا تھا۔ اس روز حرم اور عروہ کو سب سے بڑا دھچکا لگا جب انہیں عمر کی زبانی پتا چلا کہ زویا اور اس کے گھر والے بڑی خاموشی سے پاکستان چھوڑ کر کنیڈا چلے گئے ہیں۔ زویا، حرم کی وہی محلے دار دوست تھی جسے حرم پیسے سامنے کا ہی سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس بد معاش نے حرم کو ٹھٹھانے کے چند ہفتے بعد ہی زویا کو بھی برباد کیا تھا۔ اب تک زویا کی فیملی ڈیڑی رہی تھی۔ حرم اور عروہ کی طرح وہ لوگ بھی اپنے کس کی پوری پیروی کر رہے تھے۔ دونوں مظلوم لڑکیوں کے والدین اور ان کے وکیلوں کے درمیان بھی اکثر صلاح مشورہ ہوتا رہتا تھا لیکن اب اچانک ہی یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ان دنوں حرم، عروہ اور عمر نے بھی خود کو تنہا محسوس کیا۔ عمر نے اب تک کسی مرحلے پر بھی ہمت نہیں ہاری تھی، حرم اور عروہ کی ڈھارس ہی بندھ چکی تھی۔ اس نے ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا اور اپنے اس کردار کی وجہ سے بالکل چپکے چپکے حرم کے دل میں اپنی ایک خاص جگہ بنائی تھی لیکن جس روز زویا اور اس کی فیملی کے ہرون ملک جانے والا انکشاف ہوا، حرم کو پہلی بار عمر کا لہجہ نہ ہوا محسوس ہوا۔

جس روز حرم اور عروہ تک زویا والی مایوس کن خبر پہنچی اس سے اگلے ہی روز حرم کو پھر ایک نئے نمبر سے عادی کا فحش پیغام موصول ہوا۔ اس میں حسب معمول کہا گیا تھا کہ وہ پانچ منٹ بعد اس نمبر سے کال کر رہا ہے وہ ریبیو کرے۔ ہمیشہ کی طرح نہ چاہتے ہوئے بھی حرم نے کال ریبیو کی۔ (ایک دوسرے فون کی مدد سے عادی کی لوکیشن ٹریس کرانے کی کوشش بھی کی گئی تھی مگر ناکامی ہوئی تھی)

وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ ”دیکھ لیا نا۔ جان من! کچھ لوگوں کا اگلا دھڑیر کار اور پچھا گید کا ہوتا ہے۔ زویا کے پاپا جانی زمین چیرے اور آسان پھاڑنے کی باتیں کرتے تھے اب کہاں گئیں ان کی دھمکیاں۔ ڈیڑھ کروڑ کی پراپرٹی نوے لاکھ میں بیچ کر بھاگے ہیں۔ میں تو اب بھی کہتا ہوں حرم سرور! غصہ تھوک دو۔ روک لو اپنی جنونی والدہ محترمہ کو۔ اس بے کار کی پریکٹس سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوتا۔ کسی دن ہمت کر کے مجھ سے ملو۔ میں بتاؤں گا اب بھی میرے دل میں تنہی گنجائش ہے تمہارے لیے۔ پرانی باتوں کو بھول بھال کر ہم ایک نیا سفر شروع کر سکتے ہیں..... اور کیا پتا اس سفر میں جیون بھر کی رشتے داری ہی بن جائے؟ اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح متنی تھا۔

”کچھ اور کہنا ہے تم نے یا میں فون بند کروں؟“ حرم

آوارہ غنڈے اور شریف انفس ڈاکٹر کا مقابلہ تھا۔ عادی دشت میں چنگھاڑنے لگا اور عمر کو گھما گھما کر دیواروں سے بٹھنے لگا۔ اپنی تمام تر جرات اور حوصلے کے باوجود عمر اب عادی کا سامنا نہیں کر پا رہا تھا۔ سیزھیوں میں کھڑی خواتین چلانے لگیں۔ بار یال کو دو تین بندوں نے آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ عمر کے ناک منہ سے اب خون جاری تھا۔ اس کی شرٹ پھٹ چکی تھی۔ کچھ لوگوں نے آگے بڑھ کر بچاؤ کرانے کی اور عمر کو عادی کی زد سے بچانے کی کوشش کی۔ عروہ بھی سیزھیاں پھلانگتی ہوئی، ننگے سر سڑک پر پہنچ گئی۔ تب تک عمر بولہاں ہو گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے عادی کو سنبھال رکھا تھا۔ وہ جھپٹ جھپٹ کر عمر کی طرف آنے کوشش کر رہا تھا۔ تین چار افراد عمر کو بچانے کی کوشش میں تھے عروہ بھی ان میں شامل ہو گئی۔ اس نے اپنے جسم کو عمر کے لیے احوال بنا دیا۔ عادی کی دو تین سخت ٹھوکریں اسے اپنی کمر پہ کھانا پڑیں لیکن وہ ہچکچاہٹ نہیں ہئی۔

لوگ چہرے سے عادی کو گھٹک کر دور لے گئے۔ وہ عمر کے لیے لہلاہ لگا لگا رہا تھا۔ ”اے ماں مٹھا تیری تو“

بہر حال یہ بات وہی اچھی طرح جان گیا تھا کہ عمر ڈاکٹر باوہی نہیں ہے۔ وہ بازاری زبان بول رہا تھا۔ دوسری طرف عمر بھی زخمی آواز میں اسے لالہ رہا تھا۔ عمر عادی اپنے دو دوستوں کے ساتھ سلور رنگ کی ایک ٹویگا جیپ میں بیٹھا اور پھنکارا ہوا ہواں سے چلا گیا۔

اب آئی شینہ بھی چادر اوڑھے موقع پر پہنچ گئی تھیں۔ عمر کا پھلا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور ناک سے بھی خون جاری تھا۔ اس کی ایک کہنی اس بری طرح چھل چکی تھی کہ ہڈی نظر آ رہی تھی۔ ”اس کو اسپتال لے جائیں۔“ ایک شخص نے شور مچا دیا۔

عمر نے کہنی کا زخم دیکھنے کے بعد لٹی میں سر ہلایا۔ ”نہیں..... میں شیک ہوں۔“

بار یال اور عمر وغیرہ عروہ کو سہارا دے کر گھر کے اندر لے آئے۔ اوپر لاکر اسے کرسی پر بٹھایا گیا۔ حریم جلدی سے ایک بڑا مال گیلہ کر کے لائی۔ عروہ نے عمر کا خون آلود چہرہ صاف کیا۔ پھر وہ بولی۔ ”حریم بیٹی دیکھنا ذرا۔ ہونٹ پر اسٹیک کی ضرورت تو نہیں؟“

حریم نے عمر کا زخم دیکھا اور قدرے مطمئن نظر آئی۔ پھر اس نے چھوٹا آئینہ لاکر عمر کو تھما دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ اور ٹھوڑی پر آنے والے کٹ دیکھے۔ ”نہیں۔ یہ بیڑیج سے ہی شیک ہو جائیں گے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

حرام زادے کو۔ اسے مادوں کا کرگی کے گھر کے سامنے بد معاشی کیسے دکھائی جاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں اے۔“

وہ تجزی سے ہار کو ہلکا۔ ”مہر..... عمر میری بات سنو..... ٹھہرو۔“ عروہ پچانی انگریزہ عجیب کیفیت میں تند بکولنے کی طرح آگے بڑھتا چلا گیا۔

وہ اس کے پیچھے پھرتی سیزھیوں تک پہنچ گئی۔ وہ آدمی سیزھیوں سے پکارا۔ ”آپ پولیس اسٹیشن فون کریں۔“ اور ویل انکل کو بھی۔“

حریم اور آئی شینہ بھی دوڑتی ہوئی سیزھیوں پر آ گئی تھیں۔ دونوں کے رنگ ہلدی ہو رہے تھے۔ ”کیا ہوا عروہ؟“ آئی شینہ نے پکار کر پوچھا۔

”عمر کو روکیں۔ وہ دیکھیں، وہ نیچے چلا گیا ہے۔ وہ لڑنے گیا ہے۔“

آئی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر تب تک حریم نیچے سڑک پر چھا جاک چکی تھی۔ اس نے سڑک کی دوسری طرف جزل اسٹور کے قریب عدیل عرف عادی کا ٹھوس چہرہ بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے دہشت زدہ نظروں سے عروہ کی طرف دیکھا۔ عروہ نصف سیزھیاں نیچے اتر کر رک گئی تھی۔ اب تو وہ عمر کو پکار بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ سڑک پار کر چکا تھا۔

حریم اور عروہ نے دیکھا..... وہ لمبے بالوں والے منحوس صورت عدیل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے میں بیوست تھیں۔ دونوں کے درمیان چند تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا۔ پھر وہی ہوا جس کا بدترین اندیشہ موجود تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے پر ٹپ پڑے، دونوں نے ایک دوسرے پر گھونٹوں، لاتوں اور ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ سڑک پر ایک دم پھل سی جگہ گئی تھی۔ عروہ نے دہشت زدہ ہو کر ن قانونیہ پر کال کی اور مدد کے لیے کہا۔

اسی دوران میں بار یال بھی سیزھیاں اتر کر نیچے سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اس لڑائی میں اپنے عمر بھائی کا ساتھ دینا چاہتا ہو گا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ان دونوں تک پہنچتا، عدیل عرف عادی کے ساتھ آنے والے اس کے غنڈا صورت ساتھی نے دبلے پتلے بار یال کا گر بیان پڑا اور اسے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ وہ جیسے اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ اس لڑائی سے الگ رہے اور بس تماٹائی کا کردار ادا کرے اور واقعی یہ ایک سنگین لڑائی تھی۔ کچھ دیر تک تو پلڑا برابر دکھائی دیا لیکن پھر لمبے بالوں اور ٹھوس جسم والا عادی اپنے حریف عمر پر غالب آنے لگا۔ عمر بھی درویشی جسم کا مالک تھا اور عادی ہی کی طرح دراز قد بھی تھا لیکن پھر بھی یہ ایک

ہوں مگر نظر انداز کر رہی ہوں۔

وہ بولی۔ ”آپ نے سو فیصد درست بات کہی ہے۔ باجی سچ کہتی ہوں، کبھی بھی تو میں بالکل مایوس ہو جاتی ہوں اپنے آپ سے اور اپنے ارادوں سے..... یقین ہونے لگتا ہے کہ ہمارے ملک میں کمزور آدمی کے لیے انصاف کا حصول دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ ہم تک سر پھوڑتے رہیں گے اس دیوار سے۔“

”یہی تو میں تمہیں سمجھاتی ہوں عروہ! جو کچھ تمہارے بس میں تھا تم نے کیا..... اور کسی نہ کسی طور اب بھی کر رہی ہو..... اور مجھے یقین ہے کرتی رہو گی۔ مگر تمہارے بچے ہیں، ان کی زندگیاں ہیں۔ ان سب چیزوں کو کہاں تک داؤ پر لگا دیں گے۔ ہم نے ایک آواز تو بلند کر دی دی ہے نا..... اور یہ آواز کتنے لوگوں کے کانوں تک بھی پہنچی ہے۔ اس آواز نے لوگوں کے دلوں کو چھوا ہے۔ یہ آواز کسی نہ کسی شکل میں اپنے اثرات پر رقرار رہی گئی۔“

اسی دوران میں ڈور تیل ہوئی۔ چار بج چکے تھے۔ عمر اپنی والدہ کو لینے آیا تھا۔ آج وہ دینی دنوں بعد آیا تھا۔ عروہ نے دروازہ کھولا اور اسے چائے کے لیے اوپر لے آئی۔ وہ بشکل رضامند ہوا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ چائے کے ساتھ رکھنے کے لیے اتفاقاً گھر میں اسٹیکس نہیں تھے۔ عروہ نے بار یال کو بازار بھیجا۔ بار یال واپس آیا تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ عروہ چونک گئی۔ اس کے پیچھے ہی پیچھے کچن میں پہنچی۔ ”کیا ہوا بار یال؟“ وہ پریشان لہجے میں بولی۔

بار یال نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور ہولے سے کہا۔ ”وہ ادھر کھڑا ہے، سڑک کے پار۔“

”کون؟“

”وہی..... عدیل..... میں نے خود دیکھا ہے۔ ساتھ میں اس کا کوئی فرینڈ بھی ہے، موٹی سی ناک والا۔“

عروہ کی رنگوں میں لہوا چھل کر رہ گیا۔ تو نوبت یہاں تک آ گئی تھی۔ اسے اپنے پورے جسم میں لرزش محسوس ہوئی۔ ابھی تک اسے بار یال کی بات پر پوری طرح یقین نہیں آیا تھا..... اچانک اسے لگا کہ کچن کے دروازے کے بالکل پاس کوئی موجود ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتی، عمر سامنے آ گیا۔ اس کے چہرے پر بھجائی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں انگارے سے دیکھنے لگے تھے۔ وہ لمبیر آواز میں بولا۔ ”سوری آئی جان! لیکن میں نے بار یال کی بات سن لی ہے۔ میں..... میں زندہ نہیں چھوڑوں گا اس

نے کرخت لہجے میں کہا۔

وہ بگڑ کر بولا۔ ”جب اس طرح بولتی ہو تو جی چاہتا ہے کہ دوستی کا ہاتھ کھینچ لوں اور دشمنی کا ہاتھ بڑھا دوں..... اور تمہیں پتا ہی ہے میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ جب پکڑنے پر آ گیا تو تم سات دیواروں کے پیچھے بھی چھپ نہیں سکو گی۔“

”تمہارے ہاتھ کتنے بھی لمبے ہوں، میرے جسم تک نہیں پہنچ سکتے۔ میری لاش کو شاید چھوگیں۔“

”لاش بننے کی باتیں کرنا آسان ہوتا ہے لیکن لاش بننا آسان نہیں ہوتا، تجربہ شرط ہے۔“

وہ رو پاکی ہو گئی۔ ”عادی! خدا کے لیے۔ ہمارا پیچھا چھوڑ دو..... چھوڑ دو ہمارا پیچھا۔ سنا ہے تمہاری اپنی بھی نہیں ہیں۔ بھانجیاں ہیں، بھی ان لڑکیوں کا خیال بھی کرو۔ اللہ کے غضب کو آواز مت دو۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے..... ایک حد ہوتی ہے۔“

”یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ صبر اور انتظار کی بھی تو ایک حد ہوتی ہے.....“ اس کا لہجہ پھر نرم اور مٹھا ہو گیا۔ حریم سسک رہی تھی۔ وہ چند لمحوں توقف کر کے بولا۔ ”چھاپھر بات کریں گے۔ لگتا ہے کہ تمہاری طرف بارش شروع ہو گئی ہے۔“ اس نے فون بند کر دیا۔

وہ بیٹھی، ڈبڈبائی آنکھوں سے اپنے فون کو دیکھ رہی۔ وہ اس کے آس پاس موجود تھا۔ گاہے بگاہے اسے فون بھی کرتا تھا، لیکن کوئی اسے ٹریس نہیں کر پا رہا تھا۔ شاید کوئی ٹریس کرنا چاہتا ہی نہیں تھا۔ کسی وقت تو وہ یہ سوچ کر ڈر جاتی تھی کہ وہ ان کے گھر بھی آدھ کا تو شاید کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ وہ اللہ سے مدد مانگنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

آئی شینہ سہ پہر کے وقت عروہ سے ملنے آئیں۔ حریم دوسرے کمرے میں بھی اور بار یال کوئٹس کی تیاری کر رہی تھی۔ آئی شینہ نے کولڈ ڈرنک کا ”سپ“ لینے کے بعد پڑ سوچ انداز میں کہا۔ ”عروہ! میری ایک بات مانو۔ بہت بہتری آئے گی اس نے تم حریم کو اس کی بڑی پھپھو کے پاس دینی بھیج دو۔ وہاں کافی زیادہ پاکستانی کیونٹی ہے۔ ہمارے لاہور کے بھی بے شمار لوگ وہاں آباد ہیں۔ وہیں پر کوئی مناسب سارشتہ دیکھ کر حریم کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں۔“

عروہ کے سینے پر ہلکی سی چوٹ لگی۔ اس نے باجی شینہ کی طرف دیکھا۔ بے شک وہ یہ بات خلوص اور ہمدردی سے کہہ رہی تھیں لیکن شاید وہ جانتی تھیں کہ حریم کے حوالے سے ان کے بیٹے کے خیالات کیا ہیں یا شاید وہ جانتی

”اور کہنی؟“ آنٹی ثمنینہ رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔
 ”یہاں بھی بینڈ تاج ہو جائے گی۔“ عمر نے کہا۔
 عادی سے چوٹیں کھانے کے باوجود وہ مکمل حوصلے میں تھا اور
 اس کے کشادہ سینے میں اضطرابی زیر و بم تھا۔

ایسے موقعوں پر پولیس کی پھرتیاں ہمیشہ سے
 زیر بحث رہی ہیں۔ پولیس یوں تو سڑکوں پر دندناتی نظر آتی
 ہے لیکن جب ضرورت ہوتی ہے دور دور اس کا پتا نہیں ملتا۔
 یہاں بھی پولیس آئی لیکن تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد۔ تب تک
 حریم کے خالو یا اور حیات اور وکیل سلطان صاحب بھی پہنچ
 چکے تھے۔ انہوں نے پولیس انسپکٹر سے بات کی اور ساری
 صورت حال سے آگاہ کیا۔ پولیس کا یہ موقف بالکل غلط
 ثابت ہو گیا تھا کہ عادی آزاد علاقے میں کہیں روپوش ہے۔
 وہ یہیں لاہور کی گلیوں میں دندناتا رہا تھا۔ تاہم اس کو پوری
 طرح ثابت کرنے کے لیے غیر جانبدار گواہی کی ضرورت
 تھی۔ یہ گواہی ارد گرد کے لوگ ہی دے سکتے تھے۔ ایسے
 موقعوں پر گواہی دینے کے لیے کون تیار ہوتا ہے اور یہی
 ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔

اگلے دو تین روز میں پولیس نے کافی پھرتی دکھائی مگر
 نتیجہ وہی رہا ڈھاک کے تین پات۔ شاید وہ لوگ دل سے
 کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کچھ
 لوگوں نے اپنے نادیدہ ہاتھوں سے ہر وہ دروازہ بند کر رکھا
 ہے جو قانون کو عادی کی سمت لے جاسکتا ہے۔ خانہ پری
 کے طور پر عادی کے سوتیلے بھائی کو پھر حراست میں لیا گیا مگر
 ایک دو دن کی پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا گیا۔

واقعات کے چوتھے پانچویں روز کی بات ہے، عروہ
 اور حریم، عمر کی عیادت کے لیے ان کے گھر گئیں۔ پرانے
 محلے میں جاتے ہوئے انہیں عجیب سی جھجک محسوس ہوتی تھی۔
 وہ اپنی مہران کے بجائے رکشا پر گئیں۔ حریم نے چادر کا
 نقاب کر رکھا تھا۔ عمر نے اسپتال سے ایک ہفتے کی چھٹی لے
 رکھی تھی اور گھر میں ہی تھا۔ اس کے بازو پر ابھی تک پٹی تھی
 اور ٹھوڑی پر بھی میڈیکل ٹیپ چسکی ہوئی تھی۔ سارے مایوس
 کن حالات کے باوجود عمر کی آنکھوں میں اب بھی عزم کی
 چمک لٹکارا مارتی تھی۔ پانچ روز پہلے جو واقعہ ہوا تھا اس کی
 ایف آئی آر بھی عمر کی گوشوں سے ہی کٹی تھی۔

عروہ کچھ پھل اور اسٹیکس وغیرہ لے کر گئی تھی۔ آنٹی
 ثمنینہ ہمیشہ کی طرح تپاک سے ملیں تاہم حریم نے صاف
 محسوس کیا کہ وہ کچھ چپ چپ ہیں۔ وجہ کوئی ڈھکی چھپی تو تھی
 نہیں۔ حریم سے آنٹی کی انسیت اپنی جگہ تھی، مگر انہیں اپنا بیٹا

بھی عزیز تھا اور ان کا اکلوتا بیٹا بندرتج ایک خطرناک رقابت
 اور دشمنی کی زد میں آ گیا تھا۔ آنٹی ثمنینہ اور عروہ کوئی بات
 کرنے کے لیے کمرے سے باہر نکلیں تو عمر اور حریم کچھ دیر
 کے لیے کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ عمر بستر پر نیم دراز تھا،
 حریم چند فٹ کے فاصلے پر سنگل صوفے پر بیٹھی تھی۔ بوجھل
 خاموشی کو توڑتے ہوئے وہ بولی۔ ”آپ کے چہرے کو دیکھ
 کر لگتا ہے کہ آپ کو شاید بخار بھی ہے۔“

”ہاں کل کچھ ٹیپر بچہ لگتا تھا لیکن اب تو ہلکی سی حرارت
 ہی ہے۔“ حریم نے سائڈ ٹیبل کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں کچھ
 دوا میں پڑی تھیں۔ ”اگر آپ کہیں تو ”پینا ڈول“ دوں آپ کو؟“
 ”نہیں رہنے دیں۔“ اس نے کہا، پھر ذرا توقف سے
 بولا۔ ”اگر کچھ کرنا ہی چاہتی ہیں تو یہ ٹھوڑی والی بینڈ تاج ذرا اتار
 دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آئٹمنٹ لگا کر اسے کھلا رکھوں۔“

حریم فوراً اٹھی۔ اس نے کاشن اور پائیڈین وغیرہ
 لی۔ پہلے میڈیکل ٹیپ اتاری پھر چسکی ہوئی پٹی اتارنے کے
 لیے اسے پائیڈین سے نم کرنے لگی۔ وہ نیم دراز عمر کے
 اوپر جھکی ہوئی تھی۔ اس سارے عمل کے دوران میں اسے پتا
 ہی نہیں چلا کہ کب اس کے سلی بالوں کا ایک پورشن ڈھلکا اور
 عمر کے چہرے کو چھونے لگا۔ وہ پوری طرح اپنے کام کی
 طرف متوجہ تھی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ اس کی ٹیس عمر کی
 نرم اور محبت بھری گرفت میں ہیں۔ وہ بے طرح ٹھنک گئی
 لیکن اسی طرح جھکی کھڑی رہی۔

عمر کی آنکھیں بند تھیں اور آنکھوں کے گوشوں سے ہلکی
 سی نمی جھانک رہی تھی۔ وہ جو ہمیشہ خاموش رہا تھا، آج
 خاموش نہیں رہا۔ اسی طرح آنکھیں بند کیے کیے اس نے
 اپنے ہونٹوں سے حریم کے بالوں کو چھوا اور سوئے سوئے سے
 لہجے میں بولا۔ ”حریم! مجھے تمہانہ چھوڑیے گا۔ آپ کے
 بغیر..... مجھ سے جیا نہیں جائے گا۔“ یہ الفاظ ادا کرتے کرتے
 اس کی بند آنکھوں کے گوشوں سے دھمکتی ڈھلک گئے۔

حریم کے پورے جسم پر جیسے چیونٹیاں سی رینگ گئی
 تھیں۔ یہ چند الفاظ تھے لیکن لگتا تھا کہ ان کے پیچھے برسوں
 کی کشمکش اور تڑپ شامل ہے۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی
 دوران میں اس کی حساس سماعت نے کچن کی طرف قدموں
 کی مدھم چاپ سنی۔ ماما یا آنٹی میں سے کوئی اس طرف آ رہا
 تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے اپنے بال عمر کی محبت بھری
 گرفت سے چھڑائے اور سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

باقی حصہ اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں